عصمت چغتائی
(20)

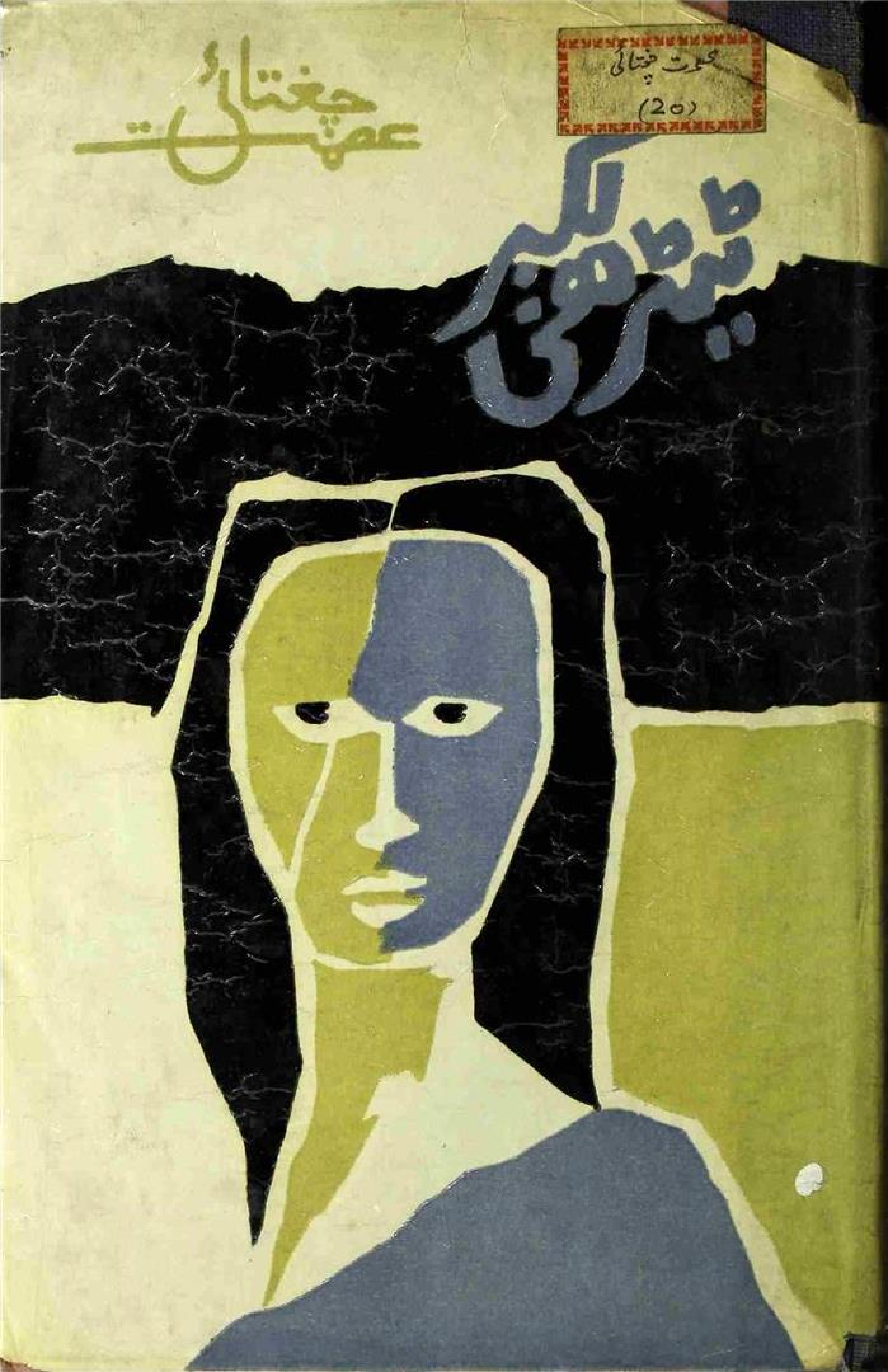

ٹیڑھی لکیر

(ناول)

عصمت چغتائی

نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنو
226018

مصنّفہ کی تحریری اجازت
سے شائع کیا گیا

اشاعت ۱۹۹۰ء
ناشر ..... نصرت پبلشرز
امین آباد، لکھنؤ

قیمت

۷۵/ روپے

TERHEE LAKEER
BY ISMAT CHUGHTAI
NUSRAT PUBLISHERS
AMINABAD . LUCKNOW
Rs 75/=

ٹیڑھی لکیر

عصمت چغتائی

●

عصمت نے جس بے باکی اور جرأت کے ساتھ پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہے ہمارے ادب میں اس کی کمی تھی؛ اور اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی۔

مجنوں گورکھپوری

●

عصمت کو سماج سے نہیں شخصیتوں بلکہ اشخاص سے شغف ہے، ان کے جوش و ہوش، ان کی تھرتھراہٹ اور کپکپی سے، ان کی کش مکش سے عداوت اور فریب کاری سے، جو انسان پر طاری ہوتی ہے تو جسم بھڑکنے لگتا ہے۔ اس کے فن میں خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہیں ملے گی۔ بلکہ انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے۔ لبالب اور ابلتا ہوا ٹکراتا ہوا اور راستہ چیرتا ہوا۔

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لیے باعث فخر ہے، انھوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اردو ادب میں جو امتیاز عصمت کو حاصل ہے اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

پطرس

پیش لفظ

جب ناول ٹیڑھی لکیر شائع ہوا تو کچھ لوگوں نے کہا میں نے ایک جنسی مزاج اور بیمار ذہنیت والی لڑکی کی سرگذشت لکھی ہے۔ علم نفسیات کو پڑھیے تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون بیمار ہے اور کون تندرست۔ ایک پارسا ہستی جنسی بیمار ہو سکتی ہے اور ایک آوارہ اور بدچلن انسان صحت مند ہو سکتا ہے۔ جنسی بیمار اور تندرست میں اتنا باریک فاصلہ ہوتا ہے کہ فیصلہ دشوار ہے۔ مگر جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن نہ ذہنی بیمار ہے اور نہ جنسی۔ جیسے ہر زندہ انسان کو گندے ماحول اور آس پاس کی غلاظت سے ہیضہ، طاعون ہو سکتا ہے اسی طرح ایک بالکل تندرست ذہنیت کا مالک بچہ بھی اگر غلط ماحول میں پھنس جائے تو بیمار ہو جاتا ہے اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر "شمن" زندہ ہی نہیں ہے جاندار ہے اس پر مختلف حملے ہوتے ہیں لیکن ہر حملے کے بعد وہ پھر ہمت باندھ کر سلامت اٹھ کھڑی ہوتی ہے وہ ہر امتحان سے گزر کر پرسکون انداز میں اپنا سر تکیے پر ٹکا دیتی ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کے بعد دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ یہ اس کا قصور نہیں ہے کہ وہ بے حد حساس ہے اور ہر چوٹ پر منہ کے بل گرتی ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔ نفسیاتی اصولوں سے ٹکرا کر وہ انھیں جھٹلا دیتی ہے ــــ ہر طوفان سر سے گزر جاتا ہے۔

"شمن" کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی اسے سمجھ نہیں پاتا وہ پیار محبت اور دوستی کی بھوکی ہے اور انہی نعمتوں کی تلاش میں بھیانک جنگلوں کی خاک چھانتی ہے اس کا دوسرا عیب ہے ــــ ضد یا شاید یہی اس کی خوبی ہے۔ ہتھیار ڈال دینا اس کی طبیعت نہیں۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے ــــ مجھے خود یہ آپ بیتی

لگتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس کیا ہے۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریوں سے جل بھی اٹھی ہوں، اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔ اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے۔ اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔ اس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخارے بھی لیے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں۔

اور جگ بیتی اور آپ بیتی میں بھی تو بال برابر کا فرق ہے۔ جگ بیتی اگر اپنے آپ پر بیتی محسوس نہ کی ہو تو وہ انسان ہی کیا؟ اور بغیر پرائی زندگی کو اپنائے ہوئے کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔

یہ شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے اس دور کی لڑکیوں کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں لٹک رہی تھیں اور میں نے ایمانداری سے ان کی تصویر ان صفحات میں کھینچ دی ہے، تاکہ آنے والی لڑکیاں اس سے ملاقات کر سکیں اور سمجھ سکیں کہ ایک لکیر کیوں ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اور کیوں سیدھی ہو جاتی ہے؟ اور اپنی بچیوں کے راستے کو الجھانے کے بجائے سلجھا سکیں۔ اور بجائے تنبیہہ اور فضیحت کے اپنی بیٹیوں کی دوست اور رہنما بن سکیں۔

عصمت چغتائی

بمبئی

اُن یتیم بچوں کے نام

جِن کے

والدین بقیدِ حیات ہیں

یعنی وہ بچے جو والدین کی [illegible] [illegible] سے محروم [illegible]

یہ [illegible] سا اپنے والدین پر بوجھ اور [illegible] ہے کہ وہ ان کے جیتے جی بھی یتیم رہے کہ ان کو والدین کی شفقت و محبت نہ ملی [illegible] والدین کے ہوتے ہوئے اپنی یتیمی کا احساس ہو تو وہ ان کی محبت سے کس قدر محروم ہوگا۔

۱

وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمیٰ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی چھپا چھپ سروئی کریپ کے دوپٹے پر لچکا ٹانک رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی سی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھانوے سے ایڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کر اتار رہی تھیں کہ ایکا ایکی گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا سارا ارمان دل کا دل ہی میں رہا اور وہ آن دھمکی۔ دنیا میں آتے ہی بغیر گلے میں گھاٹی کیے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی۔

شمن کی پیدائش

نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ، جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے۔ کیسی شادی اور کس کا بیاہ، حکم ملا ننھی سی بہن کو نہلانے کے لیے گرم پانی تیار کرو، پانی سے زیادہ کھولتے آنسو بہاتی آپا نے کوستے ہوئے چولھے پر پتیلی چڑھا دی۔ پانی بھی مذاق میں ذرا سا چھلک گیا اور سارا ہاتھ ابل کر رہ گیا۔

"خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو، اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہو جاتی۔"

حد ہو گئی تھی! بہن بھائی اور پھر بہن بھائی بس معلوم ہوتا تھا کہ منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے، امڈے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے، کتے بلیوں کی طرح، انل کے مرکھکے، اناج کے گھن ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دو بھینسوں کا دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی ان کے تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے۔

واہ! کثرت اولاد کا...

اور یہ سب ابا کا قصور تھا۔ کیا مجال جو اماں دودھ پلا جائیں۔ ادھر بچہ پیدا ہوا ادھر آگرے سے گوالن بلوائی وہ دودھ پلائے اور بیگم کی پٹی سے پٹی جڑی رہے پھر بھلا بچے کیوں سانس لیتے۔ گھر کیا تھا جیسے گائے بیلوں کا باڑہ۔ کھانا ہے تو پتیلیوں، پینا ہے تو گھڑوں، سونا ہے تو گھر کا کونا کونا زندگی سے لبریز چھلکنے کو تیار

اور یہ پیٹ کی کھرچن کالی پیلی دھنیا سی ناک، چیاں سی آنکھیں، پر چیل سے زیادہ تیز۔ بڑی آپا اور منجھو۔۔ دونوں نے کئی دفعہ اس کے پوپلے کے بچے جیسے منہ کو مسکراتے ہوئے دیکھا گویا وہ انھیں چھیڑنے کو مسکرا رہی ہے۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ اس کی زر خرید لونڈیوں کی طرح خدمت کریں گی۔ اماں کو کیا کم فکر ہو رہی ہوگی۔ آخر اتنی ڈھیر سی لڑکیوں کا نصیبہ کہاں کھلے گا۔ مانا کہ روپیہ بھی ہے اور لڑکی کو دکھانے کا فیشن نہیں پھر بھی کہاں تک تلے ڈالے جائیں گے۔ کیا ہوگا؟۔

نہ اس کا پیٹ پھولا نہ بیمار ہوئی اور روز بروز پھول کر کُپّا ہوتی گئی۔ دو ایک بھائی بہنوں تک تو ذرا چاؤ چونچلے کیے پر اب بڑی آپا کا بھی جی بھر چکا تھا اور وہ بیزار تھی۔ خیر اَنّا موجود تھی اور وہ پل رہی تھی۔

اَنّا بالکل جوان تھی، سولہ سترہ برس کی تبھی تو راتوں کو وہ گھنٹوں غلاظت میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی آنکھ بھی نہ کھلتی۔ انّا کو جگانا گو آسان کام نہ تھا مگر دودھ خوب ہوتا تھا۔ دوسرے انّا کا عاشق جب اسے کندھے پر بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑتا تو وہ سب دکھ درد بھول کر کلکاریاں مارنے لگتی۔ وہ تینوں گھر والوں کی آنکھ بچا کر بنیوں کے بھوسے والی کوٹھری میں دبک رہتے۔ انّا بھوسے پر لوٹیں لگاتی اور اس کا عاشق اس کے پیچھے پیچھے لڑھکتا۔ تب وہ بھی تالیاں بجا بجا کر گھٹنیوں دوڑتی مگر جب وہ انّا سے لڑنا شروع کرتا تو وہ منہ بسور کر اپنا نچلا ہونٹ آگے پھسلا دیتی اسے لڑائی سے سخت پریشانی ہوتی تھی۔ جب وہ کتے آپس میں بھاؤں بھاؤں کرکے لپٹ جاتے تو اس کا سارا جسم خوف سے لرزنے لگتا اور وہ بے طرح بلبلانے لگتی یہاں تک کہ کتے بھی پریشان ہو کر علٰحدہ ہو جاتے۔ جب تک وہ جاگتی رہتی انّا کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ یونہی اگر اسے چھیڑنے کو انّا کا عاشق اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا "انّا ہماری ہے" تو وہ فوراً صدائے احتجاج بلند کرتی اور اسے چھوڑنا پڑتا۔

مگر اسے اپنی اس سینہ زوری کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایک دن جب وہ تینوں حسب معمول خشک پیال پر لوٹیں لگا رہے تھے تو نہ جانے کب اس کی

آنکھ لگ گئی۔ اور وہ اپنی ننھی سی دنیا کے معصوم خوابوں میں کھو گئی ۔۔۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، انائیں ہی انائیں بکھری ہوئی تھیں۔ خوشی سے دیوانی ہو کر ایک گود سے دوسری گود میں ٹھمک ٹھمک کر لپکنے لگی۔ مگر پھر اس نے دیکھا، یکایک ساری انائیں کہیں غائب ہو گئیں۔ اس کا جی کھسلا گیا۔ ندیدی کتیا کی طرح سونگھ سونگھ کر وہ ڈھونڈ لگی ۔۔۔ اس نے پا لیا۔ پیال کے ایک کونے میں اس کی نرم گرم انا پکے آم کی طرح گول مٹول سی ہو رہی تھی۔ کوں کوں کر کے وہ اس میں گھسنے لگی اس کے ہونٹ ہلنے لگے اور حلق کی رگیں پھڑک اٹھیں، گویا دودھ کے گھونٹ حلق میں ہوتے ہوئے پیٹ میں جا رہے ہوں اسے اچھو سا لگ گیا۔ کچھ پکڑنے کے لیے اس نے اپنے موٹے موٹے ہاتھ بڑھائے مگر ایک بھیانک بلا نے اسے دور جھٹک کر انا کو دبوچ لیا اور بھنبھوڑنا شروع کیا۔ حلق پھاڑ کر وہ دہاڑی جیسے اسے سانپوں نے ڈس لیا ہو۔ اس کی معصوم آنکھیں اس کریہہ منظر کو دیکھ کر پتھرا گئیں۔ اس کی گھگی بندھ گئی چیخیں سن کر باہر سے بہشتی، بھنگی اور باورچی دوڑ پڑے۔ اور ملزم گرفتار ہو گئے

بسور بسور کر وہ انا کے پیارے مکھڑے کو تکتی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہی ہو "چوٹ تو نہیں لگی؟ ۔۔۔ میں نے تمھیں بچا لیا نا؟" مگر انا کچھ بے مزہ سی تھی اور اس کی شرارتوں پر بجائے پیار کے ہنسنے کے رکھائی سے جھٹک رہی تھی۔ اپنے تمام معصوم اور کمزور حربے اس نے انا کو منانے کے لیے کر ڈالے مگر وہ ہنسا نہ سکی۔ کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیوں روٹھی ہوئی تھی۔ مگر آج تو انا نے اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسی دن شام کی گاڑی سے اس کی انا کو آگرے واپس بھیج دیا گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یتیم ہو گئی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ کئی دن اور کئی رات روتی رہی۔ سارا گھر اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا مگر اسے چین نہ پڑا وہ گرم گرم انا جس کے سینے سے چمٹ کر بالکل ماں کے پیٹ میں سونے کا مزہ آتا تھا بھلا اب وہ کہاں مل سکتی تھی۔ اسے وہ بوتل دیکھ کر ہی صدمے کا دورہ پڑ جاتا تھا جس سے اسے دودھ پلانے کی کوشش کی گئی

بھلا کہاں وہ سانولی سلونی گدگدی انّا اور کہاں شیشے کی ذلیل بوتل مگر پیٹ کی آگ نے اسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔ منجھو بی نے جب اُسے گود میں لے کر بوتل پلائی اور چند قطرے بھوے سے اس کے حلق میں چلے گئے تو وہ خاموش ہو گئی۔ پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے منجھو سے چمٹ جاتی اور پلّے کی طرح اس کے کپڑوں میں اپنی انّا کو ڈھونڈھنے لگتی۔ منجھو گھبرا کر اسے دور لٹا دیتی اور بڑی آپا سے شکایت کرتی کہ وہ اس کے بے طرح گدگدیاں کرتی ہے۔

تجربے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا اور بالکل جیسے گائے بیل چارہ کھاتے ہیں دودھ زہر مار کر لیتی۔ مگر اس کے ہاتھ بھٹکتے ہی رہتے۔ بوتل کی چکنی چکنی سطح پر وہ پیارے اپنی ہتھیلیاں چپکا کر اسے کلیجے سے بھینچ لیتی۔ شروع شروع میں تو دودھ پیتے پیتے ایک دم اسے انّا کی آنکھیں اس کی ناک کی ننھی سی بالی اور کان کی لونگیں یاد آجاتیں اس کا دل بھر آتا اور وہ تھوڑی دیر کو چُسنی چھوڑ کر دردناک آوازیں دینے لگتی مگر پیٹ کی پکار اسے چوکنّا کرتی اور وہ خاموش ہو جاتی۔

جب سے انّا چھن گئی تھی منجھو نے اسے لے لیا تھا پتہ نہیں منجھو کو اس پر کیوں پیار آ گیا۔ شاید جس دن اس نے اس کے کپڑوں میں انّا کو ڈھونڈھنے کی کوشش کی تھی اسی دن سے منجھو کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔ بوتل سے دودھ پلا کر منجھو بی اسے سینے سے چپکا لیتی اور پلنگڑی پر لیٹ جاتی ورنہ اسے نیند ہی نہ آتی۔ منجھو کے پہلو میں اُسے کچھ کچھ انّا کی گرمی مل جاتی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منجھو کی گردن اور گال سہلایا کرتی جس کا منجھو بالکل برا نہ مانتی۔

پھر ایک دن جب منجھو نہا رہی تھی تو وہ اندر گھسی چلی گئی۔ "ارے آپا اسے پکڑو" منجھو لرز کر چلائی۔

"اوئی وہ کیا سمجھے اتنی ذرا سی تو ہے۔" مگر اس نے منجھو کو ایسی بری طرح سے گھورا کہ وہ شرما گئی وہ سکتے کے عالم میں اسے گھورتی رہی۔ "چل یاں سے" منجھو نے لوٹے کی آڑ لے کر اُسے ڈانٹا۔ مگر وہ تو جیسے مقناطیسی طاقت سے اس کی طرف

گھسنے لگی۔ منجھو نے خوف زدہ ہو کر اسے پھر دھتکارا اور جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا مسکرا کر اسے معنی خیز نظروں سے تاکتی بڑھتے ہی چلی گئی تو اس نے چلّو بھر پانی لیکر اس کے مُنہ پر چھینٹا مارا۔

پانی کی مار سے ٹھٹھک کر زور سے رو پڑی اور سسکیاں بھرتی ہوئی باہر رینگ آئی اس دن اس نے نہ ہی جی بھر کے دودھ پیا اور نہ ہی ہنسی بولی، وہ منجھو کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتی گویا اس نے اس کے ساتھ کوئی زبردست بے ایمانی کی ہے۔ اور پھوٹ کر رو پڑتی۔

جب منجھو نے اسے پہلو میں لٹا کر رضائی اوڑھ لی تو وہ خلاف معمول خاموش اُسے گھورنے لگی۔

"کیا ہے؟" منجھو نے پیار سے پوچھا اور وہ حیرت سے مسکرا پڑی آہستہ سے اس نے اس کی گردن پر اپنی انگلیوں سے کھجانا شروع کیا اور آنکھیں گاڑے اس کے تل کو دیکھتی رہی جو بائیں گال پر چمک رہا تھا۔

"نہیں بری بات" منجھو نے اس کا بھٹکتا ہوا ہاتھ اٹھا کر پہلو میں رکھ دیا وہ بسورنے لگی۔ اور ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ منجھو پسیج گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر گردن میں ڈال لیا اور کلیجے سے لگا کر سو گئی۔

منجھو نے اس کے لیے پھول جیسی فراکیں اور ٹوپیاں سلیں۔ گھڑی گھڑی نہلایا جا رہا ہے سرمے کاجل اور مسّی سے نیس، وہ اپنی ساری گتیں خاموش بیٹھی بنوایا کرتی مگر کیا مجال جو کوئی اُسے ہاتھ بھی لگا جائے۔ منجھو سے تو آنکھوں میں صابون لگ جاتا تب بھی وہ کچھ یونہی سا بسور کر چپ ہو جاتی۔ منجھو آخر کو منجھو ہی تھی۔

مگر جوں جوں بڑھتی گئی وہ منجھو کی صفائی سے عاجز آ گئی وہ اُسے سجا بنا کر نادر شاہی حکم صادر کر دیتی کہ ایک بال بھی اِدھر سے اُدھر ہوا اور نہ موت آئی۔ پر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ چلتی ہوئی ٹانگوں اور ہاتھوں کو روکنا اس کے قابو میں نہ تھا تھوڑی دیر تو وہ کلیجے پر صبر کی سِل رکھے بیٹھی رہتی۔ مگر جوں ہی منجھو کی آنکھ بچی وہ باہر

کھسک جاتی اور پھر شام کو جو وہ قدم رکھتی تو یہ معلوم ہوتا کوئی دیوانی کتیا کیچڑ کی کونڈی میں لوٹ کر آئی ہے۔ غبارہ جیسی فراک، جا نُچے ہوئے چوہے کی کھال اور اس پر باریک باریک دھول کی افشاں چھڑکی ہوئی۔ سر، بال اور آنکھیں دھول میں اَٹی ہوئی۔ دونوں نتھنے غلاظت سے ایسے ٹھسا ٹھس جیسے سیمنٹ سے دروازے چُنے ہوئے ہوں۔ جامنوں، امرودوں، بیروں اور آموں کا یا حسبِ موسم جو پھل موجود ہوتے ان کا پلستر کیا ہوا اور اوپر سے طاعونی چوہے جیسی بو!

سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں سے جتنی دھول جھڑ سکتی جھاڑ دیتیں۔ وہ زور سے بھینس کے پڈے کی طرح ڈکراتی...... پلکوں کی ریت آنسوؤں سے دھل جاتی اور کھار کی وجہ سے دونوں نتھنے سنٹ سے کھل جاتے جیسے اَٹی ہوئی نالی میں تیزاب ڈال دیا۔ پھر گھونسوں اور گرجدار دھموکوں کے شادیانوں کے ساتھ غسلِ میت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا فراک پہن کر وہ اپنی غلطی کو تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی۔ وہ پختہ فیصلہ کر لیتی کہ اب کیچڑ اور مٹی سے تو کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ دھول میں لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اس کے چہرے پر تارک الدنیا سادھو کا سا استقلال چھا جاتا جو اپنے جسم کے کسی عضو کو معطل کر لینے کا قصد کر چکا ہو۔ بیل جیسی چوکنا آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر اونگھنے لگتیں۔

مگر زمانہ سازگار نہ تھا دوسرے دن جب عین اسی وقت اسی عبرت ناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح جھومتی دھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کو سخت عبرت ہوتی اور جب دھول جھڑتی تو زمین و آسمان کانپ اٹھتے

وہ پھر توبہ کرتی، حلف اٹھاتی .... مگر سب بھول جانے کے لیے شیطان اسے پھر ورغلاتا۔ جونہی وہ سج دھج کر باہر نکلتی جملہ عناصر کو اس کے صاف کپڑوں سے بیر ہو جاتا۔ کھیتوں کی سانولی سانولی کیچڑ تال کے کنارے کی سرگوشیاں

کرتی ہوئی ریت اسے پھسلاتیں اصطبل کی بھیگی بھیگی مہکتی ہوئی گھاس آغوش پھیلا کر اس کے پیچھے دوڑتی۔ مرغیوں کا متعفن اور غلیظ ڈربا اسے پھولوں سے لدی سیج کی طرح اپنی طرف کھینچتا ...... وہ سب کچھ بھول جاتی اپنے ضمیر سے وہ قسم جو بارہا کھائی تھی ننھو سے وعدہ اور خود اس کی اپنی خودداری جیسے روز روز کی دھول جھڑائی چکنا چور کیے دیتی تھی .... وہ ان بے پناہ شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لیے بہت مضمحل ہو جاتی مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اس ابدی گناہ کے غار میں جا گرتی جس کی پاداش میں وہ روز دکھ جھیلا کرتی تھی۔

تھوڑی سی دیر میں وہ لہو و لعب میں غرق نظر آتی۔ کیچڑ کے ریشمی لڈو، بھوری بھوری بھنی ہوئی سوجی جیسی ریت کی ننھی ننھی ڈھیریاں ...... گھوڑے کی گھاس سے بنائی ہوئی چھوٹی سی جھاڑو، مرغی کے دم کے جھڑے ہوئے پر اور پنیا اس کی عزیز ترین سہیلی بھنگن کی لڑکی، ننھو کے بعد دنیا میں یہی پنیا تھی۔ وہ دونوں بھینسوں کے تھان کے پیچھے جا کر ایک دوسرے کے گلوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتیں، پھر ریت میں بلیوں کی طرح گول گول لوٹیں لگاتیں۔ مٹھیاں بھر بھر کے ریت پانی کے چلوؤں کی طرح اچھالتیں یہاں تک کہ وہ بالکل مٹی کی بدہیئت مورتیاں معلوم ہونے لگتیں۔ ان کی رگ رگ میں ریت رینگنے لگتی۔ پھر بھی ان کے جی مٹی سے نہ بھرتے اور وہ سوکھے ہوئے پتوں کے چمچے بنا کر ریت پھانکنا شروع کر دیتیں۔ خستہ بھربھری ریت وہ مزیدار پنجیری کی طرح کھا جاتیں، پیٹ والیوں کی طرح انھیں سوندھی سوندھی مٹی بہت ہی بھاتی تھی نہ جانے ان کے پھولے ہوئے کچریوں جیسے پیٹوں میں کون سے سپوت پروان چڑھ رہے تھے۔

ان کی حالت بھی کچھ حاملہ عورتوں جیسی، چکنی سرمئی رنگتیں پیلی پڑ گئی تھیں اور زبانوں پر سفید پھپھوندی لگ گئی تھی آنکھوں میں بھورے بھورے ڈورے پڑ گئے تھے پنیا کا ازار بند اتنا چھوٹا پڑ گیا تھا کہ اس کی گھگھریا میں آگے طاقچہ کھلا رہتا تھا۔ روز بروز سستی بڑھتی جا رہی تھی۔ منہ کا مزہ خراب رہتا تھا۔ لڑائی میں انھوں نے

دانتوں اور ناخنوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ کر دیا تھا جنھیں منّن ہر وقت وہ منمناتی ہی رہتیں۔ جیسے کسی نے بھتنی کو ڈبے میں قید کر دیا ہو۔ اس لیے سب نے اس کا نام بھتنی رکھ دیا۔

جب سب اسے چھیڑنے کے لیے "بھتنی بھتنی" کہتے تو وہ واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غرّاتی۔ بلّی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی اور جہاں جہاں اس کا ناخون لگتا کھال ہی اتری چلی آتی۔ جب وہ دانتوں سے کسی کی بوٹی چباتی تو اوپر نیچے کے دانت گوشت میں آر پار ہو کر آپس میں بج اٹھتے۔

وہ سپوت جو اس کے پیٹ میں پل رہا تھا اس کی سوندھی مٹّی کے شوق کو بڑھاتا ہی گیا اس کی زبان پر نمک چھڑکا گیا پھر کونین لگائی گئی مگر کسی سزا سے مٹّی کی چاٹ نہ گئی۔ کسی نے رائے دی "چڑیل کی زبان جلا دو" کسی نے ترکیب بتائی "سوئیاں چبھو دو کمبخت کے" مگر کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ جب وہ مٹّی کھاتی پکڑی جاتی تو منجھو اس کے منہ ہی منہ پر طمانچے مارتی کہ ہونٹ کٹ کر خون نکل آتا مگر وہ کچھ نہیں تو ڈلے ہی چبا جاتی۔ دیوار سے چونا ہی ناخنوں سے کھرچ کر کھا لیتی۔

ایک دن جب وہ اور پنیا رفع حاجت کی غرض سے پاس پاس بیٹھیں گپیں ہانک رہی تھیں کہ وہ سپوت وارد ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ وہ منجھو کے پاس رینگی۔

"سانپ" اس نے منجھو کی ٹانگوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ منجھو نے اسے پرے ڈھکیل دیا۔ تحقیقات کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کے پیٹ میں کیچوے پڑ گئے ہیں۔ لیکن اسے یقین نہ آیا اور رات بھر وہ "سانپ۔ سانپ" چلّاتی رہی۔ پورے وقت اسے پیٹ میں سانپ لہراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سانپوں کے گچھے کے گچھے جیسے سپیرے کی ٹوکری میں کلبلاتے ہیں، اس کے پیٹ میں اودھم مچا رہے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا اور دوسرے کے پیچھے تیسرا ہزاروں سانپ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

اس دن سے اس نے پنیا کے ساتھ سوکھے ہوئے پتّوں کے جھنڈوں میں بھر بھر کر مٹّی

کھانی چھوڑ دی للچائی ہوئی نظروں سے وہ ریت کے ذروں کو گھورتی اور ایک دم وہ بڑھ بڑھ کر سانپوں کے پھن بن جاتے جو لپ لپ اپنی زبانیں نکال کر آنکھیں مٹکانے لگتے مٹھی میں لے کر وہ ریت کو پیار سے سہلاتی جی چاہتا بھر بھر مٹھیاں کھانا شروع کر دے اور ساری دنیا کی مٹی کو اپنی زبان کے نیچے تھوک میں رول ڈالے اور پھر یہ لیس دار کھویا سا اس کے حلق کے نیچے پھسلتا چلا جائے۔ مگر فوراً ہی اس کے پیٹ میں سانپ انگڑائیاں لینے لگتے۔ ایک دم دیوانوں کی طرح وہ ریت اچھالنا شروع کر دیتی۔ زمین پر لوٹ جاتی اور ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی آپنے گال رگڑتی۔ اس کے جسم کی رگیں ایک ہنسیے کی طرح تن جاتیں اور وہ چاہتی کہ زمین کے کلیجے میں گھس جائے۔ جب ذرا جوش ٹھنڈا ہو جاتا تو آہستہ آہستہ وہ اپنا ماتھا زمین سے کھٹ کھٹ ٹکراتی۔

”دروازہ کھولو!“ اس کا ماتھا التجا کرتا مگر زمین اسی طرح ڈھیٹ بنی پڑی رہتی اسے زمین سے کیوں اتنا پیار تھا وہ اسی میں سما جانا چاہتی۔ پھر اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ ساری ریت جھاڑ دیتی۔ مگر جہاں موقع ملتا وہ مٹی میں جذب ہونے کی کوشش کرتی

”خاک میں ملے کمبخت، جتنی دفعہ نہلاؤ اتنی دفعہ گندی۔“ منجھو کہتی اور وہ سوچتی کاش کوئی جانتا کہ خاک میں ملنا اس کے لیے کوسنا نہیں بلکہ دعا تھی یہی تو اس کی آرزو تھی۔

۲

لوگوں کو شادی بیاہ کا ارمان ہوتا ہے مگر شمن کو کچھ دن سے کسی کو مارنے کا ارمان ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس کا جی پھڑپھڑانے لگتا کہ وہ کسی کو مارے۔ اپنے موٹے سے گھونسے سے کسی کو کچل کر رکھ دے۔ بار ہا ایسا ہوا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے ویسے اس کی آنکھیں

دانہ کھاتی ہوئی مرغی کی دم پر جمی ہوئی ہیں۔ جہاں سوکھی ہوئی بیٹ کا ننھا سا قطرہ اس کی ہر جنبش پر لرزنے لگتا ہے، یا اس ننھی سی چوہیا کی طرف جو صبح سے تین بار سہمی ہوئی نظروں سے صندوق کے پیچھے سے جھانک چکی ہے یا وہ کسی اور چیز کو گھور رہی ہے کہ ایک دم سے اسے مارنے کا شوق چرّاتا۔ گھر میں ایسا دبّالو کون تھا جو اس سے پٹ لیتا منجھو کیا مزے سے جب چاہتی دھم سے اس کی کمر پر گھونسا جما دیتی۔ اس کا بھی دل چاہتا کہ ایک دن وہ بھی منجھو بی کی ٹھونس کمر پر ایک تگڑا سا گھونسا جمائے ......

پھر تخیل ہی میں وہ منجھو بی کو پیٹنے لگتی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے کپڑے اتار ڈالتی اور نہلانے لگتی۔ اس وقت اسے کہیں سے اپنی کھوئی بسری انّا کا دھندلا سا خاکہ یاد آجاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصہ چڑھنے لگتا اور وہ منجھو کے سر پہ بیسن ڈال کر خوب گھسّے لگاتی زور زور سے جھانوے سے اس کی کہنیاں اور گٹّے چھیلنے لگتی پھر کھردرا سا تولیہ لے کر اتنا رگڑتی کہ منجھو کی کھال اتر جاتی اور ناک لال چقندر ہو جاتی ایک کان کی لَو ٹوٹ کر تولیہ ہی میں الجھ آتی۔ پھر وہ اسے ایک عمدہ سی فراک پہنا کر کہتی۔

"خبردار جو ہلی، ٹانگیں توڑ ڈالوں گی۔"

مگر جب وہ تخیل کی دنیا سے جاگ کر واپس آتی تو دیکھتی کہ کچھ بھی نہیں اس کے دونوں ہاتھ پتھر کی مورتی کی طرح گود میں اکڑے ہوئے ہیں، گردن کی رگیں تنے تنے دکھ گئی ہیں ...... وہ ایک انتقام بھرا لمبا سانس کھینچ کر جسم کو اعدتان لیتی اور ایک دم پاگلوں کی طرح زور زور سے بستر پر گھونسوں کی بارش کر دیتی۔ جب وہ جی بھر کر کوٹ چکتی تو تھک جاتی، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی اور بڑا ہی سکون ملتا۔

ایک دن اسے بیٹھے بیٹھے اپنی گڑیا کو مارنے کا دورہ پڑا پہلے تو اس نے اس کو ہولے ہولے دو ننھے ننھے طمانچے مارے پھر ایک دم اس پر بھوت سوار ہو گیا۔ دھڑا دھڑ اس نے گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دانتوں اور ناخونوں سے اس کے پرزے کر دیے گویا وہ اپنے کسی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔

گڑیا کا چورا چورا ہو گیا۔ اس کے جسم میں بھرا ہوا برادہ بکھر گیا۔ اور کچھ دشمن کی

زبان پر چپک گیا۔ اس کے بعد اس کا پیٹ بھر گیا اور وہ اطمینان کا سانس لے کر ہانپتی ہوئی چیت پڑ گئی۔ برادے کا مزہ بڑی دیر تک اس کی زبان پر باسی خون کی طرح جما رہا۔

پھر ایک دم اس پر خوف طاری ہو گیا۔ جیسے اس نے سچ مچ کسی کو قتل کر ڈالا ہو۔ ڈر کر وہ گھگیانے لگی اور جلدی جلدی گڑیا کے پرزے صندوق کے نیچے چھپا دیے۔ وہ منجھو بی کی طرف پناہ لینے کے لیے بھاگی۔ منجھو بے خبر بیٹھی اپنا کرتا سی رہی تھی۔ اس کی ران سے لگ کر لیٹ گئی اور اس کی گردن پر اپنی سہمی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگی۔

منجھو بی ذرا کپڑے سینا ہی نہیں جانتی تھی۔ بلکہ ایک دن اس نے ایک الف ب کا قاعدہ منگا کر مشین سے سی ڈالا۔ شمن پاس بیٹھی مشین کے دانتوں کو کٹ کٹ کاغذ چباتے دیکھتی رہی۔ دانتوں میں ہلکی سی لطیف کھجلی ہونے لگی۔ ان دانتوں پر انگلی پھیر کر عجیب سی لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ قاعدہ سی کر منجھو نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"آج سے تم پڑھنا شروع گی، اچھا!"

"اچھا!" شمن نے مان لیا اور قاعدہ دیکھنے کے لیے اُچکنے لگی۔ یہ پہلی یا دوسری کتاب اس کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ جسے پڑھنے میں پریشان کرنے پر منجھو بی اسے مار دیا کرتی تھی۔ ویسے گھر میں پڑھنے لکھنے کا سارا دلچسپ سامان اس کی پہنچ سے دور رکھا جاتا تھا۔ مارنے کے کام کا تو تھا نہیں یہ قاعدہ۔ اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابا لفافہ سا بنا کر پیار میں اس کے سر پر مارا کرتے تھے۔

"دیکھیں۔ دیکھیں منجھو بی۔" اس نے کتاب لے کر دیکھنا شروع کی۔ پھر ذرا ک میں اس کی پھکنی سی بنا کر منجھو کے سینے پر ماری

"اے گدھی، تمام موڑ کر رکھ دی!" منجھو نے اس سے قاعدہ لے لیا۔

"دیکھو یہ الف ہے۔ الف!"

"کاں؟" اُسے بالکل یقین نہ آیا۔

"یہ .... یہ الف سے انار"

"ایں ہاں، الف سے انار کاں ہوتا ہے۔ انار تو آتش بازی میں چھوٹتا ہے فر فر، ہیں نا؟"

"ہٹ، یہ دیکھ، یہ الف ہے۔ الف سے انار.... کہو الف سے انار"

"کہو الف"

"یوں کہو...... الف"

"نہیں ہم نہیں کہتے، پہلے یہ تو بتاؤ یہ کیا ہے؟ ...... یہ یہ"

"یہ جیم ہے"

"اور یہ؟"

"یہ ص ض"

"اونہوں۔ ص ض نہیں ہیں یہ تو چائے دانیاں ہیں"

"چل پگلی، یہ دیکھو الف سے انار۔ کہو"

"کہو" وہ بے وقوفوں کی طرح منجھو کا منہ تکنے لگی۔

"ارے میں کہتی ہوں الف کہو" صبر کا پیمانہ چھلکا۔

"الف کہو"

"اونھ چڑیل" منجھو نے دھکا دے کر اسے اپنی گود سے انڈیل دیا اور اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ شمن نے قاعدہ اٹھا لیا۔ بالکل سوّر کمبخت، سوّر تھا قاعدہ کالی کالی ٹیڑھی تصویریں۔ سوائے لوٹے کی شکل کے "ص ض" کے اسے کچھ نہ بھایا اور جیم کو تو وہ دیکھ کر ہی جل گئی۔ کس قدر اترائی ہوئی مہترانی کی شکل کی تھی!۔ توبہ!....... الف سے انار!....... منھ بھلا کیسے؟ یہ مٹکے کی شکل کا انار نہ لال لال چنگاریاں نہ کچھ...... بالکل ردّی۔ خیر الف تو وہ پڑھ لے گی مگر "جیم" تو وہ مر جائے جب بھی نہیں پڑھے گی۔ بہت ہو گا منجھو گھونسے

مارے گی مگر ہرج ہی کیا ہے مارنے دو۔ اپنا کیا جاتا ہے۔ گھم سے جیسے محرّم میں ڈھول بجا اس پر۔ پھر کسی کو محرّم کے ڈھول کی طرح پیٹ ڈالنے کا جنون سوار ہوا۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔ اس نے دھیان بٹانے کے لیے قاعدہ اٹھا لیا۔ کٹ کٹ مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے اپنے مسوڑھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ یوں ہی جو سرے پر لٹکتا ہوا ڈورا پکڑ کر کھینچا تو کچّے زخم کی طرح ٹانکے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مزہ آیا جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں سے اتر رہی ہو۔ قاعدے کے ورق بکھر گئے۔

ارے! منجھو شرطیہ برا مانے گی اور کیا عجب جو مار بھی بیٹھے اس نے جلدی سے قاعدے کے ورق سمیٹ کر مشین کے دانتوں کے نیچے رکھ دیے اور ہینڈل گھمانی رہی کٹ کٹ، کٹ کٹ، وہ اِدھر سے اُدھر بڑی مشّاقی سے چلایا کی، یہاں تک کہ قاعدہ سوزنی کی طرح ٹانکوں سے بھر گیا۔ خیر اچھا ہوا۔ "ص ض" کمبخت جائے دانی کی شکل کے غارت ہو گئے اور جیم بھی مٹ گیا۔

مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونسوں سے زیادہ وزنی گھونسا جمایا۔ اس کے بعد تھپڑ اور چانٹے۔ وہ دیر تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔ اگر ہر بار مار پڑنے پر آنسو گرانا لازمی ہوتا تو یقیناً مصیبت ہو جاتی اور اس کی آنکھوں کی ڈھیلے کبھی کے بہہ گئے ہوتے، ادھر منجھو کے تھپڑوں کا خزانہ کم ہوتا نہ نظر آتا اور جو وہ ہر تھپڑ پر ایک آنسو بھی بہاتی تو سات سمندر کا پانی ہوتا سو بھی خشک ہو جاتا۔ اس لیے وہ اب بس گلے سے رُویا کرتی تھی۔ دماغ بالکل پُرسکون اور غیر متاثر رہتا۔

یہ دوسری کتاب تھی جس سے اُسے للّہی بغض ہو گیا۔ ایک تو وہ ناول ہی کیا کم تھی جسے پڑھتے وقت منجھو بی اس کی کسی آہ و زاری پر کان نہیں دھرتی تھی اب دوسری یہ جس کی آمد ہی منحوس ثابت ہوئی۔

مگر یہ کتاب تو اس کی جان کو چمٹ گئی ایسی کہ چھٹنا دشوار ہو گیا۔ الف تو خیر دل پر پتھر رکھ کر پڑھ لیا گیا۔ مگر جیم، حتیٰ کہ ص ض، کمبخت بھی پڑھنا پڑے۔ حیرت تو اسے جب

ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ......

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

بات یوں ہوئی اس نے ایک دن منجھو سے پوچھا۔

"منجھو جب قاعدہ ختم ہو جائے گا تو مٹھائی بٹے گی نا؟"

"ہاں! اور پھر دوسری کتاب شروع ہو گی۔"

"دوسری!...... پھر؟"

"پھر بڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا......" منجھو نے نہایت معصومیت سے بتایا کس سادگی سے وہ اُسے آنے والی بلاؤں سے دوچار کر رہی تھی۔

خاموش اپنی گود میں ہاتھ سمیٹے وہ بیٹھی رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک موٹی سی بھیانک کتاب اس کے سر پہ پتھر کی سل کی طرح گر رہی ہے جس میں "ص ض" اور "جیم" سے بھی زیادہ کمینے اور غیر دلچسپ الفاظ موجود ہیں۔

بہت سے بہن بھائیوں اور بھرے پُرے خاندان میں زندگی کے دن ماضی کی تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے۔ جیسے کوئی بہت سے کنکروں کو سوپ میں ڈال کر پھٹک رہا ہے اور ہر کنکر سوپ کے دندانوں میں پنجے گاڑے جا ہولے ہے۔ سائیں۔ سائیں۔ لمبے لمبے پینگوں کی طرح زندگی گزرنے لگی۔

۳

منجھو بی مارتی تھی تو کیا تھا؟ دلار بھی تو کرتی تھی۔ پیٹ کوٹ کر جب اُسے خوب رُلا چکتی تو سینے کی گرمی سے اس کے سارے زخم سینک دیتی پر اب اس کی زبان

چل نکلی تھی۔ جب منجھو مارتی تو وہ اسے کوسنے دینے لگتی جو اس نے نوکرانیوں سے سیکھ لیے تھے۔

"مر جائے، اللہ کرے منجھو بی مر جائے" اماں اپنی لاڈلی کو کوستے دیکھ کر خوب بگڑتیں۔

"کھود کے گاڑ دوں گی جو میری بچی کو کوسا۔ کلموہی کہیں کی" وہ تو خود اماں کی بچی تھی نہیں، اس کی بدمعاش انّا کے جانے کے بعد سے منجھو ہی اس کی ماں تھی۔

"یوں کہو کہ اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے" اماں نے سکھایا اور اس نے یوں ہی کہنا شروع کیا۔

"اللہ میاں منجھو کا بیاہ ہو جائے، منجھو بی کا بیاہ ہو جائے" اس کوسنے کا کافی اثر ہوتا، پہلے تو منجھو بی بگڑتی زور زور سے دھمو کے مارتی مگر پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے اور وہ مسکرا مسکرا کر شرمانے لگتی۔

دعا نہ جانے کیسے برے وقت نکلی تھی کہ جھٹ قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑبڑ تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گھر اتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو گھیر گھار کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھائیاں اور زرق برق کپڑے چاروں طرف پھیل گئے۔ اچھا خاصا گھر ہاٹ بن گیا۔ دنیا بھر کی عورتیں لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ دھواں دھول باجے بجنے لگے جب عورتیں منجھو کا دولھا دیکھنے دوڑیں تو وہ بھی بلک گئی۔ کسی نے اسے گود میں لے کر دولھا دکھانا چاہا، مگر وہ نہ دیکھ سکی۔ "یہ تو آدمی ہے، دولھا" وہ چلائی اور مچل گئی، پھر کسی نے اسے دولھا دکھانا ضروری نہ سمجھا وہ بھی اکتا کر اپٹنے میں بسی ہوئی منجھو سے لپٹ کر سو گئی۔

رسموں کے وقت لوگوں نے چاہا وہ دولھا کے مہندی لگا دے مگر وہ اس پر بگڑ کھڑی ہوئی کہ اوّل تو وہ دولھا نہیں سیدھا سادھا آدمی ہے اور آدمی مہندی نہیں لگاتے اس پر اسے دیوانی کہہ کر دور دھکیل دیا گیا۔

منجھو تو دولہن بنی بیٹھی تھی۔ اس لیے وہ بے نتھے بیل کی طرح گھومتی رہی پہلے

تو اس نے برّی کی شکر لے جا کر خوب غسل خانے کے مٹکوں میں گھولی جس سے بیویاں استنجا کر کے بدحواس ہو گئیں۔ اس کے بعد باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئی اور وہاں خوب ہانڈیوں میں نمک کوئلہ اور راکھ جھونکی۔ باورچی کسی دوسری طرف لگے ہوئے تھے وہ کھیر کے پیالے گننے لگی۔ چاندی کے ورق اور پستوں کی ہوائیاں لگے ہوئے پیالے کامدار شطرنجی کی طرح بچھے ہوئے تھے بڑے ہی بھلے معلوم ہوئے۔ بے اختیار اس کا جی چاہا اُن کے بیچوں بیچ میں جو خالی جگہ ہے وہاں پیر رکھ رکھ کر چلے وہ تول تول کر قدم اٹھانے لگی ایک .... دو .... تین کسی نے دیکھ لیا اور وہ گڑبڑا کر جو بھاگی تو دھڑام سے کھیر کی کیچڑ میں سر سے پیر تک لت پت۔

نہ جانے کس نے اسے نہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو منجھو کے نہلانے کی عادی ہو چکی تھی۔ یوں رساں رساں نہلانے سے وہ چڑھ گئی اور خوب ضدیں کیں، پانی کے چھینٹے اڑائے، وہ عورت تو کمر بند کی لکڑی ڈھونڈھنے لگی، ادھر اس نے تولیہ باندھ کر ٹہلنا شروع کیا .... منجھو بی کے بھاری بھاری جہیز کے جوڑے دکھانے کے لیے ایک کمرے میں سجا دیے گئے تھے۔ اس نے ستارے نوچ نوچ کر تھوک سے ماتھے پر چپکائے۔ سلمے کے تار کھینچ کر ان کے چھلّے بنائے، دوپٹوں کی تہیں کھول کر خوب پھیلا دیے۔ اتنے میں اس کی نظر گوٹہ لگی ہوئی کچولیوں پر پڑی جھلمل کرتی زرکار ڈوریاں اسے انھیں پہننے کا کتنا ارمان تھا۔ مگر اسے تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتی تھیں اماں تو غسل خانے میں ایسے چھپ کر پہنتیں جیسے موٹی سی گالی ہو۔ اور میلے کپڑوں کے ڈبے میں اس کا ہاتھ بھی تو نہ جاتا تھا۔ جلدی جلدی اس نے چاروں طرف دیکھ کر الٹے سیدھے سوراخوں میں ہاتھ ڈال کر ڈوریاں انگلے میں کس لیں۔ پھر اس نے بھاری کریپ کا دوپٹہ نکال کر اوڑھا اور اطلس کا پاجامہ دیکھ کر تو اس کے دل میں ہوکیں سی اٹھنے لگیں، جانگیے پہنتے پہنتے اس کا جی متلا گیا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ پھولوں کا ڈھیر اس نے گھسیٹ کر ٹانگوں میں پھنسا لیا۔ پھر کریپ کے دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر وہ چاروں طرف فرضی مہمانوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگی۔

"جیتی رہو بیٹی، دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو"۔ اس نے انھیں کہتے سنا اور پھر ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکا کر گھر والیوں کی طرح ہو بیٹھی۔

"اری رسولن، او رسولن کہاں مر گئی نالزادی! جا علی بخش سے کہہ کر سودا نہیں لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں، مونگ کی دال اور...... اور بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں، ہاں شمن بی کے لیے، اور شکر کی گولیاں بھی"۔ وہ خیالی ماما کو ڈانٹنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اسے یاد آیا کہ ارے ننھا تو گھٹنے پر سو رہا ہے جاگ گیا۔ اس نے پھرتی سے گھٹنا ہلانا شروع کیا جیسے بچے کو ہلکورے دے رہی ہے۔

"نائیں میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا ...... بے بھوکا ہے دودھ پیے گا اوں اوں" ...... کرتا سر کا کر وہ نقل میں گھٹنے کو دبوچنے لگی ...... مگر فوراً ہی کسی آوارہ مچھر کے کاٹے ہوئے نشان نے اس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ بچہ وچہ بھول کر وہ ہونٹ لٹکا کر ودڑا دیکھنے لگی۔

"کاٹ کھایا مرے پیٹے نے!" وہ اپنے گھٹنے پر چپتیں لگانے لگی ...... اور پھر اسے کسی کو مارنے کا دورہ پڑ گیا۔ دھما دھم اس نے جہیز کی چیزوں کو دونوں ہاتھوں سے کوٹنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں کھیت کا کھلیان کر کے رکھ دیا۔ لوگ آ گئے اور اسے یونہی گھسیٹ کر باہر نکال دیا گیا۔ اتنی فرصت کسے تھی جو اس کا پاجامہ ڈھونڈھ کر پہناتا، لہٰذا شام تک وہ تولیہ لپیٹے اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔

مگر اسے ایک تجربہ ضرور ہوا کہ تولیہ پاجامے سے کہیں زیادہ آرام دہ اور مفید ہوتا ہے۔ ایک تو گھڑی گھڑی ڈھیلا کمر بند تنگ کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دوسرے اس عجیب و غریب ہیئت میں دیکھ کر بہت سے بچے تو آتشِ رشک سے بھنے جا رہے تھے دو چار اس تاک میں لگے تھے کہ تولیہ ہٹ جائے تو اسے ننگا دیکھ لیں۔ مگر وہ انھیں جوتیوں سے مار مار کر بھگا رہی تھی۔ اُسے اس کھیل میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

"ہم سو رہے ہیں، ہمیں جگانا مت!" وہ بن کر سو جاتی اور بد ذات بچے اس کا تولیہ چھیننے لگتے۔ پھر وہ جاگ جاتی اور خوب ناخنوں اور دانتوں سے ان کی تواضع کرتی۔

جدھر وہ نکل جاتی سب اسے ڈانٹتے، بہنیں چپتیں لگا کر دھتکار دیتیں۔ مگر کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ تالا کھول کر اس کا پجامہ نکالے۔ خدا خدا کر کے جب شام کو دولہا کے آنچل یا کسی دوسری ضروری رسم کا وقت آیا تو اس کی تلاش ہوئی اور وہ پچھلے دالان میں عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہوئی پکڑ کر ماری گئی۔

دولہا آیا، غل مچا، کسی نے اسے جوتا چھپانے کو دیا۔ بڑی دیر تک تو وہ اس جوتے سے کھیلتی رہی۔ پھر سو گئی۔ رات کو جب دولہا جانے لگا تو جوتے کی ڈھنڈیا پڑی۔ لوگوں نے اسے جگایا تو وہ بوکھلا کر ان سے لپٹ گئی۔ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ بے تحاشا چلائی

"دوتی .... ارے میری دوتی!"

کہتے ہیں دولہا نگوڑا ننگے پیر گیا صبح کو جوتا پینے کے پانی میں لاش کی طرح پھولا ہوا ملا۔ خوب سمدھنوں نے اس کا شربت پیا لاکھ لوگوں نے چاہا کہ وہ بتا دے کہ اس نے جوتا مٹکے میں کس غرض سے ڈالا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی "جوتا؟ .... مٹکا؟" وہ یہی پوچھتی رہی مگر پھولا ہوا جوتا دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی اور وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

۴

جب منجھو بیاہ کر جانے لگی تو دشمن ذرا بھی نہ روئی بلکہ چپکے سے پالکی میں

جا کر بیٹھ گئی۔ منجھو جانے سے پہلے اسے یاد کرتی رہی مگر وہ نہ ملی۔ جب دلہن اور اس کے ساتھ والیاں پالکی میں بیٹھیں تو ان میں سے سب سے موٹی عورت شمن کی گود میں چڑھ بیٹھی وہ زور سے چلائی مگر موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضبط کر گئی اور موٹی عورت کے کولھوں میں کچکچا کر دانت گاڑ دیے۔ ایک غدر مچ گیا، پالکی لوٹتے لوٹتے بچی مگر شمن پکڑی گئی۔ لوگوں نے اسے گھسیٹ کر اتار لیا۔ ہزار لاتیں چلائیں، کوسا، گالیاں بکیں مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

منجھو چلی گئی، گھر میں جیسے موت ہو گئی! سارا گھر سو گیا مگر شمن کے حصے کی نیند غائب تھی۔ کئی دفعہ وہ منجھو کو پکار پکار کر روئی۔ ہچکیاں لیتے لیتے حلق دکھ گیا آواز پڑ گئی مگر کون سنتا؟

"منجھو بی...... منجھو بی........ ہائے منجھو بی"۔ وہ رات بھر سسکیوں* سے پکارتی رہی۔ شادی کے تھکے ہارے مہمان اور میزبان دنیا سے بے خبر سو رہے تھے اور وہ اکیلی اِدھر سے اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔

منجھو کے جاتے ہی اس کی گت بن گئی۔ کئی دن تک تو کسی کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ بھی گھر میں ہے یا نہیں، نہلانے یا کنگھی کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ جب بہت ہی اس میں سے سڑاند پھوٹنے لگی تو سڑتی ہوئی نالی کی طرح لوگ اس سے دور دور رہنے لگے۔ میل اور کھجلی سے بے قرار ہو کر وہ راتوں کو چلاتی اور دن بھر کونوں کھدروں میں بھٹکتی پھرتی۔ تب اماں کو نہلانے کا خیال آیا۔

سر کے بال چپک کر جٹائیں بن گئے تھے۔ اور بدن پر میل کی پپڑیاں بندھ بندھ کر اکھڑ رہی تھیں۔ نائن کے بس کی کہاں تھی۔ جب اس نے نہلانا چاہا تو اسے مارنے لگی۔ بال نچے تو اسے پچھاڑ کر ننگی ہی بھاگی۔ دونوں میں بڑی دیر تک برآمدے میں ریس ہوتی رہی۔ شمن آگے آگے اور نائن پیچھے پیچھے۔ آخر کو موری کے پاس پھسل کر گر پڑی۔ نائن نے پکڑ دھکڑ کر نہلا تو دیا مگر کیسا یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ الجھے بال ویسے ہی میل اور چیکٹ کا جو نلبے رہے میل ذرا پانی ڈالنے سے پھول گیا۔ اور

میلے کپڑے کی رگڑ سے نمی دور ہو گئی۔ بلستر ویسا ہی جما رہا اور اس نے کپڑے پہن لیے
پھر تو یہ حال ہو گیا کہ جس دن وہ نہاتی اماں موٹی سی قمچی لے کر بیٹھ جاتیں اور
ریچ پیچ کی لاش نہلائی جاتی۔ کیونکہ ایسی وحشی مار کو وہ خاطر ہی میں کب لاتی تھی

دن بھر وہ منجھو کو بھولے رہتی مگر رات کو وہی منجھو بی کی رٹ لگاتی۔ تنگ
آ کر اماں نے بوڑھی ددا سے کہا "بوا! تم ہی سلا لو اللہ ماری کو" مگر شمن نے
سوتے ہاں انھیں اپنے پاس لیٹا دیکھ کر ان کے بال کھسوٹ ڈالے اور ڈھکیل دیا
اکیلی پڑی اپنی ہتھیلیوں کو چاٹا کی۔ جب سب سو جاتے، وہ جاگا کرتی، اس کے
ہاتھ منجھو کی گردن کی تلاش میں کھری پٹیوں پر رینگا کرتے۔ اس کا جی چاہتا بس
ایک دفعہ وہ نرم گرم گردن اس کی گرفت میں آ جائے۔ پھر تو وہ مر جائے گی پر نہیں
چھوڑے گی۔ پڑی پڑی وہ منجھو کے کمینے دولھا کو کوسا کرتی۔ جو اسے چیل کی طرح
جھپٹا مار کر چھین لے گیا۔ اور منجھو کے اس نابکار دولھا کو کوسنا کبھی شاید خدا نے
سن لیا اور ایک دن تار آیا اور گھر میں ماتم ہونے لگا۔

"تمھارے دولھا بھائی مر گئے، تم روتی نہیں" تحصیلدارنی کے
لڑکے نے اس سے کہا۔

"کون منجھو بی کا دولھا؟" وہ خوشی سے چونکی۔

"نہیں بڑی آپا کے دولھا۔" خاک پڑے بڑی آپا کے دولھا کے مرنے کا کیسے
ارمان تھا۔ بد مزاج کہیں کے۔ پچھلی دفعہ گنے لائے تو سارے اماں کو بھجوا دیے۔
ایک پوری بھی نہ چھونے دی۔ اسے سخت ناامیدی ہوئی اور وہ رو پڑی۔ سب
سمجھے وہ غم میں شریک ہو رہی ہے اس لیے اور بچوں کے ساتھ بہلانے کو اسے
تحصیلدارنی کے یہاں بھجوا دیا گیا جہاں اسے بھنے ہوئے میٹھے انڈے کھلائے
گئے۔

جب منجھو بی کا دولھا مرے گا تو اس سے بھی مزے دار انڈے ملیں گے!
وہ انڈوں کا مزہ دیر تک منھ میں قائم کرنے کی کوشش کرکے سوچتی رہی۔

بڑی آپا بیوہ ہو کر میکے میں آن رہی۔ اس کے دونوں بچے بھی آ گئے۔ جنھیں چھونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ کبوتری کے گھونسلے میں ہاتھ ڈالو تو کیسی زور کی ٹھونگ مارتی ہے۔ ایسے ہی جب بڑی آپا کے بچوں کو کوئی چھوتا تو چنگھاڑتی ہوئی لپکتی۔

جب خدا خدا کر کے منجھو سسرال سے آئی تو شمن کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا وہ تو سمجھی تھی جیسے وہ اس کے بغیر دیوانی کتیا بن گئی ہے۔ منجھو بی میلی کچیلی چوہیا روتی بسورتی اترے گی مگر اسے پہلے سے بھی موٹا اور زیادہ لال دیکھ کر اسے اپنی سخت ہتک محسوس ہوئی۔ "جھوٹی کہیں کی، اماں کو لکھا کرتی تھی" مجھے اپنی شمن بہت یاد آتی ہے" خاک! یاد آتی ہوتی تو یوں طباق سا چہرہ نہ ہوتا۔ سر سے پیر تک ریشمی کپڑوں میں غرق، بجتے زیور، کانوں میں لمبے جھمکے، جنھیں بات کرنے میں وہ قصداً جھلاتی اور ناک میں چمکتی ہوئی کیل، شرما کر بات کرتے میں وہ ان کیلوں کو نزاکت سے آنکھ نیچی کر کے دیکھنے کا انداز اور وہ باریک ریشم کی جالی کا کرتا۔ جس کے اندر سے گوٹے کی چولی بادلوں میں چھپے چاند کی طرح جھلملا اٹھتی۔

آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح سب کے گلے لگنے لگی مگر اس نے شمن کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ ساری پھول جیسی فراکیں مرجھا گئی تھیں اور جانگیوں کے بجائے اوٹنگے بد وضع پاجامے پہننے لگی تھی۔ بڑی دیر بعد نہ جانے کیسے وہ اسے یاد آ ہی گئی۔

"شمن کہاں ہے" اس نے پوچھا۔ اور اس کے دل کو بری طرح ٹھیس لگی اور تو اب بی منجھو اسے پہچانے گی بھی نہیں، یہ گھنٹہ بھر سے دروازے سے لگا کون ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا ہے؟ کس نے کئی بار اس کا ریشمی دوپٹہ چھو کر متوجہ کرنے کی ناکام کوششیں کیں؟ اور یہ کون صبر کیے دیوار سے خاموش لگا کھڑا ہے۔ شمن نہیں تو پھر اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر اسے ماں بہنوں کے گلے لگنے سے فرصت ملے تو کسی اور کا بھی دھڑکتا ہوا دل ذرا سکون پائے۔ آپا کی لڑکی نوری کو تو آتے ہی کلیجے سے لگا لیا اور شمن جیسے چھل پیری چڑیل تھی کہ لوگوں کو

نظر بھی نہ آئی۔

مگر پھر بھی جب منجھو نے اُسے اپنے مہکتے ہوئے سینے سے لگایا تو اس کے دل میں ہزاروں سوتے پھوٹ نکلے اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لیتی وہ اس کے شانے سے ٹک گئی۔

"جوئیں، جوئیں، اے ہے منجھو، موئی کے ہزاروں جوئیں بھری پڑی ہیں" آپا اور اماں چلائیں اور منجھو نے ڈر کر اسے دور دھکیل دیا۔ (نوری کا غم)

"گندی ہے یہ بھنگن کی لونڈیا" نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی منجھو پھر باتوں کے ریلے میں بہہ گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ شمن دھکا کھا کر باہر چل دی اور چپکے سے سرک کر میلے کپڑوں کے گٹھڑ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، آج وہ دل اور دماغ دونوں سے رو رہی تھی، کھارے کھارے آنسو میلے بدبودار کپڑوں میں جاذب ہو رہے تھے۔ نہ جانے کب تک وہ پڑی روتی رہی کسی کو یاد بھی نہ آئی بچے دوڑ دوڑ کر منجھو کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے تھے، نوری اب بھی اس کی گود میں ڈٹی اس کی چمپا کلی سے کھیل رہی تھی۔ منجھو نے گڑیا نکال کر اسے دی اور دوسری نکال کر شمن کو پکارا۔

(شمن کا غصہ)

"نہیں ہم دونوں لیں گے" نوری مچل گئی۔ ویسے شمن اتنی ذلیل نہ تھی کہ منجھو کی گڑیا پر اس کی نیت بھٹکتی مگر جب دونوں گڑیاں نوری داب بیٹھی تو وہ ضبط نہ کر سکی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور چھت میں لٹکے ہوئے جالوں کو دیکھتی رہی جس میں نیم مردہ مکھیاں جھول رہی تھیں۔ اس پر پھر دورہ سا پڑ گیا۔ وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پاجامے، سڑی ہوئی بنیائیں اور بساندے کرتے وہ غصے میں ان سب کو نگل جانا چاہتی تھی۔

تھک کر وہ باہر برآمدے میں آ کر کونے میں بیٹھ گئی آج اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہو جانے والی ٹوپی پہنے ہے آزمانے کے لیے وہ کئی بار سامنے سے گزری مگر نہ منجھو نے اسے دیکھا اور نہ نوری نے جو دونوں

گڑیاں سمیٹے منجھو کے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

منجھو کے پلنگ میں ابھی تک دلہناپے کے دھندلے سے نشانات موجود تھے تکیے وہی سرخ ساٹن کے جن پر جھاگ جیسے کڑھے ہوئے غلاف چڑھے تھے اور وہی کارچوبی گوٹ کی رضائی۔ نوری اس کے تکیوں پر سراوندھائے قلابازیاں کھا رہی تھی۔ شمّن کا کتنا جی چاہا کہ جاکر نوری کو اتنی زور سے دھکیلے کہ وہ اندھے کنوئیں میں جاگرے اور پھر دونوں گڑیاں چھین لے۔

دیر تک بیٹھی منجھو کے مہندی لگے پیروں کو پلنگ کے نیچے سے جھانک کر دیکھتی رہی۔ لال لال پیر جس میں گھنگرودار پازیب! اس کا گلا رقّت سے بھنچ گیا کاش وہ آنکھ بچا کر کسی طرح پلنگ کے نیچے رینگ کر پہونچ جاتی اور ان دو گھنگروؤں کو آہستہ سے انگلی سے بجا کر دیکھتی جو اس کی حنا آلود ایڑی پر ہلکی ہلکی جنبشوں سے ناچ اٹھتے تھے۔ اتنے میں اسے نوری نے دیکھ لیا۔

"خالہ جان شمّن، مہترانی کی لڑکی ہیں یہ، انہیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا" وہ تتلا کر بولی اور بڑی آپا نے پیار سے اس کے تھپیڑا لگایا۔ منجھو نے مڑ کر اسے دیکھ لیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ آئی۔ پھر منجھو کا دولہا بھی گھر میں آگیا۔ منجھو کچھ شرمائی کچھ اترائی باتیں کرتی رہی۔ دولہا کی آنکھیں شاید تیز تھیں اس نے شمّن کا بھوت دیکھ لیا۔

"ارے بھئی یہ تمہاری بہن شمّن کیوں الگ کھڑی ہے؟"

"ان کے جوئیں ہیں" نوری نے جلدی سے اطلاع دی۔

"اے ہے جوئیں، یہ تو بری بات ہے، چھ چھ" شمّن اور جل گئی' یہ کمبخت کون ہوتا ہے چھ چھ کرنے والا۔

"بھئی یہاں آؤ" اس نے پھر بلایا۔

"انھیں مت بلائیے، یہ بری ہیں ان سے کوئی بھی نہیں بولتا' نوری دولہا کی گود میں بھی چڑھ گئی اور پھر دولہا نے منجھو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں

کچھ کہا۔ اس نے چونک کر شمّن کی طرف دیکھا، شمّن سمجھ گئی۔ اور پھر گرتی پڑتی بھاگی کہ اب اس کے ساتھ ہمدردی جتانے کی سازش ہو رہی ہے۔

پھر اندھیری کوٹھری میں جا کر اس نے "منجھو بی منجھو بی" پکارنا شروع کیا مگر بے کار جیسے وہ کسی مردے کو قبر سے کھینچ بلانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ منہ اوندھائے وہ پڑی تھی کہ کسی نے زور سے ہاتھ جھٹک کر اُسے چونکا دیا۔

"خبردار جو یوں میلی کچیلی منجھو کے کمرے میں گئی، مردار کہیں کی" بڑی آپا نے بے رحمی سے اُسے جھنجھوڑیاں دیں۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو وہ بلبلا کر لپٹ ہی جاتی اور ان کی بوٹیاں ہی اڑا دیتی مگر اس وقت تو کسی نے اس کے سارے احساسات پر چوٹیں مار مار کر سن کر دیا تھا۔ وہ سہم کر دوسری طرف جانے لگی۔ اتنے میں منجھو باہر نکل آئی۔

"شمّن" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شمّن کو بڑی بہادری سے کام لینا پڑا ورنہ اس کے جسم کا رواں رواں کھینچ کر منجھو میں جذب ہو جانے کے لیے تڑپ اٹھا۔

"چل ادھر کمبخت، کیا گت بنالی ہے، ذرا سے دنوں میں" منجھو نے کس کس کے دو گھونسے جمائے۔ شمّن پھوٹ پڑی، دکھ سے نہیں، ان توجہ بھرے گھونسوں کی لذت سے۔ اس کا جی دکھ اٹھا۔ گھسیٹتی ہوئی اسے غسل خانے میں لے گئی۔ شمّن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنسو بے تاب ہو کر نکلے، گھٹے ہوئے بخار امڈ پڑے۔ منجھو کے گھونسے کی شیرینی جس کے لیے وہ ترس گئی تھی۔ اس کی رگ رگ میں تیر گئی۔ اور پھر گھونسوں، تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا، اور اس لاش کو دوبارہ جگا دیا جو بالکل اس کے اندر سڑ گل چلی تھی۔ خون سرعت سے دوڑنے لگا۔ مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور ذرا سی دیر میں وہ پرانی شمّن کی طرح واویلا مچانے لگی۔

منجھو کو بھی جیسے بہت دن کی چھوٹی شراب ہاتھ آ گئی بس ٹوٹ ہی تو پڑی

پھر بال نوچ نوچ کر کنگھی کی اور سارا دن کھانا پینا چھوڑ کر اس کی جوئیں نکالیں سب نے بہتیرا منع کیا مگر اسے تو جیسے گرتے ہوئے مکان کی مرمّت کرنا تھی، وہ بھی برسات سے پہلے پہلے۔ شام کو شمن کے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے۔ بدن تو ہلکا ہوا ہی تھا، جی ایسا ہلکا ہو گیا کہ وہ دھما دھم منجھو کے پلنگ پر قلابازیاں کھانے لگی، دھواں دھوں تکیوں کو پیٹ ڈالا اور رضائی کا تنبو تان کر لاتیں چلانے لگی۔

"ہیں، ہیں، پھٹ جائے گی رضائی!" آپا چلائیں "بس ذرا ڈھیل دی اور اترانے لگیں۔ کمبخت بات کرنے کے لائق نہیں، نوری بھی تو ہے، مگر یہ دیوانی حرکتیں نہیں کرتی"۔

شمن نے دیکھا نوری منجھو کے دولھا کی گود میں بیٹھی مینا کی طرح چہک رہی تھی اس کا جی سلگ اٹھا۔ بس چلتا تو وہ نوری کی بوٹی بوٹی کر کے پھینک دیتی۔ کمینی کہیں کی ہر بات میں اماں بیٹیاں ذلیل کرنے آن مرتی ہیں۔ نوری گوری ہے وہ کالی ہے، نوری نازک، وہ بھدی، نوری ہنس مکھ شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز۔ وہ بدمزاج، بدتمیز اور پھوہڑ، پڑھنے سے دم چراتی۔ نوری روز کا سبق قرآن شریف کا، جھٹ پٹ یاد کر، سنا دیتی۔ شمن پر اس بات پر ہزاروں پھٹکاریں پڑتیں۔ وہ اپنا پچھلا سبق بھی بھول جاتی۔ نوری ننھی سی بدھنی سے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرتی اور جائے نماز پر ماں کے برابر کھڑی ہو کر نماز پڑھتی۔ لوگ واہ واہ کرتے مگر شمن خوب جانتی تھی کہ اسے نماز خاک بھی نہیں آتی۔ کھڑی بُدبُد ہونٹ ہلایا کرتی ہے۔ اسے نماز کچھ زیادہ اچھی نہ لگتی تھی، ویسے گھر میں پڑھتا بھی کوئی نہیں تھا، بڑی آپا نے تو بیوہ ہونے کے بعد زور و شوروں سے نماز پکڑی، دوسرے وہ عموماً نجس رہا کرتی تھی اس لیے کوئی نماز سکھاتا بھی تو نہ تھا۔

اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس واپس پائی ہوئی منجھو کا کیا کرے۔ اس سے لپٹتے لپٹتے تو وہ تھک گئی تھی، چھوتے چھوتے دل اکتا گیا تھا۔ مگر پھر بھی بھوک باقی تھی

رات کو کھانے پر وہ ٹھنک ٹھنک کر منجھو ہی سے سب کچھ مانگتی رہی.

"نمک، بوٹی .... سالن. گردہ .... سینگ کی ہڈی لیں گے، نہیں مٹھائی، ہمارے مرچیں لگ رہی ہیں .... چمچے سے کھائیں گے" منجھو باتوں میں مشغول اس کی فرمائشیں ٹھیک طرح پوری نہیں کر رہی تھی. اور اور جب شمن نے سالن کا ڈونگا اجلے دسترخوان پر اوندھا دیا تو اماں اور آپا میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئیں.

"چلو اٹھو" منجھو روکتی ہی رہی مگر بڑی آپا اسے گھسیٹ کر برآمدے میں کھینچ لائیں.

"آواز نکالی تو دم گھونٹ دوں گی" اگر کوئی اور ہوتا تو شمن اس سے لپٹ کر کھسوٹنے لگتی، مگر آپا سے وہ ڈرتی تھی کیونکہ انھوں نے ایک دن ایسی بے دردی سے مارا تھا کہ اماں تک کے آنسو نکل آئے تھے. اس بے رحمی میں شمن کو ایسی کریہہ نفرت پوشیدہ نظر آئی تھی کہ وہ سہم گئی تھی. اس دن سے بڑی آپا کو بڑا فخر تھا کہ گھر بھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر ان کی گھرکی سے شمن کانپ اٹھتی ہے اور فوراً کہنا مان لیتی ہے مگر انھوں نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ یوں کہنا مانتے وقت شمن کی آنکھیں کسی خوفناک نفرت سے دمک اٹھتی ہیں، ایسے ہی جیسے پنجرے میں بند شیر سدھانے والے کے چابک سے ڈرتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں جو خونی نفرت نظر آتی ہے اسے کچھ سدھانے والے کا جی ہی جانتا ہے. ایک ذرا دیر کو جو پنجرہ ہاتھ سے چھوٹ پڑے تو کیا ہو. جب وہ اسے ڈانٹتی تو شمن خاموشی سے انھیں ایسے دیکھتی کہ ان کا غصہ چوگنا ہو جاتا اور وہ اسے چبا ڈالنا چاہتیں.

شمن کھانے پر سے تو ہٹا دی گئی تھی مگر منجھو کے پلنگ پر لیٹنے کا تو پورا پورا حق رکھتی تھی. وہ خاموش ضبط کیے لیٹی رہی کہ کہیں آپا بہانا بنا کر اس کی جگہ انوری کو منجھو کے پلنگ پر نہ سلا دے، اس کی یہ عادت تھی کہ ہر جگہ اپنی بیٹی کو ٹھونسے جاتی تھی لیکن جب اس سے کہا گیا کہ جا کر اپنے پلنگ پر سوئے تو وہ بگڑ گئی. "نئیں، ہم تو منجھو کے

پاس سوئیں گے"۔

"رہنے دو آپا، یہیں سو رہنے دو، کیا ہے۔ منجھو شرما کر اپنی کیلیں دیکھنے لگی۔ شمن نے سوچا کوئی اٹھا نہ دے وہ جلدی سے سوتی بن گئی۔ مگر اسے واقعی نیند آ گئی وہ منجھو کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے سوتی رہی۔

رات کو اس کی جب آنکھ کھلی تو اس نے جلدی جلدی منجھو کی گردن ٹٹولنے کے لیے ہاتھ پھیلائے مگر ایک دم وہ رنج و ہیبت سے رو پڑی کیونکہ اس کا ہاتھ بجائے منجھو کی گرم گرم گردن کے پٹی پر بے کسی سے پڑا ہوا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا پلنگ تھا جس سے اسے قبر سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اور گھٹی گھٹی آوازیں منجھو کو پکارنے لگی۔

"چپ چڑیل، خبردار جو آواز نکالی" پاس کے پلنگ سے بڑی آپا غرائی۔ اوہ اب وہ سمجھ گئی! سوتے میں ظالموں نے اسے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا وہ جلدی سے منجھو کے کمرے کے پاس گئی، دروازے بند تھے اور اندھیرا گھپ تھا۔ مگر منجھو کے ہنسنے اور دولہا کے کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"منجھو، منجھو بی یہ میں ہوں، تمہاری شمن .... دروازہ کھولو" منجھو بی کی ہنسی ایک دم رک گئی، مگر دروازہ نہ کھلا۔

"منجھو بی، شمن ہوں .... دروازہ کھولو" وہ التجائیں کرنے لگی۔

"اے ہے چڑیل جان کو آ گئی ہے اس کی، ادھر چل۔ اگر اب کی پلنگ سے اٹھی تو بس کالی کوٹھری میں بند کر دوں گی"۔ بڑی آپا نے باہنہ پکڑی۔ اس کی باہنہ پکڑی اور بھگاتی ہوئی لا کر پلنگ پر پٹخ گئیں۔

شمن کا کلیجہ پھٹنے لگا، خوف کی وجہ سے وہ دم گھونٹے سسکیوں سے روتی رہی۔ سب سو رہے تھے مگر اسے نیند نہ آئی۔ بڑی دیر تک رونے کے بعد چپ ہو گئی مگر سسکیاں نہ رکیں، اسے پلنگ پر لیٹنا دوبھر ہو گیا اور اٹھ کر صحن میں چلی آئی۔ جاڑے اچھے خاصے تھے مگر اسے بالکل سردی نہ لگی۔ آنگن میں نیم کا

درخت بھوت کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا وہ تھوڑی دیر اس کے کھردرے تنے سے لگی اپنی ہتھیلیاں رگڑتی رہی پھر بغیر کسی ارادے کے مرغیوں کے ڈربے پر بیٹھ گئی۔ یہاں پھر آنسوؤں نے حملہ کر دیا اور گہری گہری سانسوں سے نہ جانے کتنی دیر تک روتی رہی۔ سنسان رات میں جب ہر چیز سوئی پڑی تھی اور سوائے مرغیوں کی کڑکڑ کے بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا کیا کرے۔ اتنے میں ایک بلی دیوار پر سے کود دی۔ ڈربے میں مرغیاں چوکنی ہو کر کڑکڑائیں، وہ اٹھ کر برآمدے میں واپس بھاگی، راستے میں اس کی نظر ایکدم کیاریوں پر پڑی جہاں دھنیا اور ساگ بویا ہوا تھا اندھیرے میں بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کالا کالا اون الجھا ہوا پڑا ہے، بڑی آپا کی کیاریاں۔

آناً فاناً میں وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے کھسوٹنا شروع کیا، جیسے وہ اپنی کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو اور پھر مٹھیوں میں لے کر اس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مرچوں کے پیڑ، لوکی کی بیل، چمیلی اور موگرے کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آپا جوڑے میں لگایا کرتی تھیں توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے، اب اسے ہنسی آنے لگی، جیسے کسی نے پچکاریوں سے تازہ تازہ خون اس کے جسم میں بھر دیا، آنسو بھری پھٹی پھٹی آنکھیں دہشت سے بھینگی ہو گئیں، گھنے بال ہوا میں سنپولیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اور وہ بالکل ایک چھوٹی سی مرگھٹ کی ڈائن معلوم ہوتی تھی، جو قبر کھود کر مردے کے کلیجے میں ناخون گڑ کر اسے دانتوں سے چبانا شروع کر دیتی ہے۔ وہ تھک کر شل ہو گئی۔ اور اس کا جی بھی بھر گیا اسے اب بری طرح ہنسی آرہی تھی۔ سوکھے سوکھے پاگل کتیا کے سے بھیانک قہقہے لگا رہی تھی۔

"بس بس، اب ٹھیک ہوئیں"۔ اس نے تخیل میں کسی پر دانت پیسے اور پھر وہ وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اسے نہلایا تھا، بال سنوارے تھے تو بس اب اس کی یہی سزا ہے! اس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے بالوں میں

ڈالیں، خوب کیاری کی کیچڑ میں قلابازیاں لگائیں، زمین پر تھوک کر ہتھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی ہتھیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھیر لیں۔ اس کا بس نہ تھا جو اپنے جسم کو آگ لگا کر بھسم کر دیتی تب تو منجھو کو پتہ چلتا۔ تھوڑی دیر میں اس کا جی ٹھہر گیا تو تھکن اور غصے کا آیا ہوا پسینہ خشک ہو رہا تھا، اور ہوا اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔

صبح جب نوکروں نے اسے کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیاریوں کے پاس بیہوش پایا تو خوف سے ان کی چیخ نکل گئی۔ ماما سمجھی اسے کسی نے قتل کر دیا، کیونکہ اس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ناک سے نکسیر پھوٹ کر ساری ٹھوڑی اور گردن پر خون جما ہوا تھا۔

چار پانچ روز تک اسے بخار کی وجہ سے ہوش نہ آیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سینے پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اور منجھو بڑی پریشان بیٹھی تھی۔ اس کا جی خوش ہو گیا۔ بڑی آپا تک فکر مند نظر آ رہی تھیں اور رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھیں۔

پھر تو اسے ایسا معلوم ہوا دوبارہ کسی کے یہاں اکلوتی پیدا ہو گئی۔ خوب خوب ضدیں کرتی اور منجھو تو اسے اچھا ہونے پر اپنے ساتھ سلانے کا پکا قول دے چکی تھی۔ اس کا دولہا چلا گیا تھا، اور وہ اس کے قریب ہی سوتی تھی۔ بیماری میں
خوب لاڈ ہوئے مگر وائے قسمت وہ بڑی تیزی سے اچھی ہونے لگی۔ بخار بالکل غائب 5
اور کمزوری نام کو نہیں، بڑی آپا نے پھر نظر ٹیڑھی کر لی، انار اور انگور ملنے بند اور ساگو دانہ بھی ختم۔ مگر اسے تندرست ہو کر سخت غصہ آیا۔ پڑوس میں چلا کی ماں رہتی تھی، کیا مزے سے ہمیشہ بیمار رہتی تھی، کیا اللہ میاں کو اسے مرض دیتے بھی۔ کنجوسی سوجھتی تھی! اسے اچھا ہونا پڑا۔

قادر عرف کدن

۵

جب منجھو سسرال جانے لگی تو شمن کو بھی ساتھ لے لیا۔ اس وقت نوری کی خوب کرکری ہوئی۔ بری طرح بلکی اور پچھاڑیں کھائیں۔ سب نے اسے مزے دار دھوکہ دے دیا۔ پہلے تو سب نے کہا کہ ہاں بھئی نوری بھی جائے گی۔ مگر منجھو نے چپکے سے اسے بتایا کہ نوری کو پھسلا رہے ہیں۔ شمن کو بڑا ہی مزہ آیا۔ منجھو جانے لگی تو نوری پہلے ہی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ ڈری کہ بہلانے کے بجائے سچ مچ لیے جا رہے ہیں۔ مگر گاڑی چلنے سے ذرا پہلے بڑے چچا نے نوری سے کہا۔

"آؤ بیٹی نوری، تمھیں مٹھائی دلائیں۔"

"نہیں، نہیں، ہم مٹھائی نہیں لیتے۔" نوری ایسے بہت جھکمے سہہ چکی تھی۔

"بیٹی ہمارے پیسے لے آؤ سنگ لے چلیں گے۔" منجھو بی بولی۔

"ٹوکری میں لے چلو گی خالہ جان؟" نوری چہکی اور شمن مسکرائی کہ آئی اب کمبختی بے چاری کی۔ جونہی نوری چچا کی گود میں گئی گاڑی نے سیٹی دے دی، نوری دھاڑیں مارتی رہ گئی، شمن کا ہنسی کا مارے برا حال ہو گیا، مگر تھوڑی دیر بعد اُسے بے اختیار نوری یاد آنے لگی۔ بیچاری نوری دونوں چلتیں تو مزہ آتا۔

منجھو کا گھر اُسے بالکل پسند نہ آیا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے اور چھوٹا سا صحن، منجھو کا دولھا اور منجھو کی ساس جسے دیکھتے ہی شمن نے بھانپ لیا کہ ہے دشمن کا مورچہ۔ بڑھیا اُسے شروع ہی سے بری لگی۔ اس کے علاوہ منجھو کی ساس کا پوتا کدن بھی اسے قطعی پسند نہ آیا۔ لال چقندر رنگ اور نیلی نیلی بلے جیسی آنکھیں کپا گال! ایک کمرے میں منجھو اور اس کا دولھا، دوسرے میں منجھو کی ساس اور

کدّن سوتے تھے. وہیں شمّن کا پلنگ بچھا دیا گیا. وہ اب کچھ کچھ سمجھ چلی تھی کہ منجھو کی دولھا کی موجودگی میں تو وہ کمرے میں سو نہیں سکتی. کبھی کبھی اسے تشویش ہوتی، کہ آخر کیوں؟ مگر کبھی کسی نے اسے اطمینان بخش جواب نہ دیا۔

"نہیں. منجھو کے پاس نہیں سوتے!"

"کیوں؟" وہ پوچھتی۔

"بس بک بک نہ کرو". جواب ملتا، اور وہ بک بک نہ کرتی.

منجھو سے پوچھنے کی کبھی ہمّت نہ پڑتی، وہ کچھ بدل سی گئی تھی، اگر پاس بھی لٹاتی تو پہلے ہی سے کہدیتی.

"دیکھ شمّن ہٹ کے لیٹو، ہاں بھئی مجھے گرمی لگتی ہے" وہ ویسے یوں ہی کبھی دکھاوے کو چمٹا بھی لیتی مگر وہاں اب اُسے گرمی نہ ملتی تھی جس کی کبھی وہ عادی تھی، اس لیے منجھو سے کبھی لاڈ نہ کرتی. کچھ کھنچی کھنچی سی رہتی مگر منجھو نے کبھی دھیان نہ دیا

منجھو کو قادر عرف کدّن سے بھی اس لیے نفرت تھی کہ اس سے بڑا ہو کر بیٹ لیتا تھا. کیونکہ اسے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا تھا کبھی مذاق ہی میں شمّن اس سے کُشتی لڑنے کو کہتی تو دبک جاتا. بس ہر وقت دادی بی کے پاس بیٹھا پان چبایا کرتا. کبھی سروتے سے کھیل لیتا. اور دوڑ دوڑ کر کام کرتا.

بڑھیا کو تو شمّن نے شروع ہی سے ڈھیل نہ دی، باوجود منجھو کی دھمکیوں کے اس نے انھیں دادی بی نہ کہا. بلکہ ہمیشہ "منجھو کی ساس" ہی کہتی رہی جس پر بڑھیا جل اُٹھتی. اور منجھو سے اس پر ڈانٹ پڑواتی، پھر تو وہ اور ضد باندھنے لگی. اور سوائے "اے" یا "وہ" کے کچھ نہ کہہ کر مخاطب کرتی.

کدّن دادی کے ساتھ چولھے کے پاس بھی گھستا، یہاں تک کہ وہ رفع حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا. شمّن سے تو وہ پہلے ہی دن ڈر گیا تھا. جب اس نے اس کی چھوٹی سی صراحی چھوئی تو وہ خونخوار بلّی کی طرح جھپٹی اور گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی وہ ایک دم جھجک کر بھاگ گیا تھا

اور دادی بی کے کندھے سے لگ کر خوب رویا تھا۔

کدّن کی بھی ایک کیاری تھی جس میں اس نے پودینہ اور کپاس بو رکھی تھی اور شمّن کی کیاری میں سیمیں بوئی ہوئی تھیں، کدّن کی کیاری پر بڑھیا دولت کا سانپ بن کر پہرا دیتی کیا مجال جو کوئی چھو بھی جائے۔ ایک دن بڑھیا نے جان بوجھ کر شمّن کی کیاری سے دھنیا توڑ لینا چاہا۔

"کدّن کی کیاری میں سے توڑو ہماری کیاری میں سے نہیں" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر کیاری کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"اے بیٹی ذرا سا لوں گی کدّن تو رو دے گا"

"کدّن تو رو دے گا!" شمّن کے آگ ہی تو لگ گئی۔

"نہیں" اس نے کچھ ایسے زور سے بڑھیا کو ڈانٹا کہ وہ ڈر کے بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی، کچھ ہی دن میں وہ منجھو کے گھر سے تھک گئی۔ اسے رہ رہ کر اپنا گھر یاد آتا۔ نوری، بڑے بھائی اور منجھلے بھائی ــــ وہ تو اسے اتنا مارتے بھی نہ تھے، پر اس کے موٹے موٹے گال خوب نوچتے تھے۔ بڑی آپا البتہ ٹیڑھی کھیر تھیں، لیکن ان سے ناتا رکھنے کی ایسی ضرورت ہی کیا تھی، مگر یہاں تو بڑھیا اور کدّن دو جانیں جن سے اسے کوئی دل چسپی ہی نہیں۔

منجھو تو دوپہر کو کمرہ بند کر کے سو جاتی اور اس کی ساس دالان میں بیٹھی دالیں وغیرہ چنا کرتی، شمّن پاگلوں کی طرح کیاریوں کے پاس ٹہلتی یا مرغیوں کو آنگن میں دوڑاتی کبھی باورچی خانے میں جا کر آلو بھوننے لگتی۔ پھر ان سب باتوں سے بھی دل گھبرا جاتا تو وہ خاموش منڈیر پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاتی اور سنسان سڑک پر سوکھے ہوئے پتوں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑتے دیکھا کرتی، پاس ہی بندر درختوں پر اچھل کود میں مشغول ہوتے۔ اس ڈال سے پینگ لے کر اس ڈال پر، جیسے سرکس میں نٹ جھولتے ہیں ایک دم سے کسی بندر کا ہاتھ چوک جاتا اور وہ دھپ سے دیوار پر آن گرتا۔ تو شمّن ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی، کاش وہ بھی بندر ہوتی۔ ان میں منجھو کی ساس اور

کدن سے تو زیادہ انسانیت ہو گی، یہ نہیں کہ ہر وقت بس دال بین رہے ہیں یا گیہوں پھٹک رہے ہیں اور وقت ملا تو لال پیلے چیتھڑوں کو جوڑ کر جھاڑ جھنکاڑ بلائیں سی جا رہی ہیں۔

ایک دن کدن نے اپنی رنگین شیشے کی گولیوں کا ڈبہ نکالا اور بولا۔

"آؤ شمن کھیلیں"۔

شمن اسے تو منہ نہ لگاتی مگر لال ہری گولی کو دیکھ کر اتر آئی۔ بڑی دیر تک وہ ایک ایک گولی آنکھ سے لگا کر اس میں دوڑتے ہوئے رنگ دیکھتی رہی جیسے قوس قزح کی جھاڑو سے ان کے اندر کسی نے دائرے کھینچ دیے ہوں، ایک تو بالکل ایسی تھی جیسے ریشم کا پھندنا شیشے میں بند کر دیا ہو۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ پھندنا زندہ کیڑے کی طرح رینگنے لگتا۔

"کدن آؤ ان گولیوں کو کیاری میں بوئیں"۔

"کیاری میں؟"

"ہاں پھر پیڑ اگیں گے تو ہزاروں گولیاں بیروں کی طرح لگیں گی اور جناب بس پھر اپن توڑ توڑ کر جمع کر لیں گے، ہاں"۔

"پر دادی بی ماریں گی جو!"

"ہونہہ، دادی بی کو کیا پتہ چلے گا۔ ہاں مگر جب پیڑ اگیں گے تو بس خوشی کے مارے وہ مر جائیں گی، دیکھ لینا، ہاں"۔

"تو چلو — کدن آج بنا دادی بی کے ہی کچھ کرنے کو تیار ہو گیا۔ شمن کو اس پر کچھ یونہی سا پیار آنے لگا۔ گولیاں بو کر انھوں نے خوب سا پانی ڈالا اور گھٹنوں پر کہنیاں رکھ کر انتظار میں بیٹھ گئے۔

شمن کو گولیاں اگتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب اس نے دھنیا بویا تھا تو صبح ہی صبح کیاریوں کو دیکھنے گئی تھی مگر کلا بھی نہ پھوٹا تھا اسے ڈر لگا کہ کہیں دھنیا خراب تو نہیں تھا، لیکن تیسرے چوتھے دن اس نے دیکھا باریک باریک کیا سی

رنگ کے ٹانکے زمین پر اٹھے ہوئے تھے۔ ننھے ننھے کنڈے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکل آئے تھے۔ ان میں سے دو چار تو بالکل ہی جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی ان کی گردنیں پھنسائے ہوئے کھینچ رہا ہو، ان کی کمروں پر بڑا زور پڑ رہا تھا۔ شمن نے چاہا تنکے سے انھیں سہارا دے کر ان کے سر چھٹا دے مگر وہ کٹ سے بیچ میں سے ٹوٹ گئے، اس کا دل اس روز کسی کام میں نہ لگا اور وہ کیاریوں کے پاس بیٹھی ان کلّوں کے زمین سے ابھرنے کی کشمکش دیکھتی رہی، کچھ تو جب وہ ناشتہ کرنے گئی نکل آئے اور کچھ ابھی کشتی لڑ رہے تھے، ان میں سے ایک تو بالکل زندہ کیڑے کی طرح باہر کو اپنا نازک جسم کھینچ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بل میں سے سنپولیے کی طرح نکل آیا۔ شمن نے ٹھنڈی سانس لی جیسے کلّے کا سارا زور وہی لگا رہی تھی۔ کلّے کی ناک میں دھنیے کے چھلکے کا بلاق لٹک رہا تھا جو تھوڑی دیر میں اس نے جھٹک کر پھینک دیا اور دوپہر تک تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ فتح مند سپاہی کی طرح پھیلا دیے۔

آج وہ گولیوں کے کلّے کا پھوٹنا دیکھے گی۔ چکنے چکنے کانچ کے پچرنگے حلقے جیسے چوڑی موڑ کر کنڈا بنا دیا ہو۔ وہ ان کنڈوں کو پرو کر ہار بنائے گی، نہیں، نہیں پھر پیڑ کیسے بڑھیں گے اور پھر جامنوں کی طرح رنگ برنگی گولیوں کے گچھے اس کی آنکھوں کے سامنے جھومنے لگے۔

تیسرے پہر تک تو کلّے پھوٹے نہیں، پھر اسے نیند آگئی، جب شام کو وہ اٹھی تو اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔ منجھو کی ساس مصالحہ پیسنے کے پیالے میں بیٹھی گولیاں دھو رہی تھی۔ ہیں، شاید چڑیل انھیں گوشت میں بگھارنے جا رہی ہے۔ شمن اس پر پل پڑی۔

اس کے بعد نہایت ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اس نے منجھو کے ساس کی کلائی چبا ڈالی اور منجھو نے اس کا منہ چانٹوں سے توڑ کر رکھ دیا۔

آج اس کا دل و دماغ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہونہہ، گولیاں نہیں بوئی جائیں، اس کا بس چلے تو منجھو کی ساس کو اٹھا کر بو دے، اور پھر وہ سوچنے

لگی ــــ اس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بو دیا ہے ...... دوسرے دن کلا پھوٹ رہا ہے ..... کھورا کھورا عتیوں دار ــــ سیر سے ٹوکریوں میں اژدہا لیے پھرتے ہیں نا ــــ بالکل ویسا ــــ شمن خوشی سے دیوانی، دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے، پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے بھی اونچا ہو گیا اور ٹنکوریوں کی طرح گچھے کے گچھے مرگھلی سڑی ہوئی کبڑی بڑھیوں کے لٹکنے لگے۔ ایک لمبا سا بانس لے کر وہ انھیں جھاڑنے لگی جیسے پکی پکی املیاں۔ سارا آنگن بڑھیوں سے پٹ گیا، ہزاروں، لاکھوں، کھانستی، چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پاندان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پہ بیٹھی چھالیا کتر رہی ہے، آٹھ دس باورچی خانے میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں، دو چار آچار کی مٹکیوں کے پاس پھد کر رہی ہیں۔ منی منی مکڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں اودھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم ان بڑھیوں سے گھبرا اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے انھیں دور دور کرنے لگی۔

شکر ہے جو اس نے بڑھیا کو بونے کا خیال جلدی ترک کر دیا ورنہ غضب ہو گیا تھا۔ ایک ہی بڑھیا نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اسے کئی دن پر بھی بہت غصہ آیا کہ اس نے اپنی جہیتی کو بتا کیوں دیا۔ جی چاہا ناخونوں سے اس کی کنچی بلوٹے جیسی آنکھیں نکال کر گونیوں کی جگہ بو دے۔

٦

x اُسے آہستہ آہستہ منجھو سے اور نفرت ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب اسے قابلِ اعتراض لگنے لگا۔ وہ روز بروز موٹی اور کاہل ہوتی جاتی۔ بڑھیا ساس ماما کی طرح اس کے آگے پیچھے لگی رہتی مگر اس کا منہ کسی وقت

سیدھا نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ منجھو پیلی پیلی مٹی کا ٹکڑا چبا رہی ہے۔ شمن کا دل دہل گیا اُسے یاد تھا کہ جب وہ خود مٹی کھایا کرتی تھی تو سانپ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب منجھو مٹی کھا رہی ہے۔

"منجھو بی مٹی کھاتی ہے" اس نے چپکے سے کدن سے کہا۔

"کون، میری چچی؟"

"ہاں، اور جبھی تو اس کا پیٹ پھول گیا ہے، دیکھ لینا اس کے پیٹ میں سے ایک دن یہ بڑا سانپ نکلے گا!" کدن نے دادی سے جڑ دیا۔

"دادی بی شمن کہتی ہے چچی کے پیٹ میں سے سانپ نکلے گا!"

"خاک پڑے شمن کے منہ پر، کیوں رے، منع کیا کہ اس دیوانی سے مت بولا کرے مگر سُنتا نہیں تو نے، ــــ لو بھلا بہن کے لیے مرا تن ایسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔" بڑھیا گھنٹوں بیٹھی بڑبڑاتی رہتی۔ مگر شمن کی فکر نہ گئی، وہ چھپ چھپ کر منجھو کا پیلا اترا ہوا چہرہ اور موٹا جسم دیکھا کرتی، اُسے اس کے پیٹ میں موٹے موٹے پھنکاریں مارتے ہوئے سانپ بل کھاتے نظر آتے، پھر اسے منجھو سے اور نفرت ہو گئی مگر کسی کو اس کے متعلق فکر نہ تھی بلکہ بڑھیا تو اور خوش نظر آتی تھی۔ کہ مزے سے سارے گھر میں اسی کا راج ہے وہ جان بوجھ کر اس کے لیے سڑی سڑی مرچوں دار نقصان دہ چیزیں پکاتی اور خود بھی شکر چرا کر کھاتی ہو گی۔

اس کی اماں آئیں اور منجھو ایک دن بہت زور سے بیمار پڑی۔

"کدن آج دیکھ لینا، تمہاری دادی بی سچ کہتی تھی یا ہم ــــ اتنا بڑا سانپ ہے کہ کیا بتائیے، جبھی تو منجھو بی رو رہی ہے بچاری!"

"چچا تو دورے پر گئے ہیں، کون مارے گا سانپ کو۔"

"تھانے میں سپاہی جو موجود ہیں جناب۔" اس نے نہایت اطمینان سے کہا اور سپاہیوں سے نہایت رازدارانہ انداز میں بولی۔

"تم اپنی بندوقیں لے چلنا، اچھا"

"کیوں" داروغہ جی نے اس سے پوچھا۔

"سانپ مارنے کے لیے" ہماری بہن جو ہیں نا، منجھو بی، ان کے پیٹ میں سانپ ہے اب نکلنے ہی والا ہے۔"

داروغہ جی نے سؤر کی تھوتھنی اٹھا کر کھوں کھوں ہنسنا شروع کر دیا۔ دو چار سپاہی بھی ہنسنے لگے۔

رات کو ایک دم جو شمن کی آنکھ کھلی تو گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آ رہی تھی اور منجھو کے کمرے میں غدر مچا ہوا تھا۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی اس کے کمرے کی طرف بھاگی دو چار عورتوں نے اسے پکڑ کر دبوچ لیا، مگر وہ "منجھو بی، ہائے میری منجھو بی" کی رٹ لگائے رہی۔ معلوم ہوتا تھا باہر بھی سارے سپاہی ایک دم جاگ اٹھے اور ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلنے لگیں، وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

"کیا مر گیا؟" اس نے ایک عورت سے پوچھا۔

"کیا؟ کون؟"

"سانپ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اری بیٹی، اس سے کیا سر مار رہی ہے، یہ دلہن کی بہن ہے رموئی دیوانی" منجھو کی ساس نے کہا اور بھاگی کسی کام کو۔ آج وہ بڑی اترائی ہوئی پھر رہی تھی۔ اتنے میں اس کی اماں باہر نکلیں، وہ بھی سٹپٹائی ہوئی تھیں۔ "اماں، منجھو بی" اس نے سسکی روک کر پوچھا۔

"اچھی ہے منجھو بی، چل منا سا بھانجا تو دیکھ"۔ آج اماں خوشی سے پھولی نہ سماتی تھیں۔ وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئیں۔

"اُف!" حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ننھا منا سا چینی جیسا بوا۔ ایک عورت کی گود میں رکھا تھا۔ منجھو بی چپکی پڑی تھی۔

"اور سانپ" اس نے ڈرتے ڈرتے اماں سے پوچھا۔

"چل پگلی"

"یہ منّا کہاں سے آیا؟" اس نے دوسرے دن پوچھا۔

"یہ وہ جو میم صاحب تھیں نا وہ منجھو بی کے لیے لائی تھیں"

"اچھا — تو امّاں ایک ہمیں بھی منگا دو — منجھو کی ساس تو اُسے چھونے نہیں دیتی —"

"اچھا منگا دوں گی —" امّاں نے کہا اور دو چار عورتیں ہنس پڑیں۔

"تو پھر سانپ یقیناً سپاہیوں نے مار ڈالا۔ جبھی ٹھائیں ٹھائیں بندوقیں چلی تھیں۔ اچھا" مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی کلوٹی میم صاحب اتنا سفید بچّہ کہاں سے اڑا لائیں۔ دوسرے منجھو بی تو بالکل بھک کر رہ گئی تھی۔

"دو اور دو چار" اس نے حساب لگا لیا۔ مگر ہے ضرور کچھ گڑبڑ!

اب منجھو بی کے یہاں اس کا قطعی دل نہ لگا اور وہ امّاں کے ساتھ گھر چلی آئی۔

...ن اپنے گوادٹ آئی

۷

بڑی آپا کا کردار
گذشتہ سے پیوستہ

منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ کے لیے فن کر آئی مگر تعجب ہے اسے ذرا بھی افسوس نہ تھا ؏

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اتنا چھینا کہ بالکل ہی کنگال کر دیا۔ اچھا ہی ہوا۔ ایک روگ سا دور ہو گیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اب منجھو اسے نہیں مل سکتی، اس کے حصول کے لیے جان کھپی اتنی ہی فضول ہے جتنی پتھر میں جونک لگانے کی کوشش۔

بیوہ ہو کر بڑی آپا مستقل طور پر میکے آن رہی تھیں۔ وہ شمن کی نگراں بن گئیں
اماں کو تو دنیا کا بس ایک کام آتا تھا اور وہ بچے پیدا کرنا، اس کے آگے نہ انھیں کچھ
معلوم اور نہ ہی کسی نے بتانے کی ضرورت محسوس کی۔ ابا جان کو بچوں سے زیادہ
بیوی کی ضرورت لاحق۔

شمن کو بڑی آپا پر کبھی بھروسہ نہ ہوا۔ ویسے تو برابر یہی جتاتیں کہ انھیں شمن
کی بہتری مقصود ہے اور اس کی عاقبت سدھارنا چاہتی ہیں لیکن اصل میں اسے
نوری کے لیے درسِ عبرت دینے کا بہترین آلہ بنا رکھا تھا۔

"کہنا نہیں مانوگی تو شمن کی طرح پھٹکاریں گے سب"

"نہاؤگی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی"

"پڑھ لو نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤگی۔"

"پھر تم نے شمن کی طرح ضد کی!"

"شمن کی طرح جھوٹ بولنا خوب آتا ہے —" اور

"یہ شمن ہی تمھیں بگاڑتی ہے، خبردار جو اس کے ساتھ کھیلیں۔"

یہی نہیں وہ اور آگے بھی نہ چوکتیں، اماں جان پر طعنے کسے جاتے۔

"بھئی میں اماں تو ہوں نہیں جو تمھیں بھی —"

"مجھے اماں جیسے چونچلے تو آتے نہیں" وہ کہتیں حالانکہ دونوں بچوں کو
تخمی آم کی طرح ہر وقت چوما چاٹا کرتیں۔

اس پر شمن کی اماں شرمندہ اور کھسیانی ہو کر اس کی موت کی دعائیں مانگتیں
خیر ان کی زندگی کا سہارا یہ تو فخر تھا کہ اتنی الابلا کے ساتھ انھوں نے بڑی آپا جیسی
ہیرا سی بیٹی بھی تو جنی۔

مگر یہ ہیرا سی بیٹی اٹھتی جوانی میں رانڈ ہو گئی، دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی
چھوڑے جنھیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی۔ بچے کیا تھے تہذیب
اور فرماں برداری کے دُمچھلے تھے، سوت پر سوت کات لو کیا مجال

جو تکلا ٹیڑھا ہو جائے، روز صبح اٹھ کر کھٹا کھٹ سب کو سلام کرنا، کوئی مہمان آئے تو فوراً اسے خالہ، ممانی، چچی، دادی حسب حیثیت خطاب دینا، جھٹ پٹ ــ ــ "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا" ـــــ اور "لب پہ آتی ہے دعا" سنانا اور پھر۔

"نوری ناک کو کیا کہتے ہیں؟"

"نوز"

"کان کو؟"

"ایر"

"دانت کو؟"

"چیک"

"نہیں بھئی چیک تو گال کو کہتے ہیں، دانت کو؟"

"ٹیتھ" منّو جلدی سے بولتا۔

"شاباش، بھئی واہ، بھئی واہ ـــ" مہمان مست ہو کر جھوم اٹھتے۔

"اچھا چلو اب ٹوئنکل ٹوئنکل سناؤ" ـــ کرسی پر کھڑے ہو کر اور بھئی اشارے کرتی جانا ـــ"

پھر نوری کرسی پر بندریا کی طرح پھدک پھدک کر انگریزی گانے سناتی اور منّو جسم کے مختلف حصّوں کی انگریزی بتاتا۔ حالانکہ اس وقت اس کی تمام تر توجہ ان لڈّوؤں پر ہوتی جو مہمان کے سامنے رکھے ہوتے اور اس کا ہاتھ کمر بند سے کھیلتا رہتا۔

5 لیکن عموماً مہمانوں کے آنے کے وقت شمّن کہیں کھو جاتی۔ اور میلی کچیلی گھومتی ہوئی اگر آبھی نکلتی تو کوئی اس کا تعارف ہی نہ کراتا، بہت سی بڑی آپا کی سہیلیاں اسے پڑوسن کی لڑکی سمجھ کر کبھی بسکٹ وغیرہ دے دیتیں تو فوراً بڑی آپا یاد دلا دیتیں "بس جاؤ اب کھیلو" اور وہ کھیلنے چلی جاتی۔

بڑی آپا غریب کی زندگی کا سہارا یہ دو ننھی ننھی جانیں ہی تو تھیں اور اس کی زندگی میں رہ ہی کیا گیا تھا۔ سوائے آہوں اور سسکیوں کے، یہ عمر اور رنڈاپا؟ مگر وہ اب پہلے سے بھی زیادہ بدمزاج ہو گئی تھی، گویا بیوہ ہو کر وہ بڑا تیر مار کر آئی تھی، چوڑیاں اور رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تو یہ سب لوگوں پر احسان نہیں تھا تو کیا تھا رنڈاپے میں زندگی کے دن گزار کر وہ مرے ہوئے میاں کے ساتھ ساتھ جیتے جاگتے ساس سسر اور ماں باپ کا بھی سوگ کر رہی تھی، جب کوئی خوشی کا تہوار آتا وہ اپنا ناٹک شروع کر دیتی، ایک کونے میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی اور بَین شروع کر دیتی، جلدی سے گھلی ہوئی مہندی پھکوا دی جاتی، چوڑی والی کو ہش ہش کر کے ٹال دیا جاتا، سوئیوں کا زردہ پکنا ملتوی ہو جاتا، عید کی جوتی ایسے مل جاتی گویا اماں پہ قرض آتا تھا یا وہ اپنی جان کا صدقہ دینے پر مجبور ہیں۔

مگر بن باپ کی معصوم بچی نوری کے خوب لاڈ ہوتے اس کے بہانے خوب مہندی گھلتی اور اس کے ہاتھوں پر بیل بوٹے بنائے جاتے مگر شمن کے مہندی لگانے کے خیال کو اس قدر فضول اور حقیر سمجھا جاتا کہ وہ خود لگوانے سے انکار کر دیتی۔

"بری لگتی ہے ہمیں کیچڑ جیسی مہندی"۔ وہ نفرت سے کہتی۔

"واہ بھئی جب ہاتھ دھو ڈالو تو کیسے پیارے لگتے ہیں"۔ نوری اپنے لال ہاتھوں کو دیکھ کر کہتی۔

"ہونہہ، گنواریوں جیسے لال ہاتھ، جیسے پان کی پیک لتھیڑ دی ہو، ہی ہمارے تو میموں جیسے صفا ہاتھ"۔ گو وہ خوب جانتی تھی کہ میموں کے ہاتھ قطعی اتنے گندے اور کالے نہیں ہوتے، لیکن جب وہ ایسی باتیں کرتی تو بیچاری نوری کی مہندی کا مزہ بھی کرکرا ہو جاتا اور یوں اس کا جی کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔

کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دوپٹہ نہیں اوڑھتی تھی تو اس نے بالکل سنیاس ہی لے لیا تھا، اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں کہ وہ کھل اٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دلہن کا سہاگ جوڑا بھی ماند پڑ جاتا، سفید

کریپ، یا شفتان کا دوپٹہ جس پر بیچاری بیوہ نازک سی بمبئی کی بیل چپکا لیتی، سفید چکن کارگے کا کرتا، سارا گلا مہین مہین بیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے ...... پھندنے ــــ ہاں پجامے پر رنڈاپا اتارنے کی ضرورت نہیں، سبز کاہی یا آسمانی پوت کا جھول دار پجامہ، ہاتھوں میں وہی رنڈاپا اتارتے وقت جو ماموں نے دو دو نازک سی بانکیں ڈال دی تھیں۔ پڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرد کی انگشتری اور بس۔

ہاں سنبھلی بوا اگر کبھی زبردستی آویزے پہنا دیتی تو خیر ورنہ وہی اپنی موتیوں کی لونگیں پڑی رہتیں، سیاہ گرگابی اور سفید پھول دار موزے، ریشمی ہوئے تو ریشمی ورنہ سوتی ہی سہی، مانگ کی تو بیچاری کو اجازت نہ تھی، ویسے کون روکتا تھا۔ پر اس کا اپنا ہی دل مردہ ہو گیا تھا، اس لیے بال اوپر چڑھا کر پھولے پھولے گچھے کانوں پر چھوڑ دیتی بس اتنے نیچے کہ کانوں کی لوئیں جھانکتی رہیں روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئی تھیں۔ اس لئے کہیں آتے جاتے وقت سنہری زنجیر والی عینک لگا لیتی تھیں۔

پر جب بڑی آپا رنڈاپے میں یوں سج دھج کر نکلتی تو لوگ دانتوں تلے انگلی دبا لیتے۔ "ارے وہ تو سادے کپڑوں میں پھوٹی نکلی ہے"۔ ایک دفعہ بوا سنبھلی کا پیغام لائیں تو بیویاں بڑی آپا کو دیکھ کر اس پہ پھیل پڑیں۔

"اماں نے کہا لو اور سنو، وہ نگوڑی تو بیوہ ہے"! بڑی آپا فخریہ اس غلط فہمی کا ذکر کیا کرتی کہ لوگ اس دو بچوں کی ماں کو کنواری سمجھ لیتے تھے اس کا منہ تھا بھی تو کچا کچا کنواریوں جیسا۔ اماں

جونہی کوئی آپا کے دولہا کا ذکر کرتا اماں ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتیں اور الٹی سیدھی مرنے والے کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔ اماں

"زبان تو نگوڑے کے تھی ہی نہیں، اور سینہ پہ جوڑا، منہ پہ طباق سا"۔ اماں سدا کی گپن تھیں۔ اور ہمیشہ بات میں کچھ پھندنے لگا دیتیں۔ دو انگل

کی چیز کو گز بھر کی بنا دینا تو ان کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔

"فلانی — جیسے الٹا توا — امی جیسے میدہ شہاب"! حالانکہ نہ فلانی بیچاری الٹے توے جیسی اور نہ امی میدہ شہاب، مگر پھر بھی لوگ ان کی باتوں کا یقین کر لیتے تھے اور وہ شریف بزرگوں میں گنی جاتی تھیں۔

کپڑوں کے معاملے میں تو اماں نے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا۔

"یہ تین روپے گز ہے، دلّی سے منگایا ہے" حالانکہ سب جانتے تھے کہ کٹ پیس بیچنے والی چندھی بڑھیا چار روپے سیر کے حساب سے دے گئی ہوگی۔ اماں کا ایک جھوٹ ہوتا تو بتایا جاتا۔

بڑی آپا تو خیر میاں کے فراق میں گھل گھل کر بدمزاج ہو گئی تھی۔ مگر یہ نوری اور منور کون سا رنڈاپا ٹوٹا تھا جو وہ چنگیز دوراں بن کے سینوں پر کھڑے مونگ دلتے تھے جس کی چیز جب جی چاہتا مچل کر مانگ لیتے اور وہ مل جاتی، بات یہ تھی ان کا باپ جو مر گیا تھا، پر یہ مردہ باپ سو بلیوں پر بھاری تھا۔ سارا گھر بلکہ سارا کنبہ مرنے والے کے بھوت سے لرزتا تھا، اوہ کبھی تو شمن بلبلا کر دعا مانگتی کہ کاش وہ بھی بیوہ ہو جائے یا کم از کم ماں باپ ہی مر جائیں، پھر ذرا وہ خبر لے لوگوں کی۔

بڑی آپا ماں باپ کی عزت سمیٹے بیٹھی جیسے سارے گھر کی جان پر احسان کر رہی تھی، نفس کو مار کر اس میں حکومت کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی یوں وہ باپ کی عزت کی خاطر اپنی نسوانیت کا خون کر رہی تھی۔ مگر شمن ذرا بھی اس کی احسان مند نہ تھی۔ بشوق سے وہ کوٹھے پر جا بیٹھتی تو شمن کو پروا نہ ہوتی۔ اس کی بلا سے اور پھر بڑی آپا کے بچوں سے زیادہ خوش نصیب شاید ہی کوئی ہوگا۔

—— آہ —— بیوہ اور یتیم!

۸

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آتی تھی طوفان کی طرح آتی، یکایک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ لیا، سبھی تو اس کے پیچھے "پڑھو" کا ڈنڈا لے کر پل پڑے، بڑی آپا تو پڑھائی کم نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل و حقیر زیادہ کرتیں، مولوی اور ماسٹر بھی آ کر اپنے دانت اس پر تیز کرتے۔

"پل پڑ جا"

"کیوں؟" وہ معلوم کرنا چاہتی

"یہ اس کا دیور ہے" ہوا کرے۔ شمن کو کیا۔ اس کا دیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی اسے کسی کے دیور سے کیا ناتا جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

"دس تک گن" بس اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا، ایک ہتھوڑی لے کر کھٹاک کھٹاک ماسٹر صاحب کی کھوپڑی پر سو تک گن دے —— اور پھر پانچ چھکے تیس۔ یہ لیجیے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سولہ کیوں نہیں؟ —— پھر جوڑنا، گھٹانا، ضرب، تقسیم، کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا خون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دل چسپی لینے لگتی۔ مگر دل چسپی نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ عموماً تو وہ کسی کا سوال آنکھ ٹیڑھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی۔ مگر بعض وقت ماسٹر صاحب کچھ تاڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پڑ جاتے اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا گھبرا کر ہتھیلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ کو

تھوپنے لگتی۔ ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر جھلّا کر پیٹ میں درد یا اور کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی۔ لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھومنتر ہو جاتی ایک نوکر کے لڑکے کا نام لوّا تھا جو دق کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے کلیجے پر ماتم کیا کرتا تھا۔ بس عبارتی سوال تو اس کی جان کو لوّا بن کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو جھنجھوڑیاں دیتے۔

کم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم۔

مگر یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں فرق کتنا ہے۔

"ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟"

اوّل تو سرے سے یہ گلچھرے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھر گاڑی نارنگیاں خریدے گا۔ سڑ نہیں جائیں گی ساری کی ساری .... پچھلی گرمیوں میں آگرے والی خالہ نے دو ٹوکرے خربوزے بھیجے، سارے سڑ سڑ کر ہی تو پھکے۔ مگر فوراً ہی اُسے آگرے والی خالہ کا چھدری باڈاڑھی والا میاں یاد آجاتا۔ جس کی تیمم کی مٹی کی اس نے اور لوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اس نے خربوزے بھیجنے بند کر دیے۔ اچھے ہوتے تھے بچارے خربوزے، بیج زمین پر لیس لیس کر چھلنیوں میں دھوئے جاتے تھے اور پھر ....

تڑ سے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھسلتی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سلیٹ کی نوک جو تاک میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی اس کی ناک میں آلگتی۔

"سُن — اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو تو کتنی نارنگیاں خریدے گی"

اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل

ہوئی تھی جو کھٹی جو نا نارنگیاں لیتی۔ اور کیا، سچ تو ہے، بھلا پیسے کی دو والی نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی۔ ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے۔ خواہ مخواہ کھٹی نارنگیاں خریدوائے دیتے تھے، پیسے ملتے تو کبھی کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پستے لگی گزک خریدے گی اور چکھنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔

"ارے بول ــــ کتنی نارنگیاں آئیں گی؟"

"نارنگیاں؟ .... آں ــ وہ" ابھی وہ فیصلہ بھی نہ کر چکی تھی کہ نارنگیاں لے ہی ڈالے یا گزک کے لیے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے۔

"کوڑھ مغز کہیں کی ــــ ارے ہاں نارنگیاں ــــ ایک پیسے کی دو تو ڈیڑھ روپے کی؟"

"ڈیڑھ؟ ــــ ڈیڑھ روپے کی! ذرا سوچیے"۔

"ہاں ڈیڑھ روپے کی، روپے کے آنے بنانے آتے ہیں؟"

ماسٹر صاحب کے سامنے "نہیں" میں سر ہلانے کی اجازت نہ تھی۔ لہٰذا "ہاں" "تو پھر بتا"

اور وہ آنے بنانے شروع کر دیتی ــــ کافی تو ہوں گے ڈیڑھ روپے کے آنے۔ خاصے ڈھیر سے، اور کیا! ــــ ~~جیب پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے~~ تو واسکٹ کی جیب لٹک گئی تھی، اماں نے نہ جانے کس کام کے واسطے تین آنے قرض مانگے تھے تو اس کی جان نکل گئی تھی، اماں تھیں بھی ہمیشہ کی ہوئی نادہند۔ جہاں کسی کے پاس چار پیسے دیکھے اور ان پر غریبی چھائی۔ پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ کون تھا جو تقاضا کر سکتا۔

"اری بول ڈیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟"

"ڈیڑھ روپے کے پیسے؟"

"ہاں کم بخت"

"سولہ" وہ اٹھے ہوئے تھپڑ سے بچ کر کہہ دیتی۔

"سولہ، سولہ پیسے ہیں؟"! اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا، جیسے سولہ پیسے دے کر کوئی انھیں ٹھگے لے رہا تھا۔ وہ جی بھر کر مار چکنے کے بعد خود ہی پیسے بنا لیتے۔

"چھیانوے منحوس، اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں، وہ پیسے نوائی کا چانٹا وصول کر لیتے۔

"ہاں"

"اب تو بازار جاتی ہے"!

"ہاں" گو اُسے یقین تھا کہ کوئی اسے بازار نہ جانے دے گا۔ اور نہ ہی اتنی کٹائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی۔ دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے ہیں اسے اُلّو بنانے کے لیے مگر اُسے فرض کرنا ہی پڑتا۔ کیونکہ فضا میں چانٹا منڈلاتا نظر آتا۔

"اب تو وہاں ایک پیسے کی دو کے حساب سے نارنگیاں خریدتی ہے" چر! پھر وہی کھٹی نارنگیاں! خیر وہ مجبوراً خریدتی۔

"کتنی ہوئیں؟"

"ایں؟" وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا ہی دے گی

"نارنگیاں"؟

"ارے بتا؟ کتنی ہوئیں تین نارنگیوں کے حساب سے؟" بولائے ماسٹر صاحب "تین؟" وہ ہچکچا کر سوچتی۔ "تین نارنگیاں، ہاں" وہ وثوق سے کہتی

"تین! ڈیڑھ روپے کی تین نارنگیاں؟"

"نہیں ــــ نہیں" وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے وار کہنیوں پر روکتی

"تو پھر ــــ بتا بتا ــــ فوراً"

اسی طرح شام ہو جاتی، ماسٹر صاحب پسینے میں ڈوب کر نڈھال ہو جاتے

جیسے کسی نے گھن چکر میں باندھ کر گھما ڈالا ہو۔ ان کے اعضا بے قابو ہو کر الٹے سیدھے ہلنے لگتے۔ معلوم ہوتا اتنی دیر وہ بچوں کو پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھ رہے تھے۔ پست ہو کر وہ دوسرے دن نارنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے۔

جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج ــــ جہلم، چناب، راوی ــــ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا جیسے تسبیح کے گول گول دانے جہلم جہلم کے بعد چناب ــــ گول دائرے میں ایک دوسرے کے کرتے کا پچھلا دامن پکڑے جیسے بچے ریل، ریل کھیلتے ہیں۔ جہلم، پھر چناب، پھر اس کے پیچھے راوی چلی جا رہی ہے۔ پھر ــــ

"یاد ہو گیا"؟ ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوتے

"جی، جہلم، چناب ......

"ٹھیک سے بیٹھ بے منّو کے بچے" ہاں آگے۔

"جہلم، چناب، را ــــ"

"نہیں مانے گا رے اچھو ــــ اے، کیا ہوئی تیری سلیٹ۔ نکال۔ بستے میں کیا انڈے دے رہی ہے"!

ماسٹر صاحب نہایت چابکدستی سے چوکھے چانٹے بانٹتے جاتے۔ کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے۔

"ہاں ہاں جہلم کہاں سے نکلتا ہے ــــ نکال پنسل ــــ ہاں ــــ ارے بول تو کیوں چپکی بیٹھی ہے؟"

"جہلم ــــ ام" وہ بھولنے لگی۔

"ارے آگے بھی تو بڑھ، ایک جگہ کیوں مر کے رہ گئی ــ ہاں بتا"

"چناب" قریب قریب بالکل بھول کر وہ ہانکتی

"ہاں، ہاں، ! کہاں سے نکلتا ہے؟ دیکھ رہا ہوں منّو بدذات

—— ارے ہاں بتا" ایسا معلوم ہوتا ماسٹر صاحب مچھلی مچھلی کھیل رہے ہیں اِدھر اُدھر وہ چاروں طرف بھونک بھونک کر پڑھاتے اور کسی کو بھی نہ پڑھا پاتے۔

"بول مردار کہاں بہتی ہے؟"

"جی زمین پر"

"ایں زمین پر" ماسٹر صاحب برا مان جاتے۔ گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے ان کی ہتک کر ڈالی، پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

"مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے اور کون سے خطّے کو سیراب کرتا ہے"

"جی خطّے؟"

"ارے ہاں، نہیں تو کیا تیرے سر کو سیراب کرے گا"

"جی سیراب تو ......" وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

"ہاں، نہیں یاد —— اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں، —— اسی خطّے میں"

"خطّے میں تو —— دریا بہتے ہیں"۔

"نام بتا سب دریاؤں کے، چناب اور؟"

"جی چناب؟"

"ارے بھئی ہاں، منحوس اور؟"

"اور ...... ر، ام ...... آں اور چناب" وہ دماغ کو خوب بھینچ کر زور لگاتی۔ "پھر بھول گئی دریاؤں کے نام۔ ایں؟"۔

"جی، وہ جمنا، گوداوری، کرشنا، وہ جلدی جلدی بتاتی جاتی اور کہنی کی تکون بنا کر سر پہ کھڑی کر لیتی۔ مگر ماسٹر صاحب پر تو جنون سوار ہو چکا ہوتا، اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی، کتنی کوڑھ مغز تھی وہ، ماسٹر صاحب سچ کہتے تھے اس کے دماغ میں بھوسا بھرا تھا۔ کاش اس کے جسم میں بھی کوئی اس قسم کا مادہ

ٹھسا ہوتا جو مار سے ایسی ٹیسیں تو نہ اٹھتیں۔ اس نے کتنے کتنے قلم کے خول میں سے نکلے ہوئے لہریئے دار تنکے کھائے۔ بدمزہ اور پھیکے مگر دماغ ویسا ہی کند رہا اور ماسٹر صاحب تو کہہ چکے تھے کہ وہ بالکل نہیں پڑھ سکتی۔ بھیجا ہے ہی نہیں سر میں، اور یہ تو وہی چناب تھا، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج والا چناب خدا غارت کرے اسے یاد ہی نہ آیا پھر اس کے دماغ میں گول گول تسبیح کے دانوں کی طرح جہلم، چناب، راوی چکروں میں رقص کرنے لگے ۔۔۔ مگر ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں، دریا بہتے ہیں، اچھا تو بہتے ہیں! مگر یہ کم بخت کہاں الٹے سیدھے بہا کرتے ہیں؟ کاش وہ گھر کے پاس آکر ہی بہے ہوتے تو یوں اس کی زندگی میں کٹھن بند نہ بندھ جاتے ان کم بخت دریاؤں سے تو ہزار گنا اچھا وہ نالا تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ روپہلی سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا، اس کے کنارے بالکل مکھی کے برابر مینڈکیاں گھاس میں پھدکا کرتی تھیں اور جب کاغذ کی ناؤیں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی وہ تالیاں بجاتی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے چکر پھیریاں دیتی تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔ اس نالے میں کبھی کبھی کہیں سے مچھلیاں بھی بہہ آتیں تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آن ڈٹتے۔ بڑا مزہ آتا ۔۔۔

مگر جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج انھیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

نوری

۔ نوری تھی تو بڑی آپا کی لڑکی۔ سانپ کا بچہ سپنولیا۔ شمن نے اس سے

دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری۔ باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ نبھتی، اس لیے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے، مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی، سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گڑیاں چیر ڈالا کرتے تھے، اور نوری کے پاس تو گڑیاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کیا کرتیں۔ گھنٹوں اسباب کے کمرے میں کھڑکی پر چڑھی سر جوڑے گو دڑ سے کھیلا کرتیں۔ جی گھبراتا تو گلی میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی تھیٹر کی اسٹیج تھی۔ وہ گئی چندھی بڑھیا کی نوجوان بہو ——— کھڑکی میں سے صدیق نے پکار لگائی ——— دو لڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے گالیاں دیتے گزر گئے ——— "بیر لو بیر میٹھے بیر" ——— "گردے کلیجی ——— بیل، صابن، موتی" ——— اور پھر چھجے پر بیٹھی سگھڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملاجی جن کے آتے ہی ڈر کر دونوں کھڑکی سے نیچے ڈبک جاتیں۔ دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آجاتے مگر پھر ان کے دلوں میں گدگد ہوتی۔ رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا۔ وہ ڈری ہوئی چوہیوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں، ملاجی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے، پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر انھیں غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے نہ جانے کیا کہنے لگے، پہلے تو ان کو سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں، مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں جم کر رہ گئیں۔ جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سانسیں روکے، مٹھیوں سے جنگلہ پکڑے وہ ٹکٹکی گھورا کیں۔ پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی طاقت سے جھٹکا کھا کر زخمی چڑیوں کی طرح پیچھے گریں اور اٹھ کر ایسی بے تحاشا بھاگیں جیسے ملاجی چھلانگ مار کر جنگلے میں ان کی گردنیں پکڑ ہی تو لیتے بڑی دیر تک ان کے حواس غائب رہے۔ حلق خشک اور ہاتھ پیر بے قابو۔ پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انھیں ایک دوسرے کی طرف

دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں۔

"کہو بھئی مزاج تو اچھے ہیں؟"

اس کے بعد ایک دم سے کھوکھلے قہقہے لگا کر بے دم ہونے لگیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں۔ گویا ان کے سینوں میں بڑے ہی اہم راز دفن خاموش اُدھم مچا رہے ہیں، انھوں نے آپس میں کوئی تبادلۂ خیالات نہ کیا جیسے وہ بڑی جہاں دیدہ ہیں حالانکہ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور ایسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھول بھول جاتی تھیں۔

کھانے کے وقت شمن کا جی متلانے لگا بار بار بھیانک زخم کے غار کی طرح اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پہیوں میں کسی انسان کو پستا ہوا دیکھتی تب بھی ایسی دہشت اس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے اونچائی سے بھاری پتھر پٹخ دیا ہو۔ جس کے نیچے وہ زخمی کیڑوں کی طرح دبے ہوئے تلملا رہے تھے۔

کئی دن تک وہ اس دل چسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں، جیسے وہاں وہ کوئی قتل کر کے بھاگ آئی تھیں۔ اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی، پھر دور ہی دور سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گزر جاتیں، ان کا تخیل کھڑکی سے باہر کود جاتا اور پھر وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی ہیبت کم ہو گئی اور وہ صرف ان اوقات میں بھاگ آتیں۔ جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہوتے اور گلی قبرستان کی طرح سنسان ہو جاتی پھر تو وہ اور دلیر ہو گئیں۔ اور اب یہ حال تھا کہ جان بوجھ کر ملاجی کو آتے دیکھ کر دبک جاتیں اور پھر اُچک اُچک کر جھانکا کرتیں ہر بار ان کے جی متلاتے سوکھی سوکھی قے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہو جاتیں مجروح دماغ ہل ہل جاتے۔

نوری کی گڑیا شمن کا گڈا بلا ناغہ بیاہے جاتے اور پرانے جوتے کے ڈبے کی

پالکی میں دُلہن بٹھائی جاتی۔ موتیوں کے کنگن سے آراستہ ہاتھ سے دُلہن سب کو سلام کرتی اور مسہری پر سو جاتی، پھر گڈا دونوں ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور کرسی پر کھڑا ہو جاتا ــــ کھیل ختم!

پڑوس میں صدیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈیر پر سے گھما گھمی دیکھنے کے انھوں نے بہت سی رسمیں سیکھ لیں، دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا اور دولہا نے اس کا منہ دیکھا۔

"بیوی میں تیرا غلام ــــ منہ کھولو"۔ کھسیائے دولہا کو کہنا پڑا تھا۔ اور پھر کھیر چٹائی گئی تھی دولہا نے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے مہندی لگے شرمائے ہوئے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے جیسے کسی نے ان کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں، دولہا دُلہن کی ہر پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چہک چہک کر قہقہے لگاتی تھیں۔ شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور نوری تو بضد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھری میں دُلہن دُلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھیں، گویا وہ کوئی میٹھا سا لڈو تھا جسے چکھ چکھ کر چٹخارے بھر رہی تھیں، پھر رات کو خوب دولہا کو کھسیانا کیا گیا۔ جس میں چند نوجوان شوقین بیویاں حصّہ لے رہی تھیں اور کنواری لڑکیوں کو ڈانٹ کر بھگایا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ دروازوں کی درزوں اور روشن دانوں پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں جب کہ ان کے بچّے اور خاوند گھروں میں پڑے واویلا مچا رہے تھے۔

گڈے گڑیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی، نکاح کے چھواروں کے بجائے مُرمُرے اچھالے گئے اور دولہا نے دُلہن کی ہتھیلی پر سے کھیر چاٹی۔ نوری اندھی نے سارا گڑیا کا دوپٹہ کھیر میں لپیٹ دیا۔ اس پے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر پٹخ دیا، جس پر نوری اور وہ خوب گتھم گتھا ہوئیں۔ اور ایک دوسرے کے بال بھر بھر بکٹے نوچ پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہوگئی تھی، گھوڑے کا سا منہ، اس لیے جب نئی گڑیا بڑی آپا نے بنا کر دی تو انھوں نے اس کی ناک ڈورے کے بجائے کپڑے کی بنوائی اور چٹیا بھی کالا موزہ ادھیڑ کر لگائی۔ لمبا سا موباف ڈالا، پھر بھی انھیں اطمینان نہ ہوا تو ہاتھوں میں ڈورے کی انگلیاں لگوا لیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انھوں نے نہایت ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روئی کی دو گولیاں رکھ دیں مگر اس سے انھیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ مہین کریپ کا دوپٹہ اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈورے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جیتی جاگتی عورت لگنے لگی۔ توبہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگا۔ اور وہ دن بھر اس کا بیاہ کرتی رہیں۔ لیکن ایک دن گودڑ کی تلاش میں جو بڑی آپا نے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری پکڑی گئی، اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انھوں نے ایک سرے سے گڑیا کی صدری ہی چھین لی اور کرتے میں کمر پر ٹانکے لگا دیئے۔ اس دن سے ان کا جی گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہو گیا وہ انھیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آنے لگا۔ جن کی ناک کی جگہ تکونی کلی لگی تھی اور انگلیوں کی جگہ ڈورے لٹک رہے تھے۔

۱۰

اماں دشمن سے عاجز تھیں، سارے دن بھائیوں کو کوسنا پیٹنا، نوکروں سے لڑنا۔ ان کے کام کاج میں حارج ہونا، بھاوجوں کی زندگی اجیرن اور بھتیجوں کے لیے قہر کا سامان۔ ماسٹر صاحب نے توبہ کرلی اور قرآن پڑھانے والی ملانی جی نے کان اینٹھ لیے کہ "توبہ، نوج کسی کی اولاد یوں ہاتھ سے نکل جائے"۔

اور سب سے زیادہ تو وہ نوری کو خراب کیے دیتی تھی وہی ہوا جس کا بڑی آپا کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ شمّن نے نوری کو کوڑی کام کا نہ رکھا اور وہ روز بروز گئی گزری ہوتی جاتی تھی۔ اس وقت اسے مرنے والا اور بھی یاد آرہا تھا۔ کیونکہ ایک تو نوری ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی، دوسرے اس کی اپنی صحت رفتہ رفتہ گر رہی تھی کھانا تو کسی دن ہی ہضم ہوتا ہوگا۔ اور نیند تو اس کے حصے کی اللہ میاں کے یہاں ختم ہی ہوگئی تھی۔ اس کا ایک رشتہ کا دیور حال ہی میں ڈاکٹری پاس کر کے آیا تھا۔ وہی بے چارا بھابی جان میں جان ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے دوروں کا علاج دنیا جہان کے ڈاکٹر حکیم ہار گئے نہ ہوسکا۔ اگر تھوڑا بہت کیا تو رشید ہی نے کیا۔

ویسے دوروں کا کیا ٹھیک، کہہ سن کر تھوڑی پڑتے ہیں، بس اتنا اتفاق یا خدا کی مہربانی کہو کہ دورے کے وقت رشید کہیں آس پاس ضرور ہی مل جاتا ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ ہزاروں دوائیں پی ڈالیں مگر دوروں سے پیچھا نہ چھوٹا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ سنجھلی کے مہاسوں کا علاج کردے۔ مگر وہ ٹال ہی گیا آخر کو بچاری سنجھو کی شادی ایک وکیل صاحب سے ہو ہی گئی تھی۔ سنجھو بچاری ان جانوں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں۔ شریفوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں۔ پھر کوئی اللہ کا نیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کیے۔ پالے پوسے، پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کرلی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "واہ کیا جنتی بیوی تھی۔"

پر سنجھو ابھی مری نہیں تھی۔ اس کی تو اب زندگی شروع ہو رہی تھی۔ ادھر وہ بیاہ کر گئی، اور اُدھر بڑی کو دوروں نے آدبوچا اور اس بری طرح کہ توبہ بھلی، طبیعت نڈھال اور جی کچھ کھویا کھویا سا رہتا۔ دل بہلانے کو اس نے ہارمونیم بھی سیکھنا شروع کیا۔ "ابن مریم ہوا کرے کوئی" گھنٹوں بے تال سُر ہارمونیم کی پیں پیں کے ساتھ چلتا مگر دل اور بھی بے قابو ہوگیا۔ رشید آکر گھنٹوں

بیٹھتا۔ اسے مرض کے متعلق ہدایتیں دیتا۔ کبھی ایک آدھ سوئی بھی اس کے بازو میں لگا دیتا۔ بازو میں سوئی لگاتے وقت اس کے بڑی گدگدی ہوتی اور وہ لوٹ پوٹ ہو جاتی پر دو چار دن کو دورے تھم جاتے۔

مگر بڑے بھیا کو رشید سے خواہ مخواہ کا بیر پڑ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ ان کی دلہن جو سدا کی بھلانے باز تھی پیچش کا نسخہ لکھوانے کا تقاضا کیے جاتی تھی اور رشید بچارا بھول بھول جاتا تھا۔ پر ان کا کہنا تھا وہ جان بوجھ کر، کسی کے بہکانے کی وجہ سے ٹال مٹول کرتا تھا۔ اور بڑی آپا اپنے دونوں بچوں کی قسم کھا کر کہتی تھی کہ بڑے بھیا کا نوکر ہی ایسا مکر رہا تھا کہ نسخہ لکھنے کو رشید میاں نے کئی دفعہ کاغذ مانگا سنی ان سنی کر گیا۔

"وہ بچارے تو سبھی کو بھگتنے کو تیار ہیں"۔ وہ کہتی، پھر بھیا نے جو شکایت کی تو بڑی آپا بگڑ کھڑی ہوئی کہ "وہ کسی کے نوکر نہیں ہیں، میری وجہ سے آ جاتے ہیں تو سارے گھر کو مرض اٹھ کھڑے ہوتے ہیں"۔

اور بات بھی سچ تھی، بڑی کی سسرال والوں پر اسی کا حق تھا۔ میاں مر گیا تھا تو کیا تھا اس کا کنبہ تو موجود تھا۔ وہ آج چلی جاتی تو کون اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ یہ تو اس کا ہی جی تھا جیسے مارے بیٹھی تھی۔

کہتے ہیں بڑے بھیا کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ ان بچارے کے دل میں کہاں سے بیٹھتی۔ یہ ان کی لاڈلی بیگم ہی کے کرتوت تھے۔ سو بس وہ پیچھے لگ گئے جہاں رشید آیا وہ آن بیٹھتے اور وہ بچارا جلدی سے چلا جاتا۔ ارے کہیں یوں لشتم پشتم بھی دورے ٹھیک ہوئے ہیں۔

غضب تو جب ہوا جب انھوں نے اس کے خط پکڑ لیے اور صاف بڑی سے کہلوا دیا کہ اگر یہ پتے بازی بند نہ ہوئی تو ابا جان تک نوبت پہونچ جائے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو نکاح کر لو شرافت سے۔ بڑی آپا کی ساس کے کان میں بھی بھنک پہونچی اور بڑھیا صلواتیں سناتی دہائی دیتی چڑھ دوڑی۔ وہ لے دے مچی کہ رشید

روزمرہ کا استعمال

بچارے کا آنا بند۔ اس دن سے دور سے بھی پھیکے پڑ گئے۔ کس کے بوتے پر پڑتے۔
مگر بڑی کا منصہ تین تا ڈکھا گیا۔ اور بس تو اسے تو پھر اپنے بچوں کی مامتا نے بے چین
کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے نوری کی بربادی شمن کے ہاتھوں نہ دیکھی گئی۔ مجبوراً
اسے اسکول بھیج دیا گیا۔

II

شمن نے جب اسکول میں قدم رکھا تو پہلے اس نے چاروں طرف سے اطمینان
کر لیا کہ کدھر کدھر سے دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے میڈم
کو سمجھا دیا کہ مہربانی کر کے نہ تو اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرے جائیں اور نہ
اسے گھر کی یاد نہ آنے کے لیے پیار کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اس قسم کے دکھاوے
سے بخوبی واقف تھی اور مجھو کو پرکھ چکنے کے بعد اس کو یقین ہو گیا تھا کہ کسی سے محبت
کرنا یا کروانا حد سے زیادہ مکاری ہے۔ پیار سے وہ ایسی بھڑکتی جیسے نئی چڑیا
چھنگلی سے۔ وہ ان باتوں کی عادی ہی نہ رہی تھی۔ نہ جانے کتنے دنوں سے نرم اور اخلاص
بھرے الفاظ اس کے کانوں کے پاس بھی نہ پھٹکے تھے۔ ہر بات کے جواب میں گھرکی سننے
کی عادت پڑ چکی تھی۔ لہٰذا وہ کوئی کام شاباشی سننے کے لیے کرنا ہی نہ جانتی تھی
بلکہ جب تک ہر قدم پر اسے ڈانٹ نہ ملتی وہ کچھ نا امیدی سی ہو جاتی۔ //

جماعت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے ایک بے اعتباری کی نگاہ سب
چہروں پر ڈالی، اسے ان کا گھورنا اور مسکرا کر آپس میں کانا پھوسی کرنا بہت ناگوار
ہوا۔ جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہو گئیں۔ مگر وہ الوؤں کی طرح بیٹھی رہی
اس پر لڑکیوں کے قہقہے نکل گئے۔ اور وہ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کر اس

بے عنوانی پر رائے زنی کرنے لگیں۔

"کیا آپ کی پیٹھ میں درد ہے، جو آپ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا" رعب دار مس ممتاز نے کٹتے ہوئے لہجے میں معلوم کرنا چاہا۔

"ایں!؟" اس نے منہ پھاڑ دیا۔

لڑکیاں ہنسی سے لوٹ گئیں اور خفت کی وجہ سے شمن کے گال لال ہو گئے۔ مس ممتاز شروع ہی سے "قابل نفرت" لگیں وہ اس سے آپ کر کے بول رہی تھیں جس میں علاوہ انتہائی تکلف کے ذرا طنز کی چاشنی بھی موجود تھی۔ مس ممتاز نے کوئی اور بات نہیں کی۔ اس دن کیا پڑھایا گیا ~~اور کیا پڑھایا گیا~~ یہ اس کی خاک سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے میں اسے اس قدر کشمکش کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ نہ سن سکی۔

تین چار دن وہ جماعت میں خاموش بیٹھی رہی اور اب اس میں اتنی سمجھ آگئی تھی کہ سب لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی، بیٹھ جاتی، اندر باہر آتی جاتی اور حاضری کے وقت بجائے "کیا ہے؟" کے اب وہ "جی حاضر" بولنے لگی تھی۔ مگر بولنے کے بعد بڑی دیر تک اس کے کان تمتمایا کرتے، کیونکہ جب پہلے روز اس نے حاضری دی تھی تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے پتلا حال ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ مس ممتاز کے رعب دار چہرے پر بھی دیر تک مسکراہٹ منڈلاتی رہی تھی۔

ہفتے بھر بعد اسے نیچی جماعت میں اتار دیا گیا۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر لڑکیوں نے اس معاملہ کو سانحہ بنا دیا۔ جدھر وہ جاتی اشارے ہونے لگتے۔ لڑکیاں اس کی بے وقوفی کے چرچے کر کے ٹھٹھے لگاتیں اور اب ہر ایک زبان پر یہ تھا کہ وہ اتار دی گئی۔ مس ممتاز نے رپورٹ دی کہ وہ بہت کمزور ہے اور اس درجے میں کام نہیں چلا سکتی۔

اس نئی چھوٹی جماعت میں چھوٹی لڑکیوں کے درمیان وہ ان سب کی اماں معلوم ہوتی۔ کیونکہ یہ لڑکیاں ذرا اس سے ڈرتی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے

معلوم ہوگیا کہ وہ ان سب سے عقل، عمر، اور علم میں بہت آگے ہے اس کو سبق وغیرہ کچھ یاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے تیزی سے لڑکیوں پر رعب گانٹھ لیا۔ دو مہینے بعد جب وہ گھر واپس گئی تو پہلے سے چوگنی بدزبان، خودسر اور ڈھیٹ ہو گئی تھی۔ اب اسے مار لینا بھی آسان نہ تھا۔ وہ نہایت گستاخ نگاہوں سے گھور کر تڑسے جواب دے دیتی۔ اس کے علاوہ اسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی مہارت ہو گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانے میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چرا کر بغل میں دبا لیتی کہ خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور منہ میں لقمہ لے کر وہ گن گناتی ہوئی نکل چلی جاتی تاکہ ہر کوئی سمجھے اس کا منہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال تک نہ آتا چوری کی چیز وہ نہایت تن دہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈھتی۔ یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔ لڑکیوں سے اس نے اور بھی غلیظ غلیظ باتیں سیکھ لی تھیں جو وہ نہایت فخر سے نوری کو سکھاتی۔

پھر جو وہ اسکول آئی تو اسے ایک نئی ٹیچر سے پالا پڑا۔ یہ ٹیچر بہت کم عمر سی معلوم ہوتی تھیں۔ لہٰذا آتے ہی اس نے انھیں دق کرنا شروع کیا۔ کچھ دن اس کی شرارت بھری جنگ جاری رہی۔ لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ ہار رہی ہے انھوں نے اس کی شرارتوں پر کونے میں یا بنچ پر کھڑا کر دینے کے بجائے بالکل توجہ نہ دی اور جیسے ہر بات کو ٹال جاتیں کونے میں کھڑے ہو کر تو وہ مزے سے لڑکیوں کا منہ چڑا چڑا کر ہنسایا کرتی تھی جس پر استانی جل کر اسے بینچ پر کھڑا کر دیتیں۔ بنچ پر کھڑے ہو کر وہ لڑکیوں پر بن بن کر گرتی اور خوب ہنسی پڑتی۔

مگر چند ہی دنوں میں اس نے اپنے آپ کو ہزاروں ذمہ داریوں میں جکڑا پایا۔ کلاس کی مانیٹر وہ، بورڈ وہ صاف کرے، چاک کی فکر اسے رکھنی پڑے

نقشہ ٹانگنے کی کیل مضبوط ہے کہ نہیں، لڑکیاں غل مچائیں تو اس کی مصیبت۔ اس کے علاوہ مس چرن یعنی اس نئی ٹیچر کی کتابیں اور چھتری وہ اپنے ڈیسک میں وقتاً فوقتاً رکھے اور کبھی کبھی ان کے کمرے پر امتحان کی کاپیاں پہونچانے جائے۔ کمرے میں مس چرن بالکل استانی نہیں لگتی تھیں بلکہ بڑی بے تکلفی سے اس سے کرسی پر بیٹھنے کو کہتیں۔

"اچھا بتو! چائے پیو گی یا نیبو کا شربت"۔ وہ پوچھتیں اور اسے شرم آنے لگتی۔ کبھی کسی نے اس سے ایسی عجیب باتیں نہ کی تھیں۔ تھوڑی سی دیر میں وہ دونوں سہیلیوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتیں۔ اس نے انھیں تمام گھر کے قصے سنائے۔ بڑی آپا سے وہ بڑی خفا تھی اور شانو اور ستو کی شرارتوں پر توان کے اچھو لگ لگ گئے۔ نوری انھیں کچھ کچھ پسند تھی۔

مس چرن نے اسے گھر کا کام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلانا شروع کیا شمن کو اس قدر فخر محسوس ہوتا کہ کام ختم ہو جاتا تو اسے بڑا رنج ہوتا۔ مس چرن نے اسے اسکول کے علاوہ کام دینا شروع کیا اور دوسرے امتحان پر اسے ڈبل درجہ چڑھا دیا گیا۔ خوشی تو اسے اس بات کی ہوئی کہ مس ممتاز جس درجے کو پڑھاتی تھیں وہ اس سے بھی آگے ہو گئی۔

مس چرن اب بھی اسے اپنے کمرے پر پڑھاتی رہیں اور منجھو کے بعد اسے پہلے انسان نے متاثر کر کے قابو میں کر لیا۔ اگر مس چرن کہتیں تو وہ مشکل سے مشکل کام انجام دے لیتی۔ ان کے لیے اسے کسی کو قتل کرنے میں بھی دریغ نہ ہوتا۔

اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھانے لگا۔ مس چرن کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھنچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں، اسے ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا اپنی رگ رگ میں سرایت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو

شمن جو کام کرتی ہوتی اسے گڑبڑا دیتی۔ بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی۔ اگر وہ کسی اور درجے کو کوئی کھیل کھلاتی ہوتیں تو اس کے لیے پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ رہ رہ کر ان کے قہقہے اسے سر سے پیر تک لرزا دیتے۔ سب کا خیال تھا مس چرن سیاہ فام اور بہت ہی کم رو تھیں* لیکن شمن کی آنکھیں کچھ اور ہی دیکھا کرتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مس چرن سے بھی حسین کوئی اور شے ہو سکتی ہے۔ اسے اپنے رشتہ داروں سے لگاؤ تھا، کچھ یوں ہی ساخدا سے ڈرتی تھی۔ مگر اس کے خیال میں غرق کبھی نہ ہو سکی لیکن مس چرن اس کے لیے اپنے خون اور ایمان سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ عموماً ان کی تخئیلی مورت کو عقیدت اور انتہائی جوشیلے محبت بھرے جذبات میں ڈوبی پوجا کرتی، ـــــ وہ آئیں مس چرن ـــــ وہ گئیں ـــــ وہ ان کی ساڑی ہلی اور بلاؤز چمکا ـــــ

اس کا پڑھنے میں بھی زیادہ دل نہ لگتا۔ مارے باندھے سے صرف مس چرن کی خاطر پڑھ لیتی تھی۔ گویا گھر کا کام مستعدی سے کر کے وہ مس چرن کے قدموں میں عقیدت کے پھول چڑھا دیتی تھی اور تخیل کے ساتھ اُسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بھی مس چرن کے قُرب میں رہنے لگا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو ان کے پاس محسوس کرتی ـــــ وہ کھڑی ہے، مس چرن کا خیالی ہیولی پاس سے گزر گیا ہے۔ وہ خود سو رہی ہے، مس چرن اسے تھپک رہی ہیں۔ وہ پیاسی ہے حلق چٹخا جا رہا ہے اور مس چرن اس کے منہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار عرق نچوڑ رہی ہیں۔ ان کا ہاتھ اُس کے ماتھے پر ہے، وہ برف کی بنی ہوئی ہیں اور اس احساس سے وہ بغیر نیند کے اونگھنے لگتی، وہ دیکھتی رات کو اندھیرے میں روتی ہوئی بھٹکتی پھر رہی ہے۔ ٹھنڈی گھاس پر پڑی سردی سے کانپ رہی ہے مس چرن اسے اپنے پروں بھرے پھول دار تکیے پر لٹائے ہوئے ہیں۔ وہاں وہ ڈر کے مارے مکر سادھے پڑی رہتی ہے کہ اگر ہوش میں آگئی تو سارا خواب بکھر جائے گا۔

مس چرن کا خیال اس کی جان کو مرض کی طرح لگ گیا۔ کچھ ان دنوں بورڈنگ میں آلو کھاتے کھاتے لڑکیوں کے ہاضمے بھی بگڑ چلے تھے اور شمن تو سرا الابلا ڈٹ کر کھا جاتی تھی۔ اس کی نیند بہت خراب ہو گئی تھی۔ راتوں کو اٹھ کر بڑبڑاتی اور جیسے ہی آنکھ کھلتی اسے محسوس ہوتا کہ مس چرن کھڑی ہیں اگر وہ ملی تو غائب ہو جائیں گی اندھیرے میں ان کے وجود کو گھور گھور کر وہ سونے کی کوشش کرتی۔

ایک رات کو اس نے اپنے آپ کو برآمدے میں مس چرن کے کمرے کے آگے کچھ ٹٹولتے ہوئے پایا۔ وہ ایک دم ڈر گئی۔ وہ کیسے اتنی دور تک سوتی ہوئی چلی آئی۔ جلدی جلدی کمرے میں آکر بچھونے میں دبک گئی۔ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ وہ خود تھی یا اس کا بھوت؟ جو راتوں کو لے گھسیٹے پھرتا تھا۔

دو تین دن بعد پھر اس نے مس چرن کے کمرے کے آگے خود کو ہچکیوں سے روتے ہوئے پایا۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ یہ اسے نہیں معلوم ہوا۔ اسے واپس اپنے کمرے تک آتے میں بہت ڈر لگا۔ برآمدے میں اندھیرا اور جاڑوں کی وجہ سے سب کمرے بند تھے۔ وہ ڈرپوک نہ تھی اور بلی وغیرہ سے اسے خوف نہ آتا تھا۔ مگر لوٹتے وقت وہ تیز تیز بھاگنے لگی۔ گویا بہت سی غیر مرئی چیزیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب وہ میٹرن کے کمرے کے پاس پہونچی تو ہلکی سی لالٹین جل رہی تھی۔ موڑ پر ایک بھیانک سایہ زور سے اس کے آگے جھپٹا چلا گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور آنکھیں ہیبت سے پھٹ گئیں۔

میٹرن جاگ گئی اور نکل کر اس نے آواز دی "کون ہے؟" شمن دوڑ کر اس سے چمٹ گئی میٹرن بھی بوکھلا گئی کہ یہ کیا بلا ہے۔ اور اس نے زور سے اسے پرے ڈھکیل دیا۔

"میں ہوں شمشاد شمن" اس نے جلدی جلدی زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہاں بھوت دوڑا میرے پیچھے"۔ ابھی وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔

"بھوت! کہاں ہے بھوت؟ چلو اپنے کمرے میں" میٹرن اسے کمرے کی طرف

Sleep walking

دھکیلنے لگی۔ وہ خود ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"رات کو بھی ڈنگا مچاتی ہیں" وہ بڑبڑائی اس کے کمرے میں آکر میٹرن نے بجلی جلائی۔ تو وہی بھوت بالکل شمن کے پاس کھڑا تھا۔ وہ پھر چیخی "بھوت!"

"کہاں ہے! ارے یہ تو تمھاری اپنی پرچھائیں ہے۔ پگلی لڑکی!" شمن کو بہت شرم آئی اور وہ چپکے سے پلنگ پر لیٹ گئی، میٹرن بجلی بجھا کر بڑبڑاتی چلی گئی۔ مگر اسے بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کا دل برابر دھڑک رہا تھا۔ اور تمام جسم تنا ہوا تھا۔

اس نے رات کی بات کسی سے نہ کہی۔ توبہ! اگر مس چرن کو معلوم ہو جاتا کہ وہ رات کو بھوت بن کر ان کے دروازے پر رویا کرتی ہے تو وہ ضرور اس سے نفرت کرنے لگتیں۔ وہ تو انھیں اتنا بھی نہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے دماغ پر اس بری طرح چھائی ہوئی ہیں۔ مگر یہ بات اور دلوں سے زیادہ دن نہ چھپی رہی اور پرنسپل صاحبہ نے ایک دن مس چرن سے کہہ دیا کہ وہ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو خراب کر رہی ہیں۔ بات یہ تھی کہ مس ممتاز ان کی چھوٹی بہن تھیں اور جب سے مس چرن آئی تھیں، ان کی قیمت بہت گر گئی تھی۔ علاوہ شمن جیسی مرنے والی لڑکیوں کے اور قریب قریب ساری لڑکیاں انھیں پسند کرتی تھیں۔

مس ممتاز بیڈمنٹن کھلاتی تھیں اور مس چرن باسکٹ بال زیادہ تر لڑکیوں کو باسکٹ بال پسند تھی اور مس ممتاز کا کہنا تھا کہ مس چرن لڑکیوں سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو کر ٹیچروں کا رعب کم کیے دیتی تھیں۔ انھیں کے بہکانے سے لڑکیاں بیڈمنٹن کے بجائے باسکٹ بال کھیلنے لگی تھیں۔ یہ مس ممتاز کی ہتک تھی اور ساتھ ساتھ ان کی بہن پرنسپل کی۔ شمن کو بیڈمنٹن سے نفرت تھی کیونکہ مس ممتاز ان لڑکیوں کو بہت ذلیل کرتی تھیں جو ذرا کمزور تھیں۔ انھوں نے ٹیم بنائی تھی۔ سب سے اچھی کھیلنے والی لڑکیاں ایک طرف، اور پھر سب سے برا کھیلنے والی جن میں شمن بھی تھی۔ دوسری طرف۔ روز اچھی کھیلنے والی لڑکیاں

جیتتیں اور یہ ہارتیں۔ لہٰذا اس ذلت سے بچنے کے لیے جس دن بیڈمنٹن کی باری ہوتی شمن درد سر یا اور کوئی بہانہ کر کے مس چرن کو کھلاتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ ان کی ہر حرکت کا عکس وہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ کر لینا چاہتی۔ یوں انھوں نے گیند اچھالی۔ یوں اپنے پتلے سے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے جنبش دی ـــ وہ گئی گیند۔ ـــ لڑکیاں کہتی تھیں کہ ان کے ہاتھ سوکھے اور کالے ہیں۔ مگر شمن کو وہ سنگ مرمر کے سے نظر آتے تھے۔

راتوں کو وہ اب بھی برآمدوں میں سسکیاں بھرتی بھٹکا کرتی تھی۔ ایک دفعہ جو رات کو آنکھ کھلی تو ہکا بکا رہ گئی۔ پرنسپل ٹارچ لیے مس چرن کے کمرے میں لمبا سا چوغہ پہنے کھڑی تھیں۔ اور مس چرن پریشان شمن کو سیدھا بٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ پھر ایک دم سے وہ چپ ہو گئی اور منہ پھاڑے مس چرن کو تکتی رہی۔ وہ مس چرن کے پلنگ پر بیٹھی تھی! سچ مچ کا پلنگ! وہ خواب والا وہم نہیں بلکہ سبز پھول کڑھا ہوا تکیہ، بھورا کمبل جس میں کشمشی گوٹ لگی تھی۔

اسے گھسیٹ کر اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح پرنسپل نے اس سے بہت سے سوال کیے۔ مگر اس نے منہ پھلا لیا اور کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے اتنی بہت سی باتیں بتا دیتی جو وہ سوچا، دیکھا اور محسوس کیا کرتی تھی۔

تیسرے دن مس چرن اسکول چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ کسی لڑکی سے ملنے بھی نہ آئیں بس ایک دم چوکیدار ان کا سامان لے گیا۔ اور اس کے بعد وہ پرس ہاتھ میں لیے نکلیں۔ اور سیدھی پھاٹک سے باہر چلی گئیں۔ اسکول میں کھلبلی پڑ گئی۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگیں۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بس اتنا پتہ چلا کہ کچھ شمن پر بات اٹھی تھی۔ جس پر پرنسپل اور مس چرن میں کھٹ پٹ ہو گئی۔ لڑکیوں نے شمن کو چاروں طرف سے گھیر کر سوالوں کی بارش کر دی، مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ جب مس چرن

کے جانے کی خبر پکّی ہوگئی تو ان کی ساری چاہنے والیوں نے رونا شروع کیا، اس پر پرنسپل صاحبہ اور مس ممتاز نے آکر سب کو خوب ڈانٹا لڑکیاں بڑبڑا کر چپ ہوگئیں۔

مگر شمن نے ایک آنسو بھی نہ بہایا وہ خاموش چور بنی سب سے الگ الگ پھرتی رہی۔ مگر سارے وقت تول تول کر قدم رکھتی تھی جیسے کوئی چٹخی ہوئی چیز اٹھائے پھر رہی ہے جس میں ٹھیس لگ گئی تو چکنا چور ہو کر بکھر جائے گی۔

مس چرن کے جانے کے بعد وہ بہت سخت دل ہوگئی۔ اسے اتنا تو تجربہ ہوگیا کہ انھوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ قصور خود اس میں ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ اور یہ ماننے کے لیے وہ قطعی تیار تھی۔ اسے اپنے دماغ کے اس حصّے سے سخت نفرت تھی جو ہمیشہ سارا الزام اسی پر تھوپ دیا کرتا تھا، اس نے مس چرن کے متعلق سوچنا بہت کم کر دیا، ان کا خیال اس کے دماغ میں چھپے ہوئے زخم پر ٹھوکے لگاتا جس سے اُسے روحانی اذیت ہوتی۔

وہ اس سال فیل ہوگئی۔ لہٰذا اسے مقامی مشن اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ یہاں نوری بھی اس کے ساتھ جاتی، مشن میں مس چرن سے بھی زیادہ سیاہ فام ٹیچر تھیں۔ مگر شمن کو ان میں سے ایک بھی پسند نہ آئی۔ نوری بڑی تیز تھی اور بڑی آپا بھی اُسے برابر مار مار کر پڑھاتی رہتی تھیں۔ اس لیے وہ بہت جلد اسکول میں جم گئی۔ مگر شمن سے نہ جانے لوگوں کو کہاں کا بیر تھا کہ وہ مستعدی سے کام کر کے بھی لے جاتی، تو وہ اس سے اور بہتر کام کی توقع رکھتے۔ اسے کامل یقین تھا کہ وہ کند ذہن تھی، اور یادداشت تو اس کی بہت خراب تھی، سب کہتے تھے کہ وہ بہت جلد سب بھول جایا کرتی تھی، مس چرن کو وہ آخر بھول ہی گئی اور اسے غور کرنے پر بھی ان کا ناک نقشہ لباس، ہنسی، ان کا باسکٹ بال کھلانا یاد نہ آتا۔ جب شمن ان کے کمرے میں پڑھتی تھی تو وہ ان کا ہلکے ہلکے گنگنانے جانا، ایسے کہ شمن کو بجائے خلل کے ایک طرح کی مدد سی مل جاتی تھی، فضا کو کچھ

اور چکنا اور ہموار سا کر جاتا بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ وہ کسی مشکل سوال پر اٹک گئی ہے کہ مس چرن کے گنگنانے کی چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے سوال کی گتھی سے ٹکراتیں، اور وہ ڈھیلی ہو کر کھل جاتی، مگر نہیں وہ یہ سب کچھ بھول چکی تھی۔

واہ! حسنِ بیان

دو برس اس نے مشن میں پڑھا، اُسے ایک دفعہ بڑا درجہ ملا اور دو چار انعام بھی ملے۔ مگر اس نے وہ سب لاپروائی سے پھینک دیئے، اسے کسی چیز کی قدر کرتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا، وہی زخم سا اس کے دماغ میں ٹیسیں مارنے لگتا جو مس چرن کے خیال سے دُکھا کرتا تھا۔ دو برس اس نے بائیبل پڑھی اور یسوع مسیح کی تعریف میں بہت سی نعتیں سیکھ گئی مگر اسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی کہ گرجے میں گھٹنے ٹیکنے کے لیے مونجھ کے گدّے تھے جن میں سوئیاں سی لگی تھیں جو بہت چبھتی تھیں۔

مذہب

کئی دفعہ اس کا ارادہ ہوا کہ وہ بھی چپکے سے یسوع مسیح کی بھیڑ بن جائے مگر امّاں کے ڈر کے مارے ہمت نہ پڑی، اسے یہ بات معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ یسوع خدا کے بیٹے تھے۔ مگر پھر بھی لوگوں نے ان کو چین سے نہ چھوڑا، آخر یہ دنیا اس قدر گناہ گار کیوں ہے؟ لوگ جھٹ پٹ اچھی باتیں سیکھ کر مزے سے جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے۔

مقدّس ماں کنواری تھی! یہ سوچ کر اُسے ذرا ہنسی آتی، اور وہ خود بھی تو کنواری تھی، اگر خدا نہ کرے بیٹھے بٹھائے خدا باپ اس کے یہاں بھی ایسا ہی بھولا بھالا منّا سا یسوع پیدا کر دے تو وہ کیا کرے، یقیناً امّاں تو اس کے لیے دودھ دیں گی نہیں اور کپڑے تو خیر وہ پرانے کرتوں کے بنا لے گی۔ مگر پھر اُسے یاد آتا کہ جب اس کے دھوبی کی لڑکی کے ایسا ہی منّا پیدا ہو گیا تھا تو سب نے کیسی تھڑی تھڑی کی تھی، سنتو نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ بیوہ ہے تو کیا "خدا باپ" کی قدرت میں کسی کو کیا دخل ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر وہ یہی کہتی تھی کہ "نہیں بی بی، میں نے تو پاپ کیا ہے"۔

مریم کے کنواری ہونے پر اسے ہنسی آتی

افسانہ "گیندا" کی گیندا

باپ کا معاملہ

اور باوجود گھنٹوں سوچنے کے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ پاپ ہوتا

کیا ہے اور لوگ کیوں کرتے ہیں۔ گھر آکر اس نے اماں وغیرہ کو جب یسوع کی تعریف میں نعتیں سنائیں تو انھوں نے اپنا سر پیٹ لیا اور اسے بہت ڈانٹا کہ کیا اب وہ عیسائی ہونے کا ارادہ رکھتی ہے، لہٰذا مجبوراً اسے واپس اسی پرانی درس گاہ میں بھیج دیا گیا۔ جہاں پہنچ کر مس چرن کا داغ پھر ہرا ہو گیا اور مس ممتاز سے نفرت چوگنی بڑھ گئی۔

۱۲

× اس بار اسکول کی نئی زندگی نئی بلاؤں سے شروع ہوئی جو اس پر یکایک ٹوٹ پڑیں۔ نہایت گندی، شرم ناک اور نفرت انگیز مصیبتیں، کئی دن تو وہ خود کشی کے منصوبے باندھتی رہی کیونکہ یوں رنجھ رنجھ کر مرنے سے تو ایک دفعہ زہر نگل لینا ہزار درجہ آسان تھا مگر گھر میں تو کسی قسم کا زہر دستیاب ہونا بھی تو مشکل تھا جسمانی تبدیلیوں سے تو وہ اور بھی بدحواس تھکی کی رہنے لگی تھی اور گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہایا کرتی اسے پہلی جماعت کی وہ بھیانک استانی یاد آجاتیں جو بالکل گوشت کا بے ہنگم لوتھڑا تھیں، ویسے ہاتھ پیر تو ان کے سوکھے مارے تھے مگر پیٹ اور کلیجے پر گوشت کے پلندے لدے ہوئے تھے، لڑکیاں ان کا مذاق اڑایا کرتی تھیں اور عجیب عجیب بے ہودہ لطیفے ان سے وابستہ کر دیے تھے۔ ان کی نفرت محض نفرت ہی نہ تھی بلکہ اس میں ایک طرح کا خوف اور کراہت پوشیدہ تھی۔ اصلی گھن تو شمن کو ان سے اس دن سے ہو گئی تھی جس دن وہ بھولے سے ان کے غسل خانے میں گھسی چلی گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نہاتے وقت دروازے میں کنڈی چڑھانا بھول جایا کرتی تھیں۔ ملّا جی کے بعد یہ دوسری ہستی تھی جسے دیکھ کر اس پر فالج کی سی حالت

طاری ہو گئی تھی ۔ وہ خاموش تنہائیوں میں پڑی نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی ، مستقبل بھیانک خوابوں کے نئے نئے چولے بدل کر اس کے سامنے ناچا کرتی ، کاش کوئی ایسی دوا ہوتی جسے کھا کر وہ چوہیا برابر ہو جاتی ' وہ بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی تھی ، جسم کے مختلف حصے مختلف اوقات میں بڑھ رہے تھے ۔ پہلے تو جیسے اس کی ٹانگوں کو جسم سے نفرت ہو گئی اور وہ بے طرح لمبی ہونے لگیں ' رات کو وہ محسوس کرتی اس کی ٹانگیں بڑھ رہی ہیں ، لمبی لکیروں کی طرح لہراتی ' پلنگ پر سے اتر کر دیوار پر سے رینگتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف ہو رہی ہیں ۔ وہ جلدی سے کہنی کا سہارا لے کر ٹانگوں کو دیکھتی تو وہ جھٹ سے کنکھجورے کی طرح سکڑ جاتیں گویا اس نے انھیں عین وقت پر پکڑ لیا ورنہ بھاگ ہی گئی ہوتیں ۔ وہ کنکھیوں سے لیٹ کر دیکھتی کہ اب کیا کر رہی ہیں اس کی ٹانگیں ، مگر وہ ہوشیار رسائیوں کی طرح مکر کیے پڑی رہتیں یہی نہیں اس کے جسم کا ہر حصہ غیر سا ہو چلا تھا ۔ ناک اک دم چہرے سے روٹھ کر اپنے راستے پر چلنے لگی ، اس نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک شہزادے کی ناک تین فٹ لمبی ہو گئی تھی ۔ بے چارہ شہزادہ ! کوئی اس سے بات بھی نہ کرتا اس کی چوٹی بھی کچھ عجیب بے تکی سی ہو گئی تھی ۔ جیسے چائے دانی کا کنڈا ۔ اینٹھی ہوئی چھوٹی سی دم ، جو اس کی لمبوتری گردن پر کسی طرح نہ جمتی ' ایک مرض کا علاج تو اتفاق سے اس کے ہاتھ لگ گیا ۔ اس نے اماں کی بیماری کو بھانپ لیا تھا ۔ گو اس سے چھپائی گئی تھی ۔ مگر اس کی تیز نگاہوں نے اس کی شیشی کو دیکھ لیا تھا جس نے ان کی جان بچائی تھی ۔ موقع پا کر اس نے وہ دوا چڑھا لی ۔ اثر فوری ہوا اور وہ قطعی اچھی ہو گئی ۔ بھلا اگر کبھی کو اپنا مرض بتا دیتی تو اتنی جلدی کوئی دوا تھوڑی کر دیتا ۔ اس کی تو ہر بات کو ٹالا جاتا تھا ۔ دوسرے سنجھلی بہن نے اسے ایک دفعہ اس قسم کی بات کرنے پر بہت بے شرم کہہ کر ڈانٹ دیا تھا ۔ اور غضب تو یہ تھا کمزوری اس کے تمام شرمناک رازوں کی ٹوہ میں لگی رہتی ۔ مگر وہ ہمیشہ اس سے دور رہتی ' وہ جانتی تھی کمزوری حقارت سے مسکرائے گی اور سب سے جا کر شکایت

کر دے گی۔ اپنے دکھوں میں وہ آپ ہی گھلا کرتی، مگر خاک گھلا کرتی تھی! گوشت تو جگہ بے جگہ تھپا چلا جا رہا تھا۔

اس نے بھاگنا دوڑنا کم کر دیا تھا، جیسے ہوا سے بھی ٹیسیں چبھتی تھیں، جسم پکّا پھوڑا ہو گیا تھا۔ اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہوتی تھی، بڑی جماعت کی لڑکیوں سے اسے بہت نفرت تھی اور وہ ان کا ہمیشہ مذاق اڑایا کرتی تھی دھپا دھپ جب وہ رسّی کودتے وقت زمین پر پیر پٹختیں تو ان کے کرتوں میں بلّیاں سی لڑتی معلوم ہوتیں مگر شمن کسی نہ کسی طرح کھیل میں شرکت سے بچ جاتی۔ اسے ہر روز سزائیں ملتیں لیکن وہ سب برداشت کرتی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو کچ سے بلیڈ سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی۔

ایک دم اس کی طبیعت خراب رہنے لگی، کھڑے کھڑے چکر آجاتے، ہاضمہ خراب رہتا، منہ پر کالے اور سفید سفید چکتے پڑ گئے، ماتھا پھنسیوں سے لد گیا اور سارے جسم پر کھلبلی مچی رہتی، خون جیسے کھولتے ہوئے تیل کی طرح بھاری بھاری اسے جسم میں لہراتا ہوا محسوس ہوتا۔

اسے سست دیکھ کر کسی نے پروا نہ کی، بس سزائیں بڑھتی گئیں یہاں تک اماں ابا کے پاس بھی بہت بری شکایت گئی۔

اسی زمانے میں سالانہ ڈاکٹری معائنے کا وقت آیا تو اسے ہزاروں فکروں نے گھیر لیا۔ وہ کئی دن پہلے سے سہمی ہوئی رہنے لگی۔ یہ اسکول میں اس کا پہلا معائنہ تھا وہ ہزاروں بہانے تلاش کرنے لگی، مگر جب جلّاد تلوار اٹھا لیتا ہے تو پھر بچاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔

جب میٹرن نے اس سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس نے اسے "گدھی" کہہ دیا جس پر میٹرن کو روتے روتے دورہ پڑ گیا۔ سوکھی ماری بڑھیا میٹرن بھلا اس کے دکھوں کو کیا سمجھ سکتی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کے دو طمانچے لگائے مگر وہ اس سے بھی کشتی لڑتی رہی ڈاکٹرنی نے اس سے بہت سے بے ہودہ سوال کیے جن کا اس نے "نہیں" میں ہی جواب دیا۔ جان بوجھ کر وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گئی۔

اس کے بعد اس کا دوبارہ جو معائنہ ہوا تو اس نے بہت ہی فیل مچائے۔ اس مردار ڈاکٹرنی کو لوگوں کو ٹٹولنے کا وہ شوق تھا کہ حد نہیں، بلا کی طرح چمٹ گئی۔

اسے زبردستی دوا پلائی اور چند ہی دن میں اس کا خوفناک مرض پھر سے پھوٹ نکلا اور غضب یہ کہ سارے اسکول میں دھوم مچ گئی۔ لڑکیاں مارے تجسس کے نہ جانے کیا سوچنے لگیں۔ نوری اسے دیکھنے کے بہلنے بھید لینے کئی دفعہ آئی مگر شمن نے اسے ڈانٹ ہی بتائی۔

"سچ بتاؤ شمن" وہ بولی

"کیا؟"

"یہی ــــ کہ ــــ کہ برجیس کہتی ہے کہ تمھارے بچہ پیدا ہوا ہے"۔

ہیبت کے مارے وہ چیخیں مارنے لگی، اچھا تو یہ بات تھی۔ مگر ڈاکٹرنی نے تو کچھ نہ بتایا، حد ہو گئی زیادتی کی، کسی نے اگر ابا کو لکھ دیا تو موت سمجھ لو، گیندا کی جو گت بنی تھی وہ یاد تھی مگر پھر اس کا ننھا منا بچہ اسے بے طرح یاد آنے لگا۔

"تو پھر گیا کہاں؟" اس نے دل ہی دل میں سوچنا شروع کیا، شاید چھپا دیا گیا ہو، لیکن وہ پالتی بھی کیسے، اسکول کا کام، امتحان سر پر، بھلا بچے کو کون پالتا، لیکن یہ ان لوگوں کی زیادتی تھی کہ اسے دکھایا بھی نہیں گیا، وہ دیکھنے شکل صورت کس کی سی ہوگی، بہت ہی ذرا سا ہوگا اور پریشانی دور ہو کر اسے ایک طرح کی فکر سی لگ گئی۔

اس کا بخار اترا اور وہ اپنے کمرے میں آ گئی، جب بھی کسی نے بچہ وچہ نہیں

دکھایا۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں سعادت سے ذکر بھی کیا، سعادت آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"مگر تمھاری شادی تو ہوئی نہیں!"

"ہیں؟ ـــ شادی نہیں ہوئی تو پھر سعادت؟ ـــ؟" وہ چپ رہ گئی۔ اس نے جو تخیّل میں ننھا منا چوہے برابر بچّہ بنا رکھا تھا آہستہ آہستہ دھندلا ہونے لگا۔

"مگر نوری جو کہتی تھی"

"نوری کو کیا معلوم" سعادت بزرگانہ انداز سے بولی۔ "کسی سے کہنا بھی مت، پگلی کہیں کی!"

پھر سعادت نے اُسے بہت سی باتیں بتائیں اور وہ ہنستے ہنستے بے دم ہو گئی، شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

جب وہ تنہا پلنگ پر لیٹی تو اسے اس خیالی بچے کے کھو جانے کا بہت دکھ ہوا، نوری کی اصلاع کے بعد وہ سچ مچ کا ایک ننھا منا سا کلبلاتا ہوا بچّہ کہیں اپنے سے قریب ہی محسوس کرنے لگی تھی۔ بعض وقت تو اسے یہ بھی شبہ ہونے لگتا کہ وہ اس کے پہلو میں پڑا سو رہا ہے، اور اگر ذرا بھی ہلی تو جاگ جائے گا، اس احساس کے ساتھ ہی اس کے اعضا اکڑ سے جاتے اور وہ سانس روکے دیر تک پلنگ پر ہلے جلے بغیر پڑی رہتی، اکثر سوتے سوتے اسے بچّے کے رونے کی آواز آتی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رات کے اندھیرے میں اس واہمے کو تلاش کرتی رہتی۔ حتیٰ کہ پھر اس کی آنکھ لگ جاتی، وہ اس ننھی سی جان کے ساتھ نہ جانے کب تک اسی طرح آنکھ مچولی کھیلتی رہتی۔ اگر سعادت اس پر حقیقت کا انکشاف نہ کر دیتی اور اب؟ اب نہ جانے کیوں بچّے کے خیال سے ہی اسے شرم آنے لگتی، توبہ! کیسی بری بات تھی۔

زندگی جیسے دھندلکوں میں سے نکل کر روشنی میں آتی جا رہی تھی، آہستہ

آہستہ اس کے سب دکھ دور ہونے لگے، گو اس کی سانس گھٹتی، مگر وہ سب باتوں کی عادی ہو گئی، زندگی نے رکھ رکھاؤ خود ہی سکھا دیا۔

۱۳

بات ختم ہو گئی تھی مگر اس واقعے کی نوری نے وہ تھرّی بلٹی کہ ایک دن پکڑ کر اسے ٹھونک دیا، گھر میں وہ نوری کو بڑی آپا سے چھپا کر چار چوٹ کی مار دیا کرتی تھی مگر مجال تھی جو وہ شکایت کرتی۔ بڑی آپا تو خیر اسے مار لیتیں مگر پھر وہ نوری کو زندگی کا مزہ چکھا دیتی۔ یہاں آکر تو نوری بڑی مہذّب بننے لگی تھی۔ چڑیا کی بیٹ تک کو وہ ہاتھ رو دم کہنے لگی تھی اور بڑی اترا کر "دیکھیے دیکھیے" کہہ کر بولتی تھی۔ پھر اسے شمّن نے اس کی سہیلیوں کے سامنے مارا، نوری جوان عورتوں کی طرح ماتم کر کے رونے لگی اور شام تک اپنا بستر بوریا اٹھا کر اپنی سہیلی جلبیس کے یہاں جا پڑی، بڑی آپا کو ایک نہایت ہی دردناک خط لکھا۔ جس پر وہ اس کے مرحوم باپ کو یاد کر کے خوب روئیں، اور پرنسپل کو ایک منّت بھرا خط لکھا کہ یتیم بچّی نوری کو شمّن کے پنجے سے نجات دلائیں، نوری ہنسی خوشی جلبیس کے کمرے میں رہنے لگی اور شمّن کے کمرے میں بڑی بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ آگئی۔

رسول فاطمہ سے شمّن کو جو نفرت تھی وہ جنون کی حدوں سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی" اس کی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چپٹی تھالی میں دو ملیدک رکھے ہوں" باریک سیدھی، سیدھی تنکوں جیسی پلکیں اور کھردرے بھورے رنگ کے پپوٹے ہر وقت ان میں بے کسی، غربت اور بے دقوفی جھلکتی رہتی تھی، بیٹھے بیٹھے شمّن کو ایک دم اُن

آنکھوں پر غصہ آنے لگتا۔ اور جی چاہتا ان میں گرم لوہے کی کیلیں ٹھونک دے

وہ بات بے بات اسے جھڑک دیتی۔ اگر بھولے سے اس کا میلا دوپٹہ یا بوسیدہ کتاب شمن کی میز یا بستر پر رکھی رہ جاتی تو اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا اور وہ جھلا کر اسے دور پھینک دیتی۔ یہ نفرت اور بھی بڑھتی گئی جب اس لڑکی کے ہر ظلم کے جواب میں رسول فاطمہ نہایت خندہ پیشانی سے اپنے سکڑے ہوئے ہونٹوں میں سے ٹیڑھے میڑھے دانت نکال کر گھگیانے لگتی اور کبھی تو وہ چیزوں کو بے رحمی سے ایسے پھینکتی کہ وہ اس کے منہ پر جا لگتیں۔

"اوں، کبھئی ہمیں یہ مذاق نہیں اچھا لگتا" وہ اسے مذاق سمجھتی تھی۔ گویا شمن اتنی گری پڑی تھی کہ رسول فاطمہ سے مذاق کرے گی۔ وہ پھن کھلے ہوئے سانپ کی طرح بھنا جاتی۔ مگر رسول فاطمہ اس کی طرف پیار سے دیکھ کر اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں مٹھاس پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

اسکول میں ساتھ سونے کی سخت ممانعت ہے مگر رسول فاطمہ کو اس قدر ڈر لگتا تھا کہ وہ آخری گھنٹی بج جانے کے بعد شمن کے پلنگ کے قریب پلنگ لے آتی۔ شمن نے کئی دفعہ حقارت سے اسے دھتکارا بھی۔ لیکن وہ سچ مچ اس کے پیر چھونے لگی۔ اس نے بتایا کہ جب سے اس کی ماں طاعون میں مری ہے دو دن تک گھر میں پڑی رہی تھی تب سے اسے مردوں سے بہت ڈر لگنے لگا ہے اندھیرا ہوتے ہی اسے چاروں طرف سے روحیں گھیرنا شروع کر دیتی۔

"اچھا چپ رہو" نفرت سے شمن اس کی ہر بات پر ڈانٹتی اور وہ خاموش ہو کر ہولے ہولے قرآن شریف کی آیتیں پڑھ کر چاروں طرف پھونکتی مگر جب اس نے ان مقدس آیتوں کی برکت شمن پر پھونکنا چاہی تو اس نے اس کے منہ پر ایک چانٹا جما دیا۔

"سوئر یا ہمارے منہ پر تھوک دیا" اس نے دانت پیس کر رسول فاطمہ کو اس کے پلنگ پر گرا دیا۔ رسول فاطمہ بہت ہی سوکھی ماری تھی ذرا ٹھوکے

سے بے دم ہو جاتی۔

ایک دفعہ رات کو شمن کو اپنی گردن پر چوہا سا پھدکتا محسوس ہوا، اندھیرے میں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی چوہا رسول فاطمہ کے پلنگ پر بھاگ گیا۔۔۔۔ وہ پھر لیٹ گئی، نیم غنودگی کی حالت میں اسے پھر چوہا چھاتی پر رینگتا معلوم ہوا، دھندلکے میں بڑے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چوہا نہیں بلکہ سوتے میں رسول فاطمہ کا ہاتھ ہل رہا تھا وہ کروٹ بدل کر سو گئی۔

جیسے اس نے خواب میں دیکھا کہ چوہا پھر رینگا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اسے جھٹک سکے۔ وہ اسے پچھاڑ کر اس پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ اس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ اکڑ کر تانت کی طرح تن گئیں۔ ساری قوت سن سے ایک دم اس کے جسم سے نکل گئی، اب وہ کبھی جنبش نہ کر سکے گی، رسول فاطمہ کی سوئی ہوئی انگلیاں کیلوں کی طرح چبھ رہی تھیں مگر وہ اسے نہ روک سکی، جیسے شیر اپنے شکار کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نگلتا ہے۔ بالکل اسی طرح .... وہ سہمی ہوئی خاموش لیٹی رہی۔ اور چوہے دوڑتے رہے پھر آہستہ آہستہ اس کی ڈوبی ہوئی طاقت ابھرنے لگی ایک ہی دفعہ اس کا سارا جسم بغاوت پر تن گیا اور اس نے چاہا ایک ہی جست میں وہ رسول فاطمہ کو پچھاڑ کر اٹھ بھاگے۔ مگر وہ ہل بھی نہیں، احساس ذلت نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی۔ اف ۔ اس کی یہ گت اور وہ بھی رسول فاطمہ کے ہاتھوں، اگر وہ جاگنے کا اعلان کرتی ہے تو پھر تو اسے رسول فاطمہ کو مار ڈالنا چاہیے۔ اس نے سوچا وہ ایسے ہلے گویا سو رہی ہے۔ مگر کچھ دیر میں جاگ جائے گی تو شاید رسول فاطمہ ڈر کر اسے چھوڑ دے گی ۔۔۔۔ مگر بھلا، وہ ایک جھکی تھی اور فیصلہ جلدی چاہتا تھا لہٰذا ایک دم اس نے بھلا کر اتنی زور سے کروٹ لی کہ اس کی کہنی رسول فاطمہ کی ابلی ہوئی آنکھ میں لگی مگر ذرا ادھی، کروٹ لے کر اس نے اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا۔

"کون ہے؟"

"میں ـــــ میں ہوں تمہاری رسول فاطمہ!"

کیا؟ اس کی رسول فاطمہ؟ اگر وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی تو اسے اس گستاخی کا اسی دم مزا چکھاتی مگر موقع نہ تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے زور سے اپنی چارپائی دور ڈھکیلی، ایسے کہ رسول فاطمہ کا پرانا پچکا ہوا صندوق چورا ہوگیا۔

صبح اٹھ کر رسول فاطمہ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر وہ بھری بیٹھی تھی کہ وہ بولے تو بس اس کی جان کو ہی آجائے۔ لیکن رسول فاطمہ بھیگی بلی بنی شمن کا تازہ رنگا ہوا دوپٹہ چن رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ جل گئی اور ایسے زور سے جھٹکا دے کر دوپٹہ چھینا کہ رسول فاطمہ گر پڑی ـــــ ساری اس کی ہاتھوں کی گھائیاں چھل گئیں مگر وہ برا نہ مانی بلکہ رحم طلب نظر سے اسے دیکھنے لگی، جیسے یہ چنگیزی مظالم اسے بہت ہی بھاتے ہیں۔ شمن نے جھپٹا کر جو دوپٹے کی چنٹ کھولی تو کئی شوب کھایا ہوا دوپٹہ مسک گیا، اب تو اس نے واقعی اسے ایسا ڈھکیلا کہ بچاری کی نئے تین پیسے کی مراجی چکنا چور ہوگئی، اس کی بڑی بڑی بے جان آنکھیں زخمی مینڈکوں کی طرح پھول کر اور ابھر آئیں اور ان میں غلیظ پانی جھلکنے لگی۔

ذرا ذرا سی بات پر شمن اسے دھتکارتی رہی لیکن وہ یا تو چپکی ہنستی رہتی یا ہیں ہیں کر کے بے جان ہنسی ہنسنے لگتی گویا اس کی ٹھوکروں میں جفا کی چاشنی بھری تھی۔

"بھئی ایسا بھی مذاق کس کام کا، لے کے ساری چوڑیاں توڑ دیں،" ظالم کہیں کی! وہ اسے اس قدر پیار سے دیکھنے لگی کہ شمن گھبرا کے کمرے سے بھاگی، اس کا جی چاہا سب کچھ جاکر میٹرن سے کہہ دے مگر اس کے پیر رک گئے ـــــ کیا کہے گی وہ اس سے جاکر؟ ابھی گزشتہ مہینے چھوٹی کلاسوں کی بچیوں کو بیہودہ کھیل کھیلنے پر سزا ملی تھی۔ وہ لحافوں میں دبکی ہوئی ایک دوسرے کو بچے جنوا رہی تھیں! توبہ!!

رسول فاطمہ کی صورت دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، شام کو

وہ سعادت کے ساتھ بیٹھ کر گھر کا کام کر رہی تھی کہ ایک چھوٹی بچی نے دروازے کی آڑ سے اُسے بلایا۔

"یاں آیئے شمن باجی ——" یہ چھوٹی بچیاں بورڈنگ میں بڑی لڑکیوں کی لونڈیوں کی طرح ہوتی ہیں چھوٹے موٹے کام، رقعہ پیغام لے جانا، چمن میں سے پھول چرا کر لانا کتابیں لاد کر ادھر سے اُدھر لے جانا اور اس کے بدلے میں کبھی کبھی بڑی لڑکیوں کے سر یا پیر دبانے کی عزّت حاصل کرنا، جتنی زیادہ ہر دل عزیز لڑکی ہوگی اتنی ہی زیادہ چھوٹی لڑکیاں اس کی خدمت میں حاضر رہیں گی۔ شمن ان چھوٹی لڑکیوں میں زیادہ عزیز نہ تھی۔ کیونکہ ابھی وہ خود نہایت چھچھوری سی تھی۔

"کیا ہے؟" اس نے رکھائی سے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

"یہ رسول فاطمہ آپا نے دیا ہے ——" ایک پرچہ دے کر وہ لڑکی شرماتی ہوئی بھاگ گئی۔ رسول فاطمہ نے نہ جانے کن خوشامدوں اور رشوت دہی کے بعد لڑکی کو پیغام بری کے لیے راضی کیا ہوگا۔ کیونکہ عام لڑکیاں خصوصاً چھوٹی لڑکیاں اس سے بہت نفرت کرتی تھیں۔

پرچہ لے کر شمن کے ہاتھ کانپنے لگے اس نے سعادت کی نظر بچا کر جلدی سے سوئٹر کے گریبان میں چھپا لیا اور واپس پڑھنے آ بیٹھی۔ لیکن پریشانی کی وجہ سے اس سے خاک بھی نہ پڑھا گیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے اغوا کرنے کا خط لکھا ہے اور وہ واقعی خطرے میں ہے۔

اس نے چاہا کہ کوئی بہانہ کر کے باہر چلی جائے، خط پڑھنے کے لیے وہ بے چین ہونے لگی۔ لہٰذا وہ غسل خانے جانے کا بہانہ کر کے اٹھی۔ خط میں لکھا تھا:-

میرے من مندر کی دیوی

آہ اپنے عاشق سے کیوں ناراض ہو کب تک خفا رہوگی، اگر ایسی ہی مجھ سے نفرت ہے تو اپنے پیارے پیارے

ہاتھوں سے گلا گھونٹ دو ۔۔۔ یہ تم نے کیا جادو کر دیا ہے

۔۔۔ ایک دفعہ اپنے پیروں پر سر رکھ معافی مانگ لینے دو ۔

۔۔ تمہاری حسن کی پروانہ رسول فاطمہ ۔

ہیبت کے مارے وہ شل ہو گئی ، کس قدر بدمعاشی کا خط لکھا گیا تھا ۔ اب؟ کمرے میں واپس جانے کے خیال سے اس کا دم نکلنے لگا ، وہ کوئی ایسا بہانہ کرے کہ سعادت اسے اپنے کمرے میں پناہ دے دے ، سونے کی گھنٹی بج گئی اور وہ کوئی عذر نہ تراش سکی ۔ گھنٹی کی ضربوں کے ساتھ اس کا دل بھی اونچی آواز سے دھڑکنے لگا اور وہ ڈری کہ سعادت نہ سن لے ۔

غیر ارادی طور پر قدم رکھتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اس نے رات کے کپڑے نہیں بدلے ، پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی رہی ، نیم وحشی خیالات اسے پریشان کرنے لگے ، ایک لمبی آہ کمرے میں سرسرائی اور رسول فاطمہ نے کروٹ لی ، شمن آہستہ سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی ، اب اندھیرے میں اس نے محسوس کیا کہ رسول فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں ۔ اس پر ایک دم سے نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور جی چاہا کہ کسی کی آغوش میں یوں چھپ جائے جیسے چیل جھپٹا مارتی ہے تو چوزے دوڑ کر مرغی کے پروں کے نیچے چھپ جاتے ہیں پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ باہر نکل آئی اور برآمدے میں کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ۔

" یہاں کیوں کھڑی ہو ، سردی لگ جائے گی " رسول فاطمہ اس کے ساتھ ساتھ رینگ آئی تھی ، مگر اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور غسل خانوں کی طرف چل دی ۔۔۔ جب وہاں سے نکلی تو رسول فاطمہ سکڑی کھڑی تھی ، وہ کچھ نہیں اوڑھے تھی اور اس کے بدوضع رات کے کپڑوں میں سے اس کا حقیر مریل جسم ظاہر ہو رہا تھا ۔ وہ اسے دھکا دیتی ہوئی ہاتھ دھونے کے نل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور غیر ارادی طور پر پانی کی دھار اپنی انگلیوں میں سے

چھاننے لگی۔

"چلو گی نہیں شمن ـــــ؟" رسول فاطمہ منمنائی۔ شمن نے کچھ جواب نہ دیا ـــــ نل بند کر کے وہ اپنے حلق میں گیلی انگلیاں ڈالنے لگی، حلق میں گدگدی ہوئی، کوا اینٹھا۔

"اد ـــــ ادق" وہ قے کرنے لگی۔ باوجود ڈھکیلنے کے رسول فاطمہ اس پر چڑھی چلی آئی، اور گھبرا گھبرا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگی، واقعی اسے قے ہونے لگی ہر جھٹکے پر اس کے گلے کی نسیں پھٹنے لگتیں اور معلوم ہوتا زبان ٹوٹ آئے گی۔ جب ذرا جی ٹھیرا تو رسول فاطمہ دیوانوں کی طرح روتی ہوئی میٹرن کو بلا کر لائی۔ میٹرن نے باورچی کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور اسے الائچی چبانے کو دی۔

"مجھے مریضوں کے کمرے میں پہنچا دیجیے ـــــ نہ جانے جو پھر قے ہوئی تو؟"

رسول فاطمہ بورڈنگ کے اصول سے واقف ہو کر بھی اس کے ساتھ جانے کو ضد کرنے لگی۔ مگر میٹرن نے اسے ڈانٹ بتائی۔ کیا عجب کوئی چھوت کی بیماری ہو!

دیر تک وہ بدبودار رضائی اوڑھے بیمار بنی مسکراتی رہی ـــــ اس کا حلق بری طرح جکڑ رہا تھا اور کنپٹیاں دکھ رہی تھیں۔ مگر اسے معلوم ہوتا تھا کہ چیل سے بچ کر وہ مرغی کے پروں میں دبکی ہوئی ہے۔

ایک تو رات کا کھانا نکل گیا دوسرے صبح جو بدبودار بسکٹ ملتے تھے وہ بھی بند کر دیئے گئے، تو مجبوراً اسے دوپہر تک تندرست ہونا پڑا، کھانے پر وہ حسب معمول رسول فاطمہ کے پاس نہیں بیٹھی، چونکہ دعا ہو گئی تھی اس لیے رسول فاطمہ اٹھ کر اسے بلانے نہ آسکی۔ کھانا کھاتے میں جو ایک دفعہ اس کی نظر میز کے دوسرے سرے پر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کچھ کھا نہیں رہی،

اور اس کے لیے حسب معمول کھانا نکال کر لگا دیا ہے، اس کی مسکین صورت
اور پھیلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر شمن کا دل پھر قے کرنے کو چاہنے لگا۔ اس نے
اسی دن میٹرن سے کہہ دیا کہ وہ کھانے پر اپنی جگہ بدلنا چاہتی ہے۔ سعادت
کے پاس ایک جگہ تھی وہاں وہ بیٹھنے لگی۔

نماز کے وقت وہ کچھ نہ بول سکی جب رسول فاطمہ اس کے قریب نیت باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ تو پورے وقت وہ یہ کوشش کرتی رہی کہ سجدہ کرتے وقت اس کی کہنی رسول فاطمہ سے نہ چھو جائے اس لیے وہ بار بار آیت بھول جاتی۔

رات پھر مصیبت بن کر چھانے لگی اور اس پر پریشانی نے حملہ کر دیا۔ آج وہ بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ کوئی بچاؤ کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ نفلیں پڑھتی رہی۔ پھر اس نے یا حافظ کا ورد کیا۔ آج اسے خدا بے طرح یاد آ رہا تھا اور وہ گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی، مگر کیا دعا اس نے مانگی؛ اس کے منہ سے تو ایک لفظ بھی نہ نکلا، اور پاس ہی رسول فاطمہ دو زانو بیٹھی ہاتھوں کا پلو اوپر اٹھائے ہل ہل کر دعا مانگ رہی تھی۔ شمن کا جی اور پریشان ہو گیا، اس کو ایسا معلوم ہوا رسول فاطمہ کے پلو میں ڈھیر سی دعا جمع ہو گئی ہے اور جی چاہا ایک ہاتھ ایسا مارے کہ ساری دعا باجرے کے دانوں کی طرح بکھر جائے اور جب رسول فاطمہ اسے بٹورنے جھکے ــــ تو ــــ مگر اس خیال کے ساتھ ہی اسے ترکیب سوجھی ــــــ رات ہو چکی تھی اور میٹرن اپنا چکر ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی، ان دونوں کو عبادت میں مشغول دیکھ کر وہ کچھ نہ بولی کیونکہ یہ مذہبی معاملہ تھا، ایک دفعہ اس نے لڑکیوں کو میدان میں شب قدر منانے سے روکا تھا تو غل مچ گیا تھا، دوسرے دن مقامی اخباروں کی سرخیاں عیسائی میٹرن کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔

وہ چپکے سے اٹھی اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کنڈی چڑھا سیدھی اپنے

کمرے میں ——— رسول فاطمہ نے چونک کر اسے پکارا "دشمن!" مگر وہ تیز تیز قدم چل پڑی ——— کمرے میں پہنچ کر اس کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ——— پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش دبے قہقہوں میں ڈوب گئی۔

نماز کا کمرہ دور تھا' اتنی دور کہ اگر رسول فاطمہ چیختی تب کہیں اس کی آواز سنائی دیتی' خاموش سر جھکائے وہ اس کی آواز کا انتظار کرتی رہی لیکن سوائے جھینگروں کی چیں چیں کے وہ اور کچھ نہ سن سکی ——— صبح رسول فاطمہ اس کی شکایت کر دے گی۔ پھر ——— پھر؟ ——— وہ طرح طرح کے بہانے سوچنے لگی' اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک خوفناک سانپ پر پتھر پٹخ کر بھاگ آئی ہے اور اب وہ وہاں پڑا دم توڑ رہا تھا کہتے ہیں سانپ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے ——— لیکن رسول فاطمہ کے بعد تو اسے کسی ناگن کا خوف نہ تھا۔ رسول فاطمہ دنیا میں تنہا آئی تھی' تنہا ہی رہتی تھی اور تنہا ہی چلی جائے گی ——— کل سے وہ اپنا کمرہ بھی بدل لے گی ——— مگر یہ رسول فاطمہ غل کیوں نہیں مچاتی ———؟

صبح نماز کے کمرے کے آگے لڑکیاں ایسے جمع تھیں گویا رات کوئی چوری ہو گئی ہے اور تالا ٹوٹا پڑا ہے' وہ بھی بے غرض بنی ادھر سے گزری' رسول فاطمہ جا نمازوں میں لپٹی ہوئی پڑی تھی' دو چار لڑکیاں اسے سہارا دے رہی تھیں' وہ بھاگ کر میٹرن کو بلانے گئی تھیں ——— رسول فاطمہ بخار میں جل رہی تھی اور اس کی مردہ آنکھیں انگاروں کی طرح جان دار ہو رہی تھیں۔

میٹرن نے اسے بیماروں کے کمرے میں لے جا کر لٹایا اور بہت پوچھا کہ کون اسے وہاں بند کر گیا مگر وہ یہی کہتی رہی کہ کوئی نہیں وہ خود نماز پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔

"پھر دروازہ کس نے بند کیا؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" وہ برابر ٹالتی رہی۔

شمیم کے دل پر رسول فاطمہ کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اس نے میٹرن سے خوشامد کر کے اپنا کمرہ بدلوا لیا۔ سعادت اکیلے کمرے میں رہتی تھی اس لیے اس کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی، شمیم کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی ۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑھیں گی ساتھ رہیں گی، سعادت سے اس کی بہت بنتی تھی ۔

١٢

جب اس نے دوڑ کر سعادت کو اس کے کمرے میں آنے کی خبر سنائی تو بجائے خوشی سے اچھل پڑنے کے وہ خاموش ہو گئی ۔ ایک دم سے اٹھ کر وہ میٹرن کے پاس گئی جہاں دیر تک بڑبڑاتی رہی، جب وہ باہر نکلی تو میٹرن چلا رہی تھی، اس نے زور سے دروازہ بھیڑ دیا ۔ اور منہ پھلائے لوٹ آئی ۔

شمیم کی ساری خوشی خاک میں مل گئی، وہ تو سمجھتی تھی کہ سعادت اس کے کمرے میں آنے سے خوش ہو گی، اسے بڑی ذلت محسوس ہوئی، مگر اس نے جی کو سمجھا لیا کہ چونکہ سعادت ہمیشہ سے بورڈنگ میں بہترین کمرے میں رہتی آئی ہے ۔ اس لیے وہ اس کے آنے کو اپنی حق تلفی سمجھ رہی ہے ۔ سعادت اسے خاموش دیکھ کر اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی ۔ اور وہ تاریخ و جغرافیہ کے چکر میں پڑ کر سب کچھ بھول گئی ۔

دو دفعہ رسول فاطمہ نے چپکے سے اسے بلایا مگر وہ نہ گئی ـــ رسول فاطمہ کے پاس جانے کی ممانعت بھی ہو گئی تھی، کیونکہ ڈاکٹر نے اسے دق بتادی تھی، یہ بھی سنا تھا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بعد اسے واپس نہ آنے

دیا جائے گا۔

سعادت ویسے تو اب خوش رہنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی بعض وقت شمّن کو محسوس ہوتا کہ وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔ جیسے اس کی موجودگی سے کمرہ گھٹا جا رہا ہو، کیونکہ اس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ پڑھنے کے بعد فوراً اٹھ کر اپنی ایک سہیلی کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔

اس کی یہ سہیلی نجمہ ہائی اسکول کے زمانے میں اس کے ساتھ رہتی تھی، پھر جب ٹائیفائڈ کی وجہ سے سعادت فیل ہو گئی تو وہ اس سے ایک درجہ آگے ہو گئی تھی، وہ ایف اے میں تھی اور ہائی اسکول کی لڑکیوں سے بہت بزرگانہ برتاؤ کرتی تھی، جب وہ سعادت کے کمرے میں آتی تو شمّن کو دیکھ کر ذرا دیر کو ٹھٹک جاتی بیٹھتی تو بالکل خاموش ورنہ جلدی سے بہانہ کر کے چلی جاتی، نجمہ سے شمّن بالکل بے تکلف نہ تھی۔ اور عموماً اسے دیکھ کر ذرا پریشان ہو جاتی تھی کبھی شمّن اپنے کمرے میں آتی تو نجمہ بھی جو ہنس ہنس کر سعادت سے باتیں کرتی ہوتی ایک دم خاموش ہو جاتی۔ اور دوسرے لمحے اسے کوئی نہایت ضروری کام نکل آتا اور وہ چلی جاتی، مگر نجمہ کو دیکھ کر شمّن کچھ عجیب طرح بے چین ہو جاتی جتنی دیر کھڑی وہ باتیں کرتی رہتی۔ شمّن کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا کرتا وہ جلدی سے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بے کار کے کام کرنے لگتی، مگر جب وہ چلی جاتی تو شمّن کو بہت افسوس ہوتا کہ آخر اس نے اسے اچھی طرح دیکھا کیوں نہیں، وہ اس کی اودی پھول دار شلوار کی تڑپتی ہوئی سلوٹیں، سفید چکن کا کرتہ جس کا گریبان ذرا پیچھے کو کھنچا ہوا تھا اور کمر پر چست کرنے کے لیے متوازی پلیٹیں پڑی تھیں۔ شانوں پر پھولا پھولا جھول اس کی کمر کو اور بھی پتلا بنا دیتا اور اس کا کاسنی چنا ہوا دوپٹہ جو شانوں پر سے ہوتا ہوا بغل میں گھوم جاتا تھا۔ اور آنچل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو پر جھولا کرتا، جب وہ مڑ کر جانے لگتی تو اس کی چوٹی کا پھندنا اس کے کولھوں پر

ٹھمکیاں لیتا اور اودی شلوار کے پائنچوں میں سے اس کی سانولی ایڑیاں خاصی
گوری معلوم ہوتیں جیسے مور کے بھورے رنگ کے انڈے۔

11 نجمہ بڑی نازک تھی، معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں ایک بھی پکی ہڈی نہیں
شمن کا دل اس کے چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم ایسی کہ اگر
ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابلے ہوئے انڈے کی طرح پھسل جائے۔

ایک دن یونہی وہ شمن کے پلنگ کے پاس ہی پر بیٹھ گئی۔ شمن پریشان ہو گئی۔
اور جب اس نے اپنے دوپٹے کا آنچل جھٹکا تو وہ شمن کے بازو پہ آن گرا۔ شمن
کو ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا۔ وہ سن بیٹھی
رہی، پھر آہستہ سے کھسک کر آنچل گرا دیا ـــــ لیکن فوراً ہی اسے افسوس
ہونے لگا جیسے اس نے گود میں سے کوئی بڑی پیاری چیز پھینک دی ہو، وہ دل
ہی دل میں دعا مانگنے لگی کہ کاش پھر نجمہ اسی الھڑ انداز میں آنچل پھینکے، اور اس کے
بازو سے آن الجھے ـــــ مگر نجمہ چلی بھی گئی۔

بعض وقت جب نجمہ سعادت سے باتیں کرتی ہوتی تو شمن اسے نگل
جانے والی نگاہوں سے گھورنے لگتی، وہ اس کے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش،
وہ سر موڑ کر ذرا اپنے شانے پر دیکھنا جیسے وہاں کسی کی پیار بھری نظروں
کا جواب دے رہی ہو، یا جب وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی گھما کر معصومیت
سے چھت کی طرف دیکھتی، تو شمن پاگلوں کی طرح اس ننھے سے ڈرامے کو
دیکھا کرتی۔ نجمہ اسے محسوس کرتے ہی ایک دم خاموش ہو کر ہونٹ بھینچ
لیتی گویا لوٹ رہی ہو۔

"کیا کہتی ہو؟ ـــــ کہہ بھی چکو نا ـــــ" مگر شمن کھسیا جاتی
اور ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے لگتا، زور سے پیٹ
میں جیسے ایک دم بھوک جاگتی اور پھر پیاس لگنے لگتی۔ مگر وہ بے توجہی سے
کوئی اوٹ پٹانگ کام کیا کرتی۔

پھر اسے اور کچھ ہونے لگا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے نجمہ کے ہونٹوں کی جنبش
آنچل کا کھچنا اور کمر پر لگی ہوئی بلیٹیں یاد آجاتیں، وہ تھوڑی دیر تو ان سے
لطف لیتی، مگر پھر جھنجھلا کر انھیں دور دھکیل دیتی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا سعادت نجمہ کے کمرے میں سے اس
کی ساٹن کی صدری پہن آئی۔ کلاس میں جب شمن نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ
رکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی گرم رکابی پکڑ لی ہو۔ اس نے جلدی
سے گھبرا کر ہاتھ ہٹا لیا مگر دوسرے لمحے وہ سعادت کی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے کا کوئی
بہانہ ڈھونڈنے لگی، اسے ایسا معلوم ہوا گویا چکنے چکنے سانپ اس کی ہتھیلی
میں سرک رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت گرمی کی وجہ سے سعادت نے صدری
اتار کر کرسی پر لٹکا دی اور کھانا کھانے چلی گئی۔ شمن نے کھانے پر سے آکر جو
صدری کو دیکھا تو زور زور سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ دوبارہ اسکول شروع
ہونے کی گھنٹی بج گئی۔ مگر شمن بہانے بناتی رہی۔

"چلتی ہو کہ نہیں ــــ مس جرمی کا گھنٹہ ہے، دیر ہو گی تو کھائیں
گی۔"

"تم چلو ــــ میں ذرا ــــ" وہ لوٹا اٹھا کر غسل خانے جانے
کی تیاری کرنے لگی۔

جب سب لڑکیاں بورڈنگ سے چلی گئیں تو ڈرتے ڈرتے زینے پر لوٹا
رکھ کر اس نے صدری کی طرف دیکھا۔ پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوا۔ اور وہ جاکر
دروازہ بند کر آئی۔ آہستہ آہستہ دبے پیر وہ بڑھی۔ دھڑکن ایکا ایکی اتنی تیز
ہو گئی کہ معلوم ہوا سینہ ہی پھٹ جائے گا۔ ایک مست کن بھپکا اس کی ناک
میں پہنچا اور اسے چکر آنے لگا ــــ باہر کسی نے کوڑے کے ٹین کو ٹھوکر
ماری اور جلدی سے اس نے صدری پلنگ پر پھینکی ــــ مگر دروازے
سے وہ لوٹ آئی ــــ جلدی میں اس نے صدری بجائے کرسی کے پلنگ پر

ڈال دی! اور جو سعادت دیکھ لیتی تو غضب ہو جاتا۔ وہ ضرور بھانپ جاتی کہ صدری جگہ سے *بے جگہ کی گئی ہے۔

کلاس میں مس جرمی نے کیسا ڈانٹا۔ اسے کچھ سنائی نہ دیا، وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی ـــــ مگر بڑی دیر تک اس کی انگلیاں صدری کے مس سے جھنجھناتی رہیں جیسے ان میں ننھی ننھی مرچیں لگ گئی ہوں۔

اسکول ختم ہوا تو وہ وہیں کیاریوں کے پاس منڈیر پر بیٹھ گئی پنسل کو اینٹ پر گھستے ہوئے اس نے سوچنا شروع کیا ـــــ آج اسے معلوم ہو رہا تھا۔ گویا اس نے کوئی احسان چوری کی ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں پارٹی ہو رہی تھی تو اس نے چپکے سے ایک رس گلا اٹھا لیا تھا۔ مگر کسی کے پیر کی چاپ سن کر وہ جلدی سے اسے نگل گئی اور ہاتھ دھونے کے نل میں سے پانی پینے لگی۔ اس رس گلے کا ذائقہ مشکل سے چند منٹ اس کی زبان پر ٹھیرا ہوگا۔ مگر اب تک وہ جب چاہتی تخیل کی مدد سے اس کی مٹھاس منہ میں کھینچ لاتی۔ اور اس کا سارا منہ لذت سے بھر جاتا۔ آج بھی وہ صدری کی خوشبو کو اپنے نتھنوں میں کھینچنے لگی۔ عطر تو نہ تھا، مگر تھا ضرور کچھ، سعادت میں تو وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ مرغی کے بچے جیسے بو آتی تھی۔ مگر اس خوشبو میں تو کچھ لونگوں کے بگھار کی سی مہک تھی۔ بالکل نئی اور آسانی سے کھنچ کر نتھنوں میں گھسنے لگتی تھی۔

اب تو اسے نجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی مگر قوت احساس اسے سب کچھ بتا دیتی تھی ـــــ کہ اب نجمہ کدھر دیکھ رہی ہے ـــــ اس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کو زیادہ جھک گئے ہیں۔

آج اس نے صندلی سنگھاڑے کے ریشم کا کرتا پہنا تو وہ ایسا جسم پر چپک گیا ہے۔ جیسے جسم پر صندلی وارنش چڑھا دی گئی ہو ـــــ آج اس کے ہموار چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے

گلاس میں موتی تیر رہے ہوں سفید سفید چمکیلے دھاردار موتی۔ نجمہ کے دانت دور سے دیکھنے میں بہت تیز معلوم ہوتے تھے جیسے نیولے کے نکیلے دانت، شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی

شمن جب کمرے میں پہونچی تو نجمہ کے قہقہے نے اس کے پیر پکڑ لیے، سعادت اور نجمہ پچھلے اسباب کے کمرے میں ہنس ہنس کر بول رہی تھیں۔ اب کچھ دن سے نجمہ جب آتی سعادت سے کوئی ایسی چیز مانگتی جسے نکالنے کے لیے اسے صندوق کھولنا پڑتا۔ وہ اٹھ کر اندر جاتی اور پیچھے پیچھے نجمہ بھی چلی جاتی۔ پھر وہ گھنٹوں وہاں بیٹھی ہلکے ہلکے بولا کرتیں۔ شمن کا دل کسی کام میں نہ لگتا اور وہ سانس روکے نجمہ کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی۔ اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ بھی اٹھ کر اندر جا بیٹھے، مگر اسے سعادت سے نفرت ہونے لگی کہ وہ جان بوجھ کر اسے نجمہ سے دور رکھتی ہے۔

اسکول میں فینسی ڈریس ہوا تو انھوں نے کالج کی لڑکیوں کی بھی دعوت کی ویسے بورڈنگ دور نہ تھا اور لڑکیوں کو ملنے کی بھی ممانعت نہ تھی، مگر عموماً ان کے جلسے اور تہوار جدا ہوتے تھے۔ عید کا موقع تھا اور ڈنر بڑا شاندار ہونے والا تھا۔ ہر لڑکی کا دل مردانہ لباس پہننے کو چاہتا تھا۔ لہٰذا ڈے اسکالر لڑکیاں حسب فرمائش اپنے گھروں سے لے آئیں۔ شمن نے بھی ایک سوٹ منگوا لیا۔

مردانے کپڑے پہن کر لڑکیاں شرم کے مارے گڑ گڑ گئیں۔ خصوصاً وہ تو بے حال ہو گئیں جنھوں نے داڑھی مونچھیں لگائی تھیں۔ کچھ تو کمروں میں گھس بیٹھی تھیں، شرم کے مارے چادریں اوڑھے ہوئے اور زیادہ بہادر لڑکیاں انھیں گھسیٹ گھسیٹ کر نکال رہی تھیں۔ اختر موٹی نے مولانا شوکت علی کی وضع کی داڑھی اور ٹوپی پہن رکھی تھی جسے دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکلی جا رہی تھیں۔ مگر وہ مزے سے ٹہل رہی تھی۔ ایک لڑکی نے عرب نوجوان کا لباس پہن لیا تھا

جس میں وہ بالکل زنانی معلوم ہو رہی تھی، اس کے پاس نوری ریشمی ساڑھی پہنے پھدک
رہی تھی، بچاری نوری نے تو ساڑھی بھی نئی پہننا شروع کی تھی۔ اس لیے اس کے
لیے وہی عجیب و غریب چیز تھی ــــ مگر وہ عرب نوجوان خورشید کے
پیچھے لگی تھی جو مصری لباس میں بالکل پنجابن لگ رہی تھی۔

شمن اپنا سیاہ سوٹ پہنے تین دفعہ دروازے میں سے نکلی مگر پھر
ڈر کر بھاگ گئی۔ دو چار لڑکیوں نے اسے گھسیٹا مگر پھر چھوڑ دیا۔ سوٹ پہنے
تو کئی لڑکیاں گھوم رہی تھیں، مگر شمن کا برا حال تھا گویا ننگی مادر زاد ہو۔ سب
مہمان ہال میں جمع تھے اور برابر کالج کی لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ اس نے دیکھا
سعادت دھوبی بنی ہوئی ہے۔ سفید پگڑی اور لمبی مونچھیں اور کپڑوں کی گٹھری
شانے پر اور اس کے ساتھ ــــ اس کے ساتھ نجمہ دھوبن بنی ہوئی ــــ
ــــ نام کو دھوبن تھی مگر وہ تو پوری پدمنی بنی ہوئی تھی۔ گھوم گھیر کا جھلمل
کرتا لہنگا اور شوخ گوٹے سے چھپا ہوا باریک دوپٹہ ــــ اور وہی صدری
وہی لونگوں کے بگھار کی مہک میں بسی ہوئی ساٹن کی صدری آج اس نے
دنداسہ بھی لگایا تھا اور لپسٹک بھی اور گال بھی ہلکے رنگ دار تھے۔ اور پیر!
اس کے پیر دیکھ کر شمن کا دم نکل گیا۔ مور کے انڈوں جیسی ایڑیوں میں لال
روشنائی ــــ وہ ننگے پیر تھی اور چاندی کی پازیب زمین پر گھسٹ
رہی تھی۔ ماتھے پر اس نے ٹیکہ لگا رکھا تھا جو بالکل ہیرے کی طرح دمک رہا تھا
شمن شرمانا ورمانا سب بھول کر مبہوت اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ارے شمشاد کو دیکھنا!" نجمہ زور سے ہنسی اور سب لڑکیاں
اسے دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں۔

"ہائے اللہ بالکل لڑکا لگ رہی ہے ــــ" نجمہ کا منہ لال
ہو گیا۔

"تم کیوں نہیں چلتیں ــــ چلو نا ــــ" سعادت نے رکھائی

سے کہا۔

"آؤ ۔۔۔ بھئی دھوبی تم تو ہو جاہل ۔۔۔ اور یہ صاحب بہادر ۔۔۔ ہمیں تو یہ پسند ہیں۔" نجمہ مذاق میں شمن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگی اور شمن کو ایسا معلوم ہوا وہ سو رہی ہے ۔۔۔ یہ سب خواب میں ہو رہا ہے۔

شمن کے لباس سے کوئی متاثر نہیں ہوا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی نجمہ اس کی طرف دیکھتی اس کا منہ تمتما اٹھتا اور وہ قہقہے مارنے لگتی۔ شمن بھی اسے برابر دیکھ رہی تھی۔ آج وہ بالکل اس کے قریب بیٹھی تھی۔ ایسے کہ کئی دفعہ نجمہ کا جالی دار دوپٹہ اس کے ہاتھوں پر آن گرا۔

مگر سعادت کچھ مکدر سی بیٹھی تھی، اسے نجمہ کا ہنسنا اور بات بے بات شمن سے بے تکلف ہونا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ کھانے پر مارے گھبراہٹ اور جوش کے شمن سے کچھ کھایا نہ گیا، کئی مرتبہ نجمہ کی پازیب کھل گئی تو اسے باندھنی پڑی، پھر بھاری جھمکوں سے اس کے کان دکھ رہے تھے، بار بار اُن کی خبر لینا پڑتی تھی، گو زبان سے وہ نجمہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی۔ لیکن اس کا بھولا بھالا چہرہ، اس پر بدمعاشوں جیسی مونچھیں، بال جو بار بار ہیٹ سے باہر پھسل آتے تھے، ہر بات پر شرما کر گھبرا جانا اور پھر خاموشی سے کھسیا کر مسکرا دینا ۔۔۔ ایسی باتیں تھیں کہ نجمہ کو شمن سے بے تکلف ہوئے بغیر نہ رہا گیا اور وہ اسے شمن کہنے لگی۔

جب شمن نے کچھ کہا تو اس پر بھی نجمہ کو بہت ہنسی آئی، سعادت نہایت سنجیدہ بنی اپنی ایک استانی سے آنے والے امتحان پر گفتگو کر رہی تھی، اس نے مونچھیں اتار دی تھیں اور صافے کو دوپٹے کی طرح اوڑھے ہوئے تھی بجائے دھوبی کے وہ بڑی بی معلوم ہو رہی تھی۔

جب انعام دیے جانے کا وقت آیا تو نجمہ گھبرا گھبرا کر سعادت کو

ڈھونڈھنے لگی لیکن سعادت اپنے کمرے میں تھی ۔۔۔۔۔ نجمہ بھاگی ہوئی گئی
شمن کا دل بیٹھنے لگا ۔ نجمہ سعادت پر مری جا رہی تھی ۔ اس کا جی نہ مانا تو وہ بھی
کمرے میں گئی ۔۔۔۔۔ وہاں اس نے دیکھا سعادت بُری طرح پلنگ پر پڑی
رو رہی ہے ۔ نجمہ اسے منا رہی ہے ۔ مگر سعادت کے غصّے کی انتہا نہیں ۔۔۔
اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں ۔ اتنے میں چند لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور
کہا " نجمہ باجی مس جرمی بلا رہی ہیں " نجمہ مجبوراً اٹھ کر چلدی ۔ شمن بھیگی بلی
کی طرح ساتھ ساتھ ہال میں تمام فینسی ڈریس والیاں دو دو کے جوڑوں
میں گزر رہی تھیں ، جب کوئی عجیب جوڑا گزرتا تھا تو خوب تالیاں بجتی تھیں ۔

" ارے دھوبن کہاں ہے ۔۔۔۔ نجمہ " مس جرمی پکار رہی تھیں ۔

" ہیں تمہارا دھوبی کہاں ہے ۔۔۔ ؟ "

" سعادت کی طبیعت خراب ہو گئی ۔۔۔ " نجمہ نے مردہ آواز سے
کہا ۔

" یہ تو برا ہوا ۔۔۔ اچھا تو تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ ۔۔۔۔
جلدی کرو ، اب تمہاری باری ہے ۔۔۔ "

بغیر کچھ کہے سنے نجمہ نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا اور آگے بڑھ گئی ۔ نہ جانے
شمن کہاں پیر رکھتی تھی اور کہاں پڑتا تھا ، اسے تو بس اتنا احساس تھا کہ نجمہ کے
ہاتھ میں اس کا ہاتھ ہے اور وہ ہوا میں معلق ہے ۔ نجمہ کو انعام ملا ۔۔۔۔
انعام تو تین تھے ۔ مگر پھر لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دینا شروع کیے ۔
یہاں تک کہ ہر لڑکی کے لیے انعام کا اعلان ہو گیا ۔

نوری کو اس کی سڑی ہوئی دوست برجیس نے دیا اور برجیس کو
افسر نے پھر تینوں انعاموں پر فخر کرنے لگیں ۔

نجمہ نے شمن سے اور کوئی بات نہیں کی ۔۔۔۔ انعام لینے کے
بعد وہ واپس سعادت کے پاس آ گئی اور جب جلسہ ختم ہونے کا آخری

گیت گایا جا رہا تھا تو شمن کی آواز گلے ہی گھٹ گئی، سعادت بالکل خاموش کھڑی تھی اور نجمہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے سر سے سر ملائے آخری گیت گا رہی تھی ——— وہ دونوں ایک دوسرے میں غرق دنیا سے بہت دور تھیں،

رات کو جب شمن پلنگ پر لیٹی تو بڑی دیر تک ہچکیوں کے مارے اس کا برا حال رہا ——— خاموش وہ اپنے ہتھیلیوں میں دانت گڑوئے اپنی آواز کو گھونٹتی رہی۔ سعادت آج کمرے میں نہیں تھی، آج چونکہ چھٹی تھی اس لیے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت تھی، وہ نجمہ کے یہاں تھی! یہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، بالکل بڑی آنکھوں والی رسول فاطمہ کی طرح۔ اوہ آج اسے رسول فاطمہ یاد آنے لگی اور ایسا معلوم ہوا کہ وہی اس کی قاتل تھی۔ اس نے ہی تو رات بھر اسے سردی میں اکڑنے کو بند کر دیا تھا۔

اور اب وہ بھی رسول فاطمہ کی طرح ———! اُن شرم اور نفرت سے اُسے پسینہ آ گیا ——— ٹھنڈی ٹھنڈی آگ سے اس کا سینہ دہک رہا تھا نجمہ، نجمہ اس کی روح پکار رہی تھی۔

رسول فاطمہ! اس کی سوکھی کلائیاں اور چوہے کی شکل کے ہاتھ خراب صحت اور بدوضع جسم ——— ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اوہ، وہ اس کی قاتل تھی ——— وہ اس کی آخری الجھی ہوئی سانسیں وہ گھٹی ہوئی آہیں شمن کو معلوم ہوا کہ جیسے مکڑیوں کی طرح اس کے جسم پر رینگ رہی ہیں۔

مگر وہ تو مری نہیں تھی ——— میٹرن نے کہا تھا وہ پہاڑ پر چلی جائیے تو اچھی ہو جائے گی ——— کاش کاش وہ پہاڑ پر چلی جائے! شمن دعائیں مانگنے لگی۔

مگر نجمہ؟ رسول فاطمہ کے متعلق پشیمان ہو کر اُسے نجمہ کے خیال

میں غرق ہونے کا تھوڑا سا حق محسوس ہونے لگا۔

نیند نہ آئی، بے چینی سے وہ پلنگ پر لوٹتی رہی مگر نجمہ ایک خوفناک بے رحم خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی، جس وقت اس نے رسول فاطمہ سے نجات پائی تھی تو اسے خیال ہوا تھا کہ سانپ کو مار ڈالو تو ناگن آکر بدلہ لیتی ہے ——— تو ——— یہ نجمہ اس سے بدلہ لے رہی ہے۔

خوف سے اسے پھر رونا آنے لگا۔ اپنے پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سن سن کر وہ نیم جان ہوگئی، تڑپ تڑپ کر وہ نہ جانے کب سوگئی۔

۱۵

وہ ہر ممکن کروٹ سے لیٹی مگر نیند نہ آئی۔ نجمہ ایک بھیانک خواب کی طرح اس کے دماغ میں بھری ہوئی تھی جب اس نے رسول فاطمہ سے رہائی پائی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے سانپ کو کچل ڈالا۔ مگر پھر بھی اس کے دل میں دبا چھپا خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ اگر ناگ کو مار ڈالو تو ناگن بدلہ لینے آتی ہے۔ وہ اپنے ناگ کی مردہ آنکھوں میں دشمن کی تصویر دیکھ کر اسے ڈسنے پر تل جاتی ہے۔ تو یہ نجمہ اس سے رسول فاطمہ کے زخموں کا بدلہ لے رہی تھی دکھ اور خوف سے تڑپ کر وہ روئی ساری رات پلنگ کے چاروں طرف ناگنوں کی پھنکاریں سرسراتی رہیں جنھیں سن

سن کر وہ نیم جاں ہو گئی۔

صبح اٹھ کر اس نے سعادت سے بات نہ کی ـــــ وہ خود کھنچی کھنچی
نظر آ رہی تھی۔ شمن خاموش لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی
چھٹیوں کے تین دن پہاڑ بن بن کر اس کے تنہا اور مجروح جسم کو پیستے رہے
سعادت روز رات کو غائب ہو جاتی۔ اور پھر بورڈنگ میں شمن کو قبرستان
کا سا سناٹا چھایا نظر آتا لائبریری میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھی موٹی موٹی
ڈکشنریوں کو بے معنی نظروں سے گھورتی رہی۔ ان میں سے ایک میں بھی تو
اس کے مرض کا علاج نہ تھا۔ کسی خوفناک انجام کی آمد کے خوف سے وہ
سہمی جا رہی تھی۔ یہ اس کے دل کا غبار جو آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا کب
پھوٹ نکلے گا۔

جیسے کسی نے اس کی خاموش دعاؤں کی آہٹ سن لی اس کا دل
غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر تھوڑی دیر
اور نجمہ اسی طرح مذبذب دروازے میں کھڑی رہی تو یہ غبارہ پھوٹ ہی
جائے گا۔ مگر نجمہ آہستہ سے بڑھ کر الماریوں میں کتابیں دیکھنے لگی۔ وہ شمن
کی پیٹھ کے پیچھے کھڑی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی پیٹھ پر کوئی انگیٹھی
دہک رہی ہو۔ سارے جسم پر گرم گرم نقطے سے پھدکتے محسوس ہو رہے تھے
وہ سانس روکے کتاب کے صفحے پر جھکی رہی۔ غبارہ آہستہ آہستہ چٹکنے لگا۔
"ارے تمہارے پاس ہے یہ کتاب" میں کہہ رہی تھی کون لے گیا اٹھا کر"
نجمہ نے اس کے پاس کی کرسی گھسیٹی۔ شمن نے جلدی جلدی کتاب کے ورق
تن دہی سے لوٹنے شروع کر دیے۔

تھوڑی دیر نجمہ بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی فضول بکواس۔ اتنی دیر
شمن چوری چھپے اس کی ساٹن کی صدری جس کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے
تھے اور بغل میں دبا ہوا کافوری دوپٹے کا گچھا دیکھتی رہی۔ نجمہ بے چینی

ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ اس کی کاہی اطلس کی مچلتی ہوئی شلوار آہستہ آہستہ لہرا رہی تھی
پھر وہ ایک دم چپ ہوگئی اور بڑے غور سے شمن کے خوف زدہ اور مسرت
بھرے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگی۔

"شمی!" نجمہ نے اتنے آہستہ کہا جیسے کسی نے دو باریک بالوں کو
آپس میں رگڑ دیا ہو۔ شمن کی آنکھیں لرزتی ہوئی اٹھیں اور فوراً جھپک گئیں
نجمہ نے اپنی دو انگلیاں آہستہ سے شمن کی ہتھیلی پر رکھ دیں ۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ ایک دم اس کی ہتھیلی میں تشنج ہوا۔ اور وہ سمٹ کر
نجمہ کی انگلیوں کو نگلنے لگی۔ دروازے میں سعادت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نجمہ نے
تیزی سے اپنی انگلیاں چھین لیں۔ اور عجیب تھکی ہوئی سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر
مچلنے لگی۔

"سعادت!" اس نے ہمت کر کے کہا۔ "آؤ نا۔ کہاں چلی گئیں تھیں
میں تمھیں ...." مگر سعادت نے ایک تلخ جنبش سے اس کی بات
ٹال دی۔ اور بڑی مشغولیت سے کتابیں دیکھنے لگی۔

نجمہ سعادت کے پیچھے پیچھے گئی۔ شمن نے دیکھا وہ کسی اہم فیصلے کا فیصلہ
کرنے کے لیے گیلری کے آخری کونے پر رک گئیں۔ نجمہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی
جسے سعادت ٹال کر جانا چاہتی تھی۔ مگر نجمہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے
پکڑ رکھا تھا۔

جلد ہی یہ بات بورڈنگ میں پھیل گئی کہ سعادت اور نجمہ کی جنگ ہوگئی
نیز شمن پر بھی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں۔ گو یقین تو نہیں پھر بھی اہلِ نظر کا خیال تھا
کہ کچھ اس کا بھی دخل ہے۔ سعادت کا پرانا درد سر کا مرض عود کر آیا اور نجمہ کو
گوشت کی بو سے قے ہونے لگی۔ لہٰذا دونوں نے کھانا نہ کھایا لڑکیوں
کے گروہ کھسر پھسر کرنے اور قہقہے لگانے لگے۔ سعادت کی علالت طویل
ہوگئی۔ مگر نجمہ بدستور کھانے کے کمرے میں آنے لگی۔ وہ ایک دم سے

بہت ملنسار ہو گئی۔ جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات بھی نہ کرتی ان سے ہنس ہنس کر مذاق کرنے لگی۔ لیکن بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں ایک پوشیدہ فکر جھلکنے لگتی اس کا ہر مذاقیہ جملہ زبردستی ڈھالا ہوا معلوم ہوتا ویسے تو لڑکیاں اس کی بات کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیتیں، لیکن اس کے جاتے ہی جلی کٹی کہنے لگتیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ اس کی ظاہرہ خوش مزاجی کی اصل وجہ کیا تھی۔ اسے صرف سعادت کا غم مٹانے کے لیے ان کی مدد کی ضرورت تھی مگر کسی کو اسے رکھائی سے جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ کیونکہ وہ استانیوں میں کافی پسند کی جاتی تھی اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتی تھی۔

موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے شمن آہستہ آہستہ کسی نہ کسی طرح سے اس کے قرب میں رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ نہیں تو وہ اس کی ڈاک ہی پکڑنے کی فکر میں رہتی تاکہ اسے دینے کے بہانے ہی اس کے کمرے میں جا سکے بار بار کسی جملے کے معنی پوچھنے یا مفید کتاب کا پتہ معلوم کرنے اس کے پاس چلی جاتی۔ نجمہ کا رویہ بڑا اسلجھا ہوا ہوتا۔ اگر غلطی سے وہ ذرا بے تکلف ہو جاتی تو فوراً واپس کھنچ جاتی۔ اور جلدی سے اسے کمرے میں سے ٹال دیتا۔ یہاں تک کہ بعض وقت تو شمن کو اس کی رکھائی سے بڑی چوٹ لگتی تین دن ہو گئے۔ سعادت اور نجمہ کے درمیان پرچہ بازی ہوتی رہی لیکن ملاپ کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ اس عرصے میں نجمہ کئی دفعہ شمن کے کمرے میں بھی آئی۔ ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں۔ مگر کچھ خشک سی ہو کر فوراً چل دی۔ کئی بار دونوں باغ میں بھی ملیں۔ مگر عموماً خاموشی نے انھیں جلد ہی بھاگ جانے پر مجبور کیا۔

امتحان شروع ہونے والے تھے۔ یہ امتحان بھی بورڈنگ میں شاندار تہوار کی طرح آتے ہیں۔ کئی دن پہلے سے لڑکیاں ایک دوسرے کو وِش (WISH) کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھل پھول کا تبادلہ شروع ہو جاتا اور

بہت سی تو دوپٹے ساڑھیاں چوڑیاں وغیرہ دیتی لیتی ہیں۔ آپس کے لین دین سے زیادہ یک طرفہ دین ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ لڑکیاں جو دوسروں پر مرتی ہیں وہ بڑے دل کھول کر دیتی ہیں۔ وہ خواہ کتنی غریب ہیں وظیفے پر گزارہ کر رہی ہیں خیرات میں کتابیں اور ہدیے ملتے ہیں۔ مگر جس پر مرتی ہیں۔ اس کے لیے چوری کریں گی، ڈاکے ڈالیں گی۔ بھیک مانگیں گی مگر اپنی چہیتیوں کو دس دس روپے کی چوڑیاں، پانچ چھ روپے کے ہار پھول اور گجرے ضرور پہنا دیں گی۔

جس لڑکی کی زیادہ مرنے والیاں ہوں گی۔ اتنی ہی زیادہ اسے چیزیں ملیں گی۔ اس کے علاوہ عین امتحان کی صبح ہار اور گجروں سے لاد دیں گی اور بعض چہیتیاں تو ایسی پھولوں میں چھپ جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کسی بڑے لیڈر کا جلوس نکل رہا ہو۔ بعض مرنے والیاں پھولوں اور گوٹوں کے گہنے پہنا کر بالکل دلہن بنا دیتی تھیں اور پھر یہ دلہنیں شرماتی لجاتی امتحان کے کمرے میں چلی جاتیں۔ ہر مرنے والی کا ہار پہننا لازمی تھا۔ بعض حاسدوں کا خیال تھا کہ اتنے ہار مرنے والیوں کے نہیں ہوتے تھے بس دکھانے کو یہ لڑکیاں خود منگا کر پہن لیا کرتی تھیں تاکہ لوگ سمجھیں ان کی اتنی مرنے والیاں ہیں۔

شام ہی سے شمن نے بھی نجمہ کے لیے سوا روپے کا موٹا سا گجرا منگوایا رات کو جب تک وہ جاگتی رہی اس پر پانی چھڑکتی رہی۔ بار بار اس نے ان خوش نصیب پتیوں کو چھوا جو کل نجمہ سے معانقہ کرنے والی تھیں۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ان پتیوں کی آڑ میں چھپ رہتی۔

صبح اس نے گھبراہٹ میں ناشتہ بھی نہ کیا گجرے کو کبھی اس ہاتھ میں لیتی کبھی اس میں۔ وہ کس طرح نجمہ کے گلے میں ہار ڈالے گی۔ شاید سیتا جی کو رام چندر جی کے گلے میں ورمالا ڈالتے وقت بھی اتنی الجھن نہ ہوئی ہوگی۔ بلا سے انھیں مذاق اڑانے والی لڑکیوں اور میٹرن کی تیز نگاہ کا ڈر تو نہ تھا۔ اور یہ اجڈ غیر شاعرانہ دماغ کی لڑکیاں تو بس انسان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتی تھیں

وہ برآمدوں میں کھڑی ہو جاتیں اور چونکہ خود کسی پر نہ مرتی تھیں اس لیے ہر مرنے والی کی گھبراہٹ اور ہجروں کا مذاق اڑاتیں جس سے بعض وقت چہیتیاں بھی مجروح ہو جاتیں۔ اور عام کھسیانہ پن اور بدمزگی پھیل جاتی۔ مرنے والیاں بگڑتیں تو یہ دوسری لڑکیاں جو انھیں بازار والیوں کی طرح نیچ سمجھتی تھیں کٹتے ہوئے طعنوں سے ان کے کلیجے چھلنی کر دیتیں۔ ان کی کمزوریوں کو شائع عام پر کھول کر بکھیر دیتیں۔ مگر یہ مرنے والیاں بھی بڑے پتھر کے کلیجے والیاں ہوتی ہیں۔ کوئی طعنہ کوئی ملامت انھیں ان کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ بے حس اور بے حیا ہو جاتی ہیں۔ بعض تو ایسی مرنے والیاں تھیں جن کے گھر والے تک ان کے اس جنون سے عاجز تھے۔ اگر ان پر ذرا بھی سختی کی جاتی تو وہ پاگل سی ہو جاتیں اور پھر مجبوراً ان کے ساتھ رعایت کرنا پڑتی۔

جب پھولوں میں لدی پھندی نجمہ اپنے کمرے میں سے نکلی تو شمن کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ جیسے تیسے کر کے اس نے ہار نجمہ کے گلے میں ڈال دیا۔ نجمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کی قیمت ادا کر دی۔ لیکن بجائے امتحان کے کمرے میں جانے کے وہ سعادت کے پاس بیماروں کے کمروں میں چلی گئی۔ بن جانے کیوں شمن کے پیر بھی اس کے پیچھے پیچھے اٹھ گئے۔

الٹے پیروں وہ واپس ہوئی اور بوجھل پیروں کو گھسیٹتی ہوئی کھوئی کھوئی جماعت میں چلی گئی۔ وہاں تو اس کے دل پر جیسے منوں مٹی پڑ گئی۔ سعادت بالکل تندرست اور خوش بیٹھی تھی۔ اس کا گجرا جو اس نے اتنے ارمانوں سے نجمہ کو دیا تھا جوڑے میں لپیٹے ہوئے تھی۔

سعادت اور نجمہ پھر ایسے ہی ملنے لگیں۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نجمہ کے امتحان ختم ہو گئے اور اب سعادت اور شمن کے امتحان شروع ہوئے شمن نے نجمہ کو سوا روپے کا گجرا پہنایا تھا۔ اس نے سعادت کے لیے تو

تھیں دل ہار پھول منگائے۔ مگر ثمن کے لیے شاید ہار منگانا بھول گئی۔ اسے کسی نے بھی ہار نہ پہنائے۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ چوری چھپے خود ہی ہار منگا کر پہن لیتی پھولوں میں لدی ہوئی لڑکیوں کی قطار میں کے آخر میں سر جھکائے وہ امتحان کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"ثمن .... بھئی مجھے گجرے نہیں اچھے لگتے۔ یہ پھول میں گھر سے لائی ہوں۔ اچھے ہیں نا ــــــ" بلقیس نے اسے مڑ کے شگفتہ پھولوں کا گچھا دکھا دیا۔ بلقیس ڈے اسکالر تھی اور آٹھویں میں پڑھتی تھی۔ ثمن کو معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا ننگا تن ڈھانک دیا اور اسے باغ کے باغ بخش دیے۔ پرچہ کرنے میں اس کا دل نہ لگا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے رعایتی ترقی ملی۔

امتحان کا نتیجہ معلوم ہوتے ہی چھٹیاں ہو گئیں۔ اور دو مہینے کے لیے لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیں۔ بسیرا لینے کے لیے پھر سے چڑیاں اڑ گئیں۔ دو مہینوں کا بسیرا!

دوسری منزل

۱۶

دوبارہ جو وہ اسکول میں آئی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ بلقیس کی بڑی بہن جو حال ہی میں انگلینڈ سے آئی تھیں پرنسپل ہو گئی تھیں۔ اور بلقیس اور اس کی چھوٹی بہن جلیس مع لمبے چوڑے خاندان کے پرنسپل صاحبہ ہی کے ساتھ اسکول کے احاطے میں آن رہی تھیں۔ سعادت کو ڈاکٹروں نے ایک سال کے لیے پڑھنے کو منع کر دیا تھا۔ اس کی صحت میں گھن سا لگ گیا تھا۔ نجمہ پاس ہو کر کسی اور کالج میں لاہور چلی گئی تھی۔ شمن کو دنیا سنسان اور اجاڑ معلوم ہوتی۔ دل میں تنہائی کی ہوکیں سی اٹھتیں۔ نجمہ کا خیال پھوڑا بن کر ٹیسیں مارتا۔ اس میں کس قدر دکھ بھرا ہوا تھا مگر زندگی کی چاشنی بھی تو تھی۔ نجمہ نے اسے اپنی ایک تصویر بھی دی تھی جسے اس نے اپنا بہترین مونس و غم خوار پایا۔ سعادت بھی اسے اب بہتر رنگ میں یاد آتی۔ ویسے جہاں نجمہ کا سوال نہ تھا وہ اس کی بہترین دوست تھی کاش اس نے نجمہ کو کبھی دیکھا نہ ہوتا اور اگر دیکھا تھا تو؟ وہ آگے کچھ نہ جانتی تھی مگر اسے سعادت سے دوستی ٹوٹ جانے کا صدمہ تھا نجمہ تو ایک شعلہ تھی کہ وقتاً فوقتاً ہاتھ تاپنے کی حاجت ہو۔ مگر سعادت ایک میٹھا چشمہ تھی جس سے کلاس میں کلاس سے باہر کھیل کود میں بھی بے پناہ رنگینیاں اور ہمدردیاں وابستہ تھیں۔

سعادت کو ہنسنے کا مرض تھا وہ اور شمن ذرا ذرا سی ______ باتوں پر گھنٹوں چمن کے سبزہ پر لوٹیں لگاتیں۔ سعادت بہت ہوشیار تھی اور وہ ایک معلم جیسی مدد بھی دیتی یہی نہیں وہ اگر شمن کو بد دل یا مست دیکھتی تو بڑی سختی سے ڈانٹتی۔ شمن کو اس کی ڈانٹ میں مادرانہ پیار اور فکر کی جھلک نظر

آتی اور بعض وقت وہ اترانے کے لیے فخر سے نخرے دکھاتی۔ "تمھاری بلا سے ہمیں فیل ہو جانے دو" وہ اترا کر کہتی۔

"بس جی بس، زیادہ بکواس نہ کرو ـــــ ورنہ" سعادت ڈانٹتی۔

"ورنہ ـــــ ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہ ـــــ کہ...... کچھ نہیں ـــــ میری پیاری بہن کیسی ـــــ آؤ" اور وہ شمن کے گلے میں باہیں ڈال دیتی...... مگر جب نجمہ آئی تو؟...... تو سارا شیرازہ بکھر گیا۔ اور شمن سعادت کی موت کی دعائیں مانگنے لگی اس کے سفلی جذبات بالکل شیطانی اعمال بن گئے توبہ!

بلقیس / جلیس
اوور ڈرامے

بلقیس سے شمن کی دوستی بھی عجیب وغریب طریقے پر ہوئی ایک دن بلقیس اور وہ بڈمنٹن کھیل کر پسینہ سکھانے کے لیے چمن کی بنچ پر بیٹھی تھیں کہ ایک دم سے بلقیس نے پوچھا۔

"تم نجمہ پر مرتی تھیں نا؟"

"نہیں ـــــ نہیں تو ـــــ واہ" شمن گھبرا گئی اور قسمیں کھانے لگی۔

"ارے ہم سے جھوٹ بولتی ہو ـــــ ہونہہ ـــــ جیسے ہم جانتے نہیں اور سعادت تمھاری جلتی تھی ـــــ کیوں؟"

"جی ہاں کبھی بھی نہیں"

5 بلقیس

"تو اس میں بات ہی کیا ہے میں خود پہلے نجمہ پر مرتی تھی۔ مگر آپا بی نے مجھے بتایا کہ لڑکیوں کو ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیے"

"توبہ!" شمن نے بدک کر کہا۔

"ہاں اور کیا۔ ان سے تو شادی کر کے ہمیشہ ساتھ بھی رہ سکتے ہیں کیوں ہے نا بھئی"۔

" مگر .... یہ تو .... ہائے اللہ بری باتیں نہ کرو

بلقیس "۔

" اس میں بری بات کیا ہے۔ جبھی تو مجھے اب کوڑیالے اچھے لگتے ہیں۔ میں بڑی بھی تو ہوں تم سے "۔ بلقیس روش پر سے کنکریاں چن کر ہوا میں اچھالنے لگی۔

" کوڑیالے "

" ہاں ــــ ارے، کوڑیالے! تم نہیں جانتیں کیا ہوتے ہیں ــــ جیٹھو بھی الّو ہو تم "۔ بلقیس قہقہہ لگا کر گھاس پر لوٹ گئی۔ " ارے کوڑیالے نگلی ــــ کالے اور سفید "۔ اس نے ٹھنڈی گھاس پر گال رگڑ کر ہلکی سی پھریری لی ــــ " زہریلے نف .... " نماز کی گھنٹی بج گئی اور دونوں بات ختم نہ کر پائیں۔

دو تین دن بلقیس کھیلنے ہی بورڈنگ میں نہ آئی جو شمن کی الجھن دور ہوتی۔ اس کے جی میں کھُد بُد ہو رہی تھی۔ اس کا جی نہ مانا اور اس نے لغت میں دیکھا مگر اس میں لکھا تھا: " کوڑیالے .... چتی دار سانپ، سیاہ اور سخت زہریلے .... جن کے کاٹے .... "۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوڑیالے سانپ بلقیس کو کیوں پسند ہیں۔

" بی بتا دو نا کوڑیالے کون ہوتے ہیں؟ " اس نے موقع پا کر پوچھا۔

" کوڑیالے دل کے ٹکڑے، جان ہوتے ہیں۔ اور کون ہوتے "۔

" اونہہ تو بتا دو نا "۔

کئی دن شمن پوچھتی رہی اور بلقیس ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔ مگر ایک دن اس نے شمن کو ایک تصویر دکھائی یہ ایک وجیہہ نوجوان کی تھی جو سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ پہنے تھا۔ ایک دم وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگیں۔ " اچھا تو یہ تھے کوڑیالے! کالی شیروانی یونیورسٹی کا یونیفارم تھا

اور یہ تصویر رشید کی تھی۔

ویسے بلقیس اور جلیس بورڈنگ میں نہیں رہتی تھیں پر جب کبھی ان کا دل چاہتا وہ سارے قوانین بالائے طاق رکھ کر بورڈنگ میں آن دھمکتیں پرنسپل کی بھانجیاں تھیں بھلا کس کی مجال تھی جو چوں بھی کر جائے۔ پھر ان کا دل لگنے لگا اور بلقیس ثمن کے کمرے میں مستقل رہنے لگی۔ مگر جب جی چاہتا بغیر اجازت بھاگ جاتیں۔ جلیس بدمزاج تھی اور نوری کی جماعت میں تھی وہ دونوں ایک کمرے میں رہتیں مگر روز جوتا چلتا۔ ثمن اور بلقیس نہایت بزرگانہ طریقے پر انھیں سمجھانے جاتیں اور ملاپ ہو جاتا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا دوپٹہ اوڑھے ہاتھ گلے میں ڈالے چمن میں گھومنے لگتیں۔

پہلے پہل تو نوری نے بلقیس پر مرنے کی کوشش کی اور جلیس نے ثمن پر مگر بلقیس نے نہایت جنگلی پن سے دونوں کو کھسیانا کر دیا اور پھر کچھ سوچ بچار کے بعد نویں جماعت کی ایک لڑکی کو دونوں نے چاہنا شروع کر دیا۔ مگر بلقیس نے وہاں بھی ناک میں دم کر دیا۔ جہاں کوئی چیز گم ہو جاتی وہ فوراً چلا چلا کر جلیس اور نوری پر الزام لگاتی کہ وہ اپنی چہیتی کو دے آئی ہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ بچاریاں بلقیس اور ثمن کے منگائے ہوئے پھلوں میں سے دو نارنگیاں چرا کر دے آئی تھیں۔ مگر اب بلقیس کی سڑی ہوئی چپل بھی گم ہو جاتی تو وہ یہی کہتی کہ نوری اور جلیس اپنی دوست کو کھلا آئیں۔ اس پر نوری اور جلیس خوب روتیں اور خوشامدیں کرتیں کہ ہولے ہولے بولو کہیں وہ سن نہ لے۔ شاہ جہاں ان دونوں سے دوگنی بڑی تھی اور زیادہ منہ نہ لگاتی۔ پر جب اس نے بلقیس کا ڈکرانا سنا تو دونوں کو کمرے سے نکال دیا۔ دونوں روتی ہوئی بچھونوں پر جا پڑیں اوپر سے بلقیس اور ثمن نے بھی چھیڑنا شروع کیا خوب گیت جوڑ جوڑ کر ٹہل ٹہل کر گائے۔ نوری اور جلیس قسمیں کھا کر کہتی تھیں کہ "شاہ جہاں آپا نے ہمیں نکالا تھوڑی یہ کہا" مہربانی سے چلی

جایئے ـــــ" مگر بلقیس کہتی تھی کہ شاہجہاں نے پہلے تو دھکا دیا اوپر سے
چپلیں لگائیں تب بے چاریوں کے دل ٹوٹ گئے۔ اور اس دن سے شاہ جہاں
کی جانی دشمن ہو گئیں۔ جلیس ویسے ہی دل جلی تھی بے چاری کا ناطقہ تنگ کر دیا
اس تلخ تجربے کے بعد دونوں نے مرنے کی مزید کوشش نہ کی۔ اور زیادہ تر
وقت بدذاتی کرنے، کچے آم توڑنے اور مرنے والیوں کو دق کرنے میں صرف
کرتیں۔

بلقیس کی پانچ بہنیں تھیں ان میں سے سب سے بڑی پرنسپل تھیں، بڑی
حسین نازک سی اور شرمیلی سی کسی طرح پرنسپل نہ لگتیں۔ ساری کی ساری
لڑکیاں ان پر لٹو ہو گئی تھیں۔ تہمن خود لٹو ہو جاتی اگر اس نے بلقیس سے ان
کا کچا چٹھا نہ معلوم کر لیا ہوتا۔ جناب بہت ڈرپوک تھیں۔ بیڈمنٹن کھیلنے میں
ہار جاتیں تو لڑنے لگتیں اور کم از کم گیارہ آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا
رہی تھیں۔ جن میں سے دو تو پروفیسر تھے اور باقی کوڑیالے۔

پرنسپل کی بہن ہونے کی وجہ سے بلقیس بورڈنگ میں الٹے سیدھے حکم
چلایا کرتی تھی۔ کھانے کے کمرے سے سوائے بیمار لڑکیوں کے اور کسی کو کھانا
کمرے میں منگوانے کی اجازت نہ تھی، اور اگر ایک گلاس بھی ادھر سے ادھر ہو جاتا تو
آفت آجاتی۔ مگر بلقیس کے کمرے میں جھوٹی رکابیوں کے ڈھیر سڑا کرتے میٹرن
دیکھتی اور خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ کیونکہ اس سے پہلے میٹرن صرف
اس لیے نکال دی گئی تھی کہ وہ آئے دن لڑکیوں کی رپورٹ دفتر میں لے جاتی تھی
اور لڑکیوں میں بلقیس اور جلیس اور ان کی چند لاڈلیاں تھیں اور لڑکیاں بھی
بلقیس، جلیس کی خوشامدوں میں لگی رہتیں۔ خصوصاً وہ بدنصیب بچیاں جنہیں
بورڈنگ سے کھانا مفت ملتا تھا یا فیس معاف تھی وہ اپنی دانست میں پرنسپل صاحبہ
کی خیرات پر پلتی تھیں۔

بلقیس کوڑیالوں کے نت نئے قصے آکر سناتی وہ اور جلیس کافی چھوٹی تھیں

جبھی سے ان کے کوڑیالوں کی تعداد اطمینان بخش تھی پانچوں بہنوں کے سارے عاشق اگر جمع کیے جاتے تو خاصی پلٹن بن جاتی۔ آہستہ آہستہ بورڈنگ میں کوڑیالوں کا ذکر عام ہونے لگا۔ ڈے اسکالر لڑکیوں کے بھائی پند چٹکلوں اور قصوں کے ذریعہ بورڈنگ کی نیم مردہ زندگی میں رس رچانے آنے لگے چھوٹی موٹی خرید و فروخت، پرانی کتابوں کی ردو بدل لاسکی کے سلسلے سے زندگیاں آگے چلنے لگیں اور فلم دھلوانے یا پرنٹ بنوانے کے بہانے عشق لڑنے لگے۔ بالکل جیسے ہزار سال پہلے کی دنیا میں لوگ تصویروں پر عاشق ہو جاتے تھے اسی طرح یہ نادیدہ عشق بھی چلتے لڑکھڑاتے اور گرتے پڑتے اور یہ کوڑیالے تھے بھی غضب کے۔ اور کچھ نہیں تو لڑکیوں کے نام عید کارڈ ہی چلے آرہے ہیں۔ بگڑ رہی ہیں، کوس بھی رہی ہیں۔ لیکن سارے بورڈنگ میں گھمائے جا رہے ہیں، ہر ایک کو فخریہ دکھائے جا رہے۔ ایسے گویا کچھ پرواہ ہی نہیں دیکھ دیکھ کر لوٹ گیاں ـــــ اوئی اور ہائے توبہ چلا رہی ہیں۔ ایک عورت اور مرد ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ نیچے ٹیڑھے میڑھے شعر لکھے ہیں۔

آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا ہر لڑکی نے اپنے چچیرے ممیرے خلیرے بھائی کا رومان جوڑ جاڑ کر سنانا شروع کیا۔ بلقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی اس کے بھائی کے جتنے دوست تھے وہ سب تو رجسٹرڈ عاشق تھے اور بھی جیسے پتنگ بڑھانا ہوتے وہ بھائی رشید سے دوستی کر لیتا اور اس بہانے مزے سے امیدواروں میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔ جتنے بھی کالج میں روشن خیال انقلابی لڑکے تھے وہاں مختلف سماجی اور سیاسی مشکلات پر بحث کرنے اور آئندہ پود کو روشن خیال بنانے کی تجویزیں سوچنے آجایا کرتے۔ سب نہیں نہایت روشن خیال نمونہ لباس شب خوابی ہی میں ان سب سے ملتی جلتیں۔ تاش کیرم کا زور بند تھا۔ نغمہ سرائیاں ہوتیں۔ باغیانہ بحثیں ہوتیں۔ کوئی کھٹر دل تمھی نہیں سب کے سامنے عشق چلتے پرنسپل صاحبہ کا بنگلہ روشنی سے

معمور تھا جس میں پانچوں بہنیں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جگمگایا کرتیں۔
رات کو کھسر پھسر بلقیس ان کے قصے سناتی۔ بارہ بج جاتے مگر ختم نہ ہو پاتے ایک دو ہوں تو کوئی بھگتے یہ ان عاشقوں کی فوج سے کون نہ اکتا جائے گا۔ بابر مرزا تھے تو آپا ہی کے عاشق مگر گدگدیاں بلقیس کے بھی کیا کرتے۔ حیدر صاحب تو آپا کی عمر والے تھے مگر اس پر دیوانے تھے۔ وہ تین قلم ان سے چھین چکی تھی جن میں سے ایک اس نے شمن کو دے دیا تھا۔ وہ تو ان کی انگوٹھی بھی چھین لیتی مگر انھوں نے ہنس کر کہا تھا کہ وہ دلی سے ننھی منی انگوٹھی منگوا رہے ہیں۔
"یہ انگوٹھی تو تمہاری کمر میں آ جائے گی۔" انھوں نے اس کو دونوں ٹانگوں میں بھینچ کر اس کی کمر کو اپنی انگلیوں کے چھلے میں لینے کی کوشش کی جس سے اس کو بڑی گدگدی ہوئی تھی۔ شمن یہ قصے سنتے سنتے شل پڑ جاتی۔
"تو کیا تم ان سے۔"
"تو کیا تم ان سے شادی کر لوگی؟"
"بھئی کیا پتہ، دیکھو کیا ہوتا ہے۔"
"اگر تم حیدر صاحب سے شادی کر لوگی تو بیچارے عباس کا کیا ہوگا؟ انصار تو اللہ قسم مر جائے گا۔ اور عشرت، یہ ڈیڑھ بالشت کا عشرت بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ چہ توبہ۔" شمن کو ان سب پر ترس آنے لگا۔ "ہا! بیچارے عاشق!
اچھی، تو میں کیا کروں۔ آخر یہ سب جلیس پر.......... اس بے چاری کا ایک کالیا ہے اور ایک بے چارا ادھا نفیس ——— چہ نفرت، میں تو تھک گئی۔" وہ عاجز ہو کر کہتی اور سچی بات تھی ان انقلابیوں میں زیادہ تر غریب، جسمانی طور پر ٹھٹھرے، چیچک مارے اور زرد سیاہ ہی تھے جو اپنی روح کو تسلی دینے کی خاطر حسن کی جلا چاہتے تھے اور پروانوں کی شمعوں کے متلاشی تھے۔ جلیس سب سے چھوٹی تھی پھر بھی آثار یہ کہتے تھے کہ اپنے زمانے کی نادر شاہ نکلے گی۔ ٹوٹے پھوٹے رنگروٹ ابھی سے قطاریں باندھ رہے تھے۔

کاش بلقیس اپنے عاشقوں میں سے ردی ردی چھانٹ کر بورڈنگ کی لڑکیوں کو
دے دیتی جو بے چاریاں خیالی پلاؤ سونگھا کرتی تھیں۔

"تم بھی اپنی باتیں بتاؤ" بلقیس کہتی۔

"واہ۔ ہماری کوئی بھی بات نہیں"۔

"چہ کیسی ہو تم۔ تمہیں کوئی نہیں چاہتا؟"

شمن کا دل بجھ جاتا شرم اور احساسِ کمتری سے اس کے گال تمتما جاتے لہذا ایک دن ـــــ اس نے سوچ بچار کے بعد نام لے ہی دیا۔ حالانکہ اسے اپنے سارے سگے سوتیلے اور رشتے کے بھائیوں سے نفرت تھی۔ اور وہ بھی تو ہمیشہ اسے دق ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی تو ویسی بھائیوں جیسی حرکت نہ کی تھی جس کا دوسری لڑکیاں مزے لے لے کر ذکر کرتی تھیں مجبوراً ہی اس نے اسحاق بھائی کا نام لے دیا تھا۔ لیکن اسے خوب معلوم تھا کہ اگر ان کے یا ان کی بیوی کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پہنچ جاتی کہ شمن ان کے عشق کے قصے گھڑ کر سناتی ہے تو آفت آجاتی۔ وہ اماں سے جوتے لگوائے جاتے کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا۔ اسے ویسے سوائے اسحاق بھائی کے سب ناپسند تھے۔ ان کی بڑی لڑکی سے اس کی دوستی بھی رہ چکی تھی۔

"تو وہ تمہیں پیار کرتے ہیں؟"

پیار سے شمن کو نفرت تھی۔ دوسرے اسحاق بھائی سے پیار کروانے کے خیال سے اس کا دم لوٹنے لگا تھا۔ "کستی کی کہ جب وہ دودھ کے جھاگ مونچھوں میں سے چوس لیتے تو اسے ابکائی آجاتی تھی"۔

"واہ پیار نہیں کرتے تو تمہیں کیا چاہتے ہیں!" بلقیس کو اس پہ رحم آنے لگا تو شمن نے جی کڑا کر کے سوچا کہ اگر اتنی دور سے وہ اسحاق بھائی سے پیار کروالے تو اس کا جی کیسے متلا سکتا ہے۔ لہذا اس نے شرماتے ہوئے اقبال کر ہی لیا کہ اس نے پیار کیا تھا۔ اسحاق بھائی سے ایک قلم چھیننے کا

ذکر بھی اس نے خوب مزے لے لے کر بیان کیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اسحاق بھائی کے پاس صرف سڑے ہوئے ٹب اور کھرچے ہوئے پولڈر تھے جو کوئی بے وقوف کبھی چھیننے کا ارمان نہ کرے گا۔ پر بلقیس کو کیا خبر؟

بلقیس اور شمّن کی دوستی ایسی بڑھی کہ دن رات ساتھ رہتیں، ساتھ اٹھتی بیٹھتیں اور ساتھ ہی پڑھتیں۔ بلقیس اسے بہت پسند تھی، سعادت سے بھی زیادہ، پتہ نہیں۔ نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی۔ دہکتی ہوئی شراب اور بلقیس صاف نتھرا ہوا پانی، میٹھا پانی۔ گو وہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اتار دیتی تھی۔ نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر چیونٹیوں اور مچھروں کے کاٹے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی۔ اگر کوئی آ جاتا تو وہ خود جھینپ کر لوٹ جاتا۔ بلقیس کو ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔

"واہ بھلا لڑکیوں سے کیا شرم؟" وہ ڈھٹائی سے کہتی۔ ایک دفعہ میٹرن نے ڈانٹا تو بلقیس نے اس سے کہہ دیا کہ "چونکہ تمہارا جسم چھکڑے جیسا ہے اس لیے مجھ سے جلتی ہو۔" اس پر میٹرن رو بیٹھی اور بلقیس کو بھی ڈانٹ پڑی مگر وہ کہیں سننے والی تھی۔ اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی۔ کبھی اس کے ہونٹ جھوٹ موٹ روٹھنے کے انداز میں آپ ہی آپ ابھر آتے اور کبھی خود بخود جھینپ کر وہ آئینے کے پاس سے بھاگ آتی۔ نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دبک جاتی۔ جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے رونگٹے سونے کے تاروں کی طرح چمک اٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی۔ لیکن گھنٹوں وہ فیصلہ نہ کر پاتی کہ اودی شلوار پر کپاسی دوپٹہ اوڑھے یا کاسنی! وہ اس

بارے میں شمن سے رائے لیتی۔ شمن بے چاری گردن موڑے موڑے بتا
دیتی) اسے کچھ ڈر سا لگتا تھا بلقیس سے کیونکہ کئی دفعہ باتیں کرتے ہیں اس کا دل
بے اختیار اس کی گردن پر انگلیاں پھیرنے کو چاہنے لگتا وہ نرم نرم سڈول سی
گردن جسے وہ بڑے پیارے انداز سے ایک طرف موڑے رہتی۔

بھائی رشید کو پہلے تو بلقیس کا ایک عاشق ہی سمجھتی تھی کیونکہ ان کی ایک تصویر جو اس نے کوڑیالوں کی تشریح کے سلسلے میں دکھائی تھی، میز پر اب بھی رکھی تھی جب بلقیس نے بتایا کہ وہ اس کے سگے بھائی ہیں تب وہ سمجھی یہ بھی اسی خاندانی خوبی کے حامل تھے۔ جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا تین چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔ وہ خود تو چاہے فیل ہو جاتے ہوں مگر جن لڑکیوں نے ان سے دو چار سبق لے لیے وہ شرطیہ کامیاب ہو گئیں۔

"خدا قسم تم فوراً مر جاؤ گی رشید پر۔" بلقیس شمن سے کہا کرتی۔ مگر شمن کو بورڈنگ سے باہر قدم رکھنے کی تو اجازت نہیں تو پھر بھلا مرنے کا موقع کیسے ملتا۔

مگر قسمت نے ایک عجیب طریقے سے اسے رشید سے ملوا دیا۔ سالانہ پکنک کے موقع پر پرنسپل صاحبہ اپنے بھائی اور چند نوجوانوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ سب دوسری موٹر میں گئے اور پیڑوں کی آڑ میں نہاتے دھوتے رہے وہ تو لڑکوں کو اس خیال سے لے گئی تھیں کہ کوئی لڑکی ڈوب ڈاب جائے تو وہ لوگ نکال لیں۔ وہ سب دور ہی دور تھے لہٰذا پردہ ہی پردہ تھا پر لڑکیوں کے دل ادھر ہی ادھر لگے ہوئے تھے لہٰذا پردہ سا تھا۔ وہ بھول بھول کر ادھر جا نکلتیں چیخ چیخ کر ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے کو دھکے دے رہی تھیں۔

"شمن رشید سے ملوگی؟" وہ ادھر ہے پیڑ کے پیچھے۔" بلقیس نے الگ لے جاکر کہا۔

"واہ بھئی میرا پردہ ہے" شمن نے گھبرا کر کہا۔

"اوہو تم چلو تو میں اس کی آنکھیں بند کر لوں گی۔"

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ بلقیس اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں بند کر دے گی۔ پھر شمن جھجکتی ہوئی گئی۔ رشید کا قد لمبا سا تھا اور جسم چھریرا آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی تھی جس سے ناک بھی چھپ گئی۔ صرف ہونٹ کھلے تھے اور آہستہ آہستہ تھرک رہے تھے۔ جیسے اسے سخت ہنسی آ رہی ہو گھنے بالوں کا ایک جنگل سر پہ کھڑا تھا۔ مچل مچل کر دوپٹے کے بیچوں میں سے بال نکل رہے تھے۔ گریبان کا ایک بٹن کھلا تھا۔ جس میں سے اس کی کھوری گردن کی نسیں ہنسی روکنے کی وجہ سے پھڑکتی نظر آ رہی تھیں۔

"ہی ہی ہی" وہ ایک دم سے ہنس پڑا۔ شمن اور بلقیس بھی ہنسنے لگیں رشید ٹٹولنے لگا۔

"ارے بھئی! کہاں ہیں یہ تمھاری دوست شم شم۔ ان سے کہو ہم سے ہاتھ تو ملائیں۔" بلقیس نے اسے بہت گھسیٹا مگر وہ نہ مانی۔

"دیکھو بھئی۔ پھر ہم زبردستی پکڑ لیں گے ہاں پھر برا نہ مانے کوئی، ہم آنکھیں کھولتے ہیں۔" رشید نے دھمکی دی۔

مجبوراً شمن نے اپنا ڈرا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رینگا دیا۔ پھر فوراً چھڑانے لگی کیونکہ رشید نے تو مضبوط پکڑ لیا۔

"ارے یہ تمھاری شم شم کا ہاتھ ہے؟ نہیں جی یہ تو چڑیا کا پنجہ ہے" شمن نے ہنسی روکنے کے لیے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"تو کیا ایک ہی ہاتھ ہے بس؟ اور باقی کا جسم؟ ارے بلی ان کے پیر بھی ہیں یا نہیں؟"

"ہیں"۔ بلقیس ہنسی دبا کر بولی۔

"کتنے؟"

"دو...... کھی کھی"......"

"اچھا! اور ۔ اور بلّی ان کے کان؟ ___ کان ہیں؟"

"ہاں ہاں کھی"۔

"اور ناک؟" شمن ہاتھ چھڑانے کے لیئے دوہری ہو ہو گئی مگر بے کار۔

"بھئی ایسی باتیں کرو گے تو ہم بولیں گے بھی نہیں"۔ بلقیس نے کہا۔

"اچھا جانے دو ___ یہ بتاؤ ناک کہاں ہے؟ ان کی ناک؟"
رشید نے پھر ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھوں کی طرح اس کی انگلیاں ٹھٹکتی ہوئی شمن کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ بھویں۔ پلکیں۔ نتھنے۔ ہونٹ۔ یہاں تھوڑی دیر کو ٹھٹک گئیں۔ پھر گالوں پر سے ہوتی ہوئی بالوں پر۔

رشید شمن کے چہرے کو ٹٹولتا

"ارے بلّو! ان کے چٹیا تو ہے ہی نہیں! کیسی ہے چٹیا؟" وہ اس کا کان ٹٹولنے لگا۔ ہنسی کے مارے دونوں کا برا حال ہو گیا اور شمن جھٹکا مار کر بھاگی۔

"ارے بے ایمانی ___ بے ایمانی ___ ارے پکڑ لو بلّی"۔
رشید نے دوپٹہ نوچ کر شمن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ گئی۔

شمن۔ بلقیس اور رشید

لیکن اب اس کی جھجک ٹوٹ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بہانہ بنا کر پھر بلقیس اور وہ رشید کے ساتھ کھیتوں میں خربوزے چرانے گئیں۔ وہاں اس نے دونوں کو کیچڑ میں گھٹنوں تک پھنسا دیا۔ وہاں سے نکل کر جامنوں کی تاک میں لگ گئے۔ دونوں نے اپنے دوپٹے بچھا دیئے اور بھاگ بھاگ کر کچی پکی جامنیں بیننے لگیں۔ رشید کو لڑکیوں کے دوپٹوں کا استعمال بہت اچھا آتا تھا۔ وہ بجائے انھیں لڑکی کے کندھوں کے اپنے سر پر باندھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔
اور پھر دوپٹوں کی گیندیں کیا عمدہ بنتی تھیں۔ وہ زور کی چوٹ لگتی تھی کہ بس۔

جب پکنک سے لوٹ کر آئی تو شمن کو معلوم ہوا وہ بادلوں میں جھول کر آئی ہے
پلنگ پر لیٹ کر سونے سے پہلے اس نے پوری پکنک کو شروع سے لفظ بہ لفظ دہرایا
بلقیس کے دوپٹے میں سے رشید کے مچلتے ہوئے بالوں کے گچھے، وہ اس کے بیچین
ہونٹ اور گردن کی کپکپاتی ہوئی نسیں اور پھر ایسا معلوم ہوا رشید کا ہاتھ رینگ
رہا ہے۔ اس کے ماتھے پر، بالوں پر، نتھنوں پر، ہونٹوں پر آ کر رک گیا۔ جلدی سے
اس نے گردن دیوار کی طرف موڑ لی اور سو گئی۔

صبح ہی بلقیس نے بتایا کہ رشید اس پر بے طرح عاشق ہو گیا ہے۔
"ہٹو! تمہیں کیسے معلوم؟" شمن کا دل دھڑکنے لگا۔
"میں پہچان لیتی ہوں۔ جیسے ہی تمہارا نام لو سرخ ہو جاتا ہے اور کیا۔"
"شمن خود رشید کے نام سے لال سرخ ہو گئیں۔ لہٰذا گھل مل کر دونوں رشید کی
باتیں کرتی رہیں۔ مگر کسی بہانے سے بھی وہ رشید سے نہ مل سکی نہ ہی اس کا دل ایسا بیقرار
تھا۔ اچھی بھاری خوراک مل چکی، ابھی وہی ہضم نہیں ہوئی تھی چلتے پھرتے اٹھتے
بیٹھتے پکنک کی بہاریں آنکھوں میں سمائی رہتیں۔

لیکن خدا شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ بلقیس کی سالگرہ نے دنیا ہی بدل
دی۔ اس کی جماعت کی ساری لڑکیاں اور کئی سہیلیاں جن میں شمن بھی شامل تھی
مدعو کی گئیں۔ شمن کے پاس کوئی تحفہ بھی نہ تھا صرف ایک سر پر باندھنے کا ریشمی رومال
تھا۔ وہی اس نے کاغذ میں لپیٹ کر چپکے سے بلقیس کو دے دیا۔ مگر بلقیس مارے
شرارت کے سارے ہال میں اسے نچاتی پھری۔ شمن نے دروازے کی آڑ میں سے دیکھا
کہ وہ اسے اپنے سر پر باندھ رہی تھی کہ رشید نے آ کر چھین لیا اور دوپٹے کی طرح اوڑھ
کر منہ چڑانے لگے۔

"اوں۔۔۔ شمن دیکھو یہ رشید نہیں مانتے۔ بھئی ہمارا رومال ہے" مگر رشید
رومال لے کر باہر بھاگ گیا۔

"دیکھو بھئی منع کر دو رشید کو، ہمارا رومال چھین لیا" اس نے شمن سے شکایت کی۔

پھر وہ کھڑکی میں سے رومال کا حشر دیکھنے لگیں۔ رشید اسے گلے میں ڈالے ہاکی کھیل رہے تھے۔

شام کو سب لڑکیاں وغیرہ تو چلی گئیں مگر شمّن کو پرنسپل صاحبہ کی خوشامد کرکے بلقیس نے روک لیا وہ دونوں اور جلیس مل کر کیرم کھیل رہی تھیں کہ رشیدؔ دراتے چلے آئے۔

"رشید رشید ارے پردہ ہے پردہ!" بلقیس اور جلیس چلّائیں اور شمّن کو دوپٹوں میں چھپانے لگیں۔

"کس کا پردہ ہے؟ لڑکیاں تو گئیں!"

"نہیں بھئی شمّن نہیں گئی۔ ارے بھئی رشید۔ آپا بی رشید نہیں مانتے۔"

"دیکھو جی اگر آپا بی سے شکایت کی تو ہاں بس" رشید نے دھمکی دی۔ "پردہ ہو یا نہ ہو ہم کیرم ضرور کھیلیں گے۔" وہ گھس ہی آئے۔

تھوڑی سی حیل و حجّت کے بعد یہ طے ہوا کہ رشید اپنا منہ ڈھانک کر کھیلیں بلقیس اور شمّن ایک طرف اور جلیس اور رشید دوسری طرف۔

"بھئی کچھ بد کر کھیلو ویسے مزہ نہیں آئے گا۔"

"اکنّی اکنّی" جلیس بولی۔

"نہیں بھئی رشید لوٹ کر رکھ دیگا۔ ہمیں دو دو پیسے" بلقیس چلّائی۔

"اچھا بھئی میں ہاروں تو اکنّی دوں گا اور تم ہاروگی تو چٹکی۔"

"نہیں نہیں جناب چٹکی کی نہیں ہے ایسی زور سے مارے گا کہ کیا بتاؤں۔" بلقیس نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

بڑی مشکل سے یہ طے ہوا کہ رشید کی اکنّی اور ان دونوں کی چٹکی۔ مگر ہلکے کی۔ زور سے مارنے کی نہیں۔ پردے کی وجہ سے رشید وہی ریشمی رومال کا گھونگھٹ کاڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور اب کھیل شروع ہوا۔

چھیڑنے کے لیے انھیں سب دلہن دلہن کہہ رہے تھے۔ رومال باریک تھا اور

اور اسیں سے ان کی آنکھیں صاف چمک رہی تھیں

"بلقیس یہ تو سب دیکھ رہے ہیں!" شمن نے چپکے سے شکایت کی۔

"خبردار رشید جو تم نے شرارت کی۔ خدا قسم مار ڈالوں گی۔" بلقیس نے ڈانٹا۔

کھیل پورے شباب پر آگیا تو پردہ وردہ سب غائب۔ رشید نے بے ایمانی کی۔ لہٰذا بلقیس نے ہر بار اس کا ہاتھ ہلا دیا اس لیے وہ ہار گیا۔ دوسرے کھیل میں رشید نے ذرا سنجیدگی سے کھیلنا شروع کیا۔ اور بلقیس اور شمن کا دم نکلا۔ وہ چیخ کر اس کا ہاتھ ہلا دیتیں تاکہ وہ گر پڑا جائے۔ مگر قسمت میں ہار بدی تھی۔ کھیل جیت کر رشید نے بڑی احتیاط سے رومال کا گھونگھٹ کاڑھ لیا اور آستینیں چڑھالیں۔

"چلیے دلوائیے چنٹی!" اس نے شمن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دو انگلیاں جوڑ کر ہتھیلا تیار کیا۔

"بھئی زور زور سے مارنے کی نہیں ہے۔" بلقیس اس کے اوپر چڑھ بیٹھی

"خوب میری اکنی نکل گئی تو کچھ نہیں اور اپنی باری پہ چلیں رونے کو۔ خدا قسم آج ہڈی نہ توڑ دوں تو بات نہیں۔" —— اس نے پھر انگلیاں تولیں جیسے ہی اس نے مارنے کا ارادہ کیا شمن نے ہائے کر کے ہاتھ چھڑا لیا۔

"دیکھا تم نے، تمہاری دوست حد سے زیادہ مکار ہے۔ یعنی میں نے مارا نہیں اور "ہائے" ان سے کہو سیدھی بیٹھیں۔ جگہ بے جگہ لگ جائے تو ہم ذمہ دار نہیں۔"

بڑی دیر تک وہ چنٹی مارے بغیر ڈراتا رہا۔ مار چکتا تو چھٹی ہوتی۔ بھئی ایک ہی تو بے چاری چنٹی ہے۔ مزے لے لے کر ماریں گے ہم تو۔" اتنے میں پرنسپل صاحبہ کے نوکر نے آکر حکم دیا کہ بورڈنگ کی سب لڑکیاں جائیں۔ سب کو ــــ وہ کون گیا تھا سوائے شمن کے!

"اچھا تو یہ چنٹی ادھار رہی۔" رشید نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اچھے رشید ہمیں بورڈنگ تک پہنچا آؤ۔" بلقیس گڑگڑائی۔

"ہشت ہم سونے جا رہے ہیں۔" رشید اترائے۔

"اچھی ہمارا بھیّا کیسا۔" بلقیس ان کی گردن میں جھول گئی۔

پانچ منٹ کا راستہ ہنس ہنس کر آدھ گھنٹے میں طے کیا۔ دیر تک پھاٹک پر کھڑے ہو کر بحث ہوتی رہی۔ رشید کہتے تھے شمّن کو ہاتھ ملا کر مہذب لوگوں کی طرح خدا حافظ کہنا چاہیے۔ اور شمّن کھسیانی کھڑی پھاٹک کی وارنش ناخونوں سے کھرچ رہی تھی۔ جب بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی تو جل کر بلقیس نے شمّن کو اُس پر دھکّا دے دیا۔ بہت سمٹی پھر بھی اُسے دونوں ہتھیلیاں اس کے سینے پر ٹکانی پڑیں۔ گھبرا کر رشید ارے کر کے ہٹ گیا اور شمّن اندر بھاگ گئی۔

بہت دیر تک وہ بلقیس کے چٹکیاں نوچتی اور کوستی رہی۔

۱۷

نمائش آئی اور بلقیس کی وجہ سے شمّن کو کئی دفعہ جانے کی اجازت مل گئی نمائش بھی ایک عظیم الشان تہوار ہے۔ سال کے سال میدان حشر بپا ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے سوئے ہوئے مردے صور کی پکار پر جاگ اٹھتے ہیں اور پندرہ دن کے لیے ارمانوں کی دنیا میں بسنت کھل اٹھتی ہے۔ خرید و فروخت کے لیے ٹکے کس کے پاس ہوتے ہیں دوسرے نمائش میں کون بے وقوف خرید و فروخت میں وقت گنوائے۔ ایک آفت برپا ہوتی ہے۔ جس دکان پر جاؤ کالی شیروانی اور کالے برقعوں کا جمگھٹ، برقعوں کی مجال نہیں جو ایک دم کے لیے ان شیروانیوں کے سائے سے دور رہ سکیں۔ بندے خریدو، وہاں موجود چوڑیاں چھانٹو ہاتھ گھسائے دیتے ہیں۔ سازھیوں کی دکان پر کھڑے آوازیں کس رہے ہیں۔ کھلونوں والی کی دکان پٹی پڑی ہے غرض جہاں دیکھو کوڑیالے پھنکار رہے ہیں۔ لڑکیاں ہیں کہ بدحواس ہوئی جاتی ہیں اگر شکایت

واہ!

کرتی ہیں تو الٹا اپنا آنا بند! غرض سولی پہ جان ٹنگی ہے ویسے بے کوڑیا یوں کے بجا
دنیا تلخ اور اجڑی ہوئی، ڈانٹ ڈپٹ کر دور ہٹا دیا تو باقی کیا رہ گیا نمائش میں؟
یہ جگمگاتے جواہرات؟ وہ زریں ملبوسات؟ جی نہیں یہ اوروں کی دولت ہیں۔
مفلس طالب علم کو تو اپنی زندہ دلی میں ہی ہزاروں نمائشیں مل جائیں گی۔

بلقیس بہت دن سے شمن سے تصویر کے لیے کہہ رہی تھی۔ رشید اپنے دوست کو انگلینڈ بھیج کر انلارج کرانے کو کہتے تھے۔ میٹرن کی آنکھ بچا کر دونوں کھسک گئیں اور روپے کی آٹھ والی تصویریں کھنچوانے لگیں۔

"جلدی سے کھینچیے" انھوں نے وہاں کھڑے ہوئے فوٹو گرافر سے کہا یونیورسٹی کے لڑکوں کی طرح وہ بھی سیاہ اور سفید تھا۔

"آپ تصویر کھنچوائیں گی" وہ خندہ پیشانی سے مسکرایا۔

"اور کیا بھئی جلدی کیجیے۔"

"جلدی ہی لیجیے۔ تو آیئے یہاں بیٹھیے اسٹول پر" اس نے نیا سگریٹ سلگایا شمن اور بلقیس کی رائے ہوئی ذرا سا پاؤڈر اور لپسٹک لگا لی جائے تو اچھا رہے تصویر میں کچھ تو آ ہی جائے گا۔

"آئینہ نہیں ہے آپ کی دوکان میں ..... ذرا" انھوں نے پوچھا۔

"آئینہ ہوگا کیوں نہیں ..... ادھر آیئے" وہ ان دونوں کو پچھلے کمرے میں آئینہ دکھانے لے گیا۔ وہ پاؤڈر لگاتی رہیں اور وہ کھڑا مسکراتا رہا۔

"عطر بھی تو لگایئے" شرارت سے بولا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"عطر؟ —— عطر؟"

"ہاں ہاں صاحب۔ عطر کی خوشبو بھی تو آتی ہے تصویر میں، یہ دیکھیے میرے پاس ہے۔"

اس نے انگلیوں میں عطر لے کر ان کے کپڑوں میں لگانا شروع کیا اور بڑی بے تکلفی سے!

"رہنے دیجیے" شمن نے جھلا کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اچھا اچھا صاحب..... بیٹھیے اسٹول پر۔ ذرا اچھی طرح بیٹھیے۔" اور وہ دونوں بیٹھ کر ادائیں بنانے لگیں۔

"یوں بیٹھیے ..... اور دوپٹہ کو سنبھالیے میرے خیال میں دوپٹہ تو اتار ہی دیجیے۔" وہ کیمرے سے زیادہ ان کے دوپٹے وغیرہ پر توجہ دے رہا تھا۔

"ہائے اللہ کتنا بے ہودہ فوٹوگرافر ہے۔" شمن نے بلقیس کے کان میں کہا "آپ کو تصویر کھینچنا ہو تو کھینچیے ورنہ" وہ ہمت کر کے ڈانٹنے لگی۔

"مگر یہ آپ کے گال پر پاؤڈر ---" اس نے شرارت سے مسکرا کر پیار سے بلقیس کا گال چھوا اور سگریٹ کا دھواں بالکل ان کے منہ پر چھوڑنے لگا۔

دونوں ایسی گھبرائیں کہ فوٹوگرافر کو شاید رحم آگیا، اور وہ ہٹ گیا۔

"اچھا صاحب ریڈی ---" دونوں ریڈی ہو گئیں۔ دو چار بار کپڑے میں سر ڈال کر پھر بولا۔" اوں ہوں۔ یہ آپ نے بال کیسے بنائے ہیں۔ لائیے میں ٹھیک کر دوں۔"

"آپ کو اس سے کیا؟ آپ تصویر کھینچ رہے ہیں۔ چلو شمن چلیں۔"

"ارے ارے آپ تو خفا ہو گئیں۔ بیٹھیے بھئی شمن..... اوہ معاف کیجیے گا۔ میں تو آپ کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔ بالکل خراب آئے بال تو فوٹوگرافر کو الزام دیں گی آپ، کہ تصویر بگاڑ کر رکھ دی۔ اور کیا۔" وہ کچھ روٹھ سا گیا۔ پھر وہ دونوں راضی ہو گئیں اور اس نے ان کی ٹھوڑیاں پکڑ پکڑ کر بال سنوارنا شروع کیے۔ بلقیس نے جھٹک کر اس کے سینے پر سے سر ہٹایا جیسے وہ بری طرح کھینچ کر بال بنا رہا تھا۔ وہ شرارت سے ہنسا اور شمن کی طرف چلا کہ اتنے میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور تھوڑی سی دیر میں تین چار آدمی اور آ گئے۔ شمن اور بلقیس کو ڈر لگنے لگا۔

"ہم جاتے ہیں آپ تصویر کھینچتے ہیں نہ بات۔"

"تو جائیے۔ خدا حافظ ۔ وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

"ایں؟ ...... یہ آپ۔" نووارد بولا۔ "تشریف لائیے۔"

"ہم ــ تصویر کھنچوانے آئے تھے ..... مگر ..... اتنی دیر لگادی۔"

"تو تشریف لائیے اندر ــ معاف کیجیے گا۔ ذرا میں کھانا کھانے گیا تھا۔"

"اور ــ اور ..... وہ ــ وہ فوٹو گرافر جو ابھی یہاں تھا۔"

"جی میں ہی ہوں فوٹو گرافر۔ تو آئیے۔" اس نے فخریہ اپنی کالی شیروانی کو دیکھکر کہا۔ "آئیے تشریف لائیے۔

"تو وہ کون تھا؟" بلقیس ہکلائی۔

"کون؟"

"اوہ ..... وہ حمید ــ ارے صاحب وہ تو کالج کے ایک صاحب ہیں پرنٹ لینے آئے تھے ..... آپ اندر آجائیے۔" اس نے بات ٹالنا چاہی۔

"ہیں؟" بے وقوفوں کی طرح وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔

"آئیے ــ پھر۔" فوٹو گرافر نے اپنے اوزاروں سے کھڑبڑ کرنی شروع کی

نہیں ..... اب ہم کل کھنچوائیں گے ..... آج دیر ہو گئی۔"

دونوں گھبرائی ہوئی بھاگیں وہاں سے، دل دھڑک رہے تھے۔ میٹرن انکی تلاش میں سرکاری پر پہیہ کیے پھر رہی تھی یہ دونوں ملیں تو پڑی ڈانٹ۔

"ارے اور ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔" دونوں جھوٹ بولیں اس دن بلقیس کی وجہ سے بات بن گئی ورنہ میٹرن ان بہانوں کو خوب جانتی تھی۔ کتنی لڑکیاں روز اسی طرح کھو کر مل جایا کرتی تھیں۔ اور مزہ بھی بڑا آتا ہے۔ یوں جان بوجھ کر کھو جانے میں جی کبھی تو نہیں چاہتا واپس ملنے کو کاش کسی طرح ساری عمر کیلیے یونہی نمائشوں میں بھٹکتے پھریں اور میٹرنیں نہ پکڑ سکیں۔

دوسرے دن وہ تصویر کھنچوانے نہ جاسکیں مگر نمائش میں وہی کوٹ یا لہ حمید برابر آئیں پھرتا شعر پڑھتا ان کے پیچھے لگا رہا۔ ایسے ان دونوں کے نام تو معلوم ہی ہو

کہے گئے تھے۔ شرارت میں وہ اپنے دوستوں کو شمن اور بلقیس کہتا تو وہ فوراً چمک کر جواب دیتے۔ "ہاں فوٹوگرافر صاحب!"

"آؤ شمن بندے خریدیں۔" ایک اتراتا اور لڑکیوں کی نقل کرکے اپنے دوست کو چھیڑتا۔

"ہاں بلقیس چلو تصویر کھنچوائیں۔" دوسرا اٹھلا کر جواب دیتا۔

شمن اور بلقیس چل جاتیں مگر انھیں ہنسی بھی آرہی تھی جب تک وہ سامنے رہتے وہ جلتی رہتیں مگر جیسے ہی وہ بچھڑ جاتے ان کی آنکھیں بے چینی سے تلاش کرکے انھیں ڈھونڈ لاتیں اور پھر ڈھکے چھپے جملے کسے جانے لگتے۔ نمائش کے پھاٹک کے پاس شمن اور بلقیس کو ایک چھوکرے نے ایک بنڈل لاکر دیا کہ یہ وہ دکان پر بھول آئی تھیں۔

"تمہارا ہوگا بلقیس۔"

"نہیں تو میں نے کچھ خریدا ہی نہیں، کھولو تو دیکھیں کیا ہے اس میں؟"

کھول کر دیکھا تو ٹافیاں! چاکلیٹ!! اور مٹھائیاں!!! مارے خوشی کے چیخ نکل گئی اور دونوں بنڈل پر ٹوٹ پڑیں، فوراً ان کی نگاہیں اٹھیں اور اُس کوڑیالے کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ہلکی سی سر کی جنبش سے اس نے انھیں سلام کیا اور فوراً دونوں بگڑ گئیں۔ بلقیس نے رائے دی "پھینک دو۔" مگر بھوک کا تقاضہ ہوا یہ بے وقوفی ہوگی۔ بورڈنگ میں جیب خرچ ہی کتنا ملتا ہے۔ دونوں وہاں سے چل دیں۔ کچھ ردّ و کد کے بعد دونوں نے جیبوں میں مٹھائیاں بھر لیں۔

جب نمائش ختم ہو گئی تو شمن اور بلقیس کے نام عاشقانہ خط آئے بڑے جوتے پڑتے اگر بلقیس پرنسپل صاحبہ کو سب صاف صاف نہ بتا دیتی۔ ہاں تصویریں کھنچوانے کا واقعہ گول کر گئیں۔ بات دب دبا گئی۔ بلقیس نے بتایا کہ غریب کوڑیالہ کتنے ہی خط بھیج چکا ہے مگر سب پرنسپل صاحبہ نے پھاڑ کر جلا دیے۔ جب بات بہت بڑھی تو اٹھا کر سارے خط انھوں نے پی، وی، سی کو بھیج دیے۔ اس کے

بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ کوڑیالے کا زہر بھی پھیکا پڑ گیا۔ رشید کو بھی اس معاملے کی خبر مل گئی اور اس نے یہ بات اور لڑکوں میں پھیلا دی اور سارے لڑکوں نے مل کر لنگوٹ مار کوڑیالے گوناکول لپٹے چھپوانے شروع کیے۔ بلقیس کی رائے تھی کہ خواہ مخواہ بچارے کو پریشان نہ کیا جائے۔ آخر اس نے ایسا کیا جرم کیا تھا الٹا اسی کا تو ہر طرح کا نقصان ہوا تھا۔

سالانہ جلسے کا ڈراما ہوا تھا تو اس کی تصویریں کھینچنے کے لیے رشید ہی کو بلایا گیا ویسے ڈرامے کی ساری لڑکیاں اس کے سامنے آئی تھیں۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا جاتا تو بے کار غل مچاتا جہلا کو اعتراض ہوتا۔

شمن لڑکا بنی تھی اور مونچھیں لگا کر تو شرم کے مارے اس کا دم نکلنے لگا۔ بلقیس اس کی محبوبہ روز الند بنی تھی۔

"ارے بلی یہ چھوکرا کون ہے؟" رشید نے حیرت سے پوچھا اور شمن اپنی تلوار پھینک کر جھاڑیوں میں چھپ گئی اور تصویر کھینچوانے سے قطعی انکار کر دیا۔ مگر تصویر کھینچوانا ضروری تھی اور اسے محبوبہ روز الند کا ہاتھ چومنا تھا اور یہاں تو اسے کھڑا ہونا ہی دیال معلوم ہو رہا تھا۔ ٹانگیں لرزی جاتی تھیں اور ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

"ارے چھوکرے ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو۔" رشید نے کہا اور شمن چڑھ کر منمنانے لگی۔ بلقیس نے رشید کو ڈانٹا۔

"واہ شمن تو ڈیوک کا بیٹا ہے۔ چھوکرا چھوکرا کیے جاتے ہو۔"

"اچھا تو ڈیوک کے بیٹے کمبخت کی منجن کی مونچھیں تھیں خوب!"

"ہست چھوٹے مونچھیں تھوڑی کاجل ہے"۔ بلقیس نے پیار سے شمن کی مونچھ کو دیکھا۔

"ہائے بالکل تو اصلی لگ رہی ہیں۔"

اگر پرنسپل صاحبہ آکر نہ ڈانٹتیں تو مذاق کبھی ختم نہ ہوتا اور نہ تصویریں کھنچتیں

"آپا بی اب کے ڈرامہ ہو تو ہمیں لڑکی بنائیے گا۔" رشید نے پرنسپل صاحبہ سے

کہا۔

"بھئی جب کالونچ لگا کر لڑکیاں مرد بن سکتی ہیں تو پھر میں کیوں نہیں لڑکی بن سکتا — بھئی واہ!"

جب سب جانے لگے تو رشید نے چپکے سے شمن سے کہا۔

"اے..... دیکھو جی میاں لڑکے۔ ہماری چنٹی اُدھار ہے کہیں ہضم نہ کر جانا"

وہ ہنسی روکتی جھلاتی بھاگ آئی۔

۱۸

شمن اور رشید کا رومان پینگیں بڑھاتا رہا۔ روزانہ بلقیس اس کا ایک پرچہ شمن کو لا کر دیتی۔ اس پرچے میں کچھ بھی نہ ہوتا سوائے اس پرانی چنٹی کے ارمان بھرے ذکر کے اسے رشید شم شم یا میاں لڑکے لکھتا۔ سوائے رشید کے شمن کو کچھ بھی تو یاد نہ رہا ششماہی امتحان میں وہ بری طرح فیل ہوئی اور گھنٹوں شرم سے روتی رہی۔ رعائتی درجہ مل گیا۔ حساب میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھی۔ پرنسپل صاحبہ نے اسے ٹیوشن دلوا دی۔ کمیشن کر رشید ہی اسے ٹیوشن دینے پر مقرر کیا گیا۔ اور کوئی شریف و معقول آدمی ملتا ہی کہاں تھا۔

یہ طالب علم اور معلم کا رشتہ بھی کس قدر رومان انگیز ہوتا ہے بات بے بات عشق اُبل پڑتا ہے۔ پڑھائی تو خاک بھی نہ ہوتی۔ شمن اور رشید گھنٹوں آسانی سے باتیں کیا کرتے جب بہت دیر ہو جاتی تو دوسرے دن کی امید دل میں لے کر جدا ہو جاتے پڑھنے کے لیے شمن کو پرنسپل صاحبہ کے بنگلے ہی پر جانا پڑتا۔ شام ہی سے بنگلہ اندر

اندرسبھا کا اکھاڑہ بننا شروع ہو جاتا۔" دوستوں کے جمگھٹ شروع ہو جانے خاصا بے تکلف جماؤ جمتا جس میں بے تکلف زندگی پر مباحثے ہوتے انسانی حقوق پر لکچر دیے جاتے۔ پانچ چاند کے ٹکڑوں کے گرد ستاروں کے پرے جمتے۔ مہذب اور لطیف معاشقے چلتے اور بنگلہ قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

ایک دن وہ اور بلقیس برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی رشید کی تازہ شرارتوں پر بات چیت کر رہی تھیں کہ پھاٹک کھلا اور کسی نئی لڑکی کا سامان آنا شروع ہوا۔ سامان بہت سا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کئی بہنیں آئی تھیں۔ مگر سامان کے ساتھ کوئی ذاتی اس دن چونکہ سنیچر تھا اور رشید گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا شمن بنگلہ پر نہیں گئی تھی۔

دوسرے دن پرنسپل صاحبہ دو لڑکیوں کو لیے ہوئے اپنے دفتر میں چلی گئیں۔ لڑکیاں خوبصورت ہی نہیں امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک تو ان میں سے چھ سات سال کی تھی اور دوسری پندرہ سولہ کی۔ ان کے ریشمی ملبوسات اور فیشن سے متاثر ہو کر لڑکیاں کلاسوں میں سے نکل نکل کر جھانکنے لگیں۔

کھانے پر پرنسپل صاحبہ نے بلقیس اور جلیس کو بلا کر ان دونوں لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیا۔ اور چاروں نہایت مہذب بنی بنگلے سے آیا ہوا کھانا میز کے صاف ترین کونے پر بیٹھی کھاتی رہیں۔ کھانے پر آج ویسے بھی ضرورت سے زیادہ صفائی تھی ٹوٹے ہوئے تمام چینی کے ڈونگے اور بے قلعی رکابیاں اس خاص میز پر نہ تھیں۔ بلکہ نئی پلیٹیں جو کبھی دعوتوں پر نکالی جاتی تھیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بھی بہت تھا۔ چونکہ جمعہ تھا اس لیے مکھن نکلے ہوئے دودھ کی پھیکی پھیکی کھیر بھی تھی اتنے میں پرنسپل صاحبہ اور ایک ضخیم حسین بیگم نہایت زریں لباس پہنے داخل ہوئیں اور ان نئی لڑکیوں کے پاس جا کر باتیں کرنے لگیں لڑکیوں کی کھسر پھسر سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی اماں جان تھیں۔

نووارد لڑکیوں کی اماں نے بھی کھانا چکھا اور منتظمین کی تعریف کرتی رہیں۔

"ایسا مزے دار کھانا تو گھر پر بھی نہیں ملتا" مرغن کھانوں کا اشتہار چربی کی بو

نواب زادی بولیں "لذیذ اور صحت بخش! مٹاپے سے عاجز کباب پراٹھوں سے تھکی ہوئی بیگم کی زبان میں اتنا احساس ہی کب رہا ہوا ہوگا جو کھانے کی اچھائی برائی پرکھ سکتیں کھانے کے۔ درمیان ہی سے لڑکیاں اور بیگم پرنسپل کے ساتھ واپس جانے لگیں تو بضد بلقیس اور جلیس کو بھی ساتھ لے لیا۔

شام کو بلقیس ان دونوں لڑکیوں کو لیے ہوئے واپس آئی۔ وہ اب تک بھڑکیلے لباس پہنے تھیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی ایک خوبصورت سا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی سارے وقت وہ ان لڑکیوں کے ہمراہ رہی۔ بورڈنگ میں تو یہ لڑکیاں کیا آئیں عجائبات آگئیں۔ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر ساری لڑکیاں دیکھنے ٹوٹ پڑیں۔ اتنی دیر میں ان کا کمرہ بھی سج کر تیار ہو گیا تھا۔ علاوہ خوبصورت مسہریوں کے سنگھار میز جو نہایت ہی عجیب چیز معلوم ہوتی تھی، اور میز پر لیمپ، قالین، غالیچے، ریشمی پردے غرض معلوم ہوتا تھا کہ جنگل میں کسی نے پھولوں سے لدا ہرا بھرا گلدستہ کھڑا کر دیا۔

شمن ان کے کمرے کے سامنے سے بھی نہ گزری۔ بورڈنگ میں جب سے اس کی بلقیس سے دوستی ہوئی تھی وہ دوسری لڑکیوں سے بہت دور ہٹ گئی گئی تھی۔ پرنسپل صاحبہ کی منظورِ نظر ہو کر وہ سب کی نظروں سے گر چکی تھی۔ وہ اسے خوشامدی مغرور اور خود غرض سمجھنے لگی تھیں۔ آج جب بلقیس نے مہمانوں کی آؤ بھگت میں غرق تھی وہ بے سہارا اور تنہا الو کی طرح اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانے پر بلقیس لڑکیوں کے ساتھ بنگلے پر چلی گئی اور مسکراتی ہوئی طعن آمیز نظروں کے درمیان وہ خاموش اپنی جگہ بدبودار سالن اور خشک چاول نگلتی رہی۔

بلقیس کچھ چیزیں لینے کمرے میں آئی تو شمن نے منہ پھلا کر شکایت کرنا چاہی مگر بلقیس بڑی جلدی میں تھی۔

"اچھی، نواب صاحب آج آئے ہوئے ہیں بے حد خوبصورت کپڑے ہیں نسیمہ نے زبردستی مجھے یہ دوپٹہ دے دیا آپا بی کا حکم ہے کہ لڑکیوں کا دل نہ گھبرائے کوئی بات بھی ہے کہتی ہیں پرسوں نواب صاحب کو پہنچانے دہلی تک چلو۔" وہ جلدی جلدی

چیزیں سمیٹتی رہی۔

"اور کوکو تو غضب کی پیاری ہے۔ رشید پر تو فدا ہے سارے دن کندھے پر چڑھی رہی۔" وہ ذرا جھینپتی ہوئی سی جلدی سے چل دی۔

دو چار روز کی چھٹیاں آگئیں۔ بلقیس جلیس ان لڑکیوں کے ساتھ ان کے والدین کو خدا حافظ کہنے دہلی چلی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بھی بلقیس سے کوئی بات نہ ہوئی رشید کسی میچ میں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے شمن پھر بنگلے سے دور ہی رہی۔ پھر وہ پڑھنے پہنچی تو اس نے کچھ فضا بدلی پائی۔ حالانکہ رشید کو وہ تیس روپے ابا سے ہزاروں چالیں چل کر دلواتی تھی مگر وہاں آج اس طرح برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ گویا وہ کوئی یتیم لڑکی ہے جس پر رحم کھا کر وہ پڑھا دیا کرتا تھا۔ رشید موجود نہ تھے۔ وہ لڑکیاں زیادہ تر بنگلے پر ہی رہتیں اور ساتھ ساتھ بلقیس بھی آہستہ آہستہ بورڈنگ سے اپنی چیزیں بین بین کر گھر لے جا رہی تھی۔

رشید آئے تو اس دن بالکل پڑھائی نہ ہوئی اوّل تو نسیمہ کے ساتھ کیرم کھیلنا تھا۔ دوسرے کوکو برابر کندھوں پہ کود رہی تھی۔ علاوہ بلقیس اور جلیس کے قریب قریب ہر ایک فرد ان لڑکیوں پر مکھیوں کی طرح چپکا ہوا تھا ان دونوں نے تو جس دن سے وہ آئی تھیں اپنے کپڑے چھوڑ کر ان کے ہی پہننے شروع کر دیے تھے۔ پرنسپل صاحبہ تک کو زبردستی کر کے نسیمہ نے اپنا شنان کا ستاروں ٹکا دوپٹہ اڑھا رکھا تھا۔ نسیمہ پیچھے پڑ جاتی تھی اور اپنا زیور اور کپڑا انھیں پہنا کر ہی دم لیتی

نسیمہ کی سنگھار میز جیسے کیمسٹ کی دوکان! بلقیس جلیس تو ہر وقت منہ پر الابلا پوتا کرتیں۔ سارے بورڈنگ کی لڑکیاں ان کے کمروں پر جمع ان کی تعریفوں میں چہکا کرتیں۔ نسیمہ نے تھوڑے ہی دنوں میں میدان پر پورا قبضہ کر لیا۔ قریب قریب ہر لڑکی پاؤڈر لپسٹک پرانے ریشمی جمپر دوپٹہ یا چپل کے احسان کے نیچے دب گئی ان کے ساتھ ان کی بچپن کی کھلائی بھی تھی جسے سارا بورڈنگ ان کی نقل میں بے بے کہتا تھا۔ موٹی چوڑی مردمار سی عورت خوشامدی لڑکیوں کو ہزار

دھتکاریں بتاتی پر وہ اس کے قدم چومنے کو تیار رہتی۔

نسیمہ اور کوکو پر بورڈنگ کی کوئی پابندی عائد نہ تھی نوکروں کے رہنے کی اجازت نہ تھی نگران کے کیس میں مجبوراً پرنسپل صاحبہ نے دیدی۔ وہ لوگ کھانا اپنے کمرے میں کھاتیں۔ کھانا تو خیراں کی بے بے خود اپنے ہاتھوں سے پکاتی تھی۔ چینی کے برتن بھی ان کے اپنے تھے۔ انھیں دو کمرے مع دو غسل خانوں اور اسباب کے کمرے کے ملے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا گھر تھا ان کے برآمدے کی طرف بھی کسی کو گذرنے کی اجازت نہ تھی۔

جلد ہی سنگھار کا مرض پھیلنے لگا۔ غریب لڑکیوں نے لال رنگ کی روشنائی اور چار آنے والا چھینیوں پر لگانے کا پوڈر ہی تھوپ لیا۔ جدھر دیکھو لال پیلے گال اور مصنوعی گھونگھر والے بال نظر آتے۔ بجلی کے آلے نہ ملے تو سلائیں گرم کر کے ہی بال اکھالیے۔ سچے ستارے اور گوٹے نہ جڑے تو پن اور جھوٹے پترے ہی چپکا لیے۔ ان لڑکیوں کی وجہ سے بورڈنگ میں بزاز، چوڑی والے اور پھل والے کو بھی آنے کی اجازت مل گئی۔ اور کچھ نہیں تو قرض پر ہی خرید و فروخت شروع ہو گئی۔ کمبختوں کے پاس نہ جانے کہاں سے قارون کا خزانہ آن ٹوٹا تھا کہ سارے بورڈنگ کو قرض دینے کے بعد روزانہ ٹوکریوں پھل اور بنڈلوں بسکٹ آتے اور لنگر بٹتے۔ حلوے پکتے اور پارٹیاں ہوتیں۔ آج کوکو کی سالگرہ ہے۔ سارے بورڈنگ کی دعوت پر پرنسپل صاحبہ کے خاندان بھر کی دعوت۔ آج نسیمہ کا جی گھبرا رہا ہے۔ بلقیس کی سالگرہ کی دعوت وہ خود کر رہی ہے۔ مع سارے خرچے کے اوپر سے بلقیس اور جلیس کو جوڑا بھی مل رہا ہے۔ خیرات میں مرنے والیوں کا بھی بھلا ہو رہا ہے۔

شمع اب حساب میں اتنی کمزور نہ رہی تھی جتنی نسیمہ اردو میں۔ اس نے ساری عمر کانونیٹ میں گذاری تھی۔ اب اس اسلامی اسکول کی عاقبت سدھارنے بھیجی گئی تھی۔ لہٰذا رشید اسے کچھ روپے پر اردو جغرافیہ اور حساب پڑھانے لگے

رشید خود اردو
ٹیوشن دیکر پڑھانے

تھے۔ نسیمہ نویں جماعت میں تھی۔ گو اس کی انگریزی کئی استانیوں سے اچھی تھی
اور اردو میں دوسری جماعت کی بھی قابلیت نہ تھی۔ انگریزی کے گھنٹے میں وہ
شمیم کی کلاس میں بھی آجاتی۔ سوال سننے سے پہلے وہ جواب دے دیتی اور اتنا
صحیح کہ استانیوں کی باچھیں کھل جاتیں۔ نیز دوسری لڑکیوں پر اور جوتا باڑی ہوتی
سارے وقت نسیمہ یا کچھ کچھ بلقیس بولا کرتیں اور استانیاں انھیں شاباشی دیا
کرتیں۔ باقی کی لڑکیاں گھبرائی اور شرمندہ بیٹھی پھٹکاریں سنا کرتیں

یہی نہیں کھیل کے میدان میں نسیمہ نے سب کو چیت کر دیا وہ کبھی ڈھاندلی
بھی کر جاتی۔ باز پرس پر نہایت تیز انگلش میں بولنے لگتی جس پہ ساری لڑکیاں
جھجک جاتیں اور انگریزی کی مداح استانی اس کی ساری گستاخیاں انگریزی کے
پیارے سے جملے سے معاف کر دیتیں۔ نہ جانے کیوں شمیم نے پہلی نظر میں نسیمہ
کو دشمن کا عہدہ دے دیا تھا۔ ہر موقع پر اس کی اور نسیمہ کی ٹکر ہو جاتی۔ دونوں
کی گستاخ نظریں ٹکراتیں۔ مگر جھک جاتیں۔ اب بھی رشید ملتا اس سے دو چار
میٹھی باتیں کہہ دیتا مگر وہ بات نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ کچھ بھولتا
جا رہا ہے۔ پرنسپل کی نظروں سے بھی وہ اتر گئی تھی۔ اور بورڈنگ میں تو اس کی
حیثیت تھی ہی ایک غیر جلیبی۔ نوری تو جلیس کے ساتھ کو کو کا دُم چھلا بن چکی تھی۔
غرض ایک بار پھر اسے ایک ناقابلِ بیان سنسان تنہائی کا احساس ہوا اور
اس شدت سے کہ اس نے ہر چیز سے بغاوت کر دی۔

سب سے پہلے تو وہ کتابوں پر ٹوٹ پڑی۔ نسیمہ کی زبان تیز تھی مگر معلومات
صفر کے برابر تھی تھوڑے ہی دن میں اس نے نسیمہ کی قینچی کا جواب بگڑی مگر
حفظ کی ہوئی انگریزی میں دینا شروع کیا۔ پورے پورے صفحے رٹ کر اس نے
نسیمہ کو چیت کر دیا۔ اڑیل گھوڑے کی طرح وہ پیر جما کر کھڑی ہو جاتی اور ساری
مسکراہٹوں اور قہقہوں کا جواب وہ رٹی ہوئی زبان میں دیتی رہی۔ اسے کھیل سے
نفرت تھی مگر جلتی دھوپ میں اس نے مشق کی یہاں تک کہ وہ کھیل میں بھی چوٹ

کھادی، شیرنی کی طرح سب پر حاوی ہو گئی۔

نسیمہ کے احسانات تو خیر تھے ہی جادو کے منتر۔ شمن کی ضد، ہٹ دھرمیاں اور گستاخیاں بھی بے کار نہ گئیں۔ رفتہ رفتہ ساری وہ لڑکیاں جو کسی طرح نسیمہ کی نظروں سے اتر گئی تھیں شمن کے جھنڈے تلے آ گئیں۔ نسیمہ کو اب بورڈنگ میں بہت کم وقت گذارنے کو ملتا تھا کیونکہ اسکول سے آ کر فوراً وہ اردو کی کمزوری دور کرنے بنگلے پر چلی جاتی تھی۔ کوکو بھی اب وہ پھول جیسی گڑیا نہ رہی تھی۔ بے بے کیے تو بس کی نہ تھی۔ بدتمیز بچوں کے گروہ میں ملی خاک دھول میں لوٹا کرتی اور وہ کوکو جسے چومنے کے لیے لڑکیاں بے اختیار کلاسوں سے نکل پڑتی تھیں اب چپتیں کھا کر کمروں سے نکلتی۔ پھل بھی کچھ کم آنے لگے تھے۔ کیونکہ زیادہ تر تو بنگلے پر چلے جاتے نسیمہ تو زیادہ تر کھانا بھی وہیں کھاتی۔

شمن کمرے میں خاموش بیٹھی تھی وہ اب اکیلی رہتی تھی۔ بلقیس کے جانے کے بعد اس نے کسی کو نہ آنے دیا تھا۔ وہ ایک تقریر کو رٹنے میں مشغول تھی جو اسے دوسرے دن کرنا تھی کہ اتنے میں بلقیس آئی۔ وہ کچھ شرمندہ اور پشیمان سی تھی۔ کسی کتاب کے بہانے سے وہ دیر تک میز ٹٹولتی رہی پھر بیٹھ گئی۔ شمن نے بات نہ کی تو خود ہی بولی۔ بلقیس، شمن

"پوئٹری بک میری کھو گئی ذرا اپنی دے دو" شمن نے کتاب اٹھا کر سامنے ڈال دی۔

"کل کے لیے تیاری کر لی؟"

"ہاں۔"

"لاؤ میں سن لوں۔" بلقیس نے قریب آ کر اسپیچ کی کاپی لے لی۔ شمن کے گلے میں آنسو اٹکنے لگے جی چاہا سنائے کھری کھری مگر بلقیس کی جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ چپ ہو گئی۔

"خدا قسم۔ نسیمہ مر بھی جائے تو نہیں بول سکتی۔ پتہ ہے اس نے ابھی تک

نوٹس بھی تیار نہیں کیے ہیں۔"

"بھئی وہ تو بغیر نوٹ کے بول سکتی ہے"

"خاک بھی نہیں۔ رشید نے اتنی غضب کی تقریر تیار کرکے دی، جناب نے پڑھی تک نہیں۔"

"میری اور عیسیٰ کی لڑائی ہو گئی۔" وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"ہیں؟ — ہٹو!"

"سچ!"

"مگر؟"

"کمینہ ہے! پتہ ہے تمہیں اتوار کو —" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ شمن نے بالکل تجسس کا اظہار نہ کیا۔

"مجھ سے کہنے لگے کہ آٹھ پلیٹوں کا فلم ہے۔ چار نسیمہ کی تصویریں کھینچ لینے دو پھر تمہاری اور جناب بعد میں معلوم ہوا کہ صرف چھ تھیں جن میں سے ایک جلیبی نیکر پہن کر کھنچوائے گی۔ جی ہاں گویا مرتی ہوں ان کے فلموں پر۔"

"ایک ہی فلم تھا۔"

"ہاں کہنے لگے دہلی سے لانا پڑے گا۔ اور خدا قسم اتنی بے ہودہ ہوتی ہیں۔ بعض لڑکیاں۔ یعنی رشید بے چارے نے جناب کی سیکڑوں تصویریں کھینچیں۔ ..... اور اب ..... چہ حد ہے!" بلقیس ژودرنجی ہو گئی۔ "ایک لفظ نہیں پڑھتیں آپا بی نے کہا تو فوراً دو مہینے کی ٹیوشن کا چیک لا کر دے دیا۔ یہ آپا بی خدا قسم اتنی اتنی وہ ہیں — نہ جانے کیوں دیتی ہیں۔" آپا بی غریب پانچ بہنوں اور ایک لاڈلے بھائی کی اکیلی کفیل تھیں۔

"تم بھی تو دیتی تھیں —" شمن نے کہہ ہی دیا۔

"جی ہاں۔ جو نہ دیتی ہے چڑیل سے — ہنہ۔ وہی زبردستی کرتی تھیں پتہ بھی ہے عیسیٰ کو اب کے اپنے گھر مسوری لے چلنے کو کہتی ہیں؟"

بلقیس شمن سے رونا رو کر چلی گئی۔ سہ پہر کو میٹرن سے نسیمہ کے لڑنے کی آواز سن کر ساری لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بات یہ تھی کہ بزاز آیا تھا اور پرنسپل صاحبہ کے حکم سے لوٹا دیا گیا۔ میٹرن سے جو نسیمہ نے کہا تو وہ مجبوری ظاہر کرنے لگی۔ جب پر نسیمہ خوب بگڑی مگر شکست ماننا پڑی۔ وہ باہر نکل کر جو کچھ خریدنا تھا خرید لائی۔ میٹرن چوں نہ کر سکی۔ شام کو ہال کے سامنے نوٹس ٹانگا گیا کہ بورڈنگ میں کسی سودے والے کو آنے کی اجازت نہیں۔ خرید و فروخت صرف اتوار کو ہو گی اور بورڈنگ کے باہر کے کمرے میں۔ ساری لڑکیوں نے یہ ظالمانہ نوٹس پڑھا اور بڑبڑائیں گویا بڑی ایسی خریداری کرنی تھی۔

تیسرے چوتھے دن شمن جو کمرے میں گئی تو بلقیس کو خاموش پلنگ پر بیٹھے دیکھا۔ اسے دیکھ کر وہ خاموش تکتی رہی۔ پھر منہ پھیر کر بستر پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائیں بلی کیا ہوا؟" آج بہت دن بعد شمن نے اسے پیار سے پکارا۔

"ہائے شمن!" بلقیس اس سے لپٹ کر پھوٹ پڑی۔ بڑی دیر تک وہ اسے عیسیٰ اور نسیمہ کے عشق کا حال بتاتی رہی۔ عیسیٰ آئی سی ایس کے مقابلے میں بیٹھ چکا تھا اور اس کے باپ کی سفارش سے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اور آج بلقیس نے جب اسکی دی ہوئی البم اٹھا کر پھینک دی تو وہ الٹا برا مان گیا۔

"بلقیس تم میری البم لے لینا" نسیمہ نے اسے چھیڑا۔ "میں اب دوسری منگوا رہی ہوں پیرس سے۔"

ہنہ، گویا بلقیس کسی کی بے کار چیزیں جمع کیا کرتی ہے اور پھر عیسیٰ نے معافی بھی تو نہیں مانگی۔ خیر وہ آج ہی عباس اور انصار کو چائے پر بلائے گی۔ شمن کو بھی چلنا ہوگا۔

پرنسپل صاحبہ کے پرچے پر شمن کو جانے کی اجازت مل گئی۔ آج خوب جھمکٹا

تھا۔ بلقیس بہت سجی ہوئی تھی مگر نسیمہ نے ضد میں کپڑے نہ بدلے تھے۔

"بلّی اس دوپٹے کے ساتھ کا جمپر بھی لے لیتیں ــــ میرا تو جی کھٹّا ہو گیا ہے چھپی ہوئی جارجٹ سے" نسیمہ نے چھچھورے پن سے سب کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ بلقیس اسی کے دئیے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ بلقیس خون کا سا گھونٹ پی گئی مگر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ جب اس نے عبّاس اور انصار دونوں سے انگریزی شاعری پر فاضلانہ بحث کر کے بلقیس کو بالکل پس پردہ ڈال دیا۔

رشید نے شمّن سے کچھ نہ کہا۔ اس کی ہتھیلی میں کہیں سے باریک پھانس لگ گئی تھی کہ نکلتی ہی نہیں تھی۔ شمّن دیر تک اس کی ٹائی پن کی مدد سے پھانس ڈھونڈتی رہی مگر نہ ملی کھانے پر کچھ نسیمہ اور بلقیس میں تیز تیز جلے چلے جن پر سب نے بلقیس ہی کو ڈانٹا۔ یہاں تک انصار کمینہ بھی کہنے لگا کہ بلقیس بڑی کٹ حجتی کرتی ہے۔ بلقیس کھانا چھوڑ کر چلی گئی جس پر نسیمہ کو ہنسی آ گئی۔

بورڈنگ جانے سے پہلے نسیمہ اور بلقیس میں پھر چیخ چل گئی۔ بیچ بچاؤ کروا دیا گیا مگر بلقیس کو پھر سب نے ڈانٹا نسیمہ کے ساتھ اس نے شمّن کو جانے بھی نہ دیا اور وہ اکیلی ہی چلی گئی۔ عیسیٰ، عبّاس اور انصار ساتھ جانے کو بلبلاتے رہے مگر پرنسپل صاحبہ نے کہا کہ بورڈنگ کی حدود میں لڑکوں کا جانا ٹھیک نہیں۔

رو رو کر بلقیس نے شمّن کو رات کو اپنے کمرے میں رکھ لیا بڑی دیر تک وہ اس کا رونا روتی رہی۔ سونے سے پہلے رشید کسی کام سے کمرے میں آئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

"اچھّی بجلی بجھاتے جاؤ ــــ" بلقیس نے اٹھنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے رشید کی خوشامد کی۔

وہ بجلی بجھا کر اندھیرے میں بلقیس کی ناک پکڑنے کی کوشش کرنے لگے اس کی ناک چھوڑ کر دوسرے ہاتھ سے انھوں نے شمّن کی چھنگلیا کو آہستہ سے دبا کر چھوڑ دیا اور جلدی سے باہر نکل گئے ــــ شمّن دیر تک سُن پڑی جاگتی رہی۔

دوسرے دن کھانے کی چھٹی میں ہال کے سامنے نوٹس ٹنگا تھا کہ بنگلے پر آنے کے لیے پہلے پرنسپل صاحبہ کی لکھی ہوئی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ معنی خیز نظریں نسیمہ پر پڑ رہی تھیں اور سر جوڑ جوڑ کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شام کو ایک پوٹلی میں نسیمہ کی دی ہوئی ساری چیزیں اس کے کمرے پر بلقیس کا نوکر دے گیا۔ نسیمہ نے جھاڑو دینے والی مہترانی کو بلا کر پوٹلی جوں کی توں اسے دے دی۔ نہ جانے کتنے جھلملاتے دوپٹے کرتے جوتے، البم، پاؤڈر، لپسٹک کے ڈبے، بندے، انگوٹھیاں اور پنیں ۔۔ لڑکیوں کی حسرت بھری نگاہیں دیکھتی رہیں اور مہترانی سب کچھ سمیٹ لے گئی۔

امتحانوں سے پہلے ہی گرمی کی وجہ سے نسیمہ اور کوکو پہاڑ پر چلی گئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اب نہ آئیں گی۔ ان کا فرنیچر غریب لڑکیوں میں بانٹنے کے لیے چھوڑ دیا گیا مگر وہ فرنیچر بنگلے پر پہنچ گیا۔

19

چھٹیاں آئیں تو گھر جانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہی گھر اسے ناپسند تھا مگر اب کے چھٹیوں میں تو حد ہو گئی۔ نوری سیدھی اپنی ددھیال چلی گئی۔ اس کا دل بری طرح گھبراتا۔ گو وہ کئی مضامین میں کمزور تھی مگر کتاب الٹ کر دیکھنے کو تو جی نہ چاہتا۔ گھر ویسے بھرا پُرا تھا اور غل غپاڑہ مچا رہتا تھا مگر شمن کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کی ایک بھاوج کے بچہ ہوا۔ اس اودھم میں تنہائی ذرا کم ہو گئی مگر پھر بھی اسے ہر چیز بے تکی ادھوری اور بے ڈھنگی معلوم ہوتی۔ کالج میں ہر چیز کتنے انتظام سے ہوتی تھی یہ تھوڑی کہ ہر چیز نشتم پشتم!

بلقیس کا خط آیا اور اس کے ساتھ رشید کا پرچہ بھی۔ بڑے بھیّا نے خط کھول کر

دیکھ لیا اور بڑی بے دے مچی۔ مگر شمن ایک چالاک! اس نے کہدیا کہ یہ اس کی سہیلی کے چھوٹے بھائی نے لکھا ہے اور رشید لکھتا بھی تو بچوں جیسی باتیں تھا اس نے وہی اپنی پرانی اُدھار کی چنٹی مانگی تھی بڑی ٹھٹکی ہوئی آواز میں ڈوبی ہوئی بھیک!

کچھ دن بعد بلقیس پہاڑ پر چلی گئی اور خط آنے بند ہوگئے۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ وہ اور جلیس نینی تال میں پڑھیں گی۔ اس کے بعد جب وہ کالج واپس گئی تو اسے معلوم ہوا کہ رشید انگلینڈ چلا گیا۔

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں سے ٹوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں یکبارگی سے روشن ہوگئیں۔ ان کی کرخت روشنی کی نوکیلی شعاعوں سے اس کی آنکھیں چندھیا کر جھپک گئیں۔ خاموش اور خوفزدہ وہ سانس روک کر سمٹ گئی۔ بچہ شرارت کرنے میں انگلی کاٹ لیتا ہے تو جھٹ اسے کرتے میں چھپائے سہما ہوا کونے میں دبک جاتا ہے۔ شمن کے احساسات بھی دکھ اور شرم سے خوفزدہ ہوکر نہ جانے دل کے کس سنسان کونے میں اوندھے منہ جا گرے۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔

بلقیس کا خط آیا بھی تو اس میں رشید کا کوئی ذکر نہ تھا۔ وہ بھی شاید اس کی طرح آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ جب کوئی اچانک کیچڑ میں پھسل پڑتا ہے تو رحم دل جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں تاکہ گرنے والا چوٹ تو بھی کھول کر سہلا سکے شمن زیادہ مرہم پٹی کی قائل نہ تھی۔ بڑی بے رخی سے سب کچھ دور جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

اسے اب گھر پر بھی دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس نے چھپے چوری سائیکل سیکھ لی اور بھائیوں سے بھی پریم بڑھانا شروع کیا۔ نوری جب ددھیال سے آئی تو حد درجہ پکی ہوگئی تھی۔ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ چھپ چھپ کر اس نے عجیب و غریب کپڑے سینا سیکھ لیے تھے۔ حالانکہ اسے ابھی انکی بالکل ضرورت نہ تھی مگر بڑے پراسرار طریقوں سے پہنے جاتے میلے ہوتے اور دھو کر بند صندوقوں میں سکھائے جاتے

وہ اپنے ایک رشتہ دار کے بھائی سے محبت کرنا سیکھ آئی تھی جس کے نام کے پہلے حرف سے وہ بن بن کر شرمایا کرتی۔ شمن نے اسے رشید کے متعلق کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ اب بتانے کو رہا بھی کیا تھا وہ جان جان کر اسے بھائی رشید کہتی لفظ بھائی پر غیر معمولی زور دے کر۔

بڑی آپا بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی دوستی مونچھوں والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی عزیز بیگم کے میاں انھیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر وہ تو بڑی آپا سے دوپٹہ بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں، وہ تو گھر ہی میں آن رہتی مگر لوگوں نے ایسا غل مچایا کہ حد نہیں بے چاری آپا رو رو کر اپنے مرحوم میاں اور سسر کو کوستی رہی۔ عزیز بیگم سے سارے گھر کو نفرت تھی، بڑے لڑکے تو ان کا نام سن کر ہی چڑھ جاتے، گو وہ پردہ کرنے کے قابل نہ تھے، پھر بھی وہ ان سے چھپ چھپ کر انھیں یاد دلاتیں، کہ وہ جوان ہو رہے ہیں۔ لہٰذا خطرے کی حدود میں آچکے ہیں اور چھوٹے ان کی مونچھوں سے جھینپتے تھے جنھیں وہ کند چھٹیا سے کچھ یوں ہی سا چھدرا کر لیتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر شمن کو بے اختیار نجمہ یاد آجاتی گو صورت میں بہت بل تھا، مگر نہ جانے کیا بات تھی جو دونوں میں موجود تھی وہ ہلکی سی مسکراہٹ جس میں غنودگی اور بیداری ایک ساتھ ڈبکیاں کھاتی نظر آتیں وہ نپی تلی چھوٹی سی چال ...... گرم گرم سانسیں اور دہکا ہوا رنگ!

اسی زمانے میں شمن کی ایک خالہ کا لڑکا اعجاز ان کے گھر میں آکر رہنے لگا۔ اعجاز کا باپ مر چکا تھا اور اماں نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ سوتیلا باپ اس کے حق میں سوت سے بدتر تھا وہ اسے اور خالہ دونوں کو بری طرح کوٹتا تھا۔ اس لیے اسے یہاں بھیج دیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اعجاز کو کوئی کس بات پر مار سکتا تھا، وہ عموماً چپ چاپ الو کی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا، شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ تھا، لوگ ارمان کرتے ہیں کہ ان کے بچے شریر نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ کبھی کانپ اٹھتے، وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں

طرف آنکھیں دوڑایا کرتا، اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوک، ندیدی اور متحیر نظر آتیں۔ بغیر مانگے بھی اس کی ہر رگ کا جنبش سے التجا اور بھکاری پن ٹپکتا۔ کھانے پر سب سے پہلے بغیر پکارے پہنچ کر دسترخوان کی سلوٹیں دور کرنے لگتا اور چچوں کو قرینے سے سجاتا۔ جب تک کھانا شروع نہ ہو جاتا وہ صبر سے بیٹھا میٹھی میٹھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتا، ایک ہی شوق کے ساتھ اچھی بری ہر چیز نگل جاتا، نمک، مرچ، کھٹاس، مٹھاس کے امتیاز سے بے نیاز ہر کھانے کی چیز اسے مزے دار معلوم ہوتی۔ عموماً وہ سب کے بعد کھانا ختم کرتا اور بچی کھچی روٹی اور رکابی کی پوچھن کا بڑا سا لقمہ بنا کر منہ میں رکھ لیتا۔ یہ آخری لقمہ وہ بڑے انہماک سے دیر تک چباتا رہتا۔ ہاتھ منہ دھونے پر لیکن کھانے کا مزہ قائم رکھنے کے لیے وہ کلی ہرگز نہ کرتا۔ ویسے منہ ہاتھ دھونے پر کبھی اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صبح ہی صبح برتن دھونے کے نل سے منہ دھو کر بڑی نفاست سے کرتے کے دامن سے منہ پونچھ ڈالتا، مگر دیکھنے میں پھر بھی نہایت غلیظ نظر آتا۔ گدلی اور مردہ رنگ کی جلد اور مٹیالے بال اور ملگجے کپڑے۔

گھر کے کام کاج میں وہ بڑی مستعدی دکھاتا۔ عموماً اپنے سے چھوٹوں کا کام کر دیتا۔ اسے مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور کتوں کو جوٹھے ٹکڑے کھلانے کا بہت شوق تھا۔ دسترخوان سے سارا کوڑا سمیٹ کر وہ احاطے کے کسی سنسان کونے میں مرغیوں اور کتوں کو پکار کر ڈال دیتا۔ لیکن جلدی ہی لوگوں کو اس کے اس شوق کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ کتوں کو دینے سے پہلے وہ سالن لگے ہوئے ٹکڑے، بچی بچائی ہڈی سے چپکی ہوئی بوٹی اور ایسی ہی دوسری کارآمد چیزیں منہ میں رکھ لیتا۔ اتنا کھانے پر بھی ایک طرح کی بے چینی بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلایا کرتی۔

اعجاز کا پیار کا نام اچھو تھا۔ نہ جانے کمبخت پر کس کو پیار آتا ہو گا۔ مگر لوگ بچوں کے نام رکھتے وقت دوسروں کے احساسات کا تھوڑے خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑا فرماں بردار تھا۔ ابا کو انگریزی بالوں سے سخت نفرت تھی، اور لڑکے سر

منڈواتے وقت غدر مچا دیتے تھے۔ مگر جیسے ہی نائی آتا اجّو اپنا بے ہنگم سر لے بیٹھتا اور مسکرا مسکرا کر منڈوا لیتا۔ انعام کے دو پیسے لے کر وہ کمر بند میں بڑی سی گانٹھ باندھ لیتا مگر ابّا کو یہ انعام دے کر بالکل خوشی نہ ہوتی۔ اپنے اصول پر قائم تھے مگر اجّو کا گھٹا ہوا سر دیکھ کر نفرت کی ایک لہر اُن کے دل میں بھی اٹھتی ۔۔۔ سب کو اس کے سر سے نفرت تھی۔ بچپنے میں ایک ہی رُخ لیٹے رہنے سے اس کا سر ایک طرف کیڑا لگے ہوئے خربوزے کی طرح پچکا ہوا تھا۔ چپت کھا کر وہ خوش مزاجی سے ہنس پڑتا۔ جس پر رحم کا جذبہ ذرا سر اٹھاتا ۔۔۔ لیکن فوراً ہی یہ رحم ایک غیر فانی نفرت میں تبدیل ہو جاتا چھوٹے بڑے ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ نوکر گھڑکیاں دیتے اور برابر والے اس سے گھن کھاتے ۔۔۔ اس پر طرّہ یہ کہ جب شمّن پیدا ہوئی تھی تو خالہ نے اجّو کے نام کا ٹھیکرے میں روپیہ ڈال دیا تھا ۔۔۔ ٹھیکرا تو تھا نہیں کیونکہ شمّن کے پیدا ہونے پر میم آئی تھی مگر زبانی بات ہو گئی تھی۔ امّاں بھی چپ ہو گئی تھیں کہ خالہ کا دل نہ ٹوٹے ماں غریب ہزار جان سے بیٹے پر قربان تھیں، جب کوئی تہوار آتا وہ نئے کپڑوں کا جوڑا اور تل کے لڈّو لے کر آ جاتیں۔ اجّو اچھّا بن کر وہ لڈّو پان دان کی تھالی میں لے کر ہر ایک کے سامنے پیش کرتا۔ مگر سب کے انکار کر دینے پر سارے لڈّو اسی کو ٹھنک لگانے پڑتے۔

علاوہ غریب ہونے کے خالہ بدمذاق اور پرانے فیشن کی بھی تھیں اتنے بڑے گھوڑے کے لیے پھول دار کرتا اور لال ٹول کا رومال لاتیں۔ عید کے دن صبح تڑکے ماں بیٹے اٹھ کر باسی پانچ پانی سے غسل فرماتے اور کورے کلف دار کپڑے پہن کر اجّو سب کو سلام کرنے ان کے بچھونوں پر پہنچ جاتا۔ ساتھ ساتھ دعاؤں کی پوٹلی بغل میں دبائے ہنستی مسکراتی خالہ ہوتیں۔ مگر سب ہی تو اس خلل اندازی پر بڑبڑاتے اور کوئی بھی جی سے دعا نہ دیتے۔ اجّو پڈنگ ہو یا کیک سب کو پٹین ہی کہتا۔

تاش کھیلتے میں جب وہ اسپیڈ اور ڈائمنڈ کے بجائے وہی حکم اور اینٹ کہتا تو منجھلے بھیا کا خون کھول اٹھتا۔

"اچھو کے نیچے سلام کر ـــ ناک پکڑ کر ـــ اِدھر ـــ اور اُدھر بھی ـ"

اچھو ناک پکڑ کر چاروں طرف سلام کرتا ۔" اچھا اب ایک ٹانگ پر کھڑے ہو.....

جلدی، جلدی" وہ اس کے گھٹنوں پر کھٹاک سے چھڑی مارتے ۔" نہ بھیا! کیوں مارے

ڈالے ہو نگوڑے کو ۔" خالہ کھکھیاتیں اور پھر اچھو سے خوشامدیں دوسرے بچوں کے

بستر تہ کرواتیں، بکھرے ہوئے جوتے موزے رکھواتیں، ایک پیسہ آدھی چوسی

ہوئی آم کی گٹھلی، جھوٹے دودھ چاول کا لالچ دے کر اچھو سے ہر ممکن خدمت

لی جا سکتی تھی، اور غریب ہزاروں گٹھلیوں اور جھوٹی ہڈیوں کے نیچے دبا ہوا کوڑیا

غلام کی طرح کام کرتا ۔

جب شمن اچھو کو دیکھتی تو وہ اسے موٹی سی گستاخ گالی نظر آتا ۔ اس کے جذبات

کھول کر بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور اس کا جی چاہتا کسی کی بوٹیاں دانتوں سے

چبا کر تھوک دے ۔ اوپر سے عاقبت نااندیش خالہ نے اچھو کی گت دیکھ کر سوچا

اگر منگنی کا ذکر چھیڑ دیا جائے تو شاید آئندہ داماد سمجھ کر اس شدت سے آزار نہ

پہنچایا جائے لہٰذا وہ بیچ صحن میں بیٹھ کر ارمان بھری باتیں کرنے لگیں ۔ سب دم بخود

رہ گئے اور شمن کے تو تن بدن میں چنگاریاں چٹخنے لگیں ۔ مارے نفرت کے وہ اسکے

منہ پر تھوک بھی تو نہ سکی ـــ مگر اچھو پر کچھ عجیب ہی اثر ہوا ۔ وہ ہکا بکا تھوڑی

دیر چاروں طرف دیکھتا رہا پھر ـــ ایک دم اس کی چمڑی پر نہ جانے جسم کی کن

کن رگوں سے خون جھلک آیا، اٹھ کر وہ بے تحاشہ باہر بھاگ گیا ۔

اس دن سے وہ شمن سے وہ بے طرح شرمایا اور جھینپا سا رہنے لگا ۔ شمن کو

دیکھ کر وہ مفلوج سا ہو جاتا ۔ اور اگر وہ پاس سے بھی گذر جاتی تو وہ شل ہو جاتا

اس کی غیر فانی بھوک کے بعد یہ پہلا جذبہ تھا جو اس شدت سے اچھو پر حملہ آور ہوا

تھا ۔ وہ گھر میں قدم رکھتا تو شمن کے پتنگے لگنے لگتے ۔ امیدوار دامادوں کی سی

سنجیدہ شرم اور تکلف دیکھ کر اس کا جی چاہتا اس کے منہ پر جوتا مار دے ـــ

اور بدترین جملے اس کی شان میں دہرلئے۔ ایک اور بھی زبردست انقلاب پیدا ہو گیا اس میں ـــــ وہ اس کی چلبلی بے وقوفیاں جو وہ لوگوں کے خوش کرنے اور ہنسانے کو کیا کرتا تھا۔ یک لخت بند ہو گئیں گو وہ شمن سے تمرایا رہتا۔ لیکن چھپ چھپ کر گھنٹوں اس کی ہر جنبش کو گھورا کرتا۔

رات کو سب بچوں کے پلنگ برابر برابر ڈال دیے جاتے۔ اجو کسی نہ کسی بہانے سے اپنا پلنگ شمن کے قریب اڑا لیتا۔ کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے، کیونکہ لوگ اسے حد درجے کا بے وقوف سمجھتے تھے۔ لیکن شمن کا ہی جی جانتا تھا، جب سب سو جاتے تو اجو آہستہ آہستہ اس کے پیروں میں اپنے پیر کا انگوٹھا اور انگلیاں ملا کر چٹکیاں لیا کرتا وہ اسے ڈانٹ کر دور جھٹک دیتی مگر وہ سوتا بن جاتا۔ اور رات کو آنکھ کھلتی تو اسے اپنے پلنگ پر چوہے پھدکتے معلوم ہوتے، شاید وہ ساری رات جاگا کرتا تھا کیونکہ دم بھر کو شمن چین سے نہ سو پاتی اجو کا ہاتھ یا پیر اس کی پنڈلی یا ران کو سہلایا کرتا۔

"کیا ہے اجو ـــــ ہم مار دیں گے ـــــ" اس نے کئی بار جوتا اٹھا کر مارا مگر سویا ہوا اجو آہستہ آہستہ اسے خوف زدہ کرنے لگا۔ وہ اس سے بچنے کیلیے بوڑھی لنا کی پٹی سے پٹی ملا کر سونے لگی۔ اور دوسری طرف پلنگ دیوار سے اڑا لیتی اور ان سے وہی بادشاہ اور بادشاہ زادی کی بوسیدہ اور بدمزہ کہانیاں سنا کرتی۔ سنتی کیا خاک، کہانیاں اسے رٹی پڑی تھیں، پڑی ہوں، ہاں کیا کرتی۔ اس کے خیالات بہت دور کسی نہایت ہی دلچسپ ہلکی پھلکی کہانی کا تانا بانا جوڑنے میں مشغول ہوتے۔ اس لطیف کہانی کی وہ ہیروئن ہوتی اور ہیرو؟ نہ جانے کون کون بھلا کس کی مجال تھی جو اس کی ان کہانیوں کا ہیرو بننے سے انکار کرے۔

اس نے ایک بار "ہیر رانجھا" فلم دیکھا تھا۔ ہیر نے کیا بھولے پن سے آنکھ مچولی کھیلنے میں رانجھے کو پکڑ لیا تھا۔ کچھ ایسی ہی دل دھڑکانے والی معصوم سی ملاقات اس کی اور رشید کی ہوئی تھی ...... پکنک میں جب ...... وہ ......

وہ سو جاتی۔ سائیں سائیں خواب اسے میٹھے لمبے پینگ دے کر جھلاتے۔

ایک بار پھر اوپر چڑھتی چلی جا رہی ہے، پھر چڑھتی ہے اور پھسل پڑتی ہے چکنی چکنی زمین اس کے پیروں کے نیچے گدگدیاں کرتی مچل مچل کر بھاگ رہی ہے — وہی بلقیس کا کمرہ اور کیرم کا تختہ — رشید بلقیس کے دوپٹے کا گھونگھٹ کاڑھے ہے — وہ پردہ کرتی ہے نا رشید سے — رشید کی بے ایمان آنکھیں دوپٹے کی مہین چلمن میں سے جھانک رہی ہیں — وہ ہار گئی — جیتا ہوا رشید اس کی کلائی پکڑے دو انگلیوں کو ملائے چٹکی مارنے کو تیار ہے — کہ ایک دم سے ٹھنڈی ٹھنڈی دم گھٹنے والی خلا اسے لپیٹ کر بھیڑ کی طرح کھائے ڈالتی ہے — گرم گرم پانی کی بے آواز دھاریں کندھوں اور کنپٹیوں پر سے پھسلتی رینگتی چلی جا رہی ہیں کہ ایک دم سے وہ جاگ پڑتی — اوہ! اجو کے بھوکے ہاتھ!!

دبی ہوئی خوف زدہ چیخ کے ساتھ وہ دیکھتی کہ اجو اس کے سرہانے سے بھاگ کر پانی پینے کے مٹکوں کے پاس بڑا مشغول نظر آ رہا ہے۔ وہ اس کی لرزتی ہوئی پھٹکار کا کوئی جواب نہ دیتا اور پانی پی کر خاموش اپنے پلنگ پر جا کر تا گھنٹوں خوف سے شمن کانپا کرتی۔ ہزاروں نفس جگہ بے جگہ جھنجھنایا کرتیں۔

نفرت میں خوف کا اور اضافہ ہو گیا — اجو دن بھر تو بالکل معصوم دکھائی دیتا لیکن — لیکن رات کو بھوت کی طرح ڈراؤنا نظر آتا۔ اس کی صورت اور بھی مسخ ہو چکی تھی۔ دن رات سر اوندھائے پڑھنے میں جتا رہتا — تعجب تو یہ ہے اس کی وہ غیر فانی بھوک ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کئی بار بلانے پر وہ دسترخوان پر آتا — دو چار لقمے بے توجہی سے کھا کر چل دیتا۔ اب اسے دودھ میں بساند، خربوزوں میں نیک اور آموں میں کھٹاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ میٹرک میں رٹ رٹا کر وظیفہ پانے لگا لیکن شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا۔ جب کہ وہ رات کو شمن کے سرہانے یا پائنتی کھڑا نظر نہ آتا ہو۔ اب وہ ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ بے چینی سے ٹہلتا — رک جاتا۔ جھکتا اور پھر جھجک جاتا

ایک دن شمّن کا دوپٹہ پلنگ کے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس نے جھک کر اٹھایا۔ پھر گھبرا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ لیکن فوراً ہی وہ پچھتانے لگا۔ کہ آخر اس نے جلدی کیوں پھینک دیا دوپٹہ —— دوبارہ اٹھانے کی ساری کوشش اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے خاک میں ملادی —— شمّن کو کلبلاتا دیکھ کر وہ جلدی سے پانی پینے لگا۔

عموماً شمّن جاگ بھی جاتی تو پڑی پڑی اس ڈرامے کو دیکھا کرتی۔ جونہی وہ اسے دلیر ہوتا دیکھتی کروٹ لے کر جاگنے کی دھمکی دیتی گو وہ خوب جانتی تھی کہ اس میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ بیداری کا اعلان کر سکے —— کروٹ لے کر وہ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی۔

"مر جائے —— مر جائے کاش اجّو مر جائے ——" وہ کچھ نہ سمجھتا اور جھک کر اس کے ملتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے لگتا —— مگر ایک دن تو شمّن کے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ نہا کر وہ گیلے بال کھولے سو گئی —— رات کو اسے ایسا معلوم ہوا کوئی اسے بالوں سے پکڑے جھوٹکے دے رہا ہے۔ جھلّا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخیں مارنے لگی۔ اس کی سانس رک گئی منہ پھٹا تھا مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اجّو اس کے بالوں میں بھوکے کتّے کی طرح منہ دیے سسکیوں سے رو رہا تھا۔ بھاگتے ہوئے اجّو کو اس نے زور سے چپّل اٹھا کر ماری۔

صبح کو اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا مگر چپّل نہ ملی۔

"میں نے رات کو کتّے کے کھینچ ماری تھی —— نہ جانے کدھر گئی۔"

"اوئی کتّا رات بھر بند ہا ہے —— کتّا کہاں سے آیا ——" کسی نے کہا۔

"اے شاید موری کھلی رہ گئی ہو —— کوئی جنگلی کتّا ہو گا۔"

"ہاں جنگلی ہی تھا —— ایسا ڈراونا۔" شمّن نے سہارے پر چلنا شروع کیا۔

"یہ کتے موڈی کاٹے اٹھا بھی تو لے جاتے ہیں۔"

"کتے چیل کا کیا کریں گے ؟"

"اے یونہی اللہ مارے اٹھائے جاتے ہیں، میری نئی دلی کی جوتی کلیم میاں کی کتیا اٹھائے گئی — حرام خور نے ساری چھلنی کر ڈالی۔"

بات بھٹکتی ہوئی کہیں سے کہیں پہنچی مگر شمن کی الجھن نہ گئی — آخر چپل گئی کہاں ؟ اس دن سے اجو کا پلنگ دوسرے چبوترے پر پہنچ گیا۔ شمن نے شکر کیا۔ کم بخت سے جان تو چھوٹی۔ اس کے بعد اس نے اجو کو حد درجہ بے تعلق اور اپنے پڑھنے لکھنے میں غرق دیکھا۔ جوتی کھا کر جیسے اس کا پیٹ ہی بھر گیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور شمن کے جانے میں دو چار دن رہ گئے تھے کہ اجو کو اسکول سے پیدل آنے میں لو لگ گئی۔ ویسے تو کسی کو پتہ نہ چلا لیکن شام کو جب اسے سستی سے پڑے رہنے پر ابا نے ڈانٹ کر پیڑوں میں پانی دینے کیلئے کہا تو لپک کر اٹھ بیٹھا، دو چار قدم چلا بھی مگر پھر جھوم کر زمین پر آ رہا۔ دیکھا تو ایک سو پانچ بخار......

شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے خدا نے اس کی دعا قبول کر لی اور اجو چلا — رات بھر اسے بخار اور ہذیان نے جھنجھوڑا اور دوسرا دن بھی بے ہوشی میں گذر گیا ویسے ابا کو کسی کی خبر نہیں رہتی۔ لیکن اگر کوئی بیمار ہو جائے تو گھر کو لوٹ لوٹ کر کے رکھ دیتے ہیں یہاں تک کہ اگر مرغی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی تو ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ اجو کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی وہ اٹھ کر بھاگتا۔ سارا گھر اسکا ماتھا چھوے گیا، مگر شمن نے جا کر جھانکا بھی نہیں۔ باری باری سب کی ڈیوٹی لگائی گئی تو شمن کو بھی جبراً جانا پڑا۔ مگر وہ ارادہ کر کے گئی تھی کہ مردار کو ہاتھ بھی نہ لگائے گی مگر جب اسے بے سدھ دیکھا تو ترس آ گیا اور وہ برف کی ڈلی لے کر اس کے سر پر رگڑنے لگی۔ سر میں سے بھبکے نکل رہے تھے۔ ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں کے کونوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اجو کی

حالت قابلِ رحم تھی۔ باہر برف کی قلفیاں کھل رہی تھیں۔ شمن ندیدی کا نہ سہی برچی تو لوٹ رہا تھا۔ اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے مگر اجو نے پانی کیلیے ہونٹ چبانا شروع کیا۔ اس نے برف کی ڈلی لے کر اس کے گرم گرم دہکتے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی۔ ہونٹ اس کی انگلی سے چھو گئے! وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اجو نے آنکھیں کھول دیں اور بغیر آنکھیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا۔ ایک سنخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔۔ شمن بھاگ کر جانے لگی۔

"شمن" اس نے ایک بار حلق سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ باہر آکر ملائی کو بہت کھانے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حلق جل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف کے چھلکے اس کا گلا بھینچنے لگے۔ برف کی پیالی رکھ کر اس نے اپنی انگلیوں کے پورے بھاپ سے گرم کرنا شروع کیے۔ جیسے کسی لاش کو چھو لینے سے ان کا خون جم کر رہ گیا ہو۔

وہ کھرے پلنگ پر پانی چھڑک کر پڑ رہی۔ جسم میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہو جاتا۔ اجو کی بخار سے جھلسی ہوئی آواز اس کے کان میں سانپ کی پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا اس کے جذبات کیوں بے طرح اتھل پتھل ہوئے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن جب اجو کا بستر بدلنے کے لیے اٹھایا گیا تو شمن کی کھوئی ہوئی چپل وہ دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے اوندھا پڑا تھا۔ بخار اتر کر حرارت غریزی سے بھی پارہ نیچے گر گیا تھا اور آنکھیں پتھرا چلی تھیں۔

۳۰

سوتے سوتے جو آنکھ کھلی تو شمن نے گھر میں عجیب طرح کی چہل پہل دیکھی ایک لمبا بانس لیے چپراسی کمروں کے جالے لے رہا تھا اور مہترانی پر ملازی نہ صاف کرنے پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ بڑی آپا ناک پر کپڑا باندھے تختوں کے نیچے سے کوڑا نکلوا رہی تھیں، اماں الماریاں کھول کر چینی کے برتن نکلوا رہی تھیں معلوم ہوا کلکتے والے چچا مع اپنے ہونہار سپوت عباس کے تشریف لا رہے تھے۔ عباس اکلوتے ہونے کے علاوہ انگلینڈ سے انجینیری پاس کر کے آئے تھے۔ کلکتے والے چچا حد درجہ نالائق اور نکمے تھے مگر یہ ان کا بیٹا نہ جانے کس طرح ہیرا نکل آیا۔ گورنمنٹ سے وظیفہ لے کر انجینیری پاس کر آیا۔ چچا بیچارے کے دن پھر گئے۔ "خاندان میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک خوفناک چھوت کی بیماری کی سی رہی جہاں جا کر پڑ جاتے دھکے" دیکر نکالے بغیر نہ نکلتے"۔ اماں تو ان سے پردہ کرنے لگی تھیں۔ لڑکیاں یونہی دعا سلام کر کے چلی آتیں۔ اور وہ نوکروں کی دھتکاریں اور مذاق کا نشانہ بنے جب تک ہمت قائم رہتی جمے رہتے پھر کہیں اور ٹھوکریں کھانے چلے جاتے۔ عباس کو ایک ماسٹر نے ترس کھا کر رکھ لیا تھا اور آج جو وہ چمکتے ستارے کی طرح آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے واپس آیا تو سارے خاندان کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ منجھلے اور چھوٹے ماموں اسٹیشن پر ہار پھول لے کر پہنچے۔ خالہ بی نے تو چار اسٹیشن پہلے ہی ناشتہ کا انتظام کروایا تھا۔ شمن کے یہاں چینی کے برتن اور چاندنیاں قالین نکلنے لگے تھے اور کوٹھے کا کمرہ سجنے لگا تھا۔

خیر خدا خدا کر کے عباس میاں مع اپنے بدقماش باپ اور پھوہڑ ماں اور

چیچک زدہ بہن فہمیدہ کے دوپہر کی گاڑی سے پہنچ ہی گئے۔ اماں نے بہن کو بھینچ کر گلے لگایا اور چچا کو سچ مچ دعا دی۔

"اے فہمیدہ ماشاءاللہ کتنی بڑی ہوگئی، بڑی آپا اسے پیار سے لپٹا کر بولیں ۔۔۔ تم نوری کے ساتھ سونا ۔۔۔ اچھا!"

خالہ بی جل کر کوئلہ ہو گئیں۔

"اوئی! بھلا اپنی عمر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر نوری کے پاس کیا جی لگے گا۔ اے بیٹی تم اپنی ثمینہ آپا کے پاس جاؤ وہ تمہارا منہ ہاتھ دھلوائیں گی کیا کھڑی کھڑی تک رہی ہو منہ! اے ثمینہ بہن کو غسل خانے لے جاؤ۔

بڑی آپا حیرت زدہ رہ گئیں۔ اندھیر ہے کہ نہیں، رانڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے! پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے حقدار کا خیال کریں گے۔ مگر فہمیدہ کو ثمینہ اور احمدی سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اڑیں۔

"اے شمن عباس کے لیے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ ڈھما بنی بیٹھی ہو" ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔

اے شمن خاک اتنا سوچیں گی ..... نوری؟..... جاؤ تو ذرا میری بجلی کی انگیٹھی پر پانی گرم کر کے اوپر لے جاؤ" بڑی آپا بولیں۔

مگر اس سے قبل کہ نوری پانی گرم کرتی۔ چھوٹی ممانی منہ دھلوا فخریہ عباس میاں کو لے کر اوپر سے اتر آئیں۔ سب کے سب منہ دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بٹھا کر پان لگانے لگیں۔

چچا غریب تو بوکھلا گئے اور سمجھے بھی نہیں کہ کیوں اتنی خاطریں ہو رہی ہیں بے چارے کو بڑی الکسی سی محسوس ہوتی۔ وہ تو بے چارے الٹی خوشامدوں کے عادی تھے۔ جب آتے تھے ڈیوڑھی میں پلنگ ڈلوا دیا جاتا تھا۔ وہیں سینی میں کھانا چلا جاتا۔ سارے کنبے کی خوشامدوں سے وہ بول کھا گئے۔ پر جلد ہی انھیں

معلوم ہوگیا کہ خاندان میں ضرورت سے زیادہ لڑکیاں ہیں اور لڑکے کم اور نکھٹو!
بوکھلا بوکھلا کر کبھی وہ عباس کے لیے ثمینہ کو پسند کرتے اور کبھی نوری پر رحم
آجاتا۔ ثمینہ کی عمر چار رہی تھی تو نوری کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ یتیم تھی۔
کبھی بلقیس پر مہربان تو کبھی حسنا پر کبھی شمّن پر عنایت کی بارش تو کبھی احمدی پر۔
ان کا بس چلتا تو وہ ساری کی ساری لڑکیوں کو ایک دم بیاہ لیتے
وہ کسی کام کو کہتے تو سارے گھر میں کھلبلی پڑ جاتی۔ مائیں لڑکیوں کو دوڑاتیں
اور وہ بے چاریاں کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔ ایک مقابلہ ہو رہا تھا گویا دیکھیں کون
چچا چچی کو خاطروں سے بے حال کر کے ٹرافی یعنی عبّاس کو جیت لے جاتا ہے۔ بڑی
آپا نے تو ایک نئی ہی ترکیب نکالی وہ یہ کہ نوری انگریزی کے جملوں کے معنی پوچھنے
عباس کے سر پر سوار کر دی۔ مگر ثمینہ ماشاءاللہ خود ہوشیار تھیں اور عباس کی
زیادہ تر توجّہ ان کی ہی طرف رہتی تھی نوری کو وہ بچہ سمجھتے۔ شمّن کو بدمذاق اور
احمدی کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس بے چاری کا نتیجہ تو صاف
ظاہر تھا۔

ثمینہ بی کچھ لجائی شرمائی عباس کے مذاق کا جواب دیتی رہتیں۔ ان کے لیے
سوئٹر بننا شروع کر دیا تھا جسے خالہ بی کبھی بنواتی جاتیں۔ بلقیس حد سے زیادہ
شرمیلی تھی پر اماّں کے ٹہوکوں پر مجبور ہو کر آگے بڑھتی اور پیچھے کھنچ آتی۔ شام
کو تاش بجیسی کا جادو ہوتا چچا گالیاں بک بک کر پلّ باندھ لیتے۔ ایک دفعہ
اسی طرح گالی بکنے پر اماّں نے ان سے پردہ کر لیا تھا۔ پر آج سب مہذب
بیویاں کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ خالہ بی پنکھے کے پیچھے منہ چھپا کر کھی کھی ہنستیں۔
چچا خوب بے ایمانیاں کرتے مگر شریر بچہ سمجھ کر معاف کر دیے جاتے۔ چچی
اجلی دیواروں پر پیک کی پچکاریاں مارتیں کہ اماّں لرز لرز اٹھتیں مگر کیا مجال تھی
جو کوئی بول جائے۔ بات یہ تھی کہ عباس باوا اماّں کے غلام تھے۔

یوں تو عباس ثمینہ ہی سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ مگر جونہی وہ

کسی کام سے ہٹتی وہ احمدی، شمن یا بلقیس پر مہربان ہو جاتے۔ مذاق تو وہ سب ہی لڑکیوں سے کرتے اور ان کے مذاق کا رخ دیکھ کر ہی سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی۔ ویسے ثمینہ سب سے بڑی تھیں اور پہلا حق ان کا تھا یہاں تو بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ شمن کے باپ کے احسانات چچا کی جان پر بہت تھے لہذا یہاں بھی بحث کی کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔ نوری یتیم تھی اور یہاں خاندان والوں کی شرافت اور عباس کی عالی ظرفی کا سب کو یقین تھا۔ پھر فیصلہ کیسے ہوگا؟ سب منتظر تھے۔

ویسے عباس بہت ہی دلچسپ تھے جونہی وہ اندر آتے لڑکیاں کسی نہ کسی بہانے سے جمع ہو جاتیں۔ اور پھر یا تو ان کا بٹن ٹوٹ جاتا جسے بلقیس احمدی یا شمن ٹانکتیں یا ثمینہ کی چھنگلیا کے پاس والی انگلی میں نظر نہ آنے والی پھانس چبھ جاتی جو کسی سے نہ نکلتی پر بھالے کی طرح کھٹکا کرتی۔ جب عباس اس پھانس کو نکالتے تو انھیں ایسے ایسے جملے سوجھتے کہ ثمینہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔

"بھئی اس شریر انگلی کا تو بس ایک علاج ہے۔" وہ ہنستے۔

"بھلا کیا علاج ہے وہ۔ آپ کر دیکھئے نا۔" ثمینہ شرماتیں۔

"اس کا علاج یہ ہے کہ ایک جگمگاتی ہوئی انگوٹھی ..."

"ہٹیے! وہ شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی خالہ کی باچھیں کھل جاتیں۔

"اچھا خیر لایئے اب کچھ نہ کہوں گا۔"

اس کے علاوہ نوری روز بروز انگریزی کے الفاظ میں کمزور ہوئی جاتی۔ بڑی آپا غم و فکر سے گھلنے لگتی اور ڈانٹوں کے مارے نوری کو رنگانے لیتی۔ چیلر غ مسلم کھاتے کھاتے ادھ مرے ہو گئے۔ چچی نے کاجو کا حلوا اتنا ٹھکا کہ معدہ جواب دے گیا۔ فہمیدہ کے دوپٹوں کو ٹنگتے اور ٹینتے ثمینہ اور احمدی کے انگوٹھے سوج گئے۔ سب سانس روکے وظائف میں غرق صبر سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ دیکھئے اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔ کس کی قسمت جاگتی ہے۔

شمن کو عباس پسند تھے اس لیے ہی نہیں کہ ان کے بال گھونگریالے

اور آنکھیں غلافی تھیں۔ بلکہ وہ ہنساتے جو بہت تھے۔ بیٹھے بیٹھے گال میں چٹکی بھر لینا ایک دم سے درد سر کا بہانہ کر کے گھٹنے پر لیٹ جانا۔ پان بجائے ہاتھ کے منہ میں لینا اور لیتے وقت انگلی دانتوں سے دبانے کی کوشش کرنا۔ بھولے میں ران یا گھٹنہ مسل دینا وغیرہ۔

جاڑوں کے دن سب رضائیاں اوڑھ کر بیٹھ جاتے اور ان رضائیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح کوندتے۔ لڑکیوں کے گروہ میں ننھی ننھی لرزشیں مچل مچل کر بکھر جاتیں۔ وہ دور ہٹتیں۔ لیکن پھر سمٹ آتیں۔ گھر کے بزرگ بھی بچوں کے ہنسی مذاق سے ذرا دور پان چھالیہ میں غرق بیٹھے رہتے۔ مگر ان کے کان انھیں کی طرف لگے رہتے۔

رات کو جب سب لڑکیاں کھسر پھسر کرتیں تو عباس کی ڈالی ہوئی چنگاریاں دہک اٹھتیں۔ سوائے ثمینہ کے وہ سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھیں۔ اور ان کے دلوں میں ذرا بھی تو رشک نہ تھا۔ گوپیوں کی طرح وہ مل جل کر ایک ہی کرشن کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ وہ انھیں اکیلے میں بھائی کہہ کر چھیڑا کرتیں۔ مگر ثمینہ نے اسے سب کے سامنے کہنے کو منع کر دیا تھا وہ اب عباس سے اور بھی زیادہ شرمانے لگی تھی۔ خالہ بی دن رات گوکھرو لچکوں اور کرنوں کے ذکر کیا کرتیں۔ ان کی اندھیری کوٹھری میں کچھ دن سے مراد آبادی اور تانبے کے برتنوں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

بڑی آپا بھی غافل نہ تھیں انھوں نے جھٹ پٹ چوہے دنتیاں تڑوا کر نئے فیشن کے دست بند بنوانے شروع کر دیے تھے اور ہر وقت چینی کے ان سیٹوں کا ذکر کرتیں جو وہ کلکتے یا بمبئی سے منگوانے والی تھیں جو ایک دم سے سب کچھ سانحہ طے ہو گیا تو بے چاری مارے ہولوں کے مر نہ جائیں گی۔

شمّن کی اماں ادھم سادھے ہوئے تھیں کیونکہ ذرا سی دیر میں بڑی آپا اپنے
بے وقت مرنے والے میاں کو یاد کرکے ماتم شروع کر دیتی تھیں۔ نانی ہو کر نواسی کا
پیغام چھین لیتیں؟ پھر بھی آپا احتیاطاً طعنے دیتی رہتی۔

"اے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ارے بھتیجی لوگوں
کو تو بہت مل جائیں گے۔ یتیم کو جڑ جائے تو بہت جانو۔ قرآن پاک میں بھی یہی لکھا
ہے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق ..... پھر..... مگر خالہ بی تو یہ باتیں سن کر بالکل بھولی
انجان بن جاتیں۔ وہ جہیز کی تیاری میں منہمک تھیں۔

اس کے علاوہ اور بھی قیاس آرائیاں ہوتیں۔ جیسے گھوڑ دوڑ کے میدان
میں لوگ موسم دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں اسی طرح بڑی آپا خالہ بی سے اور چھوٹی
ممانی سے باتیں کرتیں۔

"نہیں بی، میری بات مانو یا نہ مانو پر دیکھ لینا وہ بلقیس سے تو کرنے کا نہیں
ہاں اپنی نوری ....." ممانی، آپا کو خوش کرتیں۔

"اے بی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو تمینہ تو کیا شمّن ہی سے کرے تو بہت
جانو....." بڑی آپا جواب دیتیں۔

"دیکھو اب کیا ہوتا ہے ..... ویسے تمہاری خالہ پنجے جھاڑ کر پیچھے تو پڑ
گئی ہیں۔ اے کل آنکھ [illegible] کا لحاف بنایا ہے، کیا سوا چھو راز ڈالوں جیسا....
میں نے تو کہہ دیا بہن....."

غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ چکے۔ کبھی ایک آگے
تو کبھی دوسرا آگے یا جیسے انٹرویو ہو رہا ہے۔ لوگ اپنی اپنی کر چکے ہیں نتیجے کا بے صبری
سے انتظار ہے۔ چچا چچی پیغام دے کے نہیں جھکتے اور نہ ہی منہ سے پھوٹتے ہیں۔
کھا لیا پیا اور پیر پسار کر سو گئے۔ اور یہاں سب کی نیندیں حرام ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر دولہا اندر قدم نہیں رکھ چکتا۔

ادھر عباس نے آنکھ مچولیاں کھیلنا شروع کر دی تھیں۔ بلقیس جب پچھلے برآمد

سے چھالیاں نکال رہی تھی تو نہ جانے عباس کدھر سے آن پہونچے اور پکڑ لیا۔ بڑی مشکل سے بھاگی اور پھر ایک دن جو شمن نے ایک دم ڈرائنگ روم میں چلی گئی تو وہ ثمینہ بھابو کو گھیرے کھڑے تھے۔ ثمینہ تو بھاگ گئی پر جب شمن جانے لگی تو عباس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہوگی تو نہیں؟ کیوں شمن۔"

"کیوں نہیں کہوں گی ٹھہر جائیے ذرا۔" شمن نے ذرا شرارت سے کہا اور ہنسی

"نہیں، نہیں .... دیکھو کسی سے نہ کہنا .... سنو ...." اور وہ کوئی بہت مزے دار بات سنانے قریب آ گئے۔

"اچھا بھئی چھوڑیئے تو کسی سے نہ کہوں گی۔" وہ اپنی جان چھڑانے لگی۔

"اوں ہوں .... قسم کھاؤ .... ہمارے سر کی قسم کھاؤ پہلے۔" عباس نے گھسیٹ کر اُسے اور قریب کر لیا۔

"اچھا .... اچھا .... آپ کے سر کی قسم .... چھوڑیے۔" وہ بوکھلائی

"لیکن سنو تو ...." انھوں نے اسے بھینچنا چاہا۔

"شمن انھوں نے تڑپ کر بھاگتی ہوئی مچھلی کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔

دیر تک وہ جھلائی ہوئی ہانپتی رہی۔ عباس کے قرب سے نہ جانے کیوں اسے اتنی گھن آئی۔ وہ ان سے مذاق کر سکتی تھی مگر دور سے، یہ اتنے قریب کی چہلیں اسے بڑی کڑوی معلوم ہوئیں۔

"کیوں؟" وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عباس کے بال رشید سے کتنے ملتے جلتے تھے وہ کچھ قہقہے بھی اسی کی طرح لگاتے تھے .... مگر تو پھر کیا چیز تھی جس سے اسے گھن آئی لوگ ایک ہی چمچہ منہ میں ڈال ڈال کر کھاتے ہوں تو جی متلا ہی جاتا ہے۔ اس منہ کا لعاب اس منہ میں! توبہ تھوڑی ہی دیر پہلے ثمینہ بھاگی تھی ....

اور۔ عباس کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور جانے کے خیال سے وہ اداس ہو جاتا اس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی بددل ہو جاتیں اور سارے بڑے بوڑھے بھی سہم جاتے۔ وہ ایک ایک دن ٹال رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے لڑکیوں کو اندھیرے

اجالے گھیر رہا تھا۔ اور ادھر بھی چاروں طرف چٹکیاں کھلی تھیں۔ دانے ڈالے
جا رہے تھے۔ جال پھینکے جا رہے تھے۔ اور شکاری لاسہ لگائے آس میں بیٹھے تھے۔ زبان

شادی بیاہ کے دن رات چرچے ہوتے مگر چچی اور چچا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ آخر خالہ بی کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا۔ چچا کے جواب سے ایسا معلوم ہوا ایک آندھی آئی اور آبادیوں کی آبادیاں ویران کرتی چلی گئی۔ آئی سی ایس کا انٹرویو ہوتا ہے۔ کامیاب طلبا کیسے ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے مٹھائیاں بانٹتے ہیں نذر نیاز پوری کی جاتی ہے اور جو بے چارے قسمت کے مارے رہ جاتے ہیں ان کے یہاں چھوٹی موٹی موت سی ہو جاتی ہے۔ ہزاروں ارمانوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قتل۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ گورنمنٹ نے دھاندلا کے آئی سی ایس کا عہدہ ہی توڑ دیا تو یہ ایک قومی و ملکی موت کہلائے گی۔ یہی ہوا کہ چچی نے چلنے سے پہلے سب کو عباس کی شادی کا زبانی بلاوا دے دیا۔ اس شادی کا جو انگلینڈ جانے سے پہلے ہی ان ماسٹر صاحب کی لڑکی سے طے ہو چکی تھی۔ جنھوں نے عباس کو تعلیم دلوائی تھی۔ لڑکی کالی بھی تھی اور غریب بھی مگر سگھڑ بہت تھی۔

سگھڑ بہو نے نہ جانے کتنے جہیزوں چوبے دیتوں اور آنکھ کے نشئے کے لحافوں پر جھاڑو پھیر دی۔ ایک دم اماں کو مرغیوں پر پیار آنے لگا۔ کاجر کے حلوے ختم ہو کر دوبارہ نہ بنے۔ فہمیدہ کو جو خالہ جوڑہ دے رہی تھیں اس کا دوپٹہ نہ جانے کہاں کپڑوں کے نیچے ہو گیا۔ اور کرتے پاجامے کا کپڑا احمدی کو بھا گیا۔ دیواروں پر بیک کی پچکاریاں لمبے اور گہرے زخموں کی طرح دلوں کے پار ہونے لگیں۔

چچا اور چچی ایک ضروری کام کی وجہ سے فوراً روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اور
تمینہ کے ہسٹریا کے دورے پھر سے شروع ہو گئے۔ نوری کی تیتمی مواد بھری رسولی تشبیہ
کی طرح ابھر آئی اور منجھلی ممانی بلقیس کو نامراد نصیبوں جلی کے خطابوں سے پکارنے لگیں۔

چچا اور چچی خوف ناک پھوڑوں جیسی ٹیسیں کلیجوں میں چھوڑ گئے۔ چچی دو کیے

بستر میں چھوٹے سے باندھے گئیں اور فہمیدہ شمیمہ کے چاندی کے بندے اُتارنا بھول گئی۔ چچا سارے تاش کے پتے تھوک میں سان گئے اور عباس نہ جانے کتنی آہیں اور شب بیداریاں چند معصوم دلوں میں چھوڑ کر چل دیا۔

۲۱

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس کا داخلہ ایک امریکن مشنری کالج میں ہو گیا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ دنیا کتنی لمبی چوڑی ہے۔ اب تک تو وہ جیسے انڈے کی سطح پر رینگ رہی تھی۔ چکنی بے رنگی اور لامتناہی ...... مگر پھر بھی محدود۔ جتنا بھی چلے جاؤ وسعت ختم نہیں ہوتی، پھر بھی جہاں تھے وہیں۔ کالج میں قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ڈاک گاڑی میں اُڑی چلی جا رہی تھی۔ جنکشن آ گیا۔ اسے بہت جلد اس جنکشن کے غل غپاڑے میں ڈوب جانا پڑا۔ ادبی جلسے، دلچسپ لکچر، پرزور تقریریں، ہنگامہ خیز سیریں، اور قیامت انگیز عشق بازیاں۔ پہلی بات جو دو لڑکیاں کرتی ہیں وہ عاشقوں اور چاہنے والوں کی ہی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا بھاؤ اسی ذریعہ سے معلوم کرتی ہیں۔ مثلاً میری پر ساری یونیورسٹی مرتی ہے۔ بینا رائے پر سیاست کی پوری کلاس فدا ہے اور کملا پر سنسکرت کے پنڈت جی تین سال سے مر رہے ہیں۔ کشور پر فارسی کے استاد نیم جاں تھے، باقی لڑکیوں پر بھی حصہ رسداں کے چچیرے اور ممیرے بھائی اور پڑوسی فدا تھے۔ کم از کم کالج کی فضا میں تو ان کا یہی حصہ تھا۔ کالج کے قوانین بڑے سخت تھے۔ ویسے تو کسی کا سگا باپ بھی بغیر چھان بین کے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود عشق کا اتھاہ ساگر پڑا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس معاملے میں چھلے ہوئے منہ اور سڑے ہوئے پیلے دانتوں والی میٹرن کی بھی کچھ نہ چلتی تھی۔

ان میڑن سے سب کو ہی بغض* للّٰہی تھا۔ شاید جنگ عظیم میں ان کا عاشق مارا گیا تھا۔ یا شاید چھوڑ چھاڑ کر چل دیا اور غریب نے اس بہانے کی آڑ میں پناہ لے لی۔ ہر لڑکی کے راز معلوم کرنے کی فکر میں لگی رہتیں جہاں دس بجے اور اللہ کی بندی بجلی گل کرنے کے لیے سر پر سوار! خود دو دو گھنٹے پہلے سے سونے کی تیاریاں شروع کر دیتیں۔ غسل کر کے منہ پر پالش کی جاتی۔ گنتی کے چار بال امیٹھ کر گھونگر بنائے جاتے اور سیخ گھونگر بنی ہوئی بتیوں کی صورت میں ان کی پیشانی پر تھرکتے نظر آتے۔ ڈھیلا ڈھالا جاپانی کمونا جس پر اژدہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اور بغیر ایڑی کی سلیپریں پہن کر جب وہ چلتیں تو ان کا ڈھلا ہوا جسم ایسے کلبلاتا گویا ان اژدہوں میں جان پڑ گئی ہے۔

باوجود انتہائی نفرت کے ہر لڑکی کو ان کی خوشامد* میں اتوار کو ان کے مرحوم عاشق کی تصویر کی تعریف کرنی پڑتی۔ یہ تصویر ایک فوجی گورے کی تھی، نہایت کریہہ، فٹ بھر لمبا کرخت چہرہ اور اوپر کا تنگ ہونٹ دانتوں پر سے کھنچا ہوا جیسے کسی پر غصے میں دانت پیس رہا ہے۔ منڈی بھنویں اور چھدرے بال۔ بیالوجی کی لڑکیوں کا خیال تھا کہ میڑن اور اس گورے کا بیج مل* جاتا تو یقیناً گھوڑے کی کوئی عجیب الخلقت قسم پیدا ہوتی۔

یہ میڑن کسی لڑکی کو بغیر عاشق کے تصور ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ حالانکہ خود بے چاری ن تھیں۔ ایک دفعہ پریما کا سگا بھائی آیا تو وہ برآمدے میں ہی کھڑی تھی۔ اجازت لینے کا خیال بھی نہ آیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ بلکہ شمن کو بھی ساتھ گھسیٹ لے گئی۔

بے چارہ نریندر حد سے زیادہ بوکھلایا ہوا رہا۔ پھر بھی جونہی میڑن کو پتہ چلا ہانپتی ہوئی موقع واردات پر پہنچیں۔ بہتیرا پریما نے کہا کہ وہ اس کا سگا بھائی ہے۔ دوسرے نہایت چغد ہے مگر وہ نہ مانیں اور رپورٹ کر دی۔ مگر پریما ایک چلتی پرزہ* وہ داؤں لگایا کہ پرنسپل بھی خاموش ہو گئیں۔ پہلے تو وہ ملاقاتی کارڈ

ڈھونڈھ کر ان پر ملنے والوں کے نام لکھے گئے۔ اور پھر ان پر شمن اور پریا کے سرپرستوں کے دستخط کرائے گئے۔ جو ایک بی اے کی لڑکی نے کر دیے۔ ان کارڈوں کی رو سے شمن کو نہ صرف پریا کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت تھی بلکہ وہ اس کے گھر چھٹیوں میں جاکر دن رات رہ سکتی تھی۔ حالانکہ شمن اور پریا صرف دو ماہ سے کلاس فیلو تھیں لیکن ان کارڈوں پر لکھا تھا کہ ان کے والدین خاندانی دوست ہیں۔ یہ کارڈ پرنسپل کی میز پر چپکے سے رکھ دیے۔ جب پرنسپل آئیں تو پریا نے بڑی معصومیت سے کارڈوں کا ذکر کیا بلکہ اخبار کے نیچے سے نکال ان کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ الٹی میٹرن پر ڈانٹ پڑی۔

لہٰذا اتوار کو شمن پریا کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ نریندر کے ساتھ اور چھ سات دوست بھی تھے مگر پریا نے زبردستی کی اور موٹر لبالب بھر گئی۔ دوپہر کا وقت؛ چلچلاتی دھوپ، لُو کے تھپیڑے جھلسائے دے رہے تھے مگر شمن کے جسم میں ٹھنڈی چنگاریاں رینگ رہی تھیں۔ عمر میں پہلی بار اتنے ڈھیر سے کھردرے کوٹ، بڑے بڑے جوتے اور بے ضرورت ہیٹ اس سے اتنے قریب آئے تھے۔ شاید ان دونوں پر رعب ڈالنے کے لیے سب لڑکے اتر رہے تھے۔

وہ پریا سے بے حد بے تکلف تھے۔ ان میں سے ایک جب سب ہُو ہُو کر رہے تھے، پریا کے شانے سے لگا اونگھ رہا تھا اور ہر جھکولے کے ساتھ اس کا سر پریا کے سینے پر آن گرتا۔ جس پر پریا دانت پیس کر اس کے گھنے بالوں کے گچھے جھنجھوڑ ڈالتی۔ انور اس کے برہنہ بازو پر تین دن کی مونڈی ہوئی مونچھیں چبھونے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہایت فراٹے سے نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قصہ شمن کو سنانے میں غرق تھی۔ موٹر احاطے میں گھومتی ہوئی برآمدے کے سامنے رک گئی۔ بیٹھے بیٹھے جوڑ سن ہو گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ٹانگیں کھینچ کھینچ کر نکالیں اور سب چیختے چلاتے اندر پہنچے۔

شمن سب سے پیچھے تھی اس نے دیکھا کہ پریا کسی سے صوفے پر کشتی لڑنے

میں مشغول تھی۔ اور بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ زبیدہ اور اس کے دوست چیخ چیخ کر ان دونوں کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ آخر کو پریما پسپت ہو کر صوفے سے لڑھک گئی۔

"شاباش رائے صاحب!" زبیدہ نے حریف مخالف کی پیٹھ ٹھوک کر کہا۔

"ارے شمن..... رائے صاحب یہ ہے شمن!" پریما نے تعارف کرایا۔

"ہوں" وہ چشمے کے نیچے سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولے ان کے ہونٹوں میں ایک لمبا سا سگار جھول رہا تھا اور اس میں سے دھوئیں کی لمبی لمبی چسکیاں لے کر وہ ہونٹ کے کونے سے باریک ڈوروں کی صورت میں پھونک رہے تھے۔ پاس ہی اسٹول پر رنگوں کی طشتری اور برش بکھرے پڑے تھے اور سامنے ایک عورت کی نامکمل تصویر دیوار پر چسپاں تھی۔

شمن آنکھ بچا کر غور سے انھیں دیکھنے لگی۔ خوب مضبوط مگر چھریرا جسم، اونچا قد اور تپتے ہوئے سونے جیسا رنگ، اس پر چاندی سے بھی زیادہ اُجلے بالوں کا ڈھیر کا ڈھیر! یہ عجیب و غریب صورت دیکھ کر شمن ایسی بوکھلائی کہ اسے یاد بھی نہ رہا کہ وہ کتنی دیر سے انھیں گھور رہی ہے کہ ایک دم رائے صاحب بولے۔

"اے!.... کیا نام ہے اس لڑکی کا؟..... کچھ جنگلی سی معلوم ہوتی ہے"۔

"شمن" دو تین گلے ایک دم چلائے۔

"چمن"؟

"نہیں..... شمن"

"ادھر آ.... چمن!" رائے صاحب نے دھوئیں کی ڈوریاں پھونکتے ہوئے کہا۔ شمن اٹھ کر گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے وہ اس کے قریب آگئے اور ایسے تمسخر سے دیکھنے لگے گویا وہ کوئی عجیب و غریب جانور ہے۔ شرارت سے ان کے چہرے کے چھوٹے چھوٹے عضلات مسکرا رہے تھے اور بھوئیں پھڑ

رہی تھیں۔ ایک دم سے انھوں نے آنکھوں کے پپوٹے کھینچ کر دیکھے۔

"زبان نکالو" انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔ شمّن نے بے ساختہ زبان نکال دی جس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ آئی۔

"کیا بات ہے کچھ بھوکی معلوم ہوتی ہے" "ارے پریا کچھ دانہ پانی تو ڈال اس چڑیا کے لیے۔۔۔۔ کیا ہے تیرا نام۔۔۔ جمن" "شمّن رائے صاحب! پریا چلائی شمّن"۔۔۔۔ "یہ شمّن کیا ہوتا ہے؟ نہیں ہم تو اسے جمن کہیں گے۔ اسے کھانے کو دو کچھ۔۔۔۔ ارے ٹھیر، تو اتنی پیلی کیوں ہے کیا تیرے پاس پوڈر سوڈر کچھ نہیں۔۔۔۔ اِدھر آ"۔ اس سے پہلے کہ شمّن کچھ سمجھتی رائے صاحب نے اس کے گالوں پر برش سے سرخ رنگ لگا دیا۔ کھسیا کر وہ ہتھیلیوں سے گال رگڑنے لگی۔ "بڑے خراب ہیں آپ ہٹیے" پریا نے انھیں ڈھکیل دیا اور شمّن کو غسل خانے میں لے گئی۔

شام کو رائے صاحب اور سب لوگ تیرنے کے لیے حوض میں اترے شمّن کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے وہ کنارے پر پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ رائے صاحب دو تین دفعہ اوپر سے کودے اور بڑی دیر تک تیراکی کے کمالات دکھاتے رہے کبھی چیت تیرتے تو کبھی پٹ اور کبھی دیر تک پانی میں غوطہ لگا جاتے۔

"ارے یہ جل کوا کیسا بیٹھا ہے" انھوں نے شمّن کو کنارے پر پیر لٹکائے دیکھ کر چھیڑا۔ "یہ پانی میں کیوں نہیں اترتی؟" جب پریا نے بتایا کہ وہ تیرنا نہیں جانتی تو انھوں نے اس کے کان میں کچھ کہا اور غوطہ مار گئے۔ شمّن حیرت سے منھ پھاڑے پانی کو گھورتی رہی کہ اب نکلیں گے اب نکلیں کہ ایک دم سے سب چلائے۔

"مگر۔۔۔ مگر!" اور شمّن غڑاپ سے پانی میں اور بدحواس ہو کر رائے صاحب کو ناخونوں سے کھروچنے لگی جو اسے ڈوبنے سے بچاتے آئے تھے۔

”ہیں ہیں .... ارے نوچے گی تو پھر مگر کو دے دوں گا۔“
شمن کھسیا کر بسورنے لگی اور سب کا ہنستے ہنستے، برا حال ہو گیا۔
رات کو جلدی جلدی کھانا کھایا گیا اس کے بعد ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے
سب کی رائے ہوئی کہ ناچ ہو۔ پہلے تو پریما نے اپنے تازہ سبق کا مظاہرہ کیا اور
جب وہ تھک گئی تو سب چلائے۔ ”رائے صاحب، رائے صاحب۔“
پہلے تو رائے صاحب خاموش رہے پھر انھوں نے سگار طشتری میں ڈال دیا۔
اور لیمپ کی طرف پشت کر کے خاموش کھڑے ہو گئے۔ باجا بجتا رہا اور وہ پاؤں
جمائے دیوار پر گھورتے رہے۔ پھر آہستہ سے انھوں نے کرتا اتار کر ہوا میں اچھال
دیا اور اپنے برہنہ بازوؤں کو سہلاتے رہے، پھر.... شمن کا منہ حیرت کے
مارے پھٹا پھٹا رہ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ مڑے اور ان کا کسرتی جسم
سُر تال پر لہرانے لگا۔ جیسے کوئی سنگیں بت یکایک انگڑائی لے کر جاگ
اٹھا ہو۔ وہی بدن جو کچھ دیر پہلے قدرے بوڑھا معلوم ہو رہا تھا کھینچے ہوئے
ستار کی طرح بج اٹھا۔ سڈول قبضوں کی بے پناہ جنبش، پنڈلیوں کا مضبوط
خم اور چوڑے چکلے سینے کا جلال.... معلوم ہوتا تھا سُر باجے سے نہیں
بلکہ ان اعضا کی لوچدار جنبش سے نکل رہے ہیں۔ انگلیوں کی حرکت، پیر کا
دھاکا اور مچھلیوں کی ہر لرزش نغمہ بن کر پھیل گئی۔ پشت پر روشن لیمپ
چاندی جیسے گھنے اور خم دار بالوں کو تراشے ہوئے ہیروں کی طرح منور کر رہا تھا
ایک دم جیسے طوفان کی دوڑ تیز ہو گئی۔ ساز دوگن میں بھاگنے لگے۔ قہر و غضب
کا پر جلال دیوتا پراسرار دنیا سے نکل کر غیض و غضب کے کوڑے برسانے
لگا۔ دھوم گرج کے ساتھ کائنات کو ہلا کر رکھ دیا۔ رائے صاحب ایک
ہیبت ناک پہاڑ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سفید دھوتی سمندری جھاگوں
کی طرح قدموں میں لہریں لے رہی تھی۔ ان کے نقرئی بال بالکل ایسے معلوم ہو
رہے تھے جیسے پہاڑ کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا ہو۔

ساز رک گئے ۔۔۔۔ ناچ ختم ہو گیا مگر شمّن کا دماغ ناچتا رہا اور جب مذاق میں رائے صاحب نے زور سے "ہو" کر کے اس کے آگے تالی بجائی تو بے ساختہ اس کی گھگی سی بندھ گئی اور اگر سب نہ ہنس پڑتے تو وہ بالکل ہی بدحواس ہو جاتی۔ وہ حیران سب کی صورتیں دیکھنے لگی اور پھر خود بھی قہقہے مار کر ہنس پڑی۔

"ڈرپوک چوہیا" رائے صاحب نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھکول ڈالا اور اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"بول سیکھے گی تو بھی؟"

شمّن نے دانت نکال کر سر ہلا دیا۔

"ہنہ! بڑی آئی سیکھنے والی۔ پریما ذرا اس چھوکری کو دیکھنا۔ کہتی ہے ناچ سیکھے گی۔ ارے بھئی لانا تو ڈگ ڈگی۔۔۔۔ میں ذرا اسکو ناچ سکھا دوں۔"

"میں کوئی بندریا ہوں۔۔۔۔ واہ!"

"او ہو! بندریا نہیں تو پھر کیا بھالو ہے؟۔۔۔ اچھا مٹھائی لا اور شاگرد بن جا"

"پہلے آپ سکھا دیجئے تو پھر مٹھائی کھلاؤں گی۔"

"واہ بھئی خوب رہی پہلے فیس دو تبھی تو ناچ سکھائیں کہ ویسے ہی بس دو مہینے میں تیتری کی طرح ناچنے لگے گی۔"

"واہ میں تو آپ کی طرح۔۔۔۔۔ آپ"

"شمّن" رائے صاحب نے میر کی تو مٹھائی ہضم کر لی اور کچھ نہ سکھایا" پریما بولی۔

"ارے شش۔ خاموش۔۔۔۔۔ ہاں کیا نام ہے لڑکی تیرا۔۔۔ چمن؟"

"اچھا مٹھائی جانے دے بس تو اب کے چھٹی میں آ گر ہمارے کرتے میں

بٹن ٹانک دے اور ہم تمہیں ناچ سکھا دیں گے: سمجھی ؟"

"بٹن ؟"

"ہاں بٹن، سب کرتوں کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں، یہ جو پریا ہے نا ایک دم ردی کی ٹکمی! بس شوخی کرنا جانتی ہے" پریا اس تعریف پر اترا اٹھی اور رائے صاحب کی گود میں لد گئی۔

بٹن ٹانک کر ناچ سیکھنے کا پکا ارادہ کر کے وہ پریا کے ساتھ ہی ہوسٹل لوٹ آئی۔ راستے بھر وہ رائے صاحب کی باتیں دہرا کر ہنستی رہی۔ جسم کو پلنگ پر ڈال کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ میلوں کی دوڑ لگا کر آئی ہے۔ ناچ کے تاثر میں اب تک اس کی روح پھنسی ہوئی پیچ در پیچ گھوم رہی تھی۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل کسی مقناطیسی طاقت کے آگے ماتھا ٹیک دینے کو چاہتا تھا۔ آج اس کے دل میں عبودیت نوخیز کلی کی طرح کھل رہی تھی۔

"رائے صاحب کا نام کیا ہے؟ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں پریا سے پوچھا

"ارے پگلی! میرے پتا جی ہیں رائے صاحب" پریا ہنسنے لگی۔

"مگر.... مگر پریا!" وہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیوں؟" اس نے کروٹ لے کر پوچھا۔

"کچھ نہیں پریا" وہ خاموش ہو گئی۔

"ہم انھیں رائے صاحب کہتے ہیں، انھیں سب ہی رائے صاحب کہتے ہیں۔ بڑے اچھے ہیں، میرے اوپر جان چھڑکتے ہیں۔"

شمن چڑ گئی۔ اس کا جی چاہا پریا کو ڈانٹے کہ وہ کیوں ان سے جان چھڑکواتی ہے مگر پھر یہ بات انتہائی بے تکی معلوم ہوئی۔ وہ خاموش تکیہ اپنے سینے سے چمٹائے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ لوہے کے پلنگ کے زنگ کھائے ہوئے تاروں سے اکھڑا اکھڑا نغمہ نکل کر اسے سوچنے میں مدد دینے لگا۔

۲۲

شام کو لڑکیاں اونچے اونچے سیاہ بلومر اور جمپر پہن کر کالج کے میدان میں آزادانہ چھلانگیں لگاتیں، مالی، بیرے اور چوکیدار برہنہ رانوں اور سڈول پنڈلیوں کو گھور گھور کر آنکھیں سینکتے۔ چھوٹا مہتر بھی شام کو اسی وقت برآمدے جھاڑتا۔ میٹرن کو اس مہتر سے خاص عناد تھا، وہ ان کے ہاسٹل میں صفائی کرتا تھا۔ اور بقول ان کے نہایت ہی بدمعاش اور بدنگاہ تھا۔ زیادہ تر وہ اسے انتی ہی نظر آتیں۔ جب دیکھو جب ہوسٹل کے سنسان کونوں میں اسے گھیرے ایک آدھ تار مکڑی کے جالے کا دو چار آوارہ تنکے دکھا دکھا کر ڈانٹ رہی ہیں مگر وہ بھی بلا کا ضدی تھا، سر جھکائے اپنے سفید دانت چمکایا کرتا تھا۔ وہ اس پر جھلا جھلا کر چڑھی بیٹھتیں تھیں، مگر وہ انھیں ٹوٹی ہوئی جھاڑو سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھتا۔ اس کی جھاڑو کے سپاٹوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ کبھی کا اپنی دانست میں کوڑے کے ساتھ جھاڑ چکا ہے، یہ ان کا ڈھیٹ پن تھا کہ پھر بھی ٹوٹی پڑتی تھیں، نہ معلوم اسے دیکھ کر انھیں کیا ہو جاتا تھا جب وہ لڑکیوں کو گھورتا تو وہ بلبلا اٹھتیں۔ اپنی چھوٹی سے مونڈھیا پر بیٹھ کر تاسف سے سر ہلاتیں انھیں تعجب تھا کہ ذہن میں لڑکیاں اُن غنڈوں کی آنکھیں اپنی رانوں پر رینگتی ہوئی بھی نہیں محسوس کرتیں، وہ خود اپنا پھنسا ہوا فراک اور ابلتے ہوئے کولہے جو مونڈھیا کے چاروں طرف پہاڑ کی چٹانوں کی طرح جھولتے رہتے سمٹنے میں مشغول رہتیں۔ نہ جانے اتنی نحیف و نزار مونڈھیا اُن کا وزن کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ وہ اس ظالمانہ انداز سے اس پر پہلو

برتیں۔ گویا وہ چھوٹے مہتر پر سوار اُسے دلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا بس نہیں تھا ورنہ اس کی ہڈیاں چیر کر جھاڑو بنا ڈالتیں یا اس کے خون سے فرش دھلوا ڈالتیں۔ وہ اس کی بدمعاشی کو ہندوستان کی مذہبی تنگ نگاہی پر محمول کرتیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو یقیناً اس کی سیاہ روح پاک ہو جائے گی۔

بڑے رازداری کے انداز سے وہ لڑکیوں سے اس کے چال چلن کے بارے میں گھما پھرا کر سوال کرتیں۔ وہ انھیں چھپ کر جھانکتا تو نہیں؟ کمرہ صاف کرتے میں کوئی فحش اشارے تو نہیں کرتا؟ اس کی مسکراہٹ بڑی لرزہ خیز تھی۔ ایک مہتر تھا نینی تال میں جہاں وہ پہلے پہل نوکر ہوئی تھیں۔ وہ اکیلے دکیلے لڑکیوں کو پکڑ کر چوم لیا کرتا تھا۔ ایک اور بھنگی بھی جبل پور مشن اسکول میں انھیں چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ یہ بھنگی لوگ ہم لوگ کو بڑا حیران کرتے۔ ان کا عزت بھی بہت خراب کرتے ہیں۔ یہ قصے سناتے وقت ان کی دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں کسی گذشتہ زمانے کے خوانِ نعمت کی یاد میں بھوکی ہو جاتیں اور ہونٹوں پر شدت سے پسینہ پھوٹ نکلتا۔ ہا! بے چاری سفید دلیہ داسیاں بجائے وجیہہ قباؤں والے کاہنوں کے ان کالے بھنگیوں کے متھے چڑھ رہی تھیں۔ ان کی سیاہ روحوں کو خدا باپ کے قدموں تک گھسیٹ لے جانے میں وہ خود غلاظت کی دلدل میں گھسٹ جاتیں۔ ان میموں کی یہ گت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ایک فاتح قوم ہندوستان کی جھلسا دینے والی ہوا اور ہندوستانیوں کی پاگل کر دینے والی تاریک ذہنیت کے آگے بالکل ہاری ہوئی اور پژمردہ نظر آنے لگتی۔ وہ گلاب کو شرما دینے والی رنگتیں، تیل میں ڈوبے ہوئے پرانے چمڑے کی طرح سوکھ جاتیں۔ وہ آسمان کی نیلاہٹ سے زیادہ شفاف آنکھیں سوکھے تالاب میں پیاسے مینڈکوں کی طرح ابل آتیں۔ بال اور پلکیں خزاں رسیدہ پتوں کی طرح غائب، جگہ جگہ

گوشت کے ابھار تنگ جوتوں میں سے ٹخنوں پر کے گوشت کے جھولتے ہوئے لوتھڑے، یہ تھیں وہ چیزیں جو باقی رہ جاتیں۔ میٹرن جب ہندوستان آئی تھیں تو جنگِ عظیم کے لوٗ سے جھلسی ہوئی مگر نوخیز کلی تھیں اور اب گوبھی کی پالا ماری گانٹھ کی طرح بکھری جاتی تھیں۔

بھنگی سے ان کی ایسی لاگ ڈانٹ بڑھی کہ ایک دن وہ چھتری لے کر اس پر پل پڑیں۔ اسے مار کر وہ پسینے میں شرابور روتی ہوئی کرسی پر گر پڑیں۔ لڑکیوں کے ٹھٹ کمرے پر ٹوٹ پڑے، بظاہر سب ہمدردی ظاہر کرتی رہیں لیکن کسی کو بھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ان کے ہاتھ پیر سہلاتی تاکہ ان کا جی ٹھکانے ہوتا۔ دوسرے ہوسٹل کی میٹرن کو خبر ہوئی اور وہ دوڑی ہوئی آئیں، لڑکیوں کو بھگایا اور ان کے جسم کو جو ربڑ کے فیتوں اور ڈوریوں سے مصنوعی گڑیا کی طرح جکڑا ہوا تھا ذرا ڈھیلا کیا تو ہوش ٹھکانے ہوئے۔ علمِ نفسیات کی لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کر کے قہقہے لگانے لگیں۔ بات پرنسپل تک پہنچی اور چھوٹے مہتر کو میٹری بھون ہوسٹل میں بھیج دیا گیا۔

بے چاری معاملات کی اس الٹ پھیر کے لیے بالکل تیار نہ تھیں اور نہایت بردباری سے سر ہلا کر کہتیں کہ پرنسپل کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑیگا ان کے دباؤ سے نکل کر بھنگی ساری لڑکیوں کو نہ خراب کر دے، تو بات نہیں!

چھوٹے بھنگی کے بجائے بوڑھا مہتر جو بانیٔ کالج کے زمانے سے کام کر رہا تھا، نشاط محل میں صفائی کرنے لگا۔ اسے سب جمعدار کہتے تھے۔ ڈاکوؤں جیسی صورت، سیاہ پہاڑ جیسی رنگت، شب بیداری اور بھنگ کی وجہ سے سرخ انگارہ آنکھیں، آواز ایسی جیسے گہری سی باولی میں کوئی بھوت گڑگڑا رہا ہو، نہایت صاف اور مقطع دردی رعب دار چال میٹرن جو کوئی بھی حکم دیتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا "جانتے ہیں!" بے چاری ہیبت زدہ ہو کر رہ جاتیں۔ لڑکیوں سے روہانسی آواز میں اپنی بے عزتی

کا گلہ کرتیں، جو زیادہ جی بھر آتا تو سارا غصہ انھیں پر اتار دیتیں! کیلے کے چھلکے بے جگہ کیوں پھینکے؟ ردّی کا غذ جمع کرکے بڑی کھوج لگاتیں کہ اس پر کس لڑکی نے لکھا ہے، معلوم کر لینے کے بعد وہ سارے پُرزے ایک کڑی تنبیہ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر لگا دیتیں، لڑکیاں نوچ ناچ کر پھینک دیتیں۔ ایک دفعہ پرنسپل نے جو دنیا بھر کی ردّی بورڈ پر چپکی دیکھی تو غریب کو الٹی ڈانٹ بتائی۔

دنیا میں ان کی صرف ایک دوست تھیں مس جونسن چھ فٹ سے بھی کچھ نکلتا ہوا قد، سپاٹ سینا اور مردوں جیسے کٹے ہوئے بال! شیو کرتی تھیں جو ان کی لاابالی عادتوں کی وجہ سے دو دو دن نہ ہوتا، یہ ورزش اور کھیلوں کی تعلیم دیتی تھیں، نیک بخت اس زور سے گیند میں ہٹ لگاتیں کہ جی لرز اٹھتا، نئی نئی لڑکیاں تو ان کے سامنے ٹانگیں کھلے جمپر پہنتے شرماتیں۔ آواز پھٹی ہوئی جیسے پندرہ سولہ برس کے لڑکے کی ہوتی ہے۔ میٹرن اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو "ڈارلنگ" کہتی تھیں اور جب کوئی سویٹر یا ان کا اور کوئی کپڑا اسیتیں تو جان جان کر لڑکیوں کو دکھاتیں۔ ذکر کرتے میں وہ ہمیشہ "ڈیر مس جونسن" ہی کہتی اور ان ڈیر مس جونسن سے لڑکیوں کو للّہی بغض تھا۔ اوّل تو وہ سوائے ورزش کے احکامات کے بہت کم بولتیں۔ شمّن کو تو ان سے بات کرتے موت آتی، گرگڑ کرتی بھاری امریکن لہجے والی انگریزی زبان کا ایک لفظ بھی پلّے نہ پڑتا۔ ورزش کرتے میں ذرا کسی نے غلطی کی اور دیوی نے جھپٹ کر لگایا ایک مکّا!

ایک دن کھیل کی نئی یونیفارم کے لیے مس جونسن لڑکیوں کی ناپ لے رہی تھیں، شمّن کو سخت گھبراہٹ معلوم ہوئی۔ ایک ایک لڑکی اندر جاتی اور ناپ دے کر واپس لوٹ آتی۔ شمّن کی جب باری آئی تو وہ ہچکچاتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔ مس جونسن ناپنے کا فیتہ لیے ایک کاپی پر جھکی کچھ لکھ

رہی تھیں۔ شمن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "گرٹ گرٹ" نہ جانے انھوں نے کیا حکم دیا، مگر وہ گھبرا کر دوپٹے کا پلو چباتی رہی۔

"گرٹ ..... گرٹرا!" وہ پھر کچھ بڑبڑائیں، شمن نے دو قدم اٹھائے آگے نہ پیچھے! اب کے جو انھوں نے ڈانٹ کر ذرا صاف زبان میں قریب آنے کا حکم دیا، تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ کیا واہیات ہے؟" وہ گرجیں۔

"شمن کھسیانی زبردستی کی مسکراہٹ جمائے آگے بڑھی۔ فیتہ لے کر انھوں نے ناپ لینا شروع کیا۔

"ہاتھ اوپر کرو!" شمن کچھ نہ سمجھی۔

"اونہہ بے وقوف ہاتھ اوپر کرو" شمن نے بغلیں بھینچ لیں۔

مس جونس نے ایک جھنجھوڑی دے کر اسے سیدھا کھڑا کیا اور دو جھٹکے کندھوں میں جمائے شمن ڈری ہوئی بکری کی طرح روتی ہوئی فرش پر گٹھڑی مڑی ہو گئی۔

"سیدھی کھڑی ہو۔" مس جونس کہتی رہیں اور وہ اسی طرح گھری، ناک سے رونے کی آواز نکالتی ہوئی بھاگ کر دروازے سے جا ٹکرائی۔

"ارے!... سلی گرل!" مس جونس کا دو دن کا مونڈا ہوا بالائی ہونٹ مسکراہٹ سے پھڑپھڑایا مگر شمن سیدھی اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر گر پڑی اور دیر تک گھوڑے کے ہنہناتے جیسی دبی آوازیں نکال کر روتی رہی۔

اس دن سے اسے مس جونس سے ایسی شرم آئی کہ وہ برابر نیلی چھٹی جو بیمار لڑکیاں مس جونس کے لیٹر بکس میں ورزش سے معافی مانگنے کے لیے ڈالتی تھیں ڈبے بیر جاکر ڈال آتی۔ ان نیلی چٹھیوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ وہ اس کی ہیلتھ رپورٹ کے ساتھ چپکا کر ہوسٹل کی لیڈی ڈاکٹر

کے پاس بھیجی گئیں اور پھر ایک دن بورڈ پر اُس کا نام اور لڑکیوں کی فہرست میں نظر آیا۔ جو مسلسل خرابی صحت کی وجہ سے ڈاکٹری معائنے کی محتاج تھیں۔

ہوسٹل کا یہ مختصر ہسپتال تعلیم گاہ سے ذرا دور ہٹ کر امرودوں اور نارنگیوں کے باغ میں واقع تھا۔ نہایت صاف ستھرے، خوبصورت کمرے اور سامنے کھلا میدان عام طور پر لڑکیاں اتوار کو غل غپاڑے سے بچنے کے لیے رات کے کپڑے پہن کر ان کمروں میں ذرا سا بیماری کا بہانہ کر کے جا لیٹتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ کالج سے ملحق جو یونیورسٹی تھی وہاں کے لڑکے آتے جاتے ان کمروں کی کھڑکیوں کی طرف تاکا کرتے تھے اور کئی قصے بھی کھڑکیوں سے وابستہ تھے۔ کئی لڑکیاں بدمعاش لڑکوں کے ساتھ ہونے سے پہلے ان ہی کمروں میں بیماری کا بہانہ بنا کر رہی تھیں۔

اسپتال کی نرس ایک سیاہ فام حبشی نژاد امریکن نرس تھیں پھیلے ہوئے جسم کی ٹھنگنی سی عورت، نرسوں کے سفید براق لباس میں شنک ہوتی اور سنگِ مرمر کا بنا ہوا مقبرہ معلوم ہوتیں۔ عام طور پر ان کی گفتگو اُن فرار ہونے والی لڑکیوں کے متعلق ہوتی جو بھاگنے سے پہلے اُن کے زیرِ سایہ رہی تھیں ہر لڑکی کو وہ اصولِ صحت سمجھاتے وقت جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کی اہمیت پر مدلل لکچر دیا کرتیں "بوائز" کو گھیرنے کے تیر بہدف نسخے تو انھیں ازبر یاد تھے۔

پنڈلیوں کے بال خلاں پوڈر سے اڑاؤ تو موٹے نہیں نکلیں گے۔ کمر پہ سے ساڑھی خوب کھینچ کر باندھو.... "ایسے۔" وہ ساڑھی کو بالکل تہمد کی طرح کس کر بتاتیں۔ "اتنا تنگ باڈی مت پہنا کرو، سارا جسم لٹک جائے گا۔ انگلش گرلز کو دیکھو۔" وہ انگلش گرلز کا ایسے ذکر کرتیں گویا انگریزوں نے یہ ساری مفتوحات اِن منڈی ہوئی ٹانگوں اور چست باڈیوں کے ہی بل بوتے پر زیر کر رکھی ہیں۔ جسم سے بدبو دور کرنے کی اور

مختلف پوشیدہ دواؤں کے نام مفت بتایا کرتی تھیں. مگر بجائے شکر گذار ہونے
کے لڑکیاں الٹی چراغ پا ہو جاتیں.

یہ نرس ہر وقت امریکہ یعنی اپنے دیس کی تعریفیں کیا کرتیں، اور بڑے بڑے معززین کا ایسے ذکر کرتیں جیسے وہ ان کے سگے چچا ماموں تھے. عبادت کیلئے جب ساری لڑکیاں اور پروفیسر روز دوپہر کے کھانے سے قبل جمع ہوتیں تو وہ بھی امریکن استانیوں کے بیچ میں کالے تل کی طرح ملاحت سے چمکا کرتیں. ان کی آنکھیں سفید چمڑی کی قربت کے غرور سے اور بھی گڑھوں میں جا کر چمکنے لگتیں. ایسا معلوم ہوتا کہ وہ سب کو اس معجزے سے متاثر کرنا چاہتی ہیں، کہ دیکھو ہم سفیدی کے کتنے پاس بیٹھے ہوئے ہیں. سفید میمیں بھی اپنے ہر انداز سے یہی کہتی معلوم ہوتیں کہ لوگو! دیکھو تم ہمیں، اور عش عش کرو، ہم کتنے بلند ہیں کہ کیچڑ ہو یا کوئلہ ہم ہر ایک کو پاس بٹھا لیتے ہیں. یہ دیکھو ہم اس الٹے توے کے ساتھ کس خندہ پیشانی سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں. اور تم ہمیں نک چڑھا اور مغرور کہتے ہو؟ نہ جانے یہ سفید قومیں سیاہ انسانوں کو انسان سمجھ کر اس کا احسان کس پہ جتانا چاہتی ہیں. اور کس دھوم سے اس کا ڈھنڈورہ پیٹتی ہیں. انگلش چرچ جدا ہے اور وہاں کتوں اور ان کے ساتھ ہندوستانیوں کے جانے کی اجازت نہیں مگر مہینے میں ایک دفعہ باری باری سے سفید استانیاں کالے چرچ میں عبادت کر کے اسے مقدس بنانے ضرور چلی جاتیں. ہندوستانی لڑکیاں مارے غرور اور احسان کے بوجھ سے گردنیں اکڑا کر عبادت گاہ میں داخل ہوتیں.

شمن کی ایک عیسائی دوست ایلما تھی. بڑی منہ پھٹ اور زبان دراز، جنوبی ہند کی مخصوص چاکلیٹی رنگت، بھونرا سے سیاہ بال اور سادھوؤں کی سی سرخ ڈورے کھنچی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں. اودے رنگ کے پکے جامن جیسے پھیلے ہوئے ہونٹ اور رستا ہوا چہرہ اس کے گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور دانت غیر معمولی نیلاہٹ مائل سفید تھے جب وہ

زور سے قہقہے لگاتی تو بہت سے دانت چمک اٹھتے جو بڑے دھاردار اور زہریلے معلوم ہوتے۔ لڑکیاں اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں کیا کرتیں۔ گو وہ عیسائی تھی، لیکن گرجے بہت کم جاتی اور اگر جاتی بھی تو صرف لڑکیوں کے ساتھ مل کر حمد گانے۔ اس کی آواز بہت رسیلی تھی اور گانے کا بہت شوق تھا غسل کرتے وقت وہ پوری آواز سے اوٹ پٹانگ گیت گایا کرتی، اس کے کمرے میں بجائے یسوع کے کرشن کی تصویر لگی تھی۔ جس کے آگے وہ سونے سے پہلے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آئتیں پڑھ کر سینے پر صلیب کا نشان بنایا کرتی تھی، وہ کہتی تھی مجھے سفید رنگت سے گھن آتی ہے۔ اور صلیب پر لٹکے ہوئے مسیح پر رحم آتا ہے اور رحم کے ساتھ عقیدت کا جذبہ بجائے عبودیت کے دل میں بغاوت کی آرزو پیدا کر دیتا ہے۔ دوسری طرف ہنستے کھیلتے بنسری بجاتے کنہیا جی کو دیکھ کر دل ناچ اٹھتا ہے۔

پھر ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن کی تصویر تو نکال کر پھینک دی اور اس کی جگہ ایک اور تصویر لگا دی جس میں ایک بندر پیڑ پر بیٹھا کیلا کھا رہا تھا۔ دوسرا بندر نیچے سے ایک لکڑی اس کی پیٹھ میں چبھو رہا تھا اور پہلے بندر کا آدھا کھایا ہوا کیلا زمین پر گر رہا تھا۔ جس پر نیچے والا بندر مسکرا رہا تھا۔ جب لڑکیوں نے اس سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو وہ اپنے مخصوص قہقہے لگا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتی۔

"کرشن جی کی بنسری کو کیڑا لگ گیا تھا اسمیں سے مینڈھک ٹرٹرا رہا تھا۔" وہ ہانکتی، "مکھن کا بڑا شوقین تھا نا، معلوم ہوتا ہے تھوڑا سا مکھن بنسری میں لگا رہ گیا جو دیمک چاٹ گئی۔

اور پھر وہ منہ چڑا کر کہتی،

"انھیں سوائے عورتوں سے مذاق کرنے کے اور کام ہی کیا تھا، سنا ہے بیاہی عورتیں زیادہ پسند تھیں۔"

اس پر لڑکیوں نے بڑی گت بنائی پرنسپل سے شکایت کر دی یہی نہیں دو گئی بار شمن سے الجھ پڑی۔

"یہ سب پیغمبر عورتوں پر کیوں فدا تھے — یوں تو ہنری ہشتم بھی پیغمبر تھا....." مگر شمن غصے سے بے قابو ہو گئی اور آنسو نکل آئے ایلما نے خاموشی سے معافی مانگ لی۔

تین چار دن بعد بندروں کی تصویر میں تغیر ہوا۔ پیڑ پر بیٹھا ہوا بندر جان بل بن گیا اور نیچے والے نے دھوتی پہن لی اور ہاتھ سے چھوٹ کر گرتا ہوا کیلا ہندوستان کا نقشہ بن گیا۔

ایلما کو ڈرائنگ بہت بری آتی تھی مگر وہ اس بھدی تصویر میں نت نئی گلکاریاں دکھاتی اور اپنے نیلگوں دھاردار دانت کھول کر لمبے لمبے قہقہے لگاتی۔

اس کی بے ہودہ گوئی اس قدر بڑھی کہ ایک دن لڑکیوں نے سختی سے پرنسپل سے شکایت کر دی۔ دیر تک وہ اس سے بحث کرتی رہی۔ جب دفتر سے نکلی تو بہت خاموش تھی اور منہ اترا ہوا تھا۔ شمن کو اس کی باتیں بری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اسے اداس دیکھ کر اس کا جی کڑھ گیا۔ اس نے بتایا کہ پرنسپل نے کہا ہے کہ اگر آئندہ اسکے متعلق شکایت سنی گئی تو رسٹی کیشن کر دیا جائیگا۔ اور وہ باقاعدہ عبادت میں شریک نہ ہوئی تو ہوسٹل سے نکال دی جائے گی۔ گو شمن کو اس کی باتوں سے ڈر معلوم ہوتا تھا پھر بھی وہ اسے سمجھاتی رہی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے بعد ایلما نے کالج چھوڑ دیا اور یونیورسٹی چلی گئی وہیں کیلاش ہوسٹل جو یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لیے خاص طور پر کھولا گیا تھا چلی گئی۔ مگر اکثر وہ شمن کے پاس آیا کرتی۔

شمن کو اس نے کچھ خشک سی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں۔ مگر ان میں اسکا قطعی جی نہ لگا۔ ایلما یونیورسٹی میں جا کر چمک اٹھی۔ کلاس میں اوّل رہنے کے

علاوہ اسے یونین کا پریذیڈنٹ بھی بنا دیا گیا، جہاں وہ ہنگامہ خیز تقریروں سے لڑکوں اور پروفیسروں پر چھا گئی۔

۳۴

اسکول اور کالج میں کتنا لمبا چوڑا فرق ہے کہاں ایک مسلم درسگاہ اور کہاں امریکن مشن کالج، کہاں تو یہ حال کہ اگر کوئی لڑکی کھیل کھیل میں سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی پہن کر آجائے تو لڑکیوں کو دورے پڑ جائیں اور تہلکہ مچ جائے جرمانے ہوتے پھریں۔ اور کہاں اس کالج میں دوسری ٹرم شروع ہوتے ہی نئی لڑکیوں کو یونیورسٹی کے لڑکوں سے مہذب طریقے پر ملایا جاتا۔ اور اس مقصد کے لیے ایک باقاعدہ دعوت ہوتی۔ پرنسپل اور استانیاں اور پروفیسر خود ہر ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے ملواتیں، تھوڑی دیر ساتھ رہتیں، اور پھر ان کو بے تکلّف باتیں کرنے کے لیے چھوڑ جاتیں، اس جلسے کی بڑی زوردار تیاریاں ہوتیں۔ چائے، پانی کے علاوہ ڈرامے اور ناچ گانے کا بھی ایک پروگرام تیار کیا جاتا، لڑکیاں بھی کپڑوں لتّوں کا انتظام کرتیں۔ خوب شاندار جوڑے تیار کیے جاتے۔

نئی لڑکیاں تو جلسے کی دہشت سے ہی بے حال ہو جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سخت عیب کی بات ہونے والی ہے، بہت سی تو اپنے گھروں پر اس کا ذکر ہی نہ کرتیں۔ بلکہ چھپے چوری ہی گناہ کر لیتیں۔ پرانی لڑکیاں ان کا مذاق اڑاتیں۔

"سنو شمن تمھیں اپنے ساتھی کا پیار لینا ہوگا۔" پریما نے شرارت سے کہا۔

"ہائے!" شمن کو پسینہ آگیا۔

"اور کیا پیار تو لینا ہی ہوتا ہے اور پھر دوسرے دن پرنسپل کو ایک پرچے پر لکھ کر دینا ہوتا ہے کہ تم نے اتنے لوگوں کا پیار لیا" اوروں نے تائید کی۔

"ہاں اور پھر جس نے سب سے زیادہ پیار لیے ہوں اس کو انعام ملتا ہے۔"

"اور...... اور جو نہ لے تو؟"

"جو نہ لے تو اس کو جرمانہ، اور سالانہ رپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ لڑکی بالکل کمزور ہے...... خراب!"

مارے پریشانی کے شمن کی نیند اُڑ گئی، جو ابا میاں کے پاس سالانہ رپورٹ بھیجی، اور انھوں نے دیکھا تو بس خیر نہیں۔ نہ جانے کن مصیبتوں اور سفارشوں سے تو بھیجا تھا، ورنہ وہ تو یہی کہتے تھے کہ اسی کالج کی کلاسیں کھلوانے کی کوشش کرنا چاہیے دوسرے محیط بھیا جب سے انگلینڈ سے آئے تھے تعلیم نسواں کے حد سے زیادہ خلاف ہو گئے تھے، یہ الٹی ہی بات تھی، حمید بھائی نے انگلینڈ سے آکر بوڑھی تک کا پردہ اتروا دیا، بے چاری ہزار بڑبڑاتیں پنکھوں کی آڑ لیتیں مگر بھنگی، بہشتی، باورچی، سب ہی گھر میں آتنے، جوان جوان بہوئیں مزے سے لیٹی بچوں کو دودھ پلایا کرتیں، خالہ اماں بیٹھ خوب آرام سے کھجوایا کرتیں اور بیگم اماں نہایت بے تکلفی سے لیٹی چودہ پندرہ برس کی میراسیکے رانیں دلواتیں۔ بوڑھی نانی لرزتیں اور تھراتیں، بہشتی بھنگی پہلے لنگی سر پر ڈال کر آتے تھے اب یہ خود بیچاری گھونگھٹ کاڑھ لیتی ہیں۔

"نانی اماں اتنی بوڑھی ہو گئیں مگر مردوں سے شرمانا نہ چھوڑا...." حمید بھائی چڑاتے اور نانی غریب مرمر صورت دیکھتیں۔

مگر محیط بھیا نہ جانے کن متعفن موریوں کی غلاظت میں ہولی کھیل کر آئے تھے کہ اور زیادہ پردے کے حامی ہو گئے تھے۔ خاندان کی سب سے بیوقوف

اور بے ہنگم لڑکی سے شادی ٹلے کی اور شمن کی تعلیم کے خلاف جہاد قائم کر دیا۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ جلسے کا دن بھی آ ہی گیا، شمن کو تو بخار سا چڑھ آیا۔ رات بھر ایسے عجیب عجیب ڈراؤنے خواب بنا بنا کر ستاتے رہتے، کبھی کالج کے غنڈے اسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے۔ کبھی دیکھتی وہ شیشے جیسے چکنے پہاڑ پر الٹی پھسل رہی ہے اور اس کے کپڑے تار تار ہو گئے ہیں ہتھیلیاں چھل گئی ہیں، کبھی دیکھتی مٹیرن چھوٹے بھنگی کی پیٹھ پر سوار اسے جھاڑو سے ہانک رہی ہے، وہ غسل خانہ میں نہا رہی ہے کہ حبشی نژاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیئے وہ چیخ مار کر گری مری ہو گئی .... جب اس کے حواس درست ہوئے تو پریما اس کے منہ پر سے چادر اتار رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا کوئی برا سپنا دیکھا تو نے؟"

"ہاں!" وہ گھبرا کر آنکھیں مچانے لگی۔

"پگلی کہیں کی! ایسے زور سے چیخی کہ میں ڈر ہی تو گئی۔ اٹھ نا چائے کی گھنٹی بھی ہو گئی۔"

سارے دن کسی کام میں جی نہ لگا۔ عام طور پر لڑکیاں بالکل بے فکر سی نظر آ رہی تھیں، بغور سے وہ ہر لڑکی کو گھور کر اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتی مگر کچھ بھی تو ظاہر نہ ہوتا ان کے چہروں سے یا تو وہ واقعی بڑی بہادر تھیں یا اس کی طرح بن رہی تھیں۔

شام کو ہر کمرے میں کپڑے بدلے جانے کی ادودھم شروع ہو گئی، سوئی دھاگہ بٹن سے لے کر ساڑیاں بلاؤز اور بندے وغیرہ ایک دوسرے سے مستعار مانگے جانے لگے شمن نے اپنی لٹھے کی شلوار اور چنا ہوا دوپٹہ نکالا۔ آج اسے دوپٹہ بہت ناکافی معلوم ہو رہا تھا وہ اس باریک چنٹ کو کھول ہی رہی تھی جو اس نے انگلیوں میں چھالے ڈال کر بڑی کاوشوں سے بنائی تھی کہ پریما آ گئی۔

"ارے پگلی، شلوار قمیص پہن کر جائے گی، وہ ڈانٹ بتائیں گی پرنسپل کہ یاد کرو گی

کیوں؟"

"کیوں کیسی؟ معلوم نہیں کہ ساڑھی پہننی چاہیے کالج کی لڑکیوں کو"

"مگر میرے پاس تو اس وقت بس وہی چار خانے والی ہے اور جمپر بھی نہیں"۔

"تمھارا تو بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے، بھلا اس جلسے میں روئی ساڑھی چلے گی، میرے پاس ہے ــــ آؤ"۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے گئی۔

شمن نے بہتیری کوشش کی، خوشامدیں کیں مگر پرسیانے اسے کاسنی رنگ کی ساڑی جس پر بھاری بنارسی فیتہ لگا تھا اور بروکیڈ کا شلوکہ پہنا دیا۔ وہ ہلکا سا پاؤڈر ہی لگا لیتی! اور بس، مگر پرسیا نہ مانی اور زبردستی سرخی اور کاجل لگایا پھر بھی چوڑیاں اور جھمکے جن پر ملمع کیا ہوا تھا مگر اصلی معلوم ہوتے تھے اس نے خود ہی پہن لیے نہایت سبک ایڑی کا جوتا پہن کر چلنا اسے بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پل صراط پر چل رہی ہے۔ جوتا ذرا پنجہ دباتا تھا۔ مگر وہ سہہ گئی۔ آج اس نے پرسیا کی ضد میں قمقم کی بندی بھی لگا لی۔

جلسے کا شور شروع ہو گیا، جسے دیکھو بے طرح سج رہا تھا، مس جونس تک نے آج اپنی مردانہ وضع کی فراک پر پھولوں کا گچھا لگا کر کچھ نسوانیت سی پیدا کر لی تھی۔ تھوڑا بہت زنانہ پن جو ان میں باقی رہ گیا تھا آج ابھر رہا تھا۔ میٹرن بھی آج تنگ فراک کو اور زیادہ تنگ بنا کر منڈھے ہوئے تھیں ان کے جسم پر بندھی ہوئی ڈوریاں اور فیتے بستر بند کے تسموں کی طرح ان کی فراک میں سے جھلک رہے تھے، ایا بھی مہمانوں میں آ گئی تھی، اپنی سادہ دکھنی ساڑھی اور اونچے جوڑے میں وہ بالکل الورا کے غاروں کی دیوداسی معلوم ہو رہی تھی۔

شمن کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مہمان اسی کو گھور رہے ہیں اور کوئی دم میں بھاری بنارسی فیتے کی ساڑھی اس کے جسم سے پھسل کر اسے برہنہ چھوڑ جائے گی ساڑھی پہننے کی عادی نہ ہونے کی وجہ سے کبھی پلو

کھینچتی کبھی بلٹیوں کو ٹٹولتی کہ کھل تو نہیں گئیں۔ پھر ایک دم آنچل بہت زیادہ لمبا لگنے لگتا تو جھٹکے سے اسے سمر کا کر اڑس لیتی۔ ایک دم سے ایسا معلوم ہوا کہ قمقم کی بندی گولی کی طرح ماتھے میں اٹکی ہوئی چبھ رہی ہے، اور کوئی دم میں انار کے دانے کی طرح پھوٹ کر اس کے سارے چہرے پر بہہ جائے گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بلیع کیے جھمکے بوجھل ہو کر کان کی لوؤں کو کھینچنے لگے۔

اتنے میں پروفیسر اور پرنسپل بھی آگئیں، اور تعارف کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اندھا دھند ہاتھ پکڑ کر جوڑے لگانے شروع کر دیے، اور تھوڑی ہی دیر میں زیادہ تر لڑکیاں ایک لڑکے کی ہمراہی میں نظر آنے لگیں۔ جب شمّن اس عجیب و غریب تماشہ کو خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ چکی تو اسے اپنے سامنے بیٹھا ہوا پریشان حال لڑکا نظر آیا۔ شمّن نے اسے چونک کر دیکھا، اسکی متغائر بھری نظروں سے وہ اور بھی سٹ پٹا گیا۔ اور بری طرح سکلا کر اپنی ٹائی ٹٹولنے لگا، شاید وہ بھی آج شمّن کی طرح پہلی دفعہ سوٹ پہن کر آیا تھا۔

جب ذرا حواس درست ہوئے تو اس نے بہت گھبراتے ہوئے اور لڑکوں کی نقل میں چائے بنا کر پھل وغیرہ شمّن کو پیش کرنے شروع کیے، انگریزی میں شمّن شکریہ کہتی اور وہ جواب میں مستعدی سے "کوئی بات نہیں میڈیم" کہتا، لیکن بوکھلاہٹ میں کئی بار "میڈم" کے بجائے سر کہہ جاتا۔ اور پھر شرم سے نیلا ہو کر اس کے حلق میں پھندے پڑنے لگتے۔ اس کو اتنا گھبرایا ہوا دیکھ کر شمّن کو ہنسی آگئی وہ کافی بہادری سے انگریزی کے گھسے گھسائے جملوں میں اس سے باقاعدہ باتیں کرنے لگی، چھوٹی سی بات کو نہایت شستہ اور قواعد سے مرصّع انگریزی میں۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ لیکن دو چار جملوں ہی میں گفتگو کا سارا مواد ختم ہو گیا۔ مجبوراً دونوں نے نہایت تن دہی سے کھانا شروع کر دیا۔ اور باقی وقت میں چائے کی پیالیاں ہونٹوں سے چپکائے رہے۔ کیونکہ چائے پیتے میں بولنا ضروری نہ تھا۔ بیچ بیچ

ہیں وہ نہایت حسرت سے اور لوگوں کو دیکھتے جو ایک دانہ بھی نہیں کھا رہے تھے اور برابر قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دم شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گندے نالے کی متعفن کیچڑ اس کے حلق میں گھول دی، بڑی زور سے ابکائی آئی مگر اس نے گلا بھینچ کر چائے کے بڑے گھونٹ سے لقمہ نگل لیا، گرم چائے نے سارے حلق اور معدے تک کو جھلسا دیا، بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے، اس کا ساتھی بڑے رحم کی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا اس کی طرح وہ بھی ٹین کی مچھلی کھانے کا عادی نہیں۔ اس مچھلی کو کھانے کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔ اور وہ مشق غسل خانے میں مسلسل الٹیوں کے بعد حاصل ہو سکتی ہے مگر اس وقت وہ دو ننھی چڑیاں پنجرے کی تیلیوں کو حسرت سے تک رہی تھیں۔ اور زبان بند تھی۔

شمن نے دیکھا کہ ایلما اسے بڑے غور سے دیکھ کر کچھ چپکے چپکے اپنے ساتھی سے کہہ رہی ہے.... پھر اس کا مخصوص قہقہہ فضا میں کھنکا اور دھاردار دانتوں کی قطاریں چمک اٹھیں۔ گھبرا کر دونوں نے چائے کی پیالیاں رکھ دیں اور ایک دوسرے سے چھپا کر رومال ڈھونڈنے لگے۔

ایلما نے تاک کر ایک پکا سا انگور پھینکا شمن ایسی گھبرائی، جیسے ڈوب ہی تو جائے گی اس کے رس میں، باوجود تندہی سے تلاش کرنے کے رومال نہ ملا اور اس کے بوکھلائے ہوئے ساتھی نے جلدی سے رومال نکال کر اس کا گال پونچھ دیا۔ شمن کو معلوم ہوا جیسے تھم تھم کی بندی اس کے سارے جسم پر بہہ گئی اور بے چارہ بھی کرنے کو تو اس قدر ہمت کا کام کر گیا، مگر پھر اس بری طرح جھینپا کہ شمن کو ترس آ گیا۔ ایلما اور اس کا ساتھی بے حال ہو کر ہنسنے لگے، پھر وہ دونوں اپنی کرسیاں گھسیٹ کر ان کی میز پر آ گئے۔

"ارے مسٹر تم تو بہت چل نکلے ہو....... واہ بھئی"! ایلما کے ساتھی نے اس زور سے بیچارے کی پیٹھ ٹھونکی کہ ہل کر رہ گیا۔

شمّن اپنے دوست سے ملاؤ نا؟" ایلما نے کہا۔

"یہ........ یہ........" وہ ہکلا کر بولی۔

"ہیں؟ ایسی کھانے میں مشغول ہو کر نام بھی نہ پوچھا۔"

"جی...... نہیں تو" حمایت میں بولا۔

"ارے بھائی اتنی دیر سے برابر کھا رہے ہو اور......"

"جی ہاں......" وہ بھی ہکلایا، اس پر دونوں نے پھر قہقہوں کی بھر مار کر دی۔

"اور تم بڑے آوارہ ہوتے جاتے ہو...... ابھی"

"میں سچ کہتا ہوں...... آ معاف کیجئے گا" وہ جلدی سے شمّن کی طرف مڑا۔

"میں نے تو یونہی پوچھ دیا تھا۔ کہ آپ کا رومال نہ خراب ہو۔"

شکر ہے کہ ایلما اور اس کے ساتھی افتخار کے آجانے سے وہ دم گھونٹنے والا طلسم خاموشی تو ٹوٹا۔ افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف بنا دیا تھوڑی دیر میں ڈرامہ شروع ہو گیا۔ ایلما افتخار کو کہیں چھوڑ کر شمّن اور اس کے ساتھی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں جلسے کا لطف آگیا۔ عجب مزاج تھا۔ ایلما کا بھی، عشق بازی پر تل جاتی تو سب کو نچا کر پھینک دیتی، اور ایک دم جی اکتا جاتا تو سب کو سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

ڈرامہ ختم ہوا اور جلسہ بھی بکھر گیا۔ لوگ جانے لگے۔ پریما اپنے بھائی نریندر کے ساتھ اسے ڈھونڈنے آ پہنچی۔ دوسرے دن چھٹی تھی اور پریما اسے اپنے ساتھ دو دن کے لئے گھر لے جانا چاہتی تھی۔ دونوں کپڑے بدل کر جو رجسٹر میں دستخط کرنے گئیں تو میٹرن نے کہا پہلے پرنسپل سے لکھوا کر اجازت لاؤ ایک ہندو لڑکی کے گھر جانے کے لیے عام دستور

سے مختلف اور زیادہ پختہ اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پرنسپل کے پاس سے پریما روہانسی صورت بنائے واپس آئی۔

"کیوں اجازت ملی"؟

"نہیں...... ڈانٹ ملی اور جرمانہ"

"اچھا ہوا ہم پہلے ہی کہتے تھے، ٹھیک نہیں، بہت نٹ کھٹی کرتی ہو تم" میٹرن خوش ہو کر بولیں۔

اور پرنسپل صاحبہ نے کہا ہے کہ کیونکہ یہ جرمانہ آپکی کوششوں سے ہوا ہے۔ لہٰذا آپ ہی کو چاکلیٹ کھانے کے لیے دیا جائے یہ کہہ کر اس نے ان کے سامنے اجازت کا پرچہ ڈال دیا۔ جس میں نہایت شستہ سختی سے یاد دلایا گیا تھا کہ انھیں بیکار باتوں کے لیے پرنسپل کو حیران نہ کرنا چاہیے

اس کے بعد نہ پوچھیے کیا ہوا میٹرن نے بے عزتی کی حد دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ استعفیٰ دینے کی دھمکی دینے لگیں جو وہ کبھی نہ دے چکی تھیں۔

شمن اور پریما کپڑے بدل کر ـــــ دوسرے دن پہننے کے لیے کپڑوں کی پوٹلیاں باندھ کر نریندر کے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ میں جا کر ٹھنس گئیں۔ کچھ مہمان ابھی رخصت ہو رہے تھے زور و شور سے شب بخیر کہا جا رہا تھا جب موٹر احاطے میں مڑ کر پھاٹک سے گذری تو شمن نے دیکھا اس کا جلسے والا ساتھی دیوار سے لگا کھڑا تھا جیسے وہ جاتے جاتے رُک گیا۔

"اوہ!" اس نے پہچان کر کہا۔

"کون تھا؟" پریما نے پوچھا۔

"کوئی نہیں، ایک ...... ایک"

"لڑکا تھا؟ ہوں .... یہ بات ہے۔ پریما نے زور سے اس کے چٹکی لی اور نریندر نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ شمن ایک عجیب شیریں

جذبے کے ماتحت مسکرا اٹھی۔ کیرم کھیلتے میں نشانہ ٹھیک بیٹھے تو دل جھوم اٹھتا ہے۔
بالکل اسی طرح کوئی چیز دماغ میں سرد اور شیریں لہر کی طرح تیر گئی۔
راستے بھر پیا جماہیاں لے کر اونگھتی رہی اور نہ جانے غلطی
سے یا قصداً اس کی ران کو بیستا رہا مگر وہ کہیں اور تھی، دور موٹر سے بہت آگے
وہ اڑی چلی جا رہی تھی۔

۲۴

رات آرام سے گذری، دوسرے دن شمن کرسی پر بیٹھی رائے صاحب کے
کرتوں میں بٹن ٹانکتی رہی اور وہ اس کے پیروں کے پاس قالین پر پھسکڑا مارے
بیٹھے کہانیاں سناتے رہے اور سوئی میں تاگہ پرو کر بھی دیتے جاتے۔
"الٹا مت ٹانک دیجیو بٹن شمنا" وہ بڑی معصومیت سے بٹن کو الٹ پلٹ
کر غور سے الٹا اور سیدھا دیکھتے۔
"یہ سیدھا" وہ بڑی ہچکچاہٹ سے کہتے اور شمن ہنستی۔
پھر وہ اسے شہزادیوں، بھٹیاریوں اور جادوگرنیوں کے قصے سنانے لگے۔
یہ کہانیاں شمن نے ہزار بار سنی تھیں مگر رائے صاحب ان میں دل سے باتیں جوڑتے
جاتے۔ وہ بار بار بھول کر اس ایک بھٹیاری کا ذکر بیچ میں گھسیٹ لاتے جو ہر مسافر
کے ساتھ چوسر کھیلتی تھی۔ اور ساتھ اپنی بلی بٹھا لیتی تھی۔ جب ہارنے لگتی تو اشارہ
کر دیتی اور بلی لیمپ بجھا دیتی۔
"اتنے میں وہ چال بدل جاتی اور مسافر ہار جاتا" رائے صاحب بڑے
جوش سے کہتے۔
"واہ بھلا بلی لیمپ کیسے بجھا سکتی ہے؟"

"ہیں؟" رائے صاحب بڑے بھولپن سے چونکتے۔

"اور کیا، بلی کیسے لیمپ بجھا سکتی ہے؟"

"پھو...... کر کے" وہ بلی کی نقل کرتے۔ شمن ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی اور رائے صاحب بھی بچوں کی طرح کھلکھلا اٹھتے۔

"نہیں، اصل میں بھٹیاری جو تھی وہ چراغ جلا کر بلی کے سر پر رکھ دیتی، اور جب اشارہ کرتی تو بلی سر ہلا کر چراغ گرا دیتی، بس"۔

"مگر مسافر بڑے بیوقوف تھے، اوّل وہ چراغ بلی کے سر پر کیوں رکھنے دیتے تھے، بھلا بلی کا سر بھی چراغ رکھنے کی چیز ہے، دوسرے وہ اس کے ساتھ کھیلتے ہی کیوں تھے؟"

"چل ہٹ بھی، اب میں یہ کیا جانوں، تو ہوتی تو ان سے ضرور پوچھتی"۔

"اور کیا، اور بھٹیاری کو پولیس سے پکڑوا دیتی"۔

"اونہہ، ساری کہانی کا مزا کرکرا کر دیا، پگلی کہیں کی، بھلا بھٹیاریوں کو پولیس پکڑ سکتی ہے؟"

کہانی کہتے وقت ان کے چہرے اور دماغ میں کتنا بچپن آ جاتا تھا! ان کے چہرے کی جھریاں خفیف مسکراہٹیں بن جاتیں اور آنکھوں پر سے بڑھاپے کا غلاف سرک جاتا۔ یہی چہرہ اخبار پڑھتے وقت اور دفتر میں کام کرتے میں کس قدر بردبار اور خشک ہو جاتا تھا۔

شام کو رائے صاحب کرسی پر لیٹ گئے اور پکارا:

"بھئی ہمارے سر میں تیل کون ڈالتا ہے؟" پریما اور نریندر لڑنے لگے۔ پریما کا کہنا تھا کہ وہ ہوسٹل میں رہتی تھی۔ نری سارا وقت رائے صاحب کو ہڑپ کرتا رہتا تھا۔ پھر بھی اس کا جی نہیں بھرتا، نریندر کہتا تھا کہ پریما کو ایک سرے سے تیل ڈالنے کا سلیقہ ہی نہیں۔

"چمن تیل ڈالے گی، نری پیروں کے انگوٹھے کھینچے گا اور پریما میری گود میں

بیٹھے گی" رائے صاحب نے فیصلہ کیا، پر یما فوراً اٹھا کر ان کی گود میں لیٹ گئی۔

رائے صاحب کے بال بالکل سفید نہ تھے، ان میں پلاٹینم کی سی دھندلی سیاہی جھلکتی تھی، جیسے پہاڑوں پر جمی ہوئی بلوریں برف پہ ہلکا سا شام کا غبار چھایا ہوا ہو، بالوں میں غضب کا گھناؤ تھا اور ذرا سا چھو دینے سے ان میں بجلی سی دوڑ جاتی تھی، رائے صاحب ان بالوں سے کسی قدر پراسرار اور غیر مرئی معلوم ہوتے تھے۔

شمن محویت کے عالم میں ان کے پالش کیے ہوئے نخموں کو ڈری ڈری چھو رہی تھی، پاس ہی پریما گھاس پر اوندھی لیٹ کر اونگھنے لگی، نریندر بیڈمنٹن کورٹ بنوانے چلا گیا۔ اور شمن رائے صاحب کے بالوں کے گنجان کہرے میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ پرسکون انداز میں ان کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر پلکیں کانپ رہی تھیں وہ سوئے نہیں تھے۔ آدھے کھلے ہونٹوں میں سے سچے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے مصنوعی دانت اور سونے کے تار نظر آرہے تھے۔ ان کے تلخ تبسم کو نیند کے ہلکورے لیتے دیکھ کر شمن کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ نرم نرم ٹھنڈی لاوا میں دھنستی چلی جا رہی ہے۔ کنپٹی کے پاس ننھی ننھی شریانیں، معلوم ہوتا دبی ہوئی زندگیاں پھڑک رہی ہیں، بھویں بیچ ماتھے پر اودے نشتے کی طرح کھنچی ہوئی رگ، آنکھوں کے گوشوں میں چڑیا کے پنجوں کے نشان پتھر میں سے تراشا ہوا مضبوط جبڑا! اس پر رعب اور نامعلوم سی دہشت طاری ہو گئی۔ بے خیالی میں اس کی سرد اور سہمی ہوئی انگلیاں ان کی مڑی ہوئی گردن پہ جا ٹکیں۔

"ارے کیا کہہ رہی ہے........" دنیا جاگ پڑی۔........ شمن گھبرا کر اپنی انگلیوں کو چٹخانے لگی۔ رائے صاحب نے ماتھے پر شکن ڈال کر زور زور سے کھانسنا اور چھینکنا شروع کر دیا۔ شمن کو ان کی اس اچھوری حرکت سے سخت کوفت ہوئی وہ جاگ پڑی۔

"تھک گئی؟........ چل ہاتھ دھو آج تجھے چاٹ کھلائیں گے" وہ پیار سے

بولے۔ رائے صاحب اٹھ کر پریما کے کان میں گھاس کے تنکے سے گدگدی کرنے لگے۔ پریما ننھے بچوں کی طرح مچل مچل اٹھی، اور گھاس پر بیٹھ کر سب نے چاٹ اور کافی اڑائی۔

رات کے کھانے کے بعد پریما بیٹھی اکتارہ جھاڑ پونچھ رہی تھی کالج میں فرصت نہ ملتی تھی جو مشق کرے اور یہاں کھیل کود ہی اتنا ہوتا کہ کچھ یاد ہی نہ آتا۔ کل رائے صاحب نے اسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت کرنے لگے۔ راگ راگنیاں بھول کر وہ ٹپّوں میں پڑتی جا رہی تھی۔ انھیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔

طنبورا اٹھا کر انھوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے پنجے سے تال دیتے جاتے دیر تک وہ کچھ گاتے رہے شمن خاک نہ سمجھی مگر۔ ان کی گہری لوچ دار آواز رات کی خاموشی میں گھل مل کر اسے نیند کے جھونکے جھلانے لگی۔ نہ جانے کیا سُر تھے۔ دھیمے اور نرم جو احساسات پر پھوار کی طرح برستے رہے۔

قریب قریب ہر اتوار کو شمن ان کے گھر جاتی، ہر سال لڑکیوں کو ملنے جلنے والوں کا نیا کارڈ بھروانا پڑتا تھا۔ عام طور پر لڑکیاں کارڈ پھینک پھانک دیتی تھیں۔ کیونکہ جو گھر والوں کے دستخطوں کے لیے بھیجتیں وہ کبھی واپس نہ آتے اب کارڈ بھروانے کے لیے بڑی مصیبت آئی۔ پہلے کارڈ پر جو دستخط تھے وہ جعلی تھے اور اس دفعہ پرنسپل نے کارڈ بجائے لڑکیوں کو دینے کے سرپرستوں کو خود براہِ راست بھیج دیے تھے۔ اور وہاں سے شمن کے لیے یہ جواب آیا کہ کہیں جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اگر کوئی رشتہ دار ملنے آئے گا۔ تو وہ اجازت نامہ ساتھ لائے گا۔ لیکن اس طرح بڑی گڑبڑ ہوئی۔ خود بڑے بھیا ملنے آئے اور گھنٹوں پرنسپل سے لڑے وہ ابا میاں کے پاس ہو کر نہیں آ رہے تھے۔ لہٰذا اجازت نامہ ندارد تھا۔ غصے میں آ کر وہ کارڈ خود بھر کر دستخط کر کے دے گئے۔ ایک اور لڑکی کا گارڈین ملنے آیا لہٰذا اس سے بھی اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ وہ بہت چراغ پا ہوا خیر یہ طے ہوا۔ کہ وہ وہیں بیٹھ کر اجازت نامہ لکھے۔ مٹیرن سوتے سے اٹھائی گئی تھیں وہ

بڑبڑاتی ہوئی پرنسپل کے کمرے سے ملاقات کے کمرے تک پیغام رسانی کرتی رہی، پھر قلم دوات منگوایا گیا، گھنٹوں لگ گئے، پر ملاقات نہ ہو سکی۔ گارڈین بھنا کر چل دیا اور سرپھرے نے اخبار میں الٹی سیدھی چیزیں چھاپ دیں، ایک اور لڑکی کا سگا بھائی ملنے آیا اتفاق سے وہ سامنے ہی برآمدے میں کھڑی تھی، بے اختیار دوڑ کر لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد خیال آیا کہ اجازت تو لی ہی نہیں اگر میٹرن کو خبر ہو گئی تو؟ اور واقعی سانپ کی طرح اس کی پسلی پھڑکی اور سر پر موجود!

"بغیر اجازت کس سے بات کر رہی ہو؟"

"اپنے بھائی سے"

"ثبوت کیا ہے کہ یہ تمہارا بھائی ہے؟"

"ثبوت، ارے یہ میرا سگا بھائی ہے، دوسرے کیا تم سمجھتی ہو یہ میرا عاشق ہے"

"کیا معلوم؟" لڑکی جل گئی۔

"مگر یہ تو کہتا ہے کہ آپ سے ملنے آیا تھا...... آپ کا۔"

"ہشت" اس کا بھائی بولا اور میٹرن کا تو یہ حال کہ انگاروں پر لوٹ گئیں۔ لڑکی بولی "اگر آپ کو یقین نہیں کہ یہ میرا سگا بھائی ہے تو چلیے سائنس روم میں خون کا معائنہ کرا کے دیکھیے اور کیا! غرض آئے دن یہی جھگڑے ہوا کرتے روز روز کے قصوں سے منتظمین بھی تنگ آ گئے تھے۔ لڑکیوں کے چالوں کے آگے کسی کی نہ بن آتی بڑی لے دے مچتی لہٰذا پھر کارڈ بھروانے کا تقاضہ ہوا۔

اب کے شمن کو دوسری چال چلنا پڑی۔ یعنی نہایت صفائی سے کارڈ پر دستخطوں کی نقل کر ڈاک سے پرنسپل کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ ننھی ننھی چوریاں بڑی پیاری معلوم ہوتیں، اتنے رعب دار بزرگوں کو الو بنا کر لڑکیاں چپکے چپکے ان کے بھولپن پر ہنستیں۔ ڈھائی تین سو کارڈوں میں دو چار جعلی چلا دینا کچھ مشکل بات نہ تھی۔

شمن کا جانا صرف چند اتواروں کے لیے رکا اور وہ پھر جانے لگی

رائے صاحب سے اس کی خوب گھٹتی۔ بچوں یا وہ بچہ بن کر کھیلتے خوب بے ایمانیاں کرتے پریما سے تو ان کی باقاعدہ کشتی ہوتی۔ پھر کبھی وہ اگر پریما کی طرح تشمن کے گدگدیاں کر دیتے یا گال نوچ دیتے تو وہ بری طرح جھینپ جاتی اور دیر تک الگ الگ رہتی ان کے سامنے ننھا سا بچہ بن جانے کی خواہش ہونے لگتی۔

ایک دن مذاق میں انھوں نے اسے بھینچ ڈالا تو وہ کھسیا کر رو پڑی۔ رائے صاحب کچھ متحیر اور کچھ پریشان ہو گئے۔ اتنے زور سے تو انھوں نے بھینچا بھی نہ تھا۔ جب تشمن مسکرا دی تو وہ بن کر روٹھ گئے۔

کھانے پر وہ نریندر سے کچھ گاؤں وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور پھر کسی کام سے اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ تشمن ان کی بیرخی سے روہانسی ہو گئی اگر واقعی وہ خفا ہو گئے تھے تو؟........ بے اختیار اس کا دل بورڈنگ بھاگ جانے کو چاہا۔

پلنگ پر چت پڑی وہ سنسان دوپہر میں سوچا کی، آخر اتنی جلدی اس کے آنسو کیوں نکل پڑے رائے صاحب کو دیکھ کر اس پر رقت کیوں طاری ہو جاتی تھی؟ پھر اسے نریندر کا خیال آگیا وہ سب کے سامنے کتنا چپکا بنا رہتا تھا، پر اکیلے میں بری طرح سٹ پٹا جاتا۔ تشمن اس کی گھبراہٹ سے اور بھی شیر ہو جاتی، اور جب وہ شوق بھری کن انکھیوں سے اسے تاکتا تو بزرگانہ انداز سے مسکرا اٹھتی اب وہ بچہ نہ تھی۔ اسے معلوم تھا نریندر اسے چاہتا ہے! یہ چاہت کیا ہوتی ہے؟ نریندر اسے بالکل چغد معلوم ہوتا، اس کی محبت کتنی بے تکی اور کتنی بے ہنگم تھی!

اور رائے صاحب؟ وہ تو اسے دیوتا نظر آتے، بیٹھے بیٹھے اس کا جی چاہتا وہ لمبی لمبی ان کے صندل جیسے پاک قدموں میں لیٹ جائے۔ وہ آہستہ سے اسے سہارا دے کر اٹھائیں اور اس کا جھکا ہوا سر اپنے پر اسرار سینے سے لگا لیں ان کا فراخ سینہ جس میں سے مقدس مندروں کی سی مسحور کن خوشبو آتی تھی۔ ایک بار ہی وہ اپنے نتھنے چوڑے کر کے تھک کو پی جائے اور ابدی

غنودگی میں ڈوب جاتے۔

پریما کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا دونوں بچوں کے لیے سب کچھ بن کر رہ گئے، کچھ لوگ تو انھیں سچھورا کہتے تھے، اور بعض انھیں فلسفی، مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے، شمّن کو وہ نارو جی اوتار معلوم ہوتے، پریما کے ساتھ رہ کر اسے ہندو دھرم بہت مقدّس معلوم ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ قسم قسم کی ٹیکلی چھپ کر لگاتی، اور آئینے میں اسے اپنی شکل عجیب سی معلوم ہوتی؟ ننھی سی خونیں بوند سے اس کے چہرے پر ہزاروں رنگینیاں اور سنگار پیدا ہو جاتے اس کی آنکھیں کچھ کچھ ایلما کی مست سادھوؤں کی سی آنکھوں سے مشابہ ہو جاتیں اور بال زندہ سانپوں کی طرح رینگنے لگتے، معلوم ہوتا وہ ٹھنڈے ٹھنڈے شعلوں میں لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی ہے..... اس وقت رائے صاحب کے طلسمی بال اور دھلی ہوئی صبح کی طرح جھلملاتی پیشانی کے علاوہ اسے کچھ نہ نظر آتا۔ اور وہ نہ جانے کن نامعلوم تاریکیوں میں بھٹکنے لگتی۔

شام کھانا کھاتے میں کچھ دھرم اور سماج کا ذکر چھڑ گیا۔ پریما زور و شور سے لکچر دینے لگی۔ نریندر کبھی بیچ بیچ میں بول اٹھتا۔ ایکا ایکی رائے صاحب بولے۔

"ارے اور چمن، تو ہندو ہے کہ مسلمان؟"

سب ایک دم خاموش ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"رام رام، جو کہیں مسلمان ہوئی تو اپنا دھرم تو بھرشٹ ہو گیا۔ سمجھو۔"

"رائے صاحب ہمارا دھرم ایسا بودا نہیں کہ کوئی اسے بھرشٹ کر سکے، دنیا کی کوئی شکتی ہمارے دھرم کو آنچ نہیں پہونچا سکتی" پریما بولی۔

"چل چل جانے دے" انھوں نے پریما کے جوش کو ایک طرف جھٹک کر کہا۔

"کیوں ری چمن تو بتا۔"

"رائے صاحب دیکھیے میری طرف" نریندر جوش سے چیخا۔

"نہ نہ بھئی میں کچھ نہیں دیکھتا" یہ جو لڑکی ہے نا، یہ اگر مسلمان ہوئی تو"

"رائے صاحب آپ" پریما غصے سے بے حال ہو گئی۔ "اور آپ کے کتنے دوست جو مسلمان ہیں تو......"

"ہمارے دوستوں کی اور بات ہے وہ ...... مگر یہ لڑکی تو..... مجھے نہیں معلوم تھا۔ رام رام" مارے شرم کے نریندر اور پریما روہانسے ہو گئے اور شمن نے سہم کر پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ رائے صاحب کے چہرے پر ویسی ہی درشتی قائم تھی۔

"مذاق نہیں ہے، اب ہم سب کو پرائشچت کرنا پڑے گا سو الگ، اور بھئی اس چھوکری کو ہندو بنانا پڑے گا...... کیوں پھر......" وہ جھک کر شمن کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

"تو لے تجھے ابھی ہندو بنائے دیتا ہوں" گلاس میں سے پانی لے کر وہ ناخونوں سے شمن کے منہ پر چھڑکنے لگے۔ "اوم شرم" نہ جانے انھوں نے کیا پڑھنا شروع کیا۔ ایک دم سے پریما دوڑ کر ان کے بازو سے جھول گئی اور زور سے شانے میں دانت گاڑ دیئے۔

"افوہ کتیا!" رائے صاحب جلدی جلدی اپنا کندھا سہلانے لگے۔

"اچھا مت بنانے دو ہم تو کہتے تھے چلو بھئی اچھا رہے گا، کوئی موٹا سا بنیا۔ ڈھونڈ کر اس کا بیاہ کر دیں گے ...... مگر"

"شمن تنتناتی ہوئی میز پر سے اٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھی اور آنکھیں بھینچ بھینچ کر جھوٹے آنسو نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے، رے رے، ہمارا بیٹا روٹھ گیا" وہ پیچھے پیچھے آئے، دیر تک وہ اسے بہلاتے رہے، مگر شمن روٹھی رہی۔

"آنکھیں میچیں کون آئے "آنکھیں میچیں کون آئے ......" انھوں نے آنکھیں بند کر کے اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کی بائیں آنکھ کھلی ہوئی تھی جس میں سے شربتی شراب شرارت سے جھانک رہی تھی۔ شمن ہنس پڑی، لپک کر

رائے صاحب نے اسے اٹھالیا، اور کرسی پر ڈال دیا۔

شمن نے ایک کہانی سنی تھی کہ ایک آدمی اپنے ایک دوست کو دفن کرنے گیا تو اس کی تسبیح قبر میں گر گئی، بعد میں اسے یاد آیا تو اس نے سوچا چل کر لے ہی کیوں نہ آؤں۔ اس نے جا کر قبر کھولی اور نیچے اترا تو دیکھا مردہ غائب ہاں قبر کے سرہانے ایک کھڑکی کھلی ہے، اس کھڑکی کے اندر داخل ہوا تو سامنے اس کا دوست ایک مرصّع تخت پر جلوہ افروز نظر آیا۔

"یار بڑے ٹھاٹ ہیں تمھارے تو" اس نے کہا "ہاں بھائی تمھاری دعا سے مزے میں ہیں اور بھائی تمھاری تسبیح رہ گئی تھی سو یہ رہی۔" وہ بولا "ہاں وہی تو لینے چلا آیا تھا، خیر تم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اچھا بھئی السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

وہ آدمی قبر سے نکلا تو معلوم ہوا کہ دنیا ہی بدل چکی ہے، نہ گھر نہ بار نہ بیوی نہ بچّے! ایک سو دو سو برس کے بوڑھے نے بتایا کہ اس کے نکڑ دادا کے نکڑ دادا کے سکڑ دادا کے زمانے میں سنا جاتا تھا کہ کوئی آدمی اس نام کا رہتا تھا۔

تو یہ ہیں قدرت الٰہی کے کرشمے، یہاں تو علیک سلیک ہی ہوئی اور وہاں جُگ بیت گئے۔ جب رائے صاحب نے اسے اٹھا کر کرسی پر ڈالا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آسمان پر ستاروں کے ہنڈولے میں چک پھیریاں کھا کر ایک دم رک گئی۔ ہر چیز اسے اپنے گرد ڈگمگاتی محسوس ہو رہی تھی اور مندروں جیسی مقدس خوشبو سے اس کا دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ جلدی سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے صدیوں کے پیاسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

دسمبر کی چھٹیوں میں اسے اس مرتبہ کوئی گھر سے لینے نہ آیا۔ گنتی کی دو چار لڑکیاں بورڈنگ میں رہ گئیں وہ بھی اپنے اپنے مشغلوں میں ڈوبی رہتیں پریما اور شمن ہر وقت ساتھ رہتی تھیں، اس کے جانے کے بعد شمن دن بھر پریشان بھٹکتی رہتی۔ کسی پیڑ کے نیچے دری ڈال کر ناولیں پڑھا کرتی۔ پھر کبھی کبھی شام کو دو چار لڑکیاں مل کر سنیما چلی جاتیں۔ تب تو شمن اور بھی بوکھلا جاتی۔ خاموشی کرسی پر لیٹ کر وہ رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی۔ سیتا جی کی زندگی پر اسے بڑا رشک آتا، کس مزے سے وہ رام چندر جی اور لچھمن جی کے ساتھ جنگلوں میں پکنک منایا کرتی ہوں گی۔ چودہ برس کی لمبی چوڑی حسین پکنک! الیما کہتی تھی کہ اچھا ہی ہوا جو رام چندر جی کو بن باس ملا۔ کچھ تو غریبوں کی دکھ بھری زندگیوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کتنے انسان ہیں جو جانوروں سے بدتر اور جنگلوں سے بھی گئی گذری زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ لیکن تاریخ میں کوئی ایک لفظ بھی ان کے بارے میں نہیں لکھتا، یہ بڑے لوگ اگر عیش و عشرت سے اکتا کر سنیاس لے لیں تو مفت کی پبلسٹی۔ لیکن ان جنم سنیاسیوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جو پیدا ہی ننگی دنیا میں ہوتے ہیں۔

چند ہی دنوں میں اس نے ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں سے "جین ایر" نے اسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ آخری باب جہاں وہ اپنے اندھے آقا کے پاس لوٹ کر آتی ہے، اس کو اتنا پیارا معلوم ہوا کہ تین چار بار پڑھ کر بھی سیری نہ ہوئی۔ ٹیگور کی کہانیاں خصوصاً "کاسٹ اوے" پڑھ کر تو سچ مچ آنسو نکل پڑے ہارڈی کے مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اسے ہلا کر رکھ دیا مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو نچا کر پست . . . .

کرڈالا وہ بائرن شیلے اور کیٹس کی شاعری تھی۔

جب کل پانچ چھٹیاں رہ گئیں تو پریما اور نریندر اُسے لینے آپہونچے۔ شمن کو یاد بھی نہ رہا کہ وہ پریما سے ناراض تھی۔ نریندر کے ساتھ ٹھُس کر بیٹھنے میں بھی اعتراض نہ ہوا۔ اور جب اس نے حسبِ عادت اس کا پیر کچلا۔ شمن نے چٹاخ سے اس کے گال پر ایک تھپڑ جمایا۔ پریما بھی اس کی حمایت میں نریندر کے چٹکیاں بھرنے لگی۔ موٹر اڑی چلی جا رہی تھی اور اس سے بھی تیز شمن اڑ رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رُوحانی طور پر تو پہنچ بھی چکی ہے .... رائے صاحب پریما اور نریندر سے ناراض ہیں کہ وہ اسے اتنی دیر میں کیوں لائے، وہ اس کے انتظار میں کس قدر تھک گئے ہوں گے اسے دیکھتے ہی وہ نقلی مگر اصلی موتیوں جیسے دانت ایک دم جگمگا اٹھیں گے۔

مگر گھر پہونچ کر نہ ہی دانت جگمگائے اور نہ اس کے انتظار میں کوئی تھکا ہوا نظر آیا، رائے صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ شکار کو گئے ہوئے تھے آنے کے متعلق کچھ نہیں کہہ گئے تھے، گھر سونا سونا ہو رہا تھا شمن اکر بچھائی، اوپر سے نریندر نے بدمذاقیاں شروع کردیں، پریما کو سُوجھتا یا کر اُس نے شمن پر بیچ ہی اعلانِ عشق کر دیا۔ اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ کسی ٹوٹ ہی تو پڑے شمن کو اس پر بجائے غصہ کے پیار آگیا وہ مسکرادی، اور جیسے ایک عقلمند ماں بچہ کو ننھے کا گلاس مانگنے پر بڑے پیار سے بہلا دیتی ہیں۔ اسی طرح شمن نے نریندر کو چمکار دیا، اور جب وہ ناامید ہو کر سسکیاں لینے لگا تو شمن کا جی چاہا اس کا بے وقوف سر اپنے سینے سے لگا کر تھپکیاں دے، اور تسلی دے؛ وہ اپنے آپ کو ایک دم نہایت عقلمند اور بزرگ سمجھنے لگی، نریندر اسے بے حد یتیم اور بے کس معلوم ہو رہا تھا وہ بیچارہ اسکی بزرگانہ باتیں سن کر ویسے ہی حیرت زدہ ہو رہا تھا۔ بالکل سٹ پٹا گیا۔ جانے پر کچھ جھینپا کچھ روٹھا بیٹھا رہا۔

شام کو رائے صاحب اچانک واپس آگئے۔ گویا شمن کی خاموش پکار نے

انہیں کھینچ بلایا۔ خاک اور دھول میں اٹے ہوئے خاکی کپڑے، روپہلی بالوں پر کھی کی افشاں جیسے سورج پر ہلکے ہلکے بادلوں کی پرچھائیاں، دھوپ سے رنگ کچھ اور جھلس کر شوخ ہوگیا تھا۔ اور جب پپڑائے ہوئے ہونٹوں کے درمیان ستاروں کی لڑیاں چمکیں تو شمن کا دل زور زور سے اچھلنے لگا۔ اور اس کی نگاہیں مٹی میں لتھڑے ہوئے بھاری جوتوں پر جم گئیں۔

آتے ہی انہوں نے بھر گلاس برف کا پانی پیا اور خلافِ معمول سر ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئے۔ پریما اور نریندر ویسے ان سے اتنے بے تکلف تھے، مگر انہیں خاموش دیکھ کر بیچاروں کی زبانیں گنگ ہو جاتیں، اُنکی ایک تنبیہی نگاہ چانٹے کی طرح لگتی اور پریما جیسی بے چین ہستی بھی دبک کر رہ جاتی۔

"کیا بات ہے؟" شمن نے خاموشی اور سکون سے متاثر، آہستہ سے پریما سے پوچھا۔

"تھک گئے ہیں، یا شاید......" وہ رک گئی۔

"کیا؟"

"شاید مس فلپ سے لڑائی ہو گئی، وہ بھی تو شکار کو گئی تھیں،" پریما نے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

"کون ہیں یہ مس فلپ؟"

"ہیں ایک، یہاں انسپکٹرس آف اسکولز ہیں۔ رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہو گئی تھی، مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں دو دن میں شادی کر ڈالی، اب...... ارے تم نے ممی کی نئی تصویر نہیں دیکھی جو رائے صاحب نے بنوائی ہے، ٹھیرو ابھی دکھاؤں گی، ہاں تو، ممی کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ ممی آرٹسٹ تھیں اور اس قدر سیدھی، کہ ہماری دادی جی خوب ان سے گھر کا کام کرواتی تھیں دھوتی باندھتی تھیں اور بڑی کاہل تھیں۔ یہ چڑیل جب ہی سے انہیں پھانسنے کی فکر میں تھی، یہ فلپ کی بچی! رائے صاحب

اِسے بہت چاہتے ہیں، مگر جلاتے بھی خوب ہیں مگر جب روتی ہے تو پچھتاتے ہیں۔"

"بڑی بُری ہے!" شمن کے دل نے پکارا۔

"ہاں مگر رائے صاحب اُسے کبھی نہیں مناتے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ بس ملاقات ہوجاتی ہے۔ کسی پارٹی جلسے میں، اور رائے صاحب کی تو یہی عادت ہے کہ ذرا دیر میں ہنسا دیا۔ اور ذرا میں رلا دیا...... پھر اس دن

"پھر سماں رائے صاحب کی بھرائی ہوئی آواز لمبے چوڑے ہال میں گونجی۔

"ارے شمن بھی آیا ہوا ہے! کب آئے دوست" رائے صاحب نے گویا اُسے دیکھا، وہ ذرا مسکرا اٹھے۔ تھے ...... بھئی ذرا اتار" وہ کوٹ میں پھنسے ہوئے بولے۔

شمن کوٹ اتارنے لگی، قمیض بری طرح پسینے میں ڈوبی ہوئی رکھی، اور جسم جل رہا تھا، وہ پراسرار مردوں کی سی خوشبو کا جھونکا اسے آہستہ سے جھنجھوڑ گیا مگر وہ سنبھل گئی اور زمین پر بیٹھ کر جوتا کھولنے لگی، رائے صاحب نے پیر کھینچ لیے اور جھک کر ہولے سے اسکے گال پر دو انگلیاں ماردیں، شمن گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور بیرا جوتے کھولنے لگا۔

کھانے کے کمرے میں شمن کو چوہے سے رینگتے معلوم ہوئے۔ اس نے بجلی جلائی تو نریندر نامراد عاشقوں کے سارے ضروری تاثرات چہرے پر جمع کیے کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے، شمن جیسے اس کے حالِ دل سے بے خبر کرسی کھینچ کر پاس بیٹھ گئی۔

"کتنی گرمی ہے!"

نریندر چُپ!

"آج تو آئس کریم بنتی۔"

نریندر چُپ!

"رائے صاحب کو فالودہ پسند ہے نا؟" اس نے براہ راست پوچھا۔

چُپ!

"اُدُنہہ کوئی سامنے کی کھڑکی ہی کھول دے پنکھے بھی تو بند ہیں، معلوم ہوتا ہے کہیں آگ لگ گئی ہے...... ہائے کوئی......"

نریندر نے ایک حقارت آمیز نظر اس پر ڈالی اور بھنّاتا ہوا کھڑکی کے کواڑ دھڑادھڑ کھولنے لگا۔

"نری کیا بہت غصہ ہو" اس نے پیار سے چھیڑا۔

"نہیں"

"ہاں؟...... تو پھر آئس کریم کے ذکر پر مسکرائے کیوں نہیں؟" باوجود کوششوں کے نریندر مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔

"اہو ہو، بن رہے ہیں جناب، ندیدے کہیں کے، کہیں جاڑوں میں بھی کوئی آئس کریم کھاتا ہوگا"

"تم نہیں جانتیں کہ......"

"ہونہہ جیسے تم تو بہت جانتے ہو؟"

"اگر تمہیں کسی سے اتنا پریم ہوتا" وہ انگریزی چھانٹنے لگا۔

"آہا، پریم! پریم کی نیّا..... پریم...... کھونا آگے؟"

"ہنہہ.......... میں.........." نریندر بھنّایا۔

"دیکھو نریندر تم مجھے ڈانٹو گے تو........ ہاں، اچھا نہ ہوگا، بڑے آئے ڈانٹ کے بولنے والے، اور اسی پہ کہتے ہو پریم ہے؟ خاک پریم ہے تمہیں، جی ہاں پریم ہوتا تو یوں اپنا ریکٹ چھپا کر نہ رکھتے، اور لوکاٹ توڑتے وقت کچے پکے خود نہ نگل جاتے"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو، کتنے سارے توڑے، مگر اس نے پریما نے لپک لیے ہُنہ!"

"خیر لوکاٹ تو پریما نے لپک لیے اور ریکٹ کی بات گول ہی کر گئے، مُنہ جیسے میں کھا ہی تو جاتی تمہارا بلّہ"

ایک دم سے نریندر پیر پٹختا چل دیا، شمن مسکراتی ہوئی اطمینان سے کرسی پر پھیل گئی۔

"یہ لو ریکٹ، اور مجھ سے بات نہ کرنا" نریندر نے ریکٹ پٹخ دیا۔ کچھ دیر شمن اُسے دیکھتی رہی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"او.......... نوہ نری!"

"مجھ سے مت پوچھ جی، سو دفعہ کہہ دیا، ہاں نہیں تو"

شمن ماتا کے معصوم جذبے سے بے چین ہو کر ہنسنے لگی۔ اگر اس طرح، بالکل ایسے ہی فرہاد شیریں کے سامنے تیشہ پٹخ کر کہتا، ہم سے نہیں کھدتی نہر..... جی! تو یقیناً وہ شہریار کو چھوڑ چھاڑ اسی کے گلے کا ہار بن جاتی، اور پھر حکم ملتا ہے۔ ہم سے مت پوچھو جی!" وہ خوب ہنسی۔

"اوہ نری ڈیر!" وہ نریندر کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ تکنے لگی ایک دم سے نریندر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ریچھ کی طرح لپٹ گیا۔ شمن نے گھبرا کر اُسے دور ڈھکیلا، سارے بال اور کان کھسوٹ ڈالے، بیچارہ پٹے ہوئے کتے کی طرح کونے میں دبک گیا، اور شمن کچھ خوف زدہ کچھ شرمندہ بھاگنے لگی کہ آتی ہوئی پھپھیا سے ٹکر ہو گئی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"آ........ آ........ کچھ نہیں، یہ نریندر مجھے مار رہا تھا" وہ ایک دم بات پلٹ کر ہنسنے لگی، پھر مصنوعی غصے سے گال پھلا لیے۔

"ہائیں نری کے بچے" یہ رہا تیرا ریکٹ اور کہتا تھا کہ گم ہو گیا۔"

"ہاں، جھوٹا سارے زمانے کا"، شمن نے تائید کی۔

"کیوں مار رہا تھا بیچاری شمن کو؟ کیوں؟" وہ ریکٹ کے جال سے نریندر کے سر پر پٹے لگانے لگی۔

بپھرا ہوا نری بھنبھوڑ ہی کھاتا کہ اتنے میں رائے صاحب کمبل لپیٹے آ پہنچے اور

بات ٹل گئی۔

"آج نریندر کو کیا ہو گیا ہے؟" رائے صاحب نے اُسے غصّے اور شرم سے سُرخ دیکھ کر کہا، "تم دونوں نے ستایا ہو گا۔ کیوں؟"

"پریم ہو گیا ہے بے چارے کو،" شمّن نے دبی زبان سے ہنسی روک کر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

"پریم، پریم...... رائے صاحب" پریما نے چیخنا شروع کیا۔

"کیسے؟ اپنے نری کو" رائے صاحب بن کر فکر مند ہو گئے۔

"ہاں، چہ بے چارا۔"

"میں مار دوں گا، ہاں،" نریندر غرّایا۔

"ارے باپ رے! مگر کس سے ہو گیا ہے پریم؟"

"ایک ہے،" شمّن اترانے لگی۔

"جھوٹی، ہُنہ،" نریندر مارے شرم کے اور بھی بھنّا گیا۔

"ہاں، بے چارا، رائے صاحب اب؟ اپنا نری تو......"

"میں چھُری مار دوں گا...... پریما کی بچّی،"

"اور رائے صاحب......" قبل اس کے کہ پریما کچھ بولے نری نے جھٹ سے چھُری کا دستہ اُس کی انگلی پر رکھ دیا۔

کھانے پر نریندر کے عشق نے سب کو ہنسا دیا، خصوصاً شمّن تو بے تحاشا ہنستی رہی، اسے یہ کھیل نہایت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا، رائے صاحب میں بھی اپنی پرانی شگفتگی لوٹ آئی، وہ دیر تک بیٹھے کانٹوں اور چھُری کی مدد سے میز پر مجسّمے بنا کر امتحان لیتے رہے مگر انہوں نے صرف شوربہ پیا اور جلدی سے جا کر سو گئے۔

شمّن اور پریما اداسی سے نڈھال ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو گئیں یعنی تھکی

جاگتی رہی اور پریما سو گئی۔ شمن نے جاگنے اور خود سے بات کرنے کی ایک عادت سی ڈال لی تھی، روزانہ سونے سے پہلے وہ خود اپنے حضور میں اپنے سارے احساسات اور تجربات ایک ایک کر کے پیش کرتی اور ان پر خود اپنا فیصلہ سنتی، یہاں تک کہ وہ نہ جانے کب سو جاتی۔ اس سونے میں اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے مزیدار کہانیاں سنا کر سلا دیا ہو، رائے صاحب نے جھولے سے اس کے گال پر دو انگلیاں چھوا دی تھیں وہ ایک دم تازہ ہو گئیں، ساتھ ہی اسے گذرے ہوئے جنم کی بھولی ہوئی باتیں یاد آگئیں.......... دور بہت دور، صدیوں پہلے، رشید نے کیرم کھیلتے میں اس کی کلائی کو پکڑا تھا، چٹکی مارنے کے لئے دو انگلیوں کو ملا کر.......... پھر چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ سسکتی ہوئی چٹکی اب بھی اس کی رگ رگ میں چٹکیں لے رہی تھی اس نے اپنی کلائی پر سنستاتا ہوا گال رکھ دیا اور رائے صاحب کی دو انگلیوں کا مس کلائی میں رینگ گیا، اس طرح گویا اس نے اس نیم مردہ چوٹ میں نئی جان ڈال دی اسے سکون کی نیند آگئی۔

صبح اس کی آنکھ خلاف معمول دیر میں کھلی تو کالج کی گھنٹی کی آواز کہیں دور سنائی دی، ذرا ہوش آنے پر معلوم ہوا وہ کالج میں نہیں بلکہ پریما کے پلنگ پر ہے اور یہ آواز — ؟ کسی نے کانسے کی تھالی رسوئی میں گرائی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

رائے صاحب اب بھی سست نظر آرہے تھے۔ شمن دیر تک حس قلب کو کوستی رہی جس سے لڑ کر وہ اتنے مکدّر ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تازگی آجاتی اور وہ ایک آدھ جملہ ضرور کس دیتے، دیر تک بیٹھ کر تاش بھی کھیلے اور بے ایمانیاں بھی کیں، آج شمن کا دل بے اختیار انہیں چھونے کو چاہ رہا تھا۔ لہٰذا وہ پریما کے ساتھ ساتھ ان سے بھی لڑنے لگی۔ نہ جانے کس بات پر انہوں نے زور سے اس کی

انگلی چٹخا دی تو بچوں کی طرح مچل گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا ایک دم ان کے سنزر جیسے سینے کے پٹ کھل جائیں اور وہ سرنگوں ہو کر ان میں سما جائے۔

مگر وہ روٹھی ہی رہی پھر سیا دھوبی کو کپڑے دینے چلی گئی اور ترینڈر کا دورہ قائم تھا۔ وہ منہ پھلائے برآمدے میں پڑھتا رہا۔ کہ رائے صاحب آ گئے شمی نے بن کر منہ پھلا لیا، انہوں نے اس کے پھولے ہوئے گالوں کی نقل میں اپنے گال پھلا لیے اور شمی کے ہنسنے پر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ شمی پر تو بھتنی سوار تھی، وہ نہ جانے کس بات پر جل اٹھی، اور ان کے چھیڑنے پر پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے - ارے میری جان" رائے صاحب نے اسے چھوا تو وہ اور بگڑ گئی۔ وہ متعجب ہو کر صورت دیکھنے لگے، انہیں سنجیدہ دیکھ کر وہ ڈر گئی اور بری طرح ان سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

رائے صاحب نے ہنستے ہوئے اسے بچوں کی طرح تھپکنا شروع کیا وہ خاموش ان کے سینے سے سر لگائے لمبی لمبی سانسیں بھرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس پر غنودگی سی طاری ہو گئی، رائے صاحب نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا تو وہ ایک دم سوتی بن گئی۔ رائے صاحب اسے تھپکتے رہے پھر آہستہ سے انہوں نے اسے سرکا کر پلنگ پر لٹانے کا ارادہ کیا تو وہ ایک دم انہیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کانپنے لگی۔

"نہیں، نہیں، رائے صاحب" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کیا ہے...... کچھ...... ارے" وہ اس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر گئے۔

اعتراف عشق

"نہیں رائے صاحب" "مجھے گرائیے مت، رائے صاحب........ رائے صاحب...... رائے صاحب میں...... میں آپ سے پریم کرتی ہوں...... میں آپ سے...... پریم...... رائے صاحب میں" اس کی آواز

اور گھٹ کر سہم گئی۔"

"ایں ہمن....... اچھا سو جاؤ" وہ جلدی سے اس کی لپٹتی ہوئی انگلیاں الگ کرنے لگے۔

"نہیں...... نہیں رائے صاحب، میں مر جاؤں گی رائے صاحب مجھے رائے صاحب، مجھے دور نہ کیجیے" رائے صاحب ایسے جھجکے جیسے کسی نے ان کے ماتھے پر تھپڑ مار دیا۔

"رائے صاحب..... میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی" اس نے اور نڈر ہو کر کہا، رائے صاحب چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ارے پریا......" انہوں نے آواز دی۔

"مت بلائیے کسی کو، رائے صاحب میں مر جاؤنگی، میں پریم کرتی ہوں رائے صاحب" سامنے دروازے میں نریندر کتاب لیے حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا جونہیں اس نے شمن کو یہ کہتے سنا، اس کا چہرہ کانوں تک لال ہو گیا۔ جیسے کسی نے اسے ماں کی گالی دیدی ہو، شمن کی زبان لڑکھڑا گئی وہ ڈھیلی ہو کر پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑی۔

رائے صاحب چلے گئے، بغیر دوسرا لفظ زبان سے نکالے، اور شمن کا جی چاہا کاش، پلنگ سمیت وہ زمین میں سماتی چلی جائے نیچے نیچے اتنے نیچے کہ بالکل زمین کے کلیجے میں جا چھپے کیسے ہیبت اور شرم کے وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح شام تک پڑی رہی، کوئی ایسی ترکیب ہوتی جو وہ بنا کچھ کہے سنے اپنا منہ ڈھانکے وہاں سے بھاگ نکلتی، اس کے کمرے میں کوئی نہ آیا مگر اسے صاف معلوم ہو گیا کہ نریندر اور پریا دوسرے کمرے میں ڈرے ڈرے کیا باتیں کرتے رہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ اب کیا ہوگا؟

کانپتی، لرزتی، آنکھیں جھکائے جب وہ باہر نکلی تو نریندر جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ وہ بھی اُسے منہ دکھاتے ڈر رہا تھا۔ پریا نے عورت کی

پوری بہادری سے اس کا پورا مقابلہ کیا، گویا آج وہ پہلی مرتبہ اس کا بحیثیت ایک اجنبی ہستی کے استقبال کر رہی ہے۔ وہ بڑے اخلاق سے بولی اور دونوں نے جا کر مہذب لوگوں کی طرح چائے پینا شروع کی۔ آج نہ کچے لوڈوں پر جھگڑا ہوا نہ بسکٹوں پر چھینا جھپٹی ہوئی، اس کی ہمت نہ پڑی جو رائے صاحب کا نام بھی لیتی۔ پریما نہایت تپاک سے اُسے پھل وغیرہ دیتی رہی شمن بھی تکلف سے کھاتی رہی۔ کبھی کبھی اُسے پریما آنکھ بچا کر دیکھ بھی لیتی۔ مگر ایسے گھبرا جاتی گویا اُسے نہیں پہچان پائی، دونوں بے طرح سہمی ہوئی تھیں۔ وہ بے تکلف سہیلیاں ایکدوسرے سے بہت دور غیرت کی خشکی میں جا پڑی تھیں۔

اُنکے حواس بے طرح بھٹک گئے تھے جیسے دو دوستوں کے بیچ میں ریگستان در آیا ہو اور ایکدوسرے کو پکار بھی نہ سکیں شام تک خاموش رہنے کے بعد شمن نے بڑی مشکل سے اس سے بورڈنگ جانے کی اجازت دبے الفاظ میں طلب کی جو ایسی تیزی سے ملی کہ اس کا منہ اتر گیا، ڈرائیور تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا۔

آن واحد میں وہ خالی ڈھنڈھار بورڈنگ کی چہار دیواری میں تھکے ہوئے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں پہونچ گئی۔ اس نے بجلی نہیں جلائی اور جوتوں سمیت لحاف میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن لوگوں سے آنکھ ملاتے وحشت معلوم ہونے لگی، گو وہ کچھ نہ جانتے تھے۔ پھر بھی جیسے اس کے منہ پر لمبی لمبی سطریں کھنچی اسکے گناہ کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں، وہ کچھ چھپانا چاہتی ان متجسس نظروں سے جو اس پر اچانک جا پڑتیں۔ اور وہ جھجک کر دور ہو جاتی۔

وہ تو بدمعاش تھی، پرلے درجے کی آوارہ، اُس نے ایک مقدس انسان کی پاکدامنی پر سیاہ دھبے ڈالنے چاہے مگر خدا نے اسے بچا لیا، یہ اُسے کیا ہو گیا تھا....... یہ ٹوٹے ہوئے ذرے اب کیسے جڑیں گے؟ اب کیا ہوگا؟

چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی لڑکیاں لوٹنا شروع ہو گئیں۔ اب پریما بھی ایک

ایک دن بعد آجائے گی! پھر کیا ہوگا؟ وہ اس آئینے میں اپنی صورت کیسے دیکھ سکے گی؟ اس کی وحشت بڑھتی گئی۔

دوسرے دن صبح لائبریری میں لڑکیاں سر جوڑے اخبار پر مکھیوں کی طرح جٹی ہوئی تھیں، کچھ بلند آواز سے پڑھ رہی تھیں جیسے کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔ تو تماش بین لاش کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک کے بعد دوسرا گروہ اخبار پر جمع ہو رہا تھا "ہائے ...... ہا ...... بے چاری پرتیما!" اس نے کسی کو کہتے سُنا، اور اس کے ہاتھ سے لرز کر کتابیں چھوٹ پڑیں۔ مجرم کی طرح نظریں نیچی کیے وہ منتظر رہی مگر پرتیما نے شاید اُسے دیکھا نہیں اسکی نظریں اخبار کی طرف اُٹھیں لڑکیاں اُسے چھوڑ کر جا چکی تھیں، آہستہ سے وہ بڑھی، احتیاطاً کرسی پر بیٹھ گئی۔ رات کو رائے صاحب ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے یہ ان کی پُرانی بیماری تھی جس کا یکایک حملہ ہو گیا، وہ خاموش میز پر کہنیاں ٹیکے بیٹھی رہی کسی نے کلاس چلنے کیلیے شانہ ہلایا اور وہ چلنے لگی لڑکیوں کی رَو کے ساتھ۔

"کہاں جا رہی ہو؟" ایف اے کلاس نے اُسے اپنی جماعت چھوڑ کر آگے بڑھتے دیکھ کر روکا۔

"ہیں؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"تمہاری کلاس تو پیچھے رہ گئی یہ اب کہاں جا رہی ہو؟"

"اوہ، میں نقشہ لینے جا رہی ہوں، کل سٹنگ روم میں بھول آئی تھی۔"

اسے عین موقع پر بات سوجھ گئی ورنہ غضب ہو گیا تھا وہ یقیناً پکڑی جاتی، تیز قدم وہ سٹنگ روم کی طرف چلی مگر وہ کافی دور تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، اور وہ جلدی سے پلٹ پڑی، اپنی کلاس میں گھس گئی۔

نہ جانے اس نے اس دن کیا پڑھا اور کیا سُنا، آنسو تو اس کی آنکھوں

سے جب ہی خشک ہو گئے تھے۔ جب وہ دن رات متواتر اپنی بدمعاش آتا کی یاد میں روئی تھی، چہرے پر کوئی آثار لانا کمزوری کی نشانی تھی، مگر پریما کی خالی کرسی دیکھ دیکھ کر اُسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ رائے صاحب نہیں پریما مر گئی۔

رائے صاحب مر گئے! اس خیال ہی سے اس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی، ان کو جلا دیا گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُن کے وہ بال جو سورج سے زیادہ روشن تاج جلایا نہیں جا سکتا! وہ سچے سونے جیسی رنگت اور سچے موتیوں جیسے مصنوعی دانت، ناممکن......... وہ خود ہی فیصلہ کرتی۔

راتیں بڑی بھیانک ہو گئیں، رائے صاحب اس کے دماغ سے کسی طرح نہ نکلتے تھے۔ اور پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ وہ باقاعدہ ان سے ڈرنے لگی۔ رائے صاحب سے جن کے قرب کے خیال سے ہی وہ لرز اٹھتی تھی ایک دن اُس نے ایک مہارشی کی ارتھی بڑی دھوم دھام سے نکلتے ہوئے دیکھی، مہارشی کو پالکی میں باندھ کر بٹھا دیا گیا تھا، دانت کھلے ہوئے اور منہ پر سیندور، ہلدی اور چندن کے داغ جلد باسی بینگن کی طرح جھریوں دار اور سیاہ اس پر سے ہلکی ہلکی سڑے گوشت کی سی بسانند!......... پھر تو یہ حال ہو گیا کہ مارے ڈر کے دن کو اکیلے کمرے میں جاتے دم نکلتا۔ رات کو معلوم ہوتا وہی پالکی والا مردہ اس کے سرہانے بیٹھا ہے وہ ہمت کر کے آنکھیں ٹیڑھی کر کے دیکھتی اور وہ جھپ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا۔ کبھی پیٹی کے پیچھے سے ہاتھ پھیلا کر اس کا گلا ٹٹول رہا ہے کبھی غسل خانے میں اس کے پیچھے پکڑنے لپکتا۔ جاتے جاتے وہ دلیری سے مڑ کر دیکھتی اور ایسا معلوم ہوتا کوئی تیزی سے کھمبے کی آڑ میں ہو گیا، جھاڑیوں میں دبک گیا، گیلری میں سرک گیا۔ پسینے چھوٹ جاتے اور گھٹنے لرزا کرتے۔

بعض وقت رات کو کھانا کھاتے میں ایسا معلوم ہوتا کہ مردہ انگلیاں اس کے ٹخنے میز کے نیچے ٹٹول رہی ہیں، وہ ڈر کر پیر کھینچتی تو وہ ہاتھ بھی ساتھ لٹکا چلا آتا......... چیخ مار کر الگ کرتی تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اس کی شلوار

کا پانچواں حصّہ ہے۔

ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی .... دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایکدم وہ اٹھ کر ناچنے لگے ان کے بازوؤں کے پٹھے پھول پھول کر اچھلنے لگے اور بال گز گز بھر کے سانپوں کی طرح کھڑے ہو کر جھومنے لگے مصنوعی دانت سر تال میں بجنے لگے .... تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے اور وہ شمّن کی طرف بڑھے .... اس نے ایک دل دوز چیخ ماری۔ لیکن انہوں نے اسکی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ شمّن متواتر چیخیں مارتی رہی اور دونوں ہاتھوں سے مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی رہی۔

"خس خس" کچھ کہا اور وہ اٹھ کر بے تحاشہ بھاگی۔ وہ بھاگتی چلی گئی او شاید ساری رات اسی طرح بھاگتی رہتی اگر ایک دم چوکھٹ اس کے ماتھے پر اچھل کر نہ لگتی۔ وہ گر پڑی۔ جب آنکھ کھولی تو رائے صاحب اس پر جھکے ہوئے کچھ ناک میں ٹھونس رہے تھے جو دوزخ کی آنچ کی طرح دماغ کو جلائے ڈالتی تھی .... اس نے پھر چیخ ماری اور اٹھنا چاہا مگر دو تین سفید سفید کبوتری شکلوں نے اسے دبوچ لیا۔

"چپ چاپ لیٹی رہو!" یہ پرنسپل کی آواز تھی۔

"میں نے جیسے ہی ٹارچ ڈالی یہ پاگلوں کی طرح نوچنے لگی، اور پھر بھاگی" مسٹرس خود نہایت خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

تو یہ مسٹرس تھیں جنہیں وہ رائے صاحب کا بھوت سمجھ رہی تھی۔ اُن کے سفید بال کاغذ کی بتیوں میں لپٹے ہوئے روپہلی تاج کی طرح چمک رہے تھے .. .. ٹارچ ہاتھ میں تھی اور وہ خود ہسپتال کے کمرے میں پڑی تھی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اسے بجلی بجھ جانے کے بعد بھی میز پر اوندھا پڑا دیکھ کر انہوں نے ٹارچ ڈالی، بس وہ پاگلوں کی طرح بھاگی ....

...حسن اتفاق سے اُس کا خواب اور میٹرن کا ہیولا* ایک ہی کڑی میں اُلجھ کر دماغی اُلجھن کا باعث ہو گئے۔ صبح تک اُسے زور کا بخار چڑھ آیا اور اُسی حالت میں اُسے گھر پہنچا دیا گیا جہاں تین مہینے اُسے ٹائیفائڈ نے جی بھر کر جھنجھوڑ دیا۔

بیماری طویل تھی اور ساتھ غیر دلچسپ! حال ہی میں اس نے ایک کتاب پڑھی تھی، جس کی ہیروئن شروع سے آخر تک بیمار رہتی ہے اور اس بیماری کے وسیلے سے ان کے عاشق صاحب کو اس قدر بہترین موقعے حاصل ہوتے ہیں کہ حد نہیں، جب دیکھو جناب مریضہ کو سہارا* دے دوا پلا رہے ہیں، اس کے نازک ہاتھوں کی نازک ترین نبضیں ٹٹول رہے ہیں، اس کے پیاسے لبوں میں انگور کا رس نچوڑ رہے ہیں۔ اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار اس کا دل بیمار پڑنے کو چاہا کرتا، وہ ان رنگین لمحوں کا حسین تصور، جس کے خیال ہی سے اس کی نبضیں اچھلنے لگتیں اور حرارت تیز ہو جاتی تھی۔

مگر اب جو وہ بیمار پڑی تو یہ حال کہ تیمار دار تو درکنار مزے سے لوگ اس کے سامنے چیخ چیخ کر بولتے، بچے لڑتے اور پٹتے، سامنے برآمدے میں اناج پھٹکے جاتے، ہاون دستے میں ہلدی دھنیا کوٹا جاتا، بار ہا ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی آواز نہ نکلی۔ سامنے لوگ لڑ لڑ کر تاش پچیسی کھیل رہے ہیں پانی مانگا تو کون کھیل چھوڑ کر اٹھے، نوکر کو آواز دی جا رہی ہے اور وہ بھی اپنے* چنگھاڑ کر کہ مردے جی اٹھیں...... ذرا غنودگی طاری ہو جاتی تو پھر کسی کے وہ کلا کے نعرے سے آنکھ کھل جاتی۔

سامنے روز لمبا چوڑا دستر خوان بچھتا، تر مال اڑائے جاتے۔ شمن کی روح
بلبلا بلبلا کر کھانوں پر منڈلاتی، آنکھیں خوان دیکھ دیکھ کر پتھرا جاتیں، قوت
شامّہ کھانے کی مہک کے جھلے سہتے سہتے کند پڑ جاتی۔ بھائی بہن مزیدار کھانے کھاتے
دکھا دکھا کر کھاتے اور اوپر سے چڑا دیتے۔ سب اس کے ندیدے پن کو اس کی
کمزوری اور فطرتی پستی پر محمول کرتے، اس کی بیماری کی وجہ سے گھر والے پریشان
نہیں عاجز ضرور تھے۔ جبھی تو اسکا ایک دن جلا جب خاندان کے دو بڈھوں
کو جنازے کی نماز پر بحث کرتے سنا۔ وہ دونوں اس کی طرف منہ کیے ریہرسل
سی کر رہے تھے اور اسے یہی معلوم ہوا کہ گویا اسی کی نماز جنازہ پڑھنے کی تاک
میں تیاریاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہر وقت وضو کرتے تھے۔ مگر اس
قدر بدبو جسم سے نکلتی تھی کہ دم لوٹ جاتا تھا۔ دوسرے قطعی خبطی تھے۔ شمن
ان دونوں میں سے کسی کی پڑھائی نماز سے جنت میں جانے کی متوقع نہ تھی۔ کچھ چند
لوگ بیٹھ کر کفن کی لمبائی چوڑائی پر بحث کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں وہ کاغذ
کے نمونے موڑ موڑ کر تشریح کرتے جاتے، بیٹھ موڑ کر اس نے سسک سسک کے
رونا شروع کیا اور جب وہ سب چلے گئے تو اس نے ڈرتے ڈرتے اس کاغذ
کفن کے نمونے کو دیکھا۔ کس قدر ناکافی تھا یہ لباس، خدائے ذوالجلال کے حضور
میں جانے کے لیے، بھلا اگر ایک میلا ہوا جوڑا خراب ہو جائے گا تو کون سا ایسا ٹوٹا
آجائے گا۔ موت سے اُسے اور بھی ہول نظر آنے لگا۔

مگر موت اتنی بھیانک نہ تھی جتنی موت کی آدھ گت، معلوم ہوتا سب کو
اس کے مرنے کا پر اشتیاق انتظار رہا ہے اُسے نفرت ہو گئی۔ سب سے
نفرت ہو گئی۔ زندہ یا مردہ وہ ان کے لیے مر چکی تھی۔ یا شاید کبھی پیدا ہی نہیں
ہوئی تھی۔ یہ کون تھے سب اس کے؟ مانا کہ سب بھائی بہنوں نے ایک ماں کے
شکم میں تکمیل پائی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ایک مکان میں ہزاروں
کرائے دار آتے ہیں، رہتے ہیں، چلے جاتے ہیں ...... سڑک پر کتنے انسان

چلتے ہیں؟ چھکڑے گھسٹتے ہیں۔ لاریاں دوڑتی ہیں؟ وہ کون ہیں ایکدوسرے کی ہ...... کوئی نہیں! اس نے جواب دیا۔ اور وہ اسے مل گیا

تین مہینے کے بعد تھک گیا لیکن اسے بھی بری طرح تھکا گیا۔ ایک تو بیماری دوسرے اس قدر غیر دلچسپ، جب وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر پلنگ سے کرسی تک جانے کے قابل ہوئی تو بجائے خوشی کے اسے رونا آگیا۔ بال سب جھڑ گئے تھے، ہاتھ پیر جلی لکڑی کی طرح خشک اور صورت ایسی جیسے مردہ کفن پھاڑ کر نکل آیا ہو۔

اسی زمانے میں نوری بھی ایک ہفتے کے لیے آئی۔ وہ سال بھر سے اپنی ددھیال رہنے چلی گئی تھی۔ بڑی آپا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آکر وہیں ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھی۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی، کچھ یونہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خرانٹ ساس اس کے منہ پر بار بار حقارت سے اس گذرے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی، وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطرے کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اسی لیے تو اس نے کٹھن زندگی گذارنے کے لیے میکے بھیج دیا تھا، کہ کچھ تو باپ بھیوں کی لاج پیروں میں بیڑیاں ڈالے رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عمر سمجھنے لگی تھی، بات بات پر اسے گردن توڑ بخار کی طرح بڑھتے ہوئے بڑھاپے کی طرف متوجہ کر کے رہی سہی زندگی بھی نچوڑ لینے کی کوشش کرتی۔ بڑی آپا ایک زندہ شہید کی طرح سر اونچا کیے خاموش رہ جاتی۔ اسے اس ساس سے کافی نفرت تھی یہی تو وہ ڈائن تھی جس نے شادی شدہ زندگی کے تین مختصر سال طعنوں اور اعتراضات سے حد درجہ مکدر بنا دیے تھے اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دنیا اتنی مختصر زندگی لے کر آئے گی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آخر ایکدن وہ ہوگی اور اس کا میاں اگر اسے اس دن کی خبر ہوتی تو بڑھیا کے منہ پر خاک ڈال ان تین سالوں کو کلیجہ سے لگا کر رکھتی۔ بڑھیا اکلوتے بیٹے پر دیوانی رہتی مگر جب کبھی وہ بیوی کی طرف زیادہ راغب نظر آتا تو جل کر خاک ہو جاتی۔

"اے لے بھئی یہ ہر وقت کے چونچلے ......" وہ ناک سکوڑ کر طعنہ دیتی اور بڑی آپا شرم سے پانی پانی ہو جاتی وہ جلدی سے اپنے آپ کو اس کے ترستے ہوئے ہاتھوں سے چھڑا کر بھاگ آتی اور ساگ بیننے لگتی۔ دو بیٹھا وہ حسرت سے تکا کرتا، ارمان بھرے اشارے کرتا، ترسی ہوئی نظروں سے گھورتا جیسے وہ اس کی جائز بیوی نہیں پرائی عورت ہو۔ مگر وہ نہ جاتی۔

جونہی کالج سے آتا بڑھیا اپنے امراض کا پوٹلا بکھیر کر بیٹھ جاتی اور لٹے گھیرے رہتی، جونہی وہ جان چھڑا کر بیوی کے پاس آتا وہ بہو کو فوراً کسی ضروری کام کے بہانے بلا لیتی۔ بہو صبر کی سل کلیجے پر دھرے بیٹھی رہتی۔ ہاتھ کام میں لگے رہتے۔ مگر دل میاں کی ادھر آہی بات میں۔

"اے دلہن کام میں جی نہیں لگتا تو جاؤ، اے ہاں نہیں تو"

وہ اس کے دل کا حال معلوم کر کے نئے طعنے سے اس کے قدم جکڑ دیتی۔ جب اسے پکا یقین ہو جاتا کہ بہو واقعی ناامید ہو چکی ہے۔ اور بیٹے کا مزاج کافی گرم ہو گیا، جادو ٹونے کا خطرہ ختم ہو گیا تب وہ اسے چھوڑ دیتی۔

میاں کا پارہ اتارنے میں ساری خوشامدیں سارے لاڈ جن کے آسرے میں وہ پہاڑ سے دن کاٹتی، مٹی میں مل جاتے۔ دبے چھپے لفظوں میں شکایت بھی کرتی معافی مانگتی، مگر چڑھا ہوا بھوت یوں آسانی سے تھوڑی اترجاتا۔ پھر ساس کو خبر ہو جاتی تو وہ اور جلے پر پھپھولے چھوتکتی۔

"اے ہم نے تو کبھی میاں کی جوتی پر ناک نہیں رگڑی، وہی بیچارے اللہ بخشے ہماری تین سو ساٹھ سنا کرتے تھے، پر آج کل کی لڑکیوں کا تو بس توبہ ہے۔ مٹی جاتی ہیں خصم پر ......"

وہ خاموشی سے یہ سب کچھ سن لیتی اور یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ کبھی تو یہ طعنے قبر کے کونے میں دفن ہو ہی جائیں گے، اسے الٹا بڑھیا پر رحم آنے لگتا وہ اسے تختۂ غسل پر لاچار دیے بس آخری سفر کے لیے تیار دیکھتی۔ اس نے

پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس کا تیجہ وغیرہ دھوم دھام سے کرے گی تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ تعلیم یافتہ بہو کے ہاتھوں بڑھیا کی عاقبت بھی مٹی میں مل گئی۔ حالانکہ اُسے پختہ یقین تھا کہ خواہ کتنے ہی تیجے، چالیسویں کیے جائیں بڑھیا بغیر تاوان دیئے اپنی زیادتیوں کے عذاب سے نہ بچ سکے گی، تھوڑا بہت تو عذاب بھوگنا ہی پڑے گا اگر یونہی نذر نیاز کا کام چل جاتا تو پھر کیا کہنے تھے اور پھر تو وہ فراخ دلی سے تیجا کرتے بھی گھبراتی۔

مگر بڑھیا اسکے گلے میں جنّتی کے پاٹ کی طرح لٹکی رہ گئی اور نہ دا اسکی راتیں سونی ہوگئیں اور دن بھیانک کانٹوں سے بھر گئے۔

۵ نوری اب جوان ہو رہی تھی لہٰذا ساس ہر وقت بہو کو چال چلن سے رہنے کی تلقین کرتی، یا تو وہ خرچے کے ڈر کے مارے کسی سے ملتی جلتی نہ تھی یا اب سارے کنبے لڑکوں کی بلائیں لینے پر تل گئی، ساس بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اسکی بیٹی کا سارٹیفکٹ ہر جگہ کارآمد ثابت ہوا۔ اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے لڑکے کو اس پر عاشق کرا لیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ اُدھم مچائی مگر ایک نہ چلی

نوری جب آئی تو نہایت شرمیلی اور فرمانبردار بن کر آئی۔ بڑی آپا بڑی جانفشانی سے جہیز جمع کرنے لگی اس نے ایکدم سارے خرچے بند کر کے تنگی میں گذر کرنی شروع کر دی نوری بھی پھٹے پرانے کپڑے بڑے شرمیلے فخر کے ساتھ پہن لیتی ہر چیز جہیز کے لیے رکھ دی گئی گو لڑکا ابھی میٹرک میں پڑھتا تھا اور انگلینڈ جانے والا تھا۔ اور اس طرح نوری کو کم از کم سات سال امیدواری میں گذارنے تھے مگر وہ آنیوالی خوشگوار زندگی کے حسین خوابوں کے نشے میں کچھ بھی تو نہ محسوس کرتی وہ ان جھیتڑوں کو چوتھی کے جوڑے کی امیدیں کلیجے سے لگا کر پہنتی۔

اُسے اب احساس بزرگی بھی ہو چلا تھا۔ اس نے سارا چلبلا پن چھوڑ دیا تھا ایک دم گھر والیوں کی طرح سنجیدگی اختیار کر لی۔ وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ برتر

خیال کرنے لگی تھی اس کا مول اتنی جلدی ہو گیا۔ اور جس طرح دوکان میں رکھی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کا مول تول غیر متوقع قیمت پر ہو جائے۔ کوئی گاہک کا پورا آن پہنچے تو باقی کا مال حقیر پڑا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح شمّن بھی کچھ متحیّر اور حقیر سی رہ گئی۔ اسے ایک ہلکا سا احساسِ کمتری بھی ہونے لگا آخر وہ کیوں زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ جاتی ہے؟ بیماری سے اٹھی ہوئی دُم کٹی مرغی کی طرح بدہیئت اور حقیر نوری کی رومانی کم سِنی کے آگے ایک متعفن پھوڑا معلوم ہوتی۔

اسی عرصے میں کالج سے لوٹتے ہیں اعجاز دو چار روز کے لیے آیا۔ جب اس کا خط آیا تو کسی کو پڑھ کر سنانے کی مہلت بھی نہ ملی وہ خود ہی تانگے میں بیٹھ کر تلاش کرتا آن پہنچا۔ لیکن جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو اللہ کی شان یاد آنے لگی وہی سوکھا مارا بدوضع جانور ایک وجیہہ نوجوان بن چکا تھا۔ اس کا گھٹا ہوا سر چمکیلے بالوں سے آراستہ تھا۔ قیمتی سوٹ کیس میں رکھے ہوئے کپڑے کی تہیں بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

اُسے دیکھ کر شمّن کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ معلوم ہوا وہ برسوں کی کھوئی ہوئی چپل نہ جانے کس گمنام کونے سے اچھل کر اس کے منہ پر لگی، وہ خود بخود پیچھے سمٹ گئی۔ موٹی چہرے کے مارے ہوئے بال اور بھی بے رونق اور سوکھے ہاتھ زیادہ ڈراؤنے نظر آنے لگے اس نے اسے دیکھتے ہی ایکدم اس کے خلاف ایک مورچہ قائم کر لیا وہ اپنی پرانی نفرت کو اعجاز کے سامنے جھکتا دیکھ کر اور بھی چڑ گئی۔

اعجاز بالکل نیا چولا بدل کر آیا تھا وہ جھینپ اور چھچھورپن تو کوئی اس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت چرب زبان ہنس مکھ اور دلیر۔ آتے ہی اُسنے حیرت سے شمّن کو گھورا، وہی بھوکی آنکھیں کیسی گستاخی سے اُس کے آر پار تیرتی چلی گئیں۔

"ارے یہ شمشاد اتنی دبلی۔ اور تمہاری چوٹی کیا ہوئی کتر گئے بھئی واہ۔" اس نے قہقہے لگانا شروع کیے اور شمّن جھلا کر رہ گئی لوگوں نے اسے باتوں میں لگا لیا کسی نے بھی تو یہ نہ بتایا کہ وہ ابھی بیماری سے اٹھی ہے یہ نہیں کہ وہ اعجاز کے سامنے

اپنی بدصورتی کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتی تھی، بلکہ یونہی کیوں وہ غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

وہ اس کی جان کو ایک بلا بن کر آیا، دن بھر قہقہے لگاتا، آیا تو دو دن کے لیے تھا مگر دو ہفتے بعد بھی بہانے بنا کر رہے چلا جا رہا تھا۔ لوگ اس میں اس قدر دلچسپی لینے لگے تھے کہ روز وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک لیا جاتا، فوزی تو اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتی وہ بھی اس کے ہونے والے میاں کی باتیں کر کے چھیڑا کرتا۔ وہ سارے کام چھوڑ کر بس اعجاز سے الجھا کرتی۔

شمن کا جی چاہتا کوئی اعجاز کو اس کی پرانی تصویر دکھا کر اسے وہ غلاظتیں بھی تو یاد دلائے جو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا نہ جانے لوگ اپنے ماضی کو کس طرح اس قدر آسانی سے بھول کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اسے ان لوگوں سے سخت نفرت تھی جو پہلے والے غریب بدوضع اور کم عقل اجّو کو بھول کر اس نئے انسان کی آؤ بھگت کرنے لگے تھے، وہ اسے کس قدر حقارت بھری ٹھوکریں مار چکے تھے۔ مگر آج اس پر فدا تھے۔ وہی منجھلے بھائی جن کے سامنے وہ ناک پکڑ کر اٹھک بیٹھک کر چکا تھا، اسے موٹر میں لیے لیے گھومتے، وہی اماں، جو اگر وہ کتوں کا کھانا چرا لیا کرتا تھا تو صبح کا ناشتہ بند کر دیتی تھیں، اب مرغن کھانے اس کے منہ میں ٹھونسے دیتی تھیں، کبھی وہ دن بھی تھے کہ ذرا دیر تک سوتا رہتا تو اجّو پر پانی کا لوٹا اوندھا کر اس کی چارپائی الٹ دی جاتی تھی آج وہ دن چڑھے تک سوتا رہتا پھر بھی لوگ یہی کہتے، "اللہ رکھے جوانی کی نیند ہے سونے دو" شمن سلگ کر رہ جاتی، لوگ سچ بولتے کیوں ڈرتے ہیں، یہ کیوں نہیں کہتے روپے کی نیند ہے، اس جائیداد کی نیند ہے جو اس کے چچا نے اپنی زندگی ہی میں اس کے نام کر دی تھی۔ بڑا ذلیل تھا اعجاز۔ وہ ان کی ٹھوکریں جیسے بھول گیا ہو، نیچ کہیں کا۔ جب لوگوں نے تھوکا جب بھی خاموش اور شاکر رہا اور جب کہ وہی لوگ اپنا تھوکا چاٹ رہے تھے وہ نہایت خوش تھا۔ یہ کیوں اور کیسے؟......... مگر شمن اب بھی وہی شمن تھی۔ وہ اب بھی اعجاز کے

وجود پر تھوکنے کو تیار تھی، وہ گھنٹوں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتا، ہنسی مذاق کرتا مگر شمن ان سب سے دور کسی نہایت غیر دلچسپ کام میں ڈوبی رہتی وہ انجان سے بالکل مخالف سمت چلتی، اگر وہ اس سے کبھی کچھ کہنا بھی چاہتا، یونہی کوئی نہایت معمولی سی بات تو وہ سنی ان سنی کر جاتی۔

جب سے وہ آیا تھا لوگ نئے نئے پینتروں سے ہر وقت اس کی شادی کا ذکر کرتے۔ بڑی آپا بیچاری کے تو ہاتھ کٹ چکے تھے، وہ توری کے لیے ہاں کر چکی تھی حالانکہ کئی دفعہ اُن کی نیت بہک بھی گئی۔ سال دو سال میں اعجاز نوکر ہو جائیگا۔ اور وہ ہونے والا داماد نہ جانے کب اِن جوتیوں کے قابل ہو؟........ اس کے علاوہ اور سارے خاندان کی لڑکیاں اس کے قدموں میں ڈالی گئیں مگر وہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔

اتفاق کہیئے یا قسمت انہی دنوں بلقیس اور جلبیس اپنی خالہ کے یہاں آئیں زنانہ کلب میں اچانک شمن سے ملاقات ہوگئی، بلقیس بال برابر تو نہ بدلی تھی، وہی جلبلاپن چیخ چیخ کر بولنا اور اونچے اونچے قہقہے، شمن سے اس قدر کھینچ کر گلے ملی کہ شانے دکھنے لگے۔ گھل مل کر دونوں میں باتیں ہوئیں۔ بلقیس اپنی خالہ کے یہاں زنانہ سے عشق لڑانے آئی ہوئی تھی۔ خالہ کا گھر اچھا خاصہ بھرتی کا دفتر بنا ہوا تھا، شہر کے تمام شادی کے قابل یا قابل ہونے والے لڑکے ان کے یہاں حاضری دیتے تھے تین چار اپنی لڑکیوں کے علاوہ وہ اپنے عزیزوں کے لڑکیوں کے نصیبے کھولنے میں ملکہ رکھتی تھیں انہیں اسقدر مشق ہوگئی تھی جس لڑکی کا جس لڑکے سے چاہتیں جوڑ لگا دیتیں، فریقین کتنا بھی چاہیں کچھ بس نہیں چلتا۔ نکھٹو اور بدقسمت لڑکے سوچتے دیکھتے ہی تھوہر کی جڑ کی طرح چمن زار سے نکال کر پھینک دیئے جاتے ان کا آنا یک لخت قابل اعتراض ہو جاتا۔ تشبیہ

بلقیس خالہ کی تمام سہولتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، پڑھائی چھوڑ کر اس نے کچھ دن سلیقہ اور فیشن سیکھنے کے لئے انگریزی اسکول میں نام لکھوالیا

تھا اور وہاں سے ایسی دھاڑ دار ہو کر آئی تھی کہ چلا نہیں۔ عجیب بات اس لڑکی میں یہ تھی کہ وہ ہر اس نسوانی حربے کا جو مرد کو مارنے کے مصرف میں آتا ہے فخریہ ذکر کرتی، چالاکیوں خودغرضیوں اور مکاریوں کا بڑی معصومیت سے اعتراف کرتی۔

"عیسے مجھے خاک پسند نہیں پر جب میں نے اسے ستار سنایا تو کم بخت مر گیا جلیس نے ڈائلمن بجایا مگر بیچاری شرما گئی۔"

"نور حد الو ہے' پتہ ہے کل برنا ڈ شا میرے لیے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لایا۔ بڑا پڑھاکو ہے' کہتا ہے پروفیسر ہوں گا۔ اب بھلا شمن کتنے سال لگ جائیں گے کم از کم چار سال رکھ لو۔ بھلا کون بیٹھا رہے دیگا مجھے؟ اختر سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے جان کو آ گیا ہے...... مگر میں نے ابھی کسی کو جواب نہیں دیا ہے۔ خدا قسم جو اختر میرے لیے پدما جیسی انگوٹھی نہ لایا تو کبھی جو کر جاؤں منگنی۔

خالہ بی کہتی ہیں اختر خاصہ ہے، مگر میں کہتی ہوں موئی کی جائداد حد بڑی ہے.. ...... پتہ ہے تین موٹریں ہیں اور......"

کلب کے بعد وہ شمن کو اپنی خالہ کے گھر لے گئی اور دوسرے دن دونوں بہنیں بغیر کہے سنے آ دھمکیں۔ شمن کے گھر یوں تو گھر اچھا خاصہ تھا مگر بے سلیقہ پن اور لاپروائی کی وجہ سے یہ حال تھا کہ دو چار ٹوٹی کرسیاں میلی دریوں کے تخت' اور بان کی کھری چارپائیوں کے سوا کچھ اٹھنے بیٹھنے کا انتظام نہ تھا۔

جھینپتی کھسیاتی شمن اُسے اپنے کمرے میں لے آئی، اس کو کمرہ کہنا بالکل بیجا تھا' اُسی جگہ کچھ صندوق چینی کے برتنوں کی الماری بھی تھی' ایکطرف چھت میں جڑاول کا سامان جھول رہا تھا۔ کونے میں جالا لپٹے تمباکو کا بانس کھڑا تھا، جسے کبھی حرکت نہ دی جاتی تھی مکڑیوں اور چھپکلیوں کا پرسکون راج قائم تھا۔

"اپنے کمرے میں چلو نا" بلقیس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا اور شرم کے مارے شمن کا جی مر جانے کو چاہا روپے کی کچھ کمی نہ تھی پنشن ہی اتنی کافی تھی کہ اگر چاہتے تو ڈھنگ سے رہنا مشکل نہ تھا مگر پنشن سے پہلے کون سے ٹھاٹھ تھے ویسے گھر میں پندرہ بیس نوکر اور

مفت خورے موجود تھے، باہر چار چار بھینسیں گھوڑے کتے مرغیاں وغیرہ بھری پڑی تھیں، باہر تو بیٹھنے کے لیے کچھ مونڈھے وغیرہ تھے بھی مگر گھر میں بڑی بڑی بیویاں بھی آتیں تو لشتم پشتم پلنگوں اور تختوں پر چادریں بچھ جاتیں۔ اُس نے کبھی کسی کو اپنے گھر کی حالت نہ بتائی تھی۔ اور بلقیس جلیس سے دو چار دفعہ گپ بھی ماردی تھی، وہ تو اس گھر میں پیدا ہو کر پچھتائی تھی۔ کاش وہ کہیں اور جنم لیتی۔ اتنے بہن بھائیوں کے بجائے دو ایک لایق فائق بھائی اور وہ ایک اکیلی لاڈلی بیٹی ہوتی، کوٹھی بنگلہ ہوتا صوفے اور کوچیں ہوتیں، چاہنے والے چچا اور تریاں ہوتے والی خالائیں ہوتیں .... کاش اس کے گھر میں بھی ایک باغ ہوتا اور وہاں نارنگی اور لوکاٹ کے پھول مہکا کرتے جنہیں توڑنے کے لیے اُس کی انگلیاں حسین اور نازک ہو جاتیں ...... یہ تو اُسے خواب میں بھی میسر نہ ہوا، اُسنے خواب بھی سدا بھیانک اور ڈراؤنے ہی دیکھے، بھوتوں اور چڑیلوں کی دنیا کے۔

وہ بلقیس اور جلیس کو لیکر احاطے کے ایک سنسان کونے میں چلی گئی، یہ کونا بھی کوڑے کرکٹ، ٹوٹی ہوئی اینٹوں، بوسیدہ ڈلیوں اور ٹوٹی ہوئی جھلنگوں سے پٹا پڑا تھا، مگر بلقیس بڑی بے تکلفی سے دلیز پر اخبار کا کاغذ بچھا کر بیٹھ گئی۔ جلیس نوری کے رومان سننے اور املیاں بیننے چلی گئی۔

گھنٹوں سر جوڑے وہ نہ جانے ایک دوسرے کو کیا باتیں بتاتی رہیں۔ بلقیس نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح تندہی سے شادی کی تیاریوں میں لگی ہوتی ہے اور وہ تمام تیاریاں یہ تھیں کہ اتنے ڈھیر سے لڑکوں میں سے زندگی کا ایک ساتھی چننا تھا اتنے جنوں میں سے ایک کو چن لینا اور باقیوں کو مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح جھاڑ دینا۔ بلقیس جیسی جذباتی لڑکی کے لیے کتنا مشکل تھا۔

"آخر تمہیں محبت کس سے ہے؟"

"محبت جو سچ پوچھو تو مجھے عباس سے ہے، بچپن سے ہم ایکدوسرے کو جانتے ہیں اور ہمارے خیالات بھی ایک جیسے ہیں۔"

"چہ...... جھوٹی! پہلے کہتی تھی میں انصار پر مرتی ہوں، بڑا قوم پرست ہے،"

یہ ہے، وہ ہے، شمّن نے چڑ کر کہا۔

"ہے تو وہ قوم پرست مگر بہن پر کچھ بتاؤ گذر کیسے ہو سکتی ہے اسکی؟ بھئی بات یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو مجھے سوسائٹی پسند ہے۔"

"بلقیس حد مکار ہو تم بھی، محبت میں تو انسان ان باتوں کو سوچتا بھی نہیں۔"

"مگر اصل میں تو مجھے اختر ہی سے زیادہ محبت ہے۔"

"ہنہ اختر سے یا اسکی نئی موٹر سے۔"

"یہ، بھئی تم تو بے وقوف، موٹر اسکی خاک پسند نہیں، خدا قسم موعی کی موٹر دیکھو تو بس مر جاؤ۔"

"تو پھر محبت؟"

"محبت تو ——— غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر ...."

"مگر؟"

"مگر شادی تو امیر ہی سے کرنا پڑتی ہے .... کیوں ہے نا بھئی؟"

"کیوں؟ یہ تو بالکل رنڈیوں جیسی بات ہوئی۔"

"ہشت، رنڈیوں جیسی کیوں ہوئی، اور اگر ہے بھی تو کیا ہوا نہیں شمّن ایک ہی تو بات ہے۔"

"کیا؟"

"ہاں بھئی، دیکھو .... آپ جیسے .... اُنہہ بھئی مجھے نہیں معلوم تم تو بحث کرتی ہو، چہ توبہ ہم کیا باتیں کرنے لگے .... شمّن کل میں نے نماز پڑھی تھی۔"

"اچھا ......؟"

"ہاں اختر نے کہا تھا میں شلوار قمیص میں بالکل لیلیٰ معلوم ہوتی ہوں، وہ میرا کالا شفاں کا ستاروں والا دوپٹہ ہے میں نے ایرانیوں کی طرح لپیٹ کر اوڑھا کہنے لگا ...... وہ کچھ رُکی۔

"کیا کہنے لگا؟"

"کہنے لگا لاؤ تمہاری تصویر کھینچ کر دیکھیں میں بھیجوں گا......... میں نے کہا جائے نماز پر کھڑی ہو جاؤں تو زیادہ اچھی رہے گی......... مگر شمن تو کھڑی ہو کر حد بُری لگی تو میں بیٹھ کر دُعا مانگنے لگی......... تصویر کھینچ کر...... ہی...... ہی" وہ ہنسی۔

"کیا؟ کیا؟"

"وہی کمبخت پیار کر لیا" بدتمیز کہیں کا؟ بلقیس بن کر شرمانے لگی۔ دونوں ہنس رہی تھیں، کہ اعجاز خاص معشوقانہ انداز سے ریکٹ گھماتا ہوا برآمدے میں آنکلا۔

"اوہ؟ معاف کیجئے گا" وہ جلدی سے مڑ کر جانے لگا۔

"حد!!!"

"کون تھا یہ؟ ہائے بالکل فریڈرک مارچ کی سی شکل ہے۔" بلقیس نے زور سے شمن کا بازو مسل کر پوچھا۔

"ہے ایک، ہمارا رشتے کا بھائی۔"

"اچھا؟ بے ایمان کہیں کی۔"

"واہ!" شمن مسکرائی۔

"جان سے خدا قسم شرطیہ تم مرتی ہو اس پر۔"

"ہنہ، کبھی بھی نہیں"

"ہائے بڑی بدمذاق ہو، خدا قسم ہ......... وہ دیکھو اِدھر ہی دیکھ رہا ہے تمہیں گھور رہا ہو گا۔" وہ پھر اترائی۔

"چپ گدھی کہیں کی۔" شمن نے اس کے خوب چٹکیاں لیں، کوئی نامانوس سی چیز دل میں کلبلائی مگر وہ جھلاتی ہی رہی۔

جب بلقیس اور جلیس جانے لگیں تو اعجاز پھر باہر نکل کر کسی نوکر سے فضول باتیں کرنے لگا۔ جب اُن کی موٹر چلی گئی تو وہ شمن کی طرف مڑا وہ جلدی سے اندر چلی آئی۔

شام کو کھانے کے وقت اعجاز جان بوجھ کر اس کے پاس گھس کر بیٹھا بھی

بلقیس کی باتیں سُن تو نہیں لیں بدذات نے؟ دو چار میٹھی باتیں بھی کرنے کی کوشش کی۔ مگر شمن نے کسی بہانے سے اُٹھ کر جگہ بدل لی۔ وہ پان لگا رہی تھی کہ پاس آ بیٹھا۔

"ایک ہمیں بھی، پر کہیں منہ نہ کاٹ دینا"..... وہ اترا کر بولا۔ شمن نے جب پان دیا تو اس نے اُس کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی۔ شمن نے جل کر پان چھوڑ دیا۔ یہ فرسودہ رومان اُسے ایک آنکھ نہ بھایا اُسے ان گونگے عاشقوں سے سخت نفرت تھی جن کا دل بولتا ہے پر منہ سے نہیں پھوٹتے۔

"لاؤ میں پڑھا دوں" لیمپ جھکا کر وہ پاس آن بیٹھا۔

"پڑھ چکی" شمن نے شرارت سے کتاب بند کر دی اور جوتا پہنتی چل دی۔ خوب اُس کی چالوں کو پہچان رہی تھی، وہ آج پھر وہی پرانا بھوکا اچھو معلوم ہو رہا تھا اور ارد گرد ایسا منڈلا رہا تھا۔ جیسے گوشت پر چیل۔ شمن جان جان کر اُسے دُھتکار رہی تھی، اعجاز کو پیاسا ہانپتا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ترس محسوس کر رہی تھی

دو دن تک وہ ترستا رہا۔ مگر شمن نے اُسے بولنے کی مہلت نہ دی۔ مگر رات کو جب سب کچھ سو چلے تھے وہ باہر سے کسی بہانے سے آیا پہلے تو وہ حسب عادت دکھانے کے لیے کچھ ڈھونڈتا رہا پھر پانی پینے لگا رک رک کر اُس نے پورا گلاس چڑھا لیا۔ شمن، ہنسی دبائے خاموش پڑی رہی وہ مڑا تو شمن نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ وہ واپس لوٹا۔

"شمن" اُس نے آہستہ سے پکارا۔

"یہاں بیٹھ جاؤں" قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اعجاز پلنگ کے کونے پر بیٹھ گیا۔

"شمن ایک بات کہوں؟..... کئی دن سے....." اس کی آواز اٹک گئی۔ شمن کے ہاتھ پیر سُن ہونے لگے جملہ حواس ایک نقطے پر جمع ہو کر کھنچنے لگے، اُس نے سانس روک لی۔

تم جانتی ہو دو سال کی ٹریننگ اور ہے اور پھر کسی اچھی جگہ پوسٹ ہو جاؤں گا چچا میاں کی جائداد بھی کافی ہے مگر میں سوچتا ہوں شملہ پر ایک کوٹھی خرید لی جائے تو"

"کوٹھی اور باغ...... نارنگی کی کلیاں......" شمن کی انگلیاں اینٹھنے لگیں

میرے خیال میں میری حیثیت کا انسان ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے ناموزوں تو نہیں ...... ٹھیک ہے نا۔"

"اعجاز" اس نے سانس پھیپھڑوں میں گھونٹا۔

"ہاں شمن...... یہ لوگ تو جاہل ہیں...... کچھ نہیں سمجھتے" احساس کمتری ہے اور کچھ نہیں" تو بس اب تمہارے ہاتھ میں ہے سب کچھ۔"

"میرے...... میرے ہاتھوں میں......" شمن نے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں تاکہ وہ نامعلوم سی دولت کہیں رینگ نہ جائے۔

"وہ تمہاری دوست ہے نا......"

"ایں؟" شمن نے مضبوطی سے ٹیوب میں ہوا روک دی۔

"ہاں...... بلقیس تمہاری پرانی دوست ہے...... تم چاہو تو شادی کروا سکتی ہو۔"

"مگر......"

"بھئی دیکھو بہانے مت بناؤ، ہماری بھنو کیسی، خدا قسم جو تم کہو گی...... وہ تمہیں ہارڈی کا جھڑنے والا پورا سیٹ پسند ہے نا......"

"مگر......" اس نے اُسے روک کر کہا۔" بلقیس کا ٹیسٹ بہت اونچا ہے...... معاف کرنا اجو......" وہ بضد ہو کر بولی" وہ ذرا اور قسم کی لڑکی ہے"

"مگر شمن...... میں کافی آزاد خیال ہوں......"

"میرا مطلب ہے آجکل لڑکیوں کو آزاد خیالی سے زیادہ کلچر چاہیے……"

"تو……"

"اور وہ خاندان دیکھتی ہیں معاشرت دیکھتی ہیں، بلقیس کے اُمیدوار زیادہ تر نوابوں ہی کے خاندان سے ہیں۔ دوسرے تم سوچتے ہو یہ تمہاری جائداد بہت ہی زبردست ریاست ہے کہ……"

"میں یہ تو نہیں کہتا……" اعجاز کی آنکھوں میں اُسے بھوک اور شکست جھلکتی نظر آئی۔

"فضول بکواس ہے۔"

اعجاز سر جھکائے چلا گیا، وہ خاموش بے حس و حرکت پڑی رہی…… کچھ نہ سوچا، اُسے تو بس ایک احساس تھا کہ اُس نے نارنگی کے جھاڑ میں ہاتھ ڈالا اور کسی زہریلے ناگ نے پھن مار دیا۔ زہر کی طرح کوئی چیز سنسناتی لہراتی اسکے دماغ کی طرف چڑھی چلی گئی جسے جھٹکنے کی بھی اُس نے کوشش نہ کی۔

کیا اُسے اجو سے محبت ہو چلی تھی؟…… چہ، توبہ کیجیے، اس واہمے کو سوچ کر وہ ہنس پڑی۔ پھر؟ اُس نے اس کا جواب پانا ضروری نہ سمجھا۔

اعجاز کے جانے سے پہلے ان کی شادی کی ذکر چھڑا، وہ کچھ دل برداشتہ سا رہا چونکہ شمن کے والد نے اس کی پرورش میں کافی پیسہ خرچ کیا تھا اس لیے پہلا حق تو انہیں کو پہنچتا ہے اس سے قبل کہ کچھ اعجاز سے کہا جاتا اُس نے فوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے، جھگڑے اُٹھے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونگ رچے مگر کالج جا کر اُس نے صاف صاف انکار کر دیا اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا۔ اعجاز کچھ کھسیانا اور متحیر سا رہ گیا۔ بلقیس کا ذکر اُس نے کسی سے نہ کیا…… اور شمن؟ نڈر لگا کر اُس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا۔ بغاوت اس کی رگ رگ غرور سے پھڑک اُٹھی۔ اُسے خود اپنی دلیری پر حیرت ہونے لگی۔

(اُس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا' دل توڑ دیے اُمیدیں خاک میں ملا دیں'
اوہ کتنی ظالم تھی وہ؟

۲۷

ایلما کو دیکھ کر تو وہ اس سے لپٹ ہی گئی، اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے رکھے تو وہ دوزخ کی آگ میں سے بھی مسکراتی ہوئی گذر جاتی۔ وہ اس دفعہ ایک تحفہ لائی تھی نا ایلما کے لیے ایک باغی کی گود میں وہ ایک نیا باغی ڈالنے لائی تھی۔ ایلما نے اپنی جادو بھری آنکھیں اسکی نڈر آنکھوں میں ڈال دیں اور مسکرا اٹھی۔

"کیوں؟" اس نے صرف اتنا پوچھا۔

"میرا دل!" بجائے لمبی چوڑی تفصیل کے نئے باغی نے پیر جمائے میدان میں۔

Good ایلما نے مسرت سے جھوم کر کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو، کسی کو ہم سے "کیوں" کہنے کی جرأت ہی نہ ہونا چاہیے۔ آؤ چلو" گرد نے چلنے کی بات پکڑ لی۔

اُسی دن ایلما نے اُسے یونیورسٹی کے یونین کے صدر اور سکریٹری سے ملایا۔

بہت تیزی سے شمن نے دنیا کے اُس رُخ کو دیکھ لیا جہاں انسان اپنے گھونگے جیسے خول سے باہر نکل کر اپنے وجود کے سوا بھی کچھ دیکھتا ہے۔

وہ ایلما کے کمرے میں گئی تو ذرا دیر کو ٹھٹک کر رہ گئی، اسکے پلنگ پر یونین کا پریزیڈنٹ افتخار لیٹا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا وہ جھینپ کر لوٹنے ہی والی تھی کہ ایلما سر پر تولیہ کو صافے کی طرح لپیٹے غسل خانے سے نکلی۔ شمن کا تعارف کرایا گو وہ افتخار سے اچھی طرح واقف تھی مگر بات چیت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایلما بال سکھانے لگی اور شمن سے چائے بنانے کو کہا۔

"دودھ بالکل نہیں، شکر ایک چمچہ۔" افتخار نے تکیہ پر سر گھما کر حکم دیا۔

"یہ سٹرٹی چائے میں دودھ نہیں لیتا، بلکہ نیبو نچوڑ لیتا ہے۔" ایلما نے تشریح کی۔

"نیبو"

"جی ہاں۔ آپ نے کبھی نہیں پی روسی چائے۔" افتخار نے بات اٹھالی۔

"روسی چائے"

"ہاں روسی چائے میں نیبو ڈالتے ہیں، آپ بھی آزمائیے، بڑی مزے دار ہوتی ہے۔" شمن نے ہچکچاتے ہوئے نیبو اٹھا کر پیالی میں نچوڑ لیا۔

"اور لوگ تو ابھی تک آئے نہیں۔ سٹیل سیدھا وہیں پہنچ جائیگا۔" یونین کے آزاد اور ترقی پسند گروپ کی میٹنگ پکنک کی صورت میں کھلے میدان میں ہونا قرار پائی تھی۔

"کیا مس بوگا بھی چلے گی؟"

"تو! مس بوگا نہ چلے گی تو پھر جا ہی کون سکتا ہے۔ مگر کیوں پوچھا تم نے؟"

"یونہی۔ ایسے ہی، بات یہ ہے کہ مجھے کمبخت سے نفرت ہے، عورت ہے کہ..."

.... وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر تیزی سے بولا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا جو ہم کسی طرح اسے بھولے سے چھوڑ جاتے۔"

"ارے وہ اپنی موٹر سائیکل پہ دندناتی چلی جائیگی۔ تم نے دیکھی نئی موٹر سائیکل لی ہے اس نے۔"

شمن بڑے انہماک سے چمچ چلا رہی تھی افتخار نے اُسے غور سے دیکھا۔

"یہ اب چینی گھل رہی ہے" وہ ابود سے اشارہ کر کے بولا۔ "میرا مطلب ہے پیالی کی چینی کب تک چلائیں گی، کچھ دیر میں پیندے میں سوراخ ہو جائیگا۔" ایلما نے دانت چمکا کر اپنی مخصوص ہنسی اگلنا شروع کی اور شمن نے جھینپ کر بڑا سا گھونٹ چڑھا لیا۔ زور سے اُبکائی آئی اور وہ منہ پر رومال رکھ ہچکیاں لینے لگی۔

"یہ...... یہ چائے؟" نیبو سے دودھ پھٹ کر گدلے رنگ کے لوتھڑے چائے میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔

"خوب اچھی دودھ ڈالو تو نیلو نہیں نچوڑنا چاہیے" افتخار نے اسکیلیے نئی چائے بنائی" رسکی چائے پینے کیلئے مذاق ہونا چاہیے۔

چائے پی کر گروہ کے گروہ شہر کی حدود سے باہر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہوگئے کچھ تانگوں میں اور کچھ سائیکلوں پر لڑکیوں کو بٹھاتے چل دیے راستے میں مس بوگا اپنی نئی موٹر سائیکل پر سیتل سنگھ کالج کے مشہور کھلاڑی کو بٹھائے سب کی آنکھوں میں دھول جھونکتی نکل گئیں۔

آسمان گہرا لاجوردی اور شفاف تھا معلوم ہوتا تھا گاڑھی گاڑھی وارنش کی ہوئی ہے۔ خشک ہوا موسم خزاں کی نیم مردہ پتیوں کو اِدھر سے اُدھر گھسیٹتے پھر رہی تھی گو ہوا ہلکی پھلکی اور نرم پڑ گئی تھی مگر اس کا ہر طمانچہ جسم میں زندگی دوڑا رہا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے گچھے چھدرے پیڑوں کے نیچے بے تکلفی سے بکھر گئے دو مخالف عناصر کے لطیف اور اچھوتے ملاپ سے فضا میں بہار رچی ہوئی معلوم ہوتی تھی مردانہ آوازیں زیادہ بھاری بھرکم اور لڑکیوں کے قہقہے زیادہ سریلے ہو گئے تھے۔

لڑکیوں کی تعداد قدرتی طور پر محدود تھی لہٰذا ایک ایک لڑکی بطور تبرک ہر گروپ میں بانٹ دی گئی یوں ایلما سے جدا ہو کر شمن ایک بالکل نئے اور چھٹتو قسم کے غیر دلچسپ گروہ کے ہتھے چڑھ گئی قدم پھونک پھونک کر نہایت عالمانہ اور شستہ گفتگو شروع ہوگئی، اور بہت جلد سب کی قابلیتیں جواب دے گئیں۔ بے طرح دم گھٹنے لگے۔ اِدھر اُدھر کے گروہ میں یونیورسٹی کے چنے ہوئے موتی جگمگا رہے تھے ان کی آب و تاب دور ہی سے لوگوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی، ایک طرف مس بوگا چند بے فکروں کے جماؤ میں اپنی کھردری آواز میں انگریزی کے مزاحیہ گیت گانے کی کوشش کر رہی تھیں، تالیاں بجاتے میں ان کی باہوں کا پلپلا گوشت تھل تھل ہل رہا تھا۔ ایک جھاڑی میں آدھا گھسا ہوا افتخار سب سے الگ چیونٹیوں کی قطاروں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا گویا وہ آیا ہی اس غیر

ضروری کام کیلئے تھا۔ شمن کے ساتھی جن میں سے اکثر ایلما کے پرستار تھے بے چینی سے اس کے قرب میں پہونچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مگر ظہور اپنے شمن ہی کو بھگت رہے تھے۔ ورنہ ان کے دل تو ایلما اور مس ہوگا کے قہقہوں کے سُر تال پر ناچ رہے تھے۔

شمن کو اس گھٹے ہوئے سکون سے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود بھاگ کر ایلما کے قرب میں پہنچ جاتی۔ یا کم از کم یہی معلوم کرتی کہ افتخار جھاڑی میں الجھا ہوا کون سے معمے سلجھا رہا تھا۔ ساتھیوں کی بے وقوفانہ خاموشی سے وہ جی ہی جی سلگ رہی تھی۔ فضا نہ جانے کتنی دیر کند رہتی۔ اگر ستیل اور ایلما میں پُر جوش جنگ نہ شروع ہو جاتی۔ ستیل ایلما کا برابر کی جوٹ کا مقابلہ تھا گو ایلما اُس سے ہر میدان میں ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی تھی، پھر بھی وہ جب بھی مڑ کر دیکھتی اسے جیتا ہوا پاتی۔ ان دونوں میں قابلِ رشک نفرت تھی۔ اگر ایک دن تھا تو دوسرا رات، جتنی ایلما پُر اسرار تھی اتنا ہی ستیل چٹیل میدان کی طرح بے لذت! ایلما انتہا کی تلخ اور تیز، ستیل حد درجہ بے فکر اور مسخرہ! کرکٹ کے علاوہ انگریزی شاعری میں بھی ٹانگ اڑی ہوئی، اور یہاں اسکی ایلما سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ ستیل کے بازو گوریلے کے سے اور سینہ گینڈے کا سا لیکن دماغ اونٹ سے بھی بدتر۔ وہ شاعری سے اتنا ہی دور رہے جتنا ٹیگور گلی ڈنڈے سے۔ اس لیے ہر موقع پر ہر جگہ دونوں ایک دوسرے کی کاٹ کرتے۔ زبانیں دونوں کی تیز تھیں لہٰذا لوگ بے چینی سے ان دو متضاد عناصر کے ٹکرانے کا انتظار کرتے۔

آج ایلما ہندوستان کی آبائی غلامی اور ناداری کا علاج واحد ایک سرے سے عام تباہی اور قتل تجویز کر رہی تھی۔ اس کی رائے تھی کہ اس سسکتی ہوئی قوم کو آبِ حیات نہیں بلکہ زہریلی گیس ملنا چاہیے۔ تاکہ ایک بار بالکل نام و نشان مٹ جائے۔ طاعون کا علاج کیلشیم کے انجکشنوں

سے نہیں بلکہ لوہے سے داغنے سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ صدیوں کا سمویا ہوا زہر
تریاقوں سے نہیں بلکہ زہر ہی سے نچوڑا جا سکتا ہے۔

ستیل پتے تلے مہذب جملوں میں لُٹے سے ایک نیم حکیم خطرۂ جان سے تشبیہہ دے رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر نہیں جو علاج نہ جانے۔

"وہ ڈاکٹر نہیں گدھا ہے جو ایک عضو کے سڑ جانے پر اُسے جڑ سے کاٹنے کے بجائے زمبک کی مالش تجویز کرے۔ یہ صدیوں کے بجھاتے ہوئے کیڑے عبث ہے ان میں جان ڈالنے کی کوشش کرنا، مٹی کا تیل چاہیے تھوڑا سا۔"

"وہ بے جان تو نہیں ہاں کمزور ہیں۔"

"تو کرکٹ کھلانی چاہیے ان سب کو" ایلما کے حلق میں قہقہہ پڑا۔

"ہاں، اور تھوڑی سی شاعری کی خوراک ....." سوائے مس بوگا کے کسی نے داد نہ دی۔ اُن کی ہنسی میں وہ جھنکار تھی کہ سب کے قہقہے ماند پڑ جاتے۔ ایلما اُسے مادۂ حرخ کہا کرتی تھی، وہ زندگی کو ہلکے پھلکے غبارے کی طرح ہوا میں لہراتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ اب ایک نئے تیسرے مضمون میں ایم۔ اے کر رہی تھیں اور اُن کے رویّے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کے ہر مضمون کو لیکر ایم۔ اے کر ڈالیں گی۔ مگر ایلما کا خیال تھا کہ علم سے زیادہ انہیں کالج کی ایک عادت سی پڑ گئی تھی یونیورسٹی کی چہار دیواری کے باہر اُن کی زندگی صفر کے برابر ہو جاتی تھی۔ سوائے پروفیسروں اور کالج کے لڑکوں کے اُنہیں کسی سے بات کرنی بھی نہ آتی تھی، اُنہوں نے بہت چاہا کہ نئی زندگی کی عادت ڈالیں، کہیں نوکری کر لیں۔ مگر گاڑی نہ چلی۔ "تانگے میں جتنے کا عادی ٹٹو کھلے میدان میں کلیلیں کرتے شرماتا تھا۔" یہ نہیں کہ وہ پیدائشی بدشکل تھیں، اور سوائے کالج کے اُن پر کوئی لٹو نہ ہوا۔ بلکہ وہ خود باوجود کوششوں کے کسی پر لٹو نہ ہو سکیں۔ لکچر ہال، لائبریری، ریڈنگ روم، بورڈنگ کا کھانا، آئے دن نئے نئے انسانوں کا داخلہ اور اخراج انہیں اس کی ایک لت پڑ گئی تھی وہ ہر نو وارد پر قابض ہو جاتیں اُسے ساتھ لیے لیے تمام اصول اور یونیورسٹی کے عجائبات سے دوچار کرائیں بالکل تشبیہ

ایک محبت کرنے والی ماں کی طرح وہ ان کو چھوٹی موٹی پریشانیوں اور پڑلنے اور شریر لڑکوں کی بدمعاشیوں سے بچا لیتیں۔ عباس ایک بالکل تازہ فرسٹ ایرفول کو تو وہ بالکل پوٹے تلے چھپائے رکھتیں۔ لیکن ہر نیا شکار کچھ دن بعد الٹا شکاری بن جاتا، اُن کے دستِ شفقت کی گرمیوں سے اکتا جاتا اور الٹا انہیں منتق ستم بنا ڈالتا۔

جنسی اعتبار سے وہ ایک عجیب و غریب معمہ تھیں۔ سُنا ہے جب وہ سائنس میں ریسرچ کر رہی تھیں تو پروفیسر رستم سے ان کی بڑی راہ و رسم تھی یہاں تک کہ وہ بارہ بارہ بجے تک بیٹھی سائنس کی گتھیاں سلجھایا کرتیں لیکن ایکدن جب مشتاق پروفیسر نے جو انہیں نہایت ہی دقیق گتھی سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے تیزاب سے انہیں اندھا کرتے کرتے چھوڑا۔ اب تک ہنسے سے سہمے ہوئے بچے کی طرح اس حادثہ کی تفصیل بیان کرتیں، اور اس بھولپن سے لڑکوں کے ہر سوال کا جواب دیتیں کہ وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتے۔ وہ ذرا بھی نہ جھینپتیں اور پروفیسر کی دست درازیوں کی تشریح عملی حرکتوں سے کرتی جاتیں۔

ایلما کہتی تھی کہ افتخار بھی کسی زمانے میں اُنکا چہیتا تھا مگر اُسے اُن سے اس دن سے نفرت ہو گئی جس دن انہوں نے عشق و محبت کا کچھ عجیب بھونڈے اور گھناؤنے پن سے ذکر کیا۔ وہ سہم کر رہ گیا۔ ورنہ یہی افتخار گھنٹوں ان کے کمرے میں لیٹا رہتا۔ وہ سوئٹر بنا کرتیں اور افتخار اُن کے زانو پر سر رکھے پڑا رہتا۔ وہ اُسکی دست درازیوں کو غلطیاں سمجھتیں اور اشارے کنائے کو بھولپن!

آج کل وہ بڑے زور و شور سے ستیل پر کرم فرما تھیں دو سوئٹر بن کر دے چکی تھیں اور وہ دن بھر موٹر سائیکل پر لادے پھرتیں اُس کی ہر بات پر "وَنڈر فل" اور "چارمنگ" کہتیں۔ گو ایلما سے اچھے خاصے تعلقات تھے مگر ستیل کی دیکھ بھال اپنا فرض سمجھتیں۔ جب ستیل نے ایلما کے باغیانہ خیالات کا مذاق اڑایا تو وہ جوش سے چیخ پڑیں اور جب ایلما کوئی بجھتا ہوا جملہ کہہ دیتی تو وہ ستیل

کو پیٹ ہوئے بچے کی طرح چمکا رتیں۔ جبس پر اُس کا مُنہ سُرخ پڑ جاتا لڑکوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اُسے گود لینے والی ہیں۔ اور گجرات میں جو اُن کے پاپا کی کپڑوں کی ملیں ہیں، وہ سب اسی کو ملیں گی۔ خوب!

سیتل نے ہارتے ہوئے پہلوان کی طرح ٹینٹوے پر حملہ کیا۔

"عورت کو سیاست سے کیا تعلق ...... اس کا تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ ......" ایلما کی آنکھیں نفرت سے چمک اٹھیں۔ وہ سیتل کے اس حملے کے آگے کچھ بے دست و پا ہو جاتی۔ مگر قبل اس کے کہ سیتل عورت کے اس ایک مصرف کی تشریح کرتا افتخار نے آ کر محفل درہم برہم کر دی۔ افتخار کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ سیتل کا وجود چاند کی طرح پھیکا پڑ جاتا۔ وہ کبھی افتخار سے نہ اُلجھتا بلکہ فخریہ ہار مان لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ

[illegible]

افتخار نے فوراً نہایت تندہی سے آنکھ مچولی کا پروگرام بنا ڈالا۔ ایک لڑکے کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور باقی سب گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ نیا اور شرمیلا لڑکا ذرا سی دیر میں تختۂ مشق بن گیا۔ گھنٹوں چکراتا رہا کوئی ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصے میں مِس بوگا مسرت سے چیختے چیختے بالکل بدحواس ہو چکی تھیں۔ تالیاں بجا کر اور ہنس کر وہ کھیل کو لمور تماشہ بنائے دیتی تھیں۔ پسینے میں تر بتر اور مُنہ تازہ سِنکے ہوئے کیک کی طرح تمتمایا ہوا تھا، ڈھیلے برہنہ بازو جن پر بھورے تل چھاپے کی طرح جمے ہوئے تھے ہوا میں بات بے بات اچھل رہے تھے۔ باڈی کے بند کھِسل کر کندھوں پر سے نیچے آ رہے تھے۔ اور ساڑھی اونچی نیچی ہو گئی تھی۔ جب اُن کے بتائے ہوئے داؤں پیچ لگا کر بھی وہ لڑکا کسی کو نہ پکڑ سکا تو وہ لوگوں کو جان بوجھ کر چور بن جانے کی رائے دینے لگیں۔

"او افتخار! آنا آگے کو۔ تو کیوں دُبکا ہوا ہے۔ تھک گیا بیچارا ہمارا سیتل سنگھ اب بھی تیری باری، تو بن چور۔"

جب کسی نے نہ سُنا تو وہ کھیل کے تمام اصول توڑ کر چور سے بغل گیر ہو گئیں

چور نے اُنہیں فوراً بوجھ لیا، اور غریب پر اس معنی خیز قہقہے نے گھڑوں پانی الٹ دیا جو اس کے دوستوں نے اُس کے حالِ زار پر لگایا۔

مس بوگا نے جھلا جھل کر پٹی بندھوائی اور تتلا تتلا کر ہر ایک کو پکارنے لگیں۔ لیکن بےچاری کی خوشی نہایت مختصر رہ گئی۔ کیونکہ افتخار نے فوراً آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پکڑوا دیا۔ کھسیانی ہو کر وہ اُسے تھپڑوں سے مارنے لگیں اور ہنستی ہوئی پھر تماشبینوں میں آن ملیں۔ کھیل بدمزہ ہو کر مصیبت بن گیا۔ کیونکہ افتخار جب کسی کو پکڑتا جان بوجھ کر اُس کا نام نہ بتاتا اور سزا کے طور پر پھر چور بنتا۔ اگر اُس کے بجائے کوئی اور ہوتا تو نہ جانے کیا گت بنتی۔ مگر لوگ نہایت خندہ پیشانی سے ہنس رہے تھے۔

شمن کھیل سے بےتعلق، نہ جانے کدھر دیکھ رہی تھی اور کیا سوچ رہی تھی۔ کھیل سے ذرا ہٹ کر ایلما کھڑی سیتل کے لمبے چوڑے جسم کو جو سوکھی پتیوں پر لیٹا انگڑائیاں لے رہا تھا ایک عجیب نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سیتل نے کچھ کہا اور ایلما کے زہریلے دانت بھیڑیے کی دھار دار بجلیوں کی طرح چمکنے لگے۔ سیتل نے اس کی تلخیوں کا جواب ایک طنزیہ مسکراہٹ سے دیا اور اپنے بھاری جسم کو بیلن کی طرح پتیوں پر لڑھکا دیا۔ کراری خشک پتیاں چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح چٹک کر خاموش ہو رہیں۔ ایلما نے اس ہتک آمیز لتاڑ سے کھسیا کر زمین سے ایک مٹی کا ڈلا اٹھایا اور زور سے سامنے پیڑ کے تنے پر کھینچ مارا۔ سیتل نے بروقت قہقہہ لگایا اور ایسا معلوم ہوا وہ قہقہہ اس ڈھیلے میں چھپا بیٹھا تھا اور باریک ذرّوں کی شکل میں فضا میں بکھر گیا۔

شمن زور لگا کر اپنا بازو چھڑانے لگی بےخیالی میں اس نے دیکھا بھی نہیں اور افتخار نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ ایسی بُری طرح بھڑکی جیسے سچ مچ کے چور نے دبوچ لیا ہو۔ افتخار کی انگلیاں رسّی کے پیچوں کی طرح اور مضبوط ہو گئیں۔ وہ چھوڑنے والا آدمی نہ تھا۔ غل مچا کر بےانصافی اور بےایمانی کی دہائی دینے لگا۔ ساتھ ہی مس بوگا پر تالیوں اور چیخوں کا دورہ پڑ گیا۔ شمن کو مجبوراً خاموش کھڑے ہو کر اپنے

آپ کو چھوانا پڑا۔ حالانکہ افتخار اُسے فوراً پہچان گیا تھا مگر بن ٹھن کر وہ اٹھلاتے ہوئے چلا گیا۔ ناک کو ہاتھ، ہاتھ کو پیر بتا کر سب کو خوب ہنسایا، خصوصاً مس بوگا تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

"ارے سچ بتائیے یہ ہمارے ہی گروپ کا کوئی آدمی ہے یا........"

"جی........ ابھتکھار جی۔ ہی ہی" مس بوگا اپنی جگہ پر دونوں پیروں پر پھدک رہی تھیں۔

"ارے مونچھیں! نہیں مونچھیں نہیں....... کون ہو سکتا ہے؟ سیتل عباس قادری.........؟ دت؟ وہ اور بنا اور شمن روہانسی ہو گئی۔ افتخار نے پٹی کھول دی۔

"اوہ آپ؟........ معاف کیجئے گا" وہ مضحکہ خیز ادب سے جھکا اور مس بوگا نے پھر ہنسی کی چیخیں ماریں۔

افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ شمن کو جیسے کوڑے کی پوٹلی میں سے نکال کر اونچے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔ یونین کا صدر معمولی ہستی نہیں، اگر وہ کسی میں دلچسپی لیتا ہے تو کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے واپس لوٹتے وقت دس بیس سائیکلیں پیش کی گئیں یہاں تک کہ مس بوگا نے اُسے سیتل کے ساتھ ہی بیٹھ جانے کی دعوت دیدی۔

"ہاں ہاں تم اسکی گود میں بیٹھ جانا" وہ بڑی معصومیت سے رائے دینے لگیں سیتل نے مسکرا کر شانوں کو ایک استقبالیہ جنبش دی اور شمن کا جی چاہا مس بوگا کے ایک زور کی چپت لگائے جیسے وہ اپنے بدتمیز چھوکرے کے گندے گلاس میں پانی پلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔

رات کو شمن ایلما کے ساتھ ہی رک گئی وہ نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتی رہی، گھوم پھر کر سیتل کا ذکر آجاتا اور ایلما دانت پیس کر رہ جاتی۔

"مگر جانتی ہو؟" اس نے بستر پر بیٹھ کر کہا۔

"کیا؟"

یہ......... کہ مجھے سیتل سے نفرت کیوں ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"دنیا میں متضاد عناصر ایک دوسرے کے قرب سے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ پانی کو قریب پا کر آگ اور بھڑکتی ہے۔ سیاہی کو دیکھ کر سفیدی اور زیادہ تندہی سے چمکتی ہے۔"

"ہوں" شمن سوچنے لگی۔

"کیا مجھے سیتل سے محبت ہو سکتی ہے" ویسے ہی پوچھتی ہوں۔

"کیا پتہ ہو بھی جائے۔"

"ہاں شاید، مگر جانتی ہو وہ.......... وہ محبت کس قسم کی ہوگی۔"

"جانے!"

"اسے دیکھ کر دل میں بڑے ذلیل جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے میں ایک گوشت کا حقیر لوتھڑا ہوں۔ جیسے......."

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تم نہیں سمجھوگی۔" تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی آنکھیں کھولتی بند کرتی رہی۔

"شمن....... سیتل کو دیکھ کر......... بدمعاشی کرنے کو دل چاہتا ہے! ہیں نا؟" اس نے ہولے سے کہا۔

"ہٹو....... اللہ نہ کرے۔ نفرت ہے مجھے تو۔" شمن جھجکی۔

"ہاں ہاں نفرت ہی تو ہے......... اونہہ تم نہیں سمجھتیں۔" وہ کچھ اداس ہو گئی۔

"دیکھو....... مگر ہوتا ہے ایسا......... دنیا میں کئی طرح کے انسان ہوتے ہیں کچھ تو ایسے جنہیں دیکھ کر سوئی ہوئی مامتا انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اور کچھ ایسے جن کے ساتھ دو چار باتیں کر کے جی بھر جاتا ہے۔" وہ شمن سے زیادہ

خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

"مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ لمبا چوڑا معاہدہ کر کے ان کے ساتھ لمبا چوڑا سفر کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

"سفر؟ .... کیسا سفر؟"

"زندگی کا سفر!"

"مگر سیتل؟"

"ہاں شہری، اور چند ایسے بھی ہیں جن سے ایک بار تجربے کے طور پر ــــ"

"تو یہ ہے ایلما!"

"اور پھر ان کی صورت سے گھن آنے لگتی ہے، اُن کے تصور سے جی متلاتا ہے" جی چاہتا ہے پھر اُنہیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور بھول جائیں۔"

کمرے کی دھندلی روشنی میں ایلما کا سانولا چہرہ اندھیرے غاروں میں چھپی ہوئی کائی کی طرح بے جان ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں اور بھی غیر مانوس اور بوڑھی ہو رہی تھیں۔

"عجیب لڑکی ہو" شمیؔ نے جیسے خود سے کہا۔

"کیا؟ عجیب لڑکی، ممکن ہے عجیب لڑکی ہوں .... شاید" وہ چپ ہو گئی "شمیؔ" اُس نے پھر کہا "جب میں اپنے دل کو ٹٹولتی ہوں تو وہاں بڑے وحشیانہ خیالات چھپے نظر آتے ہیں جنہیں میں جلدی سے وہیں بند کر کے لوٹ آتی ہوں، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایک دن وہ باہر نکل کر مجھے دبوچ نہ لیں ...... شمشاد! اگر میں اُن بھوتوں کو باہر نکل آنے دوں تو ......"

"کون سے بھوت؟"

"یہی .... یہی جو میرے دل میں اوٹ پٹانگ ناچا کرتے ہیں، مگر بہت بُرا ہوا! .... بہت ہی بُرا۔"

"وہمی ہو تم تو۔ ایلما پاگل کہیں کی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ...... کمبخت سیتل ..."

"نہیں نہیں تم ڈرو نہیں۔ میں جو بات کہہ ڈالتی ہوں کبھی نہیں کرتی، سمجھیں تم۔ جب ایک بار کچھ سوچتی ہوں تو........ اچھا سو جاؤ تم تھک گئی ہو۔"

"نہیں نہیں مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔ کہو تم، دیکھو ایلا تم اس کمبخت سنتیل کے منہ نہ لگا کرو...... نہ جانے کیوں مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر؟ تو تمہیں بھی اس سے ڈر لگتا ہے؟" ایلمانے اس کے پاس جھک کر پوچھا

"اور کیا بھئی، ایسی کمینی آنکھیں ہیں۔"

"ارے پگلی وہ ڈر........ وہ ڈر....... اب کیسے بتاؤں، انہہ تم سمجھتی کیوں نہیں۔" ایلا اس کی کند ذہنی سے عاجز آگئی۔

"اور وہ کیا کہہ رہا تھا، عورت کا ایک ہی مصرف ہے، کیا ہے وہ؟"

"اور وہ یہی مصرف، جو ابھی تم نہیں سمجھتیں، وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ عورت مرد کی دلبستگی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔"

"چہ توبہ! منحوس کہیں کا! تو تمہیں غصہ آگیا تھا۔"

"ایں؟ نہیں تو مجھے اس بات پر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ........ جب وہ لیٹا تھا تو تم نے دیکھا تھا؟"

"کیا؟"

"انہہ اب تمہیں کیسے بتاؤں ہائے توبہ اور اوٹی ڈوٹی کرنے لگو گی، مثلاً ابھی اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس کا........ جو....."

"کیا؟" شمّی نے ڈر کر پوچھا۔

"جنھیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے، مثلاً جیسے افتخار ہے اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے پھر بھی وہ بڑا عجیب، مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میرا پہلا بچہ افتخار کا۔"

"ایلا!" شمّی بے وقوفوں کی طرح سینے میں سانس لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہاں بگلی، اور کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ......وہ"

"مر جاؤ خدا کرے،" تہمینہ بگڑ گئی۔

"لیکن میں ایک لمبے سفر میں اختیار کو نہیں بھگت سکتی"......آآ......

اس نے لمبی سی جمائی لی اور لحاف میں کھسک گئی۔

"تھک جاؤں، میں تو دو دن میں تھک جاؤں گی" اس نے سونے سے پہلے بار بار تھکی ہوئی جمائیوں کے درمیان دہرایا۔

[illegible] اختیار کھو بیٹھے تو ٹھیک [illegible] مگر زندگی کے لمبے سفر میں [illegible] کی رفاقت اتنا ہی [illegible] ہیں۔

۲۸

ایلا کی جیسی بن کر کیلاش ہوسٹل آنا پڑا۔ پرنسپل اس کی گمراہی پر تنبیہہ کر کے ہار گئیں، مجبوراً انہیں درس اخلاق دینے کے لیے اسے نکالنا پڑا۔ آنے سے پہلے کیا کیا منصوبے باندھے تھے کہ آزادی ملی تو یوں گل چھرے اڑائیں گے۔ مگر جب جڑیا کے پر کتر دیے جائیں تو وہ پنجرے کے باہر بھی قید ہی رہتی ہے۔ اور یہ کاٹے ہوئے پر اس جنم میں تو نکلتے نہیں نکلے بھی تو ٹیڑھے بیڑھے! دوسرے جب انسان پہ خود اپنی نگرانی کا بار پڑتا ہے تو وہ بہت کوتاہ نظر ہو جاتا ہے۔ چھپ چھپ کے جھوٹ اور بہانے خود کو دینے میں کیا لطف؟ لکچر میں جانے کا بہانہ کر کے سینما اڑ جانا اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ آزادی سے جلد ہی جی بھر گیا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کو بھی اس کے چال چلن کی فکر نہیں رہی وہ بلا سے کچھ کرے کسی کو کیا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا لوگ اپنے کاندھوں کا بوجھ کھسکا کر آہستہ آہستہ اس کے سر پہ ڈالتے جا رہے ہیں، اوروں کی قید سے چھوٹ کر خود اپنی ذمہ داری کی زنجیروں میں جکڑتی جا رہی ہے اس کی ہستی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک محافظ اور دوسری محفوظ

واہ!

لائبریری سے نکلتے میں سٹیل سے ٹکر ہو گئی! یقیناً اتنا تو غیر مرئی نہیں ہوں کہ دکھائی بھی نہ دوں۔" اس نے مصنوعی جھلاہٹ سے کہا۔ شمن نے حال ہی میں عینک لگانا شروع کی تھی جھینپ کر شیشے رومال سے صاف کرنے لگی۔

"جی ہاں، خوب صاف کر کے دیکھیے، ویسے چھ فٹ کی چیز اتنی باریک تو نہیں کہ خورد بین سے دیکھنا پڑے!"

شمن کو ہنسنا پڑا، اسٹیل بھی ہنس دیا۔ وہ پنسل لینے جا رہا تھا، لیکن اب تو اسکے قلم سے کام چل جائے گا۔ ایلما سچ کہتی تھی کہ سٹیل کے قرب میں انسان گوشت کا لوتھڑا بن جاتا تھا۔ اس نے نہایت بے تکلفی سے اسکے گریبان سے قلم لپک لیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ برا مانتی وہ تیزی سے معافی مانگتا ہوا نوٹ لینے پرلے کونے میں چلا گیا۔ شمن بجی ہوئی شکل لیے دوسرے کونے کی میز پر بیٹھ گئی۔

باوجود کوشش کے شمن سٹیل کے وجود کو نظر انداز نہ کر سکی بار بار اس کی نظر اسی گوشے کی طرف بھٹک جاتی جہاں وہ کچھ کتابیں الٹ پلٹ کر رہا تھا وہ میز پر کہنیاں ٹکائے ہوئے موٹی سی ڈکشنری کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور سوچ سوچ کر کچھ لکھتا جاتا تھا۔ بار بار وہ قلم کو ہونٹوں پر رگڑ کر کچھ سوچنے لگتا اور کتاب پر جھک جاتا، اس کی پھنسی ہوئی سپورٹ شرٹ کھال کی طرح سینے اور شانوں پر منڈھی ہوئی تھی مضبوط گردن ورزش کی وجہ سے آہنی سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی تھی وہ بار بار پہلو بدلتا اس کا کسرتی جسم بالکل اڈونس کے مجسمے کی طرح کھنچا ہوا اور سڈول تھا۔ بھوئیں زیادہ گھنی اور تکونی آنکھیں از حد پھرتیلی اور گہری ہو رہی تھیں، جب وہ ہونٹ اپنے روٹھنے کے انداز میں سکیڑ لیتا تو بالکل ضدی بچے کی سی شکل ہو جاتی۔"

شمن نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی اور نہ جانے کس پر دانت پیسنے لگی۔ سٹیل کے خلاف یہ اسے فضول غصہ کیوں آنے لگا، دھڑکتے ہوئے دل سے ایلما کے الفاظ یاد آ گئے تخیل نے نہ جانے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا کیا منظر دکھا دیے ...... اندھیرے گوشے، سنسان گپھائیں اور دھندلے دھندلے پیڑ ولا کے گھنے جھنڈ ......

سیتل

خزاں رسیدہ پتیوں کی چرمرانے کی آواز........ مگر نہیں تو سیتل کے پہلو بہ پہلو سے میز چرچرائی تھی ــــــ سیتل! سیتل! سیتل! کیوں! آخر کیوں وہ اُسکے دماغ پر چڑھا چلا آتا تھا؟ بغیر قلم لیے وہ لائبریری سے نکل بھاگی اور کامن روم میں جا کر لیٹ گئی۔

سیتل کی طاقت کا راز

لیکن پھر وہ خود بخود ہنسنے لگی، یہ اُسکی کمزوری نہیں، سیتل کی طاقت تھی جو اُسے تھکائے دے رہی تھی، وہی طاقت جو ایک حسن فروش بیسوا میں پاکر اچھے کھلے انسان جنیں سیانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اُس نے اس سے پہلے کسی سے سُنا بھی نہ تھا کہ جیسے فاحشہ عورتیں سینہ تانے کمر لچکاتی ناز و عشوہ کی بجلیاں گراتی لوگوں کو مسلتی چلتی ہیں اسی طرح بعض مرد بھی اپنے جسم کی سستی اور چھچھوری نمائش کیا کرتے ہیں! سیتل کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے "لو دیکھ لو یہ مضبوط پٹھے یہ رانیں یہ چوڑا چکلا سینہ ہے، ہمت نظر بھر کے دیکھنے کی؟" وہ جو بار بار قلم کو ہونٹوں پر رگڑ رہا تھا۔ کیا بھونڈا طریقہ تھا پیغام رسانی کا۔ اُسے گھن آنے لگی۔

واہ!

کمرے میں بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اور عجیب پُراسرار و نرم اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی پردہ ہوا سے لرزتا، روشنی کی ننھی سی کرن سسکیاں بھرتی پھر اُسی خوشگوار تاریکی میں گھل مل جاتی، اس کے دماغ کی رگیں سوکھی پتیوں کی طرح خستہ ہو رہی تھیں، ڈر تھا کہ کہیں ذرا بھی دھیان بھٹکا اور اُن کا چورا ہو جائے گا۔

"ارے آپ یہاں؟" ربڑ کے جوتے پہنے بلی کی طرح چلتا نہ جانے کب کرسی کے پیچھے

تشبیہ

آن کھڑا ہوا۔ شمن اچھل پڑی جیسے وہ بے خبر مزے سے بہار رہی تھی اور کسی نے دروازے چوپٹ کھول دیے، اس نے جلدی سے اپنے حواس سمیٹ لیے اور بیٹھ گئی۔

"یہ آپ کا قلم" اُس نے گال کھجانے کے بہانے اُسے گال سے لگایا، اس کی آنکھوں نے بتا دیا کہ کیوں قلم دیتے وقت اس کی انگلی ذرا زیادہ دیر تک دب گئی، شمن نے گھبرا کر قلم چھوڑ دیا۔

"ارے ہاتھ جل گیا" وہ اپنی بھوری آنکھیں جھپکا کر ہنسنے لگا۔

دور لاپروائی سے مُڑ کر اُس نے ایک پینٹنگ کو دیکھنا شروع کیا جیسے وہ چلتے چلتے رک گیا ہو، پاس رکھے ہوئے اسٹول کا سہارا لیکر دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر شمّن کی طرف مڑا۔

باہر برآمدے میں نوکر چاکر گھوم رہے تھے لائبریری بھی دور نہ تھی لیکن شمّن کا دل ایسے دھڑکا جیسے وہ سُنسان تنہائیوں میں نامعلوم خوف سے بھاگ رہی ہے مگر سب راستے بند ہیں، بڑے بڑے حشرات الارض لمبے چوڑے دہانے کھولے ہوئے چاروں طرف سے لپک رہے ہیں۔ اگر سیتل ایک لمبی سی چھری لے کر اُس کا قیمہ کر ڈالتا تو بھی اسے جنبش کرنے کی سکت نہ آتی...... مگر سیتل اُلّو نہ تھا، اُسے کچے پھلوں سے نفرت تھی وہ نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور پھل کے پک کر رس دار ہو جانے کا انتظار کرتا یہاں تک کہ خود اُس کی آغوش میں رس کی بارش ہو جاتی مجبوراً وہ اُسے چکھ لیتا، بالکل زبردستی کی دعوت سمجھ کر۔

سیتل چلا گیا۔ مگر بڑی دیر تک اُسے وہ مُلّاجی یاد آیا کیے جو بہت دن ہوئے جب وہ اور نوری کھڑکی میں بیٹھی گلی سے جھانکا کرتی تھیں اور پھر حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے گر جایا کرتی تھیں، وہ جلدی سے کامن روم سے بھاگ آئی۔

یونیورسٹی میں دو گروہ تھے، ایک تو پروفیسروں کا چہیتا اور دوسرا ہر دلعزیز، مگر جس کی حرکتوں پر یونیورسٹی کے منتظمین کے علاوہ حکومت کی نظر بھی رہا کرتی تھی۔ اس گروہ کے سردار ایلما اور افتخار تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مفسد اور مکّار تھا۔ اس کی زبان اس قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا مگر جونہی دل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا، بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر میں ختم کر دیتا۔ اسی لیے منتظمین کو ہر معاملے میں اُس کی مدد کی ضرورت پڑتی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے اہم موقعوں پر اسی کی رائے سے مہمان اور صدر چنے جاتے یونیورسٹی کو کوئی بہانہ بھی تو اُسے دفع کرنے کا نہ ملتا تھا، ورنہ وہ تو ہمیشہ کالج کی نگاہ میں چُبھتا نظر آتا۔

صورت شکل سے وہ نہایت معمولی درجے کا انسان نظر آتا تھا عام طور پر

اس پر ایک قسم کی ناسمجھی اور بے وقوفی طاری رہتی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اسکا اصلی چہرہ نہیں تھا۔ اُس کا یہ چہرہ تو بہت تھوڑی دیر کے لیے صرف پرنسپل نے اپنے دفتر کے پرائیویٹ لمحوں میں دیکھا تھا یا کبھی کبھی جب وہ خود کو بھول جاتا تو دیکھنے والے اس کے چہرے سے تکدر ظاہر ہو جاتے۔ اس کے ہونٹ حملہ آور بھیڑیے کی طرح ہونٹوں پر سے کھنچ جاتے اور آنکھوں میں صدیوں کی دبی ہوئی غلامی کی خاموش بغاوت سلگنے لگتی۔ اس کی صحت بھی خراب رہتی تھی اور زیادہ تر کھانستا چھینکتا رہتا تھا

قدرتی طور پر شمّی کی نظر بار بار افتخار کی طرف اٹھتی، گو وہ بہت کم اس سے بات کرتا مگر جب بھی وہ ملتے ایسا معلوم ہوتا وہ ایک دوسرے کو برسوں سے پہچانتے ہیں وہ اس کی ہر بات پر آنکھ میچ کر صاد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی اب وہ مداحوں کے گروپ سے قدم بڑھا کر ممدوح بنتی جا رہی تھی۔ اور نئے انتخاب پر اسے یونین کا کارکن بھی بنا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ خود اعتمادی بڑھ کر کچھ غرور کی حدود کو چھونے لگی تھی۔ اب ایکا ایکی اپنی ہی جیسی مگر زیادہ عقلمند اور ذہین نظر آنے لگی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح مسحور ہو کر اس کی پُر اسرار آنکھوں اور زہریلے دانتوں سے اتنی متاثر نہ ہوتی تھی اُسے خود اپنی ہنسی میں ایک غیر مانوس سی جھنکار سنائی دینے لگی تھی۔ ہاں افتخار اور اس کی کھوئی ہوئی سی جھلاہٹ اُسے اب بھی متحیر کر دیتی تھی۔

اسی زمانے میں الٰہ آباد میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا جلسہ شروع ہو گیا اور بڑے بڑے عہدیداروں کو پیچھے چھوڑ کر نہ جانے کیسے شمّی کا انتخاب نمائندہ جماعت میں ہو گیا۔

افتخار یونیورسٹی کی یونین کا صدر تھا۔ اس کی حرکات و سکنات پر یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کی ہی نہیں بلکہ حکومت کی بھی نظر رہا کرتی تھی۔ بظاہر شکل و صورت سے وہ بالکل ناسمجھ اور کم فہم معلوم ہوتا تھا مگر اور بعض لوگ اسے مفسد اور خطرناک سمجھتے تھے۔ مگر وہ اپنی تیز طرار زبان اور خلوص، چستی اور ہوشیاری سے اشتعال انگیز تقریروں سے مجمع کا رخ [illegible] اور طلباء کے گروہ کا رخ فساد کی طرف موڑنے کی استعداد رکھتا تھا۔ اسکی اس قابلیت کو اپنے من چاہے رخ کی جانب موڑ دینے کی استطاعت رکھنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ اور اسی معجزہ نمائی میں افتخار ماہر تھا۔ صحت کی طرف سے وہ کمزور رہتا اور زیادہ تر کھانستا چھینکتا رہتا تھا۔ [illegible] اور اسی میں اس کی پر اسرار شخصیت اور طاقت کا راز پنہاں تھا۔

شمّی بھی افتخار کی مداح تھی۔ اور نیز یہ کہ اس کی ہر بات پر صاد کرتی تھی۔ گو وہ افتخار سے اس کی ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں مگر جب ملتی تو ایسا معلوم ہوتا گویا صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ نئے انتخاب میں شمّی کو یونین کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ اور اپنی اس قابلیت پر خوش ہو جانے کے احساس نے ہی اسے نہ صرف خود اعتمادی عطا کی بلکہ مغرور بھی بنا دیا۔)

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو رہی ہے۔ لہٰذا لوٹتے میں رک گئی۔ نوری اندر کمرے میں مائیوں بیٹھی تھی۔ شمن کو دیکھ کر وہ اُس سے لپٹ گئی۔ نوری اور شمن ہمیشہ ان منقوعات سر باکے رہی تھیں۔ مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیار اُبل پڑا، بڑی محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔ عام باتیں جو ایک مائیوں بیٹھی ہوئی لڑکی اپنی بچپن کی سہیلی سے کرتی ہے۔ ہونے والے شوہر کے متعلق سنے سنائے افسانے، ساس نند کے ارمان بھرے ڈکھڑے، ٹیکہ، جھومر اور پازیب کا ذکر۔ ماں دادی اور دوسرے رشتہ داروں کی مدد سے اُس نے دور ہی دور سے عشق کر لیا تھا۔ جہیز کی تیاری میں گویا روحانی کورٹ شپ ہو گئی تھی۔ ہر ٹانکے پر دہ ہونے والے میاں کا خیال ایک لڑی میں پروتی جاتی۔ ساس نندوں کا رومانٹک برتاؤ اور دیوری اور جیٹھانی کے ذریعے سے وہ ہونے والے ساتھی کو بخوبی پہچان چکی تھی۔ اُس کی چھوٹی سے چھوٹی ضد اور عادت وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

"اُنہیں مہندی سے نفرت ہے۔ گہرے رنگ سے تو چڑتے ہیں، بڑی خوشامد سے تو سہرا باندھ رہے ہیں۔" وہی عام چھچھورے دولہاؤں کے نخرے، مگر نوری انہیں بے انتہا عجیب و غریب بنا کر سنا رہی تھی۔

"کہتے ہیں گھونگٹ نہیں کاڑھنے دیں گے، بھلا میں بھائی میاں کے سامنے کیسے چلوں گی، میرا دم تو نکل جائے گا۔" اُس نے منگنی کے بعد ہی سے اُسکے تمام رشتہ داروں سے ناطے جوڑ لیے تھے اور انہیں ناموں سے پکارتی تھی جن سے وہ اُن کا ذکر کرتا تھا۔

"روز صبح شیو کرتے ہیں ورنہ ایسے کھردرے گال ہو جاتے ہیں کہ جلا دیں"

وہ ایسے کہنے لگی گویا وہ برسوں سے اُن گالوں کو سہلانے کی عادی ہے۔ تخیل بھی کیا غضب کی چیز ہے جہاں کسی کی رسائی نہ ہو۔ پرندہ پر بھی نہ مار سکے وہاں مزے سے خیالوں کے ہنڈولے میں جھولتے چلے جاؤ۔ منگنی سے پہلے ہی نوری کا پردہ کرا دیا گیا تھا۔ اور اب وہ تین سال انگلینڈ رہ کر آ رہا تھا۔ کوئی پوچھے کہ بخت یہ سب تجھے کس نے بتایا کہ اس کی داڑھی کھردری ہے۔ مونچھیں چبھنے والی ہیں اور ہتھیلیاں چکنی ہیں۔

شمن نے اس سے بالتفصیل نہ پوچھا ورنہ وہ اُسے شادی کے بعد کی اپنی پُرسکون زندگی، بچوں کے پیارے پیارے نام، روزانہ گوشت ترکاری کا حساب کتاب سب کچھ بتا دیتی۔ نہ جانے کب سے وہ زندگی کی اس جمع تفریق میں مشغول تھی، اور پھر سب کا خیال تھا کہ نوری ابھی کم سن ہے۔ بوجھ نہ اُٹھا پائے گی۔ یہ بھولی مائیں اتنا نہیں جانتیں کہ ذرا سی ننھی مُنّی بچی سے بوڑھی دادی بن چکی تھی۔

نوری کو چھوڑ کر وہ دورِ زندگی کے ہیر پھیر پر غور کرنے لگی، یہ لڑکی ذات بھی معمہ ہے۔ چار پانچ سال کی تو بچی ناخنوں جیسی۔ جو دیکھے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ابھی یہ حال ہے تو بڑھ کر آفت کا پرکالہ نکلے گی۔ جہاں دس پانچ سال اور بیتے ایک دم بیٹا گوہ بزرگوں جیسی گفتگو اور طور طریق غائب اس کی جگہ دوپٹہ کہیں ہے تو پاجامہ کہیں گریبان چاک ہے تو جوتی پیروں سے نکلی بھاگتی ہے۔ بات کرتے میں سو بار زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اور ہزار بار چہرے کا رنگ بدلتا ہے۔ کیا نئے الفاظ اور تازہ بصیرتیں اس شدت سے حملہ آور ہوتی ہیں کہ سُدھ بُدھ ہی غائب ہو جاتی ہے یا احساسِ شباب ایک شعبدہ بن کر ہوش و حواس کو معطل کر دیتا ہے۔

نوری خواب بیداری سے جی سیر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سر اپنے بازو سے نہ ہٹایا۔ اس کا نرم گرم جسم، خیالوں سے رنگین چہرہ، اُبٹنے میں بسے ہوئے گیسو۔ وہ خود سے اُسے دیکھنے لگی، عورت! کیا ہی عجیب عورت جو جلوے کی طرح

قاب کی طرح سجا بنا کر کل اک مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔ اسے نہلا دھلا کر عطر میں بسایا جائے گا۔ کہ اگر تھوڑی بہت بساند ہو بھی تو معلوم نہ پڑے، ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا اُن کو چھپانے کے لیے ڈھیر سا مسالہ چھڑک دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح دلہن کو شیرے میں لتھیڑ کر دولہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا۔ اور جب ایک بار نگل گیا تو مہا شیر اپنا ہے، پر وقتی دل کشی دو چار گھنٹوں میں اُتر جائے گی اور دلہن صرف بیوی رہ جائے گی! لفظ بیوی کے خیال ہی سے شمن کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی نوری کے نوجوان جسم سے لپٹے ہوئے درجنوں بچے، اور ہزاروں فکریں جونکوں کی طرح چپکی خون چوستی نظر آنے لگیں۔

"عورت کا صرف ایک مصرف ہے......" اُسے سیتل کے الفاظ یاد آ گئے۔

دفعتاً اُسے الہ آباد کی میٹنگ بھی یاد آ گئی، خصوصاً آخری اجتماع، جو تاروں کی چھاؤں میں الاؤ لگا کر کیا گیا تھا۔ چاروں طرف گچھوں کی صورت میں بیٹھ کر کانا پھوسی ہو رہی تھی، دنیا کے اہم مسائل طے کیے جا رہے تھے، لڑکوں کی بھاری اور مدھم آوازوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی مہین بولیاں روپہلی گھنگھروؤں کی طرح بج رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کی چڑچڑ، بالکل ساز سنگیت کا لطف آ رہا تھا۔ الاؤ دھیما ہو گیا تھا۔ صرف کبھی کبھی جب کوئی گروہ مونگ پھلیوں کی مٹھیاں بھر کر پھینکتا تو ایک آدھ شعلہ لپک اٹھتا۔

اُس دن کتنی نگاہیں اسے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور اس نے بجائے اُن کو جھٹک دینے کے سینے سے لگا کر تھپکیاں دی تھیں۔ اُسے سردی لگی تھی تو کتنے کوٹ اور مفلر اس پر برس پڑے تھے ہر ایک خود دکھ اٹھا کر اس کے قیمتی جسم کو بچانے کی فکر میں تھا نہ جانے اس قربانی میں کیا لطف آ رہا تھا کہ ہر ماتھا جھکا جا رہا تھا۔ اتفاق کہیے یا جو کچھ بھی اس کے ہاتھ میں افتخار کا کوٹ آیا تھا، پہلے تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ سگریٹ کے علاوہ اور بھی بہت سی پریشان کن خوشبوئیں ایک دم دماغ پر چڑھ گئی تھیں شمن نے اوڑھے ہی کون سے ہزاروں کوٹ تھے جو ان خوشبوؤں کو پہچان سکتی۔ اس

چوری چھپے نے چھپے چوری اس دلچسپ کوٹ کی جیبیں بھی ٹٹول ڈالی تھیں۔ افتخار بڑا لاپرواہ تھا، متوں کوڑا بھرا پڑا تھا۔ تمباکو کا چورا، ٹوٹی ہوئی دیاسلائیاں، دو چار پنسل کی چھیلن کے ٹکڑے پروگراموں کے تڑے مڑے پرچے۔ دوسری جیب میں مونگ پھلیوں کے چھلکوں کے علاوہ ایک خط بھی تھا جو وہ الاؤ کی روشنی میں نہ پڑھ سکی اور نہ جانے کیوں اُسے اپنی صدری میں اڑس لیا۔ جلسہ بکھرنے لگا تو وہ افتخار کو ڈھونڈنے لگی۔

حرض میں "— کمال کر دیا آپ نے تو، بھئی میں نے تو سب کی حرض میں دے دیا تھا کوٹ اور آپ قبضہ ہی جما بیٹھیں۔ خدا قسم مرا جا رہا ہوں سردی کے مارے یا تو مجھے بھی لپیٹ لیجئے اسی میں یا........"

افتخار کو بجریاں بکتے دیکھ شمن سہم گئی۔

"لیجئے اپنا کوٹ" اس نے ہمت کر کے کہا۔

"ہیں اور آپ؟ مرنے کا شوق ہے؟"

"میں یہ پہنے ہوں کافی گرم ہے"

"اوہو......... جل گیا میرا ہاتھ تو........." اس نے بن کر صدری کا کپڑا چٹکی سے چھوا

"اچھا اب بنیے مت اور جلدی سے کیمپ میں جا کر بستر میں دُبک جائیے"

"نیند جو نہیں آ رہی ہے میں جا کر اپنا کوٹ پہن لونگی لیجئے"

دونوں کیمپ میں آ گئے اور افتخار نے کوٹ نہ لیا بلکہ اس کی رضائی اوڑھ لی دونوں باہر آ گئے تھے۔

کاہے کی خوشبو ہے؟ افتخار نے بنارسی رضائی کو ناک سے رگڑ کر پوچھا تھا۔ شمن نے نہ جانے کیا جواب تھا۔ ایک بے تکی خاموشی درمیان میں حائل ہو گئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے کا وجود دُبری طرح کھٹکنے لگا۔ افتخار نے سگریٹ سلگایا اور پھر جھنجلا کر مسل ڈالا۔

ہنہ! وہ خطرے سے غرّایا۔

"جی ؟"

"آپ چاہتی ہیں میں چلا جاؤں، یہ سنبھالیے اپنی رضائی"

"ایں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں .... میں ...... بلکہ میرا مطلب کچھ یوں نہیں۔" اُس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں کو بے معنی سی جنبش دی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے بہت پسند کرتی ہو۔"

"یہ ..... میں ؟" وہ چڑ کر ہکلائی۔

"ہاں، اور جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے کھل کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اُسے روک کر بولا، "میں تم سے بہت بڑا ہوں، دنیا بھر کی ٹھوکریں کھائی ہیں بہت کچھ سمجھنے لگا ہوں میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اسلیے ...... تو ...... خیر جانے دو .... تو میں کیا کہہ رہا تھا" وہ ایکدم گم ہو گیا۔

"ہاں اسی لیے تم سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"کہیے!"

"تم بہت بھولی ہو ...... اُس میں کوئی فخر کی بات نہیں۔" اس نے جلدی سے اپنے الفاظ کی تردید کی "معصومیت ایسی دولت نہیں جس پر کوئی اس دنیا میں ناز کر سکے ...... تو میرے خیال میں ....."

"تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ تمنّی خاموش رہی نہ جانے کیوں اُسے تردید کرنے میں احساس کمتری ہونے لگا۔

"اور میری عمر اُسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے، میں نے اتنی بار محبت کی ہے کہ یاد بھی نہیں ماں کی محبت سے لیکر مجھے رنڈیوں فقیرنیوں اور ان سے بھی گری ہوئی عورتوں کی محبت نصیب ہو چکی ...... مگر تم سے جو محبت ...... لاحول ولا قوۃ!" وہ جھلایا "کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے زیادہ کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ نہیں بلکہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں عجیب جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔"

"تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ تم سے لگاؤ پیدا ہوتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔

.... جیسے .... جیسے یوں سمجھو جیسے میں تمہیں اپنا کوٹ دے دوں اوڑھنے کے لیے

تو مجھے یقین ہے کہ وہ محفوظ رہے گا۔" شمن ڈر گئی کہ کہیں اُس نے خط نکالتے دیکھ

تو نہیں لیا۔

"تم اس میں سے کچھ نہ چرا سکوگی۔ برسوں کے لیے بھی اگر میں اپنی محبت مع

تمام رعنائیوں کے سپرد کر دوں تو بھی خیانت نہ کروگی اور یہ اطمینان بتا نہیں

سکتا ایک مرد کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے میرا مطلب اور مردوں سے نہیں خود اپنی

ذات سے تھا۔"

"مگر یہ کیوں؟" وہ ایکدم بولا۔

"یہ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"میں؟ میں کچھ نہیں بتا سکتا، ہُنہ خود ہی نہیں سمجھتا، کہ تم جیسی سیدھی

سادی لڑکی مجھے کیا دے سکتی ہے جو مجھے دردر کی خاک چھان کر بھی نہ ملا۔ میں

تمہارے ساتھ بغیر تھکے بہت دور تک جا سکتا ہوں......" شمن کو اپنا کلیلیا

سفر یاد آ گیا۔

"مگر ہمارے راستے جُدا جُدا ہیں......"

"کیوں؟" شمن نے کسی علیمہ ہاتھ سے گلا چھڑا کر کہا۔

"اس لیے کہ...... تم بالکل جیوکور ہو...... اور دنیا کے گھستے کھا کر

میں بالکل گول ہو چکا ہوں"

"مگر تراشنے سے ہیرا اور بیش بہا ہو جاتا ہے۔" شمن اپنی زبان کی طراری پر

جھینپ گئی۔

"ہیں؟...... مگر میں پتھر ہوں...... تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بن رہا ہوں۔"

وہ بگڑا۔

"نہیں تو"

"ہنہ...... جانتی ہو میں نے تمہاری رضائی کیوں اوڑھی؟" شمن کا دل دھڑکا۔ "اسے دیکھ کر مجھے گذری ہوئی زندگی کی باتیں یاد آگئیں...... تمہیں نہیں معلوم میری ایک بہن بھی تھی۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی تھی، مجھے اب تک یاد ہے ہم دونوں ایسی قوس قزح کی طرح رنگیلی رضائی میں گھس کر ریل ریل کھیلا کرتے تھے۔ آج اس رضائی کو دیکھ کر...... ہنسو مت! تم ہنسی کیوں ہو، ہاں اسے دیکھ کر میرا دل بے اختیار ریل ریل کھیلنے کو چاہا، تمہیں دیکھ میرا دل ہمیشہ چھیڑنے کو چاہتا ہے۔ مگر میں رک جاتا ہوں کہ کہیں تم اسے کچھ اور نہ سمجھنے لگو، شمشاد معشوقاؤں کے تو ہم نے ہزاروں چٹکیاں لی ہیں، مگر ویسی چٹکی جو میری بہن پلنگ کے نیچے گھس کر میری پیٹھ میں بھر لیا کرتی تھی، اس کی یاد آج تک میری رگ رگ سمائی ہوئی ہے، میری بہن مر گئی اور پھر مجھے ویسی محبت نصیب نہ ہوئی۔

وہ تھوڑی دیر رضائی پر ٹکے ہوئے ستارے ناخونوں سے کھرچتا رہا پھر کچھ یاد کر کے بولا۔ "ہم صبح ناشتے پر ارد کی کھچڑی کھایا کرتے تھے، وہ دبلی پتلی اور بڑی ہلکی سی تھی، اور میں پلنگ پر بیٹھ کر کودا کرتا تھا تو وہ لڑھک کر میرے اوپر آن گرتی اسے کھانسی کی وجہ سے گھی کھانے کو منع کر دیا گیا تھا، مگر وہ ضد کرتی تو اماں روٹی کی گولی بنا کر کھچڑی پہ رکھ دیتیں۔ وہ قطعی نہ سمجھتی اور مزے سے کھچڑی کھا لیتی۔ ایک دن میں نے اسے بتا دیا۔

"تجھے یہ گھی تھوڑی ہے، روٹی ہے۔"

"روٹی؟" وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گئی اور جب اسے اماں کی چالاکی معلوم ہو گئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔ تم نے کبھی ارد کی کھچڑی کھائی ہے؟"

"اونہوں" شمن کا گلا بھر آیا۔

"اور...... اور۔ ارے یہ میں تم سے کس قدر بے تکی باتیں کر رہا ہوں،"

لاحول ولا قوۃ تم سمجھ رہی ہو گی کہ میں بھی برا جغد ہوں وہ کھسیا گیا۔

"ارے میں تو بالکل بھی......"

"جھوٹ تم مجھے قطعی الو سمجھ رہی ہو۔ اور نہیں تو کیا ہیں جب تمہیں پسند کرتا ہوں تو بجائے تمہیں آغوش میں لینے کے یہ ارد کی کھچڑی"۔

"تو کیا ہوا آپ مجھے بہن کی طرح چاہتے ہیں"۔

"ایں؟ قطعی نہیں، میں ان لوگوں کو پرلے درجے کا مکار سمجھتا ہوں۔ جو غیر لڑکیوں کو جو ان کی معشوقہ بن سکتی ہیں، بہن کہتے ہیں، مگر شاید تم ٹھیک کہتی ہو، میں معشوقائیں بناتے بناتے تھک چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں لفظ بیوی سے چڑتا ہوں، مگر میں تمہیں بہن تو نہیں بنانا چاہتا۔ لاحول ولا قوۃ"۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک سرے سے میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا بہت دفعہ میرے دل میں تمہاری طرف سے ایسے خیال آئے ہیں، جو ایک بہن کے لیے نہیں آتے، تم ابھی نہیں سمجھو گی۔ ایک دن آئے گا۔ جب ان الفاظ کے معنی تم خود بخود سمجھ جاؤ گی۔ تم.... ....کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم بھائی نہیں بلکہ دوست سمجھو، ایسا دوست جس سے کسی قسم کا تکلف نہ ہو"۔

"کیوں نہیں"۔

"میری بہن زندہ رہتی تو میں اُسے کبھی بھی صرف بہن نہ سمجھتا، اس کی شادی ہو جاتی مگر ہم بہترین دوست رہتے"۔

"آپ شادی نہیں کریں گے؟"

"شادی سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھنا اور ایک لڑکی کو بکا اسٹامپ لگا کر وصول کرنا ہی شادی ہے، تو میں کنوارا ہی بھلا، اور ویسے تو......" شمن کچھ جھینپ گئی۔

"تو اس میں کیا ہوا" وہ جلدی سے بولا۔ "مرد ہوتا کوئی عیب تو نہیں گو ہم کہتے

نہیں مگر ہماری ماں بہنیں خوب جانتی ہیں کہ..... ہم مرد ہیں، میں اسے گناہ نہیں سمجھتا۔"

"آپ شادی کے خلاف ہیں، میرا مطلب ہے نکاح کے؟"

"قطعی، نکاح ایک وعدہ ہے جو صرف اسلیے پختہ کیا جاتا ہے کہ کہیں وعدہ کرنے والا مُکر نہ جائے ذرا سوچیے تو سہی زندگی کے اتنے اہم معاملے کو کاغذی گواہ کس طرح مضبوط بنا سکتے ہیں، شادی ایک فعل ہے قول نہیں۔" فوبیا

شمن کچھ نہ سمجھی۔

"تو پھر لوگ نکاح کیوں کرتے ہیں؟"

"گدھاپن کرتے ہیں۔"

"واہ" شمن لاجواب ہو کر ہنسی۔

نوری نے کروٹ لی اور اس کا سر بازو سے ڈھلک کر تکیے پر ٹک گیا، شمن نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا شاید وہ آنے والے کل کے سب سے زیادہ رنگین لمحوں کو سمیٹ کر خواب دیکھ رہی تھی، اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ رات کی تنہا خاموشی میں شمن کا جی چاہا کاش وہ کسی طرح جھانک کر اس کی جگمگاتی دنیا کی ایک جھلک دیکھ سکتی، مگر افتخار کے الفاظ گھوم کر پھر اُسے اپنی دنیا میں واپس گھسیٹ لے گئے۔

"اور گیا گدھاپن تو ہے ہی، اگر مجھے کوئی عورت کہے کہ مجھے تمہارا اعتبار نہیں چار آدمیوں کے سامنے کہو کہ تم مجھے...... مجھے......" شمن کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ رک گیا تھا، مگر پھر جلدی سے بولا۔

"تو میں اُس سے کہوں گا۔ بیگم صاحبہ جلتی پھرتی نظر آؤ، ہمیں چار آدمیوں کی گواہی کے بغیر ہی کوئی چیز مل جائے تو پھر......"

"مگر یہ تو ناانصافی ہے آپ کی!" وہ جلدی سے بولی۔

"کیوں"۔

"کیونکہ جن عورتوں کی زندگی اس طرح خراب ہو جاتی ہے وہ کیا کریں؟"

"کیوں صاحب عورتوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے تو مردوں کی نہیں ہوتی؟"

"لوگ عورتوں کی ہی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔"

"مردوں کی نہیں کرتے؟"

"مرد پرواہ جو نہیں کرتے!"

"تو عورتوں سے کون کہتا ہے کہ وہ پرواہ کریں۔ کہہ دیجیے سماج۔"

"اور کیا؟"

"اور یہ سماج بنایا کس نے؟ خود انڈا پھوٹ کر بچہ نکل آیا؟"

"نہیں تو"

"جب ہم نے ہی سماج بنایا ہے تو ہم ہی توڑ سکتے ہیں۔"

"مگر اور بھی مصیبتیں ہیں جو صرف عورتوں کو بھگتنی پڑتی ہیں۔" شمن نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"یعنی بچہ وغیرہ؟"

"جی ہاں"

"بھئی واہ کیا عورت ہیں آپ بھی کہ اپنے عظیم ترین فرض کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں عورتوں کو زیادہ نہیں پڑھانا چاہیے۔"

"ارے!" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے اور وہ اس کی بدحواسی پر زور زور سے ہنسا۔

"مگر جو بچے ہوں گے وہ......"

"حرامی ہوں گے وہ......"

"حرامی ہوں گے؟"

"ہاں......"

"حد ہے، بھئی ہمارے اور آپ کے نظریے بہت مختلف ہیں۔ میں حرام حلال اور جھٹکا سب ایک ہی چیز سمجھتا ہوں۔ قدرت کے اصول کی پیروی کر کے پیدا ہونے والا جاندار انسان بننے کا حقدار ہے۔"

"مگر میرا مطلب ہے...... اقتصادی مشکلات۔"

"تو یوں کہیے میاں تمہیں بینک کی کتاب چاہیے۔"

"یونہی سمجھ لیجیے۔"

شمن کو کچھ لاجواب سا دیکھ کر افتخار کو دکھ سا ہوا، وہ بولا۔

"ٹھیک کہتی ہو، یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب میں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں ابھی تو نہیں شاید ہماری تمہاری زندگی میں وہ وقت آجائے کہ اس کا جواب مل جائے۔"

دیر ہو گئی تھی اور وہ واپس کیمپ کی طرف چل دیے۔

"ہاں ایک بات اور، جو تم سے کہنا بھول ہی گیا۔" اس نے رضائی دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا پھر رک گیا۔ "ہاں تم یہ اپنی رضائی مجھ کو دے سکتی ہو؟"

"رضائی؟"

"ہاں اس کوٹ کے بدلے میں نہیں بلکہ مفت"

"لے لیجیے" وہ اُلٹی احسان مند تھی۔

"سلام" اس نے مسخرے پن سے ماتھے کو ہاتھ لگایا۔

"ایک بات اور، وہ یہ.........کہ میں سینی ٹوریم جا رہا ہوں، ڈاکٹروں نے مجھے ٹی بی بتا دی ہے۔ ارے......؟ وہ شمن کی گھبراہٹ پر مسکرایا۔ "جیسے یہ کوئی نئی بات ہے پرانی شکایت ہے، دو دفعہ ہوا کھا آیا ہوں مگر۔ مگر اب کے شاید جلدی ہی نہ نکل سکوں۔"

"لیکن آپ اتنے بیمار تو نہیں نظر آتے۔"

"نظر تو نہیں آتا، مگر تم جیسی نظروں کو اندیشہ ہے کہ کہیں میرے جراثیم دوسروں کو لگ نہ جائیں، یہ چھوت کی بیماری ہے۔" اس نے معنی خیز قہقہہ لگایا۔ ہماری مہربان گورنمنٹ نے "بی" کلاس میں میرے لیے پلنگ دلوا دیا ہے۔ سارا خرچہ یونیورسٹی اور حکومت کے ذمے۔"

وہ ہنستا رہا۔

"جب شارعِ عام پر ایک گڑھا ہو کر اس میں غلاظت بھر جائے جو ہر آنے جانے والے کے منہ پر اُچھلنے لگے تو حکومت کا فرض ہے کہ عام صحت کی خاطر اسے دور کر دے......شکر کرو کہ تو تُو ناچیل سے بچ گیا......ورنہ......اوہ یہ میں کیا بکنے لگا......" چلنے سے

پہلے اس نے کہا۔

"ہاں ایک وعدہ کرو...... یہ رضائی تو میں نے لے لی اب ایک اور بھی قیمتی وعدہ مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کہئے۔" وہ اب بے صبر ہو چکی تھی۔

"کہ جب کبھی میں تمہیں کوئی ہدایت دوں تو تم اس پر عمل کرو گی۔ میرا مطلب ہے کہ میری وہ درخواست جس سے تمہارے اُوپر کوئی آنچ نہ آئے۔"

"میں آنچ سے نہیں ڈرتی۔"

"مجھے معلوم ہے مگر میں تمہیں اپنے تندور میں نہیں گھسیٹنا چاہتا، میں پختہ وعدہ نہیں چاہتا سوچ لو، اگر تم سمجھتی ہو کہ......"

"آپ نے میری خاموشی کا غلط اندازہ لگایا۔"

"تو......"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

"تو آؤ۔"

قلم اور کاغذ لے کر افتخار نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ جب سارا کیمپ غفلت کی نیند سو رہا تھا، دو سہمے ہوئے انسانوں نے سر جوڑ کر چند سطور لکھیں۔

"آنکھیں بند کرو۔" افتخار نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

"ہائے!" سوئی کی نوک شاید انگلی میں گہری اتر گئی۔

"لکھو۔"

"شمشاد!" شمیں نے لرزتے ہوئے انگلیوں سے لکھ دیا۔

"خدا حافظ۔" وہ رضائی میں منہ چھپائے تاریکی میں ڈوب گیا۔

شمیں جاگ اٹھی۔ یہ خواب اُس نے لفظ بہ لفظ دُہرا لیا؟ بکھرتے ہوئے حواس سمیٹ کر اُس نے پھر زنجیر کو پکڑا متحیر آنکھیں پھاڑے جیسے وہ اب بھی کیمپ کے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہی تھی آج، آج اُسے کسی نے خوب جھنجھوڑیاں دیکر زندگی کے نئے موڑ پر

دکھا دیا تھا۔ دیر تک حواس رسیاں تڑا کر بھاگتے رہے مگر دور دھندلی روشنی میں اُسے بہت ہی لمبا راستہ اٹھتا گرتا نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے اپنے خون سے اپنے دیوتا پر عبودیت کا قشقہ کھینچ دیا تھا۔ اُسے معلوم بھی نہ تھا کہ اس کا خون اتنا سُرخ ہے، اور یہ نام شمشاد سرخ پرچم کی طرح شفق بن کر کتنی دور تک پھیلا آ رہا تھا۔

اس نے پھر بن بیاہی دلہن کی طرف دیکھا، کل وہ بھی اپنے دیوتا کے حضور میں ماتھا ٹیک دے گی تو ری دھندلی ہو کر ایک آدمی کی عورت رہ جائے گی۔ غرور اور اطمینان کی لہروں نے ہلکورے لیکر اسے سلا دیا۔

۳۰

شادی کے درمیان ہی اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کتنے ہی بزرگوں سے بڑی ہو گئی ہے اُس نے بڑھیوں کو خوب چھیڑا یہاں تک کہ وہ مچل مچل گئیں۔ وہی اعتراض جنہیں سُن کر وہ رو دیا کرتی تھی۔ اُس نے توڑ مروڑ کر اُلٹے انہی کے سر مار دیے اور اس مسخرے پن سے معترض کھسیا گئے اور لوگ ہنس دیے۔ خصوصاً اُن بڑھیوں کو تو رُلا کر چھوڑا جو ہر بات پر۔۔۔۔

"اے ہے نوج جو ہمارے زمانے کی لڑکیاں ایسی بے شرم ہوتیں!"

"توبہ ہے، گریبان تو دیکھو سارا آگا پیچھا کھلا پڑا ہے۔"

"جب دیکھو جب ٹھٹھی۔ جب دیکھو دھما چوکڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے"

ان لوگوں کو جلا کر اُسے بڑا مزا آیا۔ نہایت ڈھٹائی سے اُس نے ان کی ہر بات کی کاٹ شروع کر دی، گویا ساری عمر کی ڈانٹ کا آج پورا پورا بدلہ لے کر چھوڑے گی۔ اُسے آج معلوم ہوا کہ بجائے ہنسنے کے ان بڈھوں پر رحم آنا چاہیے۔ جوانی کہیں ڈانٹ پھٹکار سے دبتی ہے؟ ہار تو ہمیشہ بڑھاپے کی ہے۔ جب قدرت کسی کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں

ہنسنا شروع کر دیتی ہے، تو وہ دانت کچکچا کر بہار ہی پر جلن اتارتا ہے۔ مسرت بھرے قہقہے بھی ٹھٹھی، عشق بد معاشی، اور جوانی بے حیائی نظر آنے لگتی ہے جو اُن لڑکیوں کی چکنی نرم باہیں اور سڈول جسم دیکھ کر بڑھیوں کو اپنے کھٹائی جیسے جھریرے جسم پر غصہ آتا ہے۔ جی پر چھریاں چل جاتی ہیں۔ یہی جی سے دعا نکلتی ہے کہ کوئی اُن کی طرح جوانی کو بھی خزاں کی چادر میں لپیٹ کر اُن کے ساتھ ساتھ دفن کر دے تاکہ وہ بھی اُن کی طرح مُردہ اور بے رنگ ہو جائیں؟

محفل میں جتنی لڑکیاں نظر آئیں سب بد مذاق اور چھوٹی، دو چار لڑکے دکھائی دیے وہ ڈرپوک اور دبّو سے۔ مگر پھر بھی اُن میں گھُل مل گئی تاکہ ایک دفعہ وہ بھی پڑھی لکھی لڑکیوں کے اخلاق سے متاثر ہو جائیں۔ چند لڑکیاں پڑھی لکھی بھی تھیں۔ مگر شمن کی طرح لڑکوں سے گھُل مل جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ ان کے لیے لڑکے اب بھی رومنٹک، بدمعاش اور بے رحم دانے بنے ہوئے تھے۔ جن کی آوازیں سُن کر وہ اصطبل میں بندھی گھوڑیوں کی طرح ہنہنانے لگتیں گو زبان سے بیچی لڑکوں کو کوس رہی تھیں، مگر جان بوجھ کر ایسی جگہ جا رہی تھیں کہ ان سے ٹکر ہو جائے۔ اور پھر وہاں سے ایسی اترا کر شرماتی لجاتی بھاگتیں گویا کچھ چھین ہی تو گیا۔ پھر گھنٹوں پسینے میں ڈوبی دل دھڑکا یا کرتیں۔ لڑکے بھی بھاگ دوڑ میں جو کچھ نہ کر جاتے کم تھا۔

"کم بخت کہیں کا ـــ میرا کلیجہ اب تک کانپ رہا ہے" وہ اُس ٹیم لذت ٹکر کی گدگدیاں یاد کر کے دوسری ٹکر کی اک آرزو میں لرزا کرتیں۔ اس کے علاوہ کئی لڑکیاں اپنے ہونے والی سسں نندوں سے وہ شان دار عشق چلا رہی تھیں کہ گیا کہیے وہ ان سے ہونے والے شوہر کا تصور وابستہ کر لیتیں۔ اور اُن سے ایسے شرماتیں جیسے نئی دُلہن دولہا سے شرماتی ہے۔ بھلا اس رومانی عیاشی سے کون روک سکتا ہے؟

کہاں یہ رنگین فضا اور کہاں کالج کے کھُلے میدان میں پروفیسروں کے زیرِ سایہ ایک دوسرے سے مصنوعی سنجیدگی طاری کر کے پوچھا "آپ کا مزاج کیسا ہے؟" گویا

ایک لڑکی کو ایک لڑکے سے کے مزاج ہی کی تو پڑی رہتی ہے

شمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی قید ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں یہ بوسیدہ لوگ کہ عورت کو پردہ میں رہنا چاہیے۔ سچ تو ہے کتنے مزے سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جا سکتی ہے۔ جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جیسے دکھا دیا۔ بدصورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہوں گی جیسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا۔ یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔

جب ہی تو پچھلے زمانے کا ادب اٹھا کر دیکھو ہر عورت حُسنِ مجسّم رکھی ہے۔ عورت حسینہ تھی یا دوشیزہ اور اب اسے اُستانی، ڈاکٹرنی نرس فقیرنی، بھنگن یا لڑکی کہا جاتا ہے یہ پردے سے نکل کر حسینہ سے صرف عورت کیوں رہ گئی؟ وہ اُسکے سارے قتل و غارت کے حربے کیا ہوئے، تیر نظر کُند اور ابروؤں کی دھار کھٹل! بات یہ ہے کہ پردے سے نکل آنے پر غازۂ سُرمہ ہستی کا راز کھل گیا، سب کو معلوم ہو گیا کہ ابرو نوچ کر کمانیں بنائی گئی ہیں اور آنکھوں سے بجلیاں مسکارہ کی مدد سے گرائی جا رہی ہیں ہونٹ "ٹھنجی" کے صدقے برگ گل بنے ہوئے ہیں اور گالوں پہ روژ کی شفق کھیل رہی ہے۔ گو ویسے ہندوستان میں جتنی حسن کی قلّت پہلے تھی اب بھی ہے مگر یہ پردہ ہٹ جانے سے تو نظر کا پردہ ہی اُٹھ گیا، عورت بڑے نقصان میں رہی۔

دولہا شام کو گھر میں آیا تو صنف نازک بھوکی مکھیوں کی طرح جٹ گئیں اچھی بھلی پردہ والیاں پل بھر کو سٹ پٹائیں پھر وہ بھی مست ہو گئیں۔ مرد میں خواہ وہ دولہا ہی کیوں نہ بنا ہوا ہو کتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ اچھے بھلے دماغ کھو بیٹھتے ہیں اس پر ستم یہ کہ ساتھ ساتھ دو چار دولہا کے شہ بالے بھی رینگ آئے۔ پہلے تو دو چار ٹوٹی پھوٹی ناکارہ بڑھیوں نے غل مچایا مگر یا لاحول مار لے گئے۔ یہ طے ہوا کہ شہ بالے خیر بیٹھ جائیں بشرطیکہ اپنی رشتہ داریوں کے دوپٹوں میں منہ چھپانے کا پختہ وعدہ کریں اُن کی دوپٹوں میں سے جھلکتی شریر آنکھوں کو دیکھ کر شمن کو بے اختیار بلقیس کی سالگرہ یاد آ گئی جب کیرم کھیلنے میں رشید کو رومال کا گھونگٹ نکال کر کھیل میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی تھی۔

"یہ بھی دولہا کے دم چھلے کیوں آئے ہیں؟" شمن نے مصنوعی غصے سے پوچھا تو ان میں سے ایک کبوتر بازوں جیسی آنکھوں والے نے کچھ دانتوں ہی دانتوں میں جواب دیا جس پر اس کے ساتھی نے کہنی ماری۔

"پاگل ہے بیچارا" ایک نے شمن سے سفارش کی۔

"پاگل نہیں دیوانہ کہو" اس نے پھر کبوتر باز جیسی آنکھیں چلائیں۔ اور پھر کچھ بڑبڑایا جس پر اس کے ساتھی نے چپ رہنے کی رائے دی۔

جتنی دیر دولہا دلہن سے آرسی مصحف کی کشتی لڑتا رہا لڑکے دوسری لڑکیوں کے چٹکیاں بھرنے کی تاک میں لگے رہے معلوم ہوتا تھا ایک نہیں چھ سات آرسی مصحف ہو رہے تھے لڑکیاں چڑھ کر باتیں سنا رہی تھیں۔ مگر مٹنے کا نام نہ لیتی تھیں کبھی ہوئی مقابلہ کر رہی تھیں۔

رخصت ہوتے وقت نوری کلیجہ پھاڑ کر روئی۔ شمن جل گئی۔

"بن کیوں رہی ہو مری تو جاتی تھیں شادی کے لیے"

"واہ!" نوری کھسیا کر نتھ سنبھالنے لگی۔

"یا اس لیے خوشی کے مارے رو رہی ہو کہ اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی"

نوری چپ ہو گئی اس کے آنسو بھی نہ جانے کیسے خشک ہو گئے۔

"کوئی زبردستی ہو رہی ہے تمہاری شادی، کیوں کر لی۔ اب طلاق لے لو"

شمن اسے خاموش دیکھ کر اور چبھتے کڑے جملے سنانے لگی۔

اسے نوری بالکل گائے بیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بے وقوفوں کی طرح نہیں پکا کاغذ لکھا کر کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو، اور پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے۔ اور وہ چیز بھی ڈھول تاشے سے اسے خرید کرنے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے۔ اس سودے میں اور آئے دن جو چاوڑی میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ چھوٹا موٹا بیوپار ہے جیسے کچی لو بکوڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ ہے جب تک ایک فریق خیانت نہ کرے

بیوپار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا کھوٹ۔ }

مگر دولہا جب نوری کو لے کر جانے لگا تو شمّن کے دل کے کسی نامعلوم کونے میں ایک عجیب سا شبہ پیدا ہوا جیسے نوری فروخت نہیں کی گئی بلکہ یہ جو اُسے کلیجے سے لگائے لے جا رہا ہے اپنی زندگی کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے لے جا رہا ہے ننھی نوری۔ یہ کم عمر الھڑ لڑکی اُسکی مستی میں ایسے گہرے پنجے گاڑ دے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اُسی کے ہاتھ میں لگام دے کر اُسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ حیف ہے کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، مگر جب یہ جوتی اُنکے سر پر بجتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو چکتا ہے اُسے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے سے لدی ہوئی بیویاں ظالم، جو اُن کی کمائیوں پر بالکل اسی طرح قابض تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر، وہ اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں۔ بجائے درجنوں کے صرف ایک سے۔

پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں۔ شاید اسی طرح خود اُن کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار اپنے ظلم کا ڈھنڈھورا نہیں پیٹتا۔ بزدل ہی شیر کی طرح گرج کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے۔ جو "پرجا کا چاکر" بن کر انہیں اُلّو بناتی ہے، اُس کی چالیں کس قدر خطرناک اور پُراسرار ہیں۔ بجائے شرمندگی کے اُسے اپنی نسوانیت ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔

مراثنیں گا رہی تھیں۔ اُن کی آواز میں رقت تھی!

{ ہم تو بابل تورے کھونٹے کی گیّاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں

"کیا گہنے ہیں اس معصومیت کے گویا یہ گائیں بیلوں سے زیادہ بھولی ہوتی ہیں" شمّن نے پاس بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے کہا۔

"اور کیا بہن گائے بیچاری تو ہوتی ہی سیدھی ہے۔"

"کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بیچارا زندگی میں زیادہ اُلّو بنتا

ہے یہ کولھو کا بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے۔ بل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے، لیکن یہ گائیں! سوائے گھاس چبانے اور دُودھ دینے کے اور کیا کام کرتی ہیں؟ ان کی بلا سے دُودھ بچھڑے نے نہ پیا آدمی نے کھیر بنا کر کھا لی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر۔ اور پھر بھی انسان گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوجتا بھی نہیں۔

اس کا اور بھی جی جل گیا۔ مراثنیں بے چارے دُولہا کا مذاق اڑا رہی تھیں جی چاہا جا کر ان کا مُنہ مسل دے۔ کمبخت، بیلوں میں بھی جاتا ہے۔

تیسری منزل

شادی سے لوٹی تو ایسا معلوم ہوا کہ دو عزیزوں کو دفن کر آئی' ایک تو نوری اور دوسرا افتخار نوری کو تو دوسرے دن سے سوائے دولھا کی شرارتوں کے اور کسی جھگڑے میں دل چسپی نہ رہی سارا دن بیٹھی وہ ہم جولیوں کو سرگوشیوں میں افسانے سنا سنا کر بے حال کرتی رہی پتہ نہیں ان ہم جولیوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی ــــ کس چیز کی تلاش تھی یا شاید وہی جذبہ تھا جو لوگوں کو قصے کہانیوں میں جنسی ذائقہ کا متلاشی بنا دیتا ہے۔

اور افتخار؟ .... وہ الہ آباد سے سیدھا بھوالی چلا گیا۔ انچارج پروفیسر نے تذکرے کے طور پر بتا دیا کہ انھیں بڑا افسوس ہے کہ افتخار ان کے ساتھ نہیں جا سکا بلکہ وہ اپنے پرانے مرض کے علاج کے لیے سینی ٹوریم چلا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے چند دعائیہ جملے بھی کہے مگر صاف ڈھکوسلہ معلوم ہوئے وہ خوب جانتی تھی کہ خواہ اللہ کتنا بھی افتخار پر مہربان ہو اگر دنیا نہ چاہے تو وہ کبھی بھی بھوالی سے صحت پا کر نہیں نکل سکتا۔ گو لوگ اس کی موت کا سارا الزام ملک الموت اور نوشتۂ تقدیر کے سر تھوپ دیں گے۔

افتخار کے بعد سیتل خود بخود یونی ورسٹی کی باگ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پشت پر پروفیسر اور پرنسپل بھی کی شفقت بھی تو تھی۔ نہ جانے کن متھ کنڈوں کی مدد سے اسے پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ الیما کچھ ششدر رکچھ جھلائی سی بے تکی باتیں کرنے لگی۔ اس نے سیتل کی مخالفت کی نہ ہی یونین کے کسی جھگڑے میں دل چسپی لی۔ نہ جانے وہ کس چیز سے کچھ خوف زدہ سی نظر آتی تھی۔ وہ اس کی بزرگانہ ڈوبی ہوئی آنکھیں کسی نامعلوم دھمکی سے خوف زدہ ہو جاتیں تو وہ بالکل معصوم بچے کی طرح معصوم اور بھولی معلوم ہونے لگتیں۔ اس کی ہنسی میں جھجک آجاتی اور دانت مصنوعی چینی کے کشش ٹکڑے بن جاتے۔

سیتل کے عروج نے بجائے مرعوب کرنے کے اسے ڈرا دیا تھا۔ مگر یونین کی ساری مردنی غائب ہو کر نئی جان پڑ گئی۔ ترقی پسند گروہ میں ممبروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ نئے جوش و خروش سے معینہ

شنگ ہونے لگی نئے قواعد بنے کئی شاخیں بنائی گئیں۔ ڈرامہ سیکشن، آرٹ سیکشن اور گاؤں سدھار کی اسکیم بنی اور ہنگامے شروع ہو گئے۔

چند روز تو شمن کچھ غیر مطمئن سی رہی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک دم سے افتخار کی جگہ سیتل کو دیکھنے کی کیسے عادت ڈال لے۔ کالج اور یونیورسٹی کی زندگی بھی پانی کا بلبلہ ہوتی ہے، جو چند لمحے تیرتا رہتا ہے تو ہزاروں رنگینیاں اس کے خول پر منعکس رہتی ہیں مگر جونہی پھوٹا سب کچھ غائب، وہی افتخار جس کا وجود یونیورسٹی میں قطبی ستارے کی سی حیثیت رکھتا تھا آج آسمان سے ٹوٹ کر نہ جانے گمنامی کے کس غار میں جا گرا تھا اور در و دیوار کو اس کی کمی بھی تو محسوس نہ ہوتی تھی۔ گویا خاک کا ایک حقیر ذرہ تھا جسے آندھی نے اٹھا کر دور پھینک دیا تھا تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ دو چار دن تو غلطی سے لوگوں نے بجائے سیتل کے افتخار کا نام لیا۔ مگر پھر بہت جلد زبانیں نئے بول کی عادی ہو گئیں اور سیتل کی خوش بیانی، حسین اور لمبے چوڑے جسم نے افتخار کی یاد کو دلوں سے مار بھگایا۔ ایلما سکریٹری رہی لیکن شمن کو خزانچی کی کرسی سنبھالنی پڑی نئے عہدے کی دہشت نے اسے کچھ ایسا بدحواس کر دیا کہ سوچے سمجھے بغیر وہ ترقی پسند گروپ کی پرجوش رکن بن گئی۔

ہیرا جب تک کان کے گمنام اندھیرے میں رہتا ہے بے کار کنکری بنا پڑا رہتا ہے۔ مشک کو جب تک گھسا نہ جائے تو سادہ سی ایک گولی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سیتل کے سوا کسی نے بھی نہ پرکھا کہ شمن کی اس پریشان اور ڈری ہوئی شخصیت کی آڑ میں استقلال اور بغاوت کا لاوا دبا پڑا ہے اس خاموش اور حلیم میدان کے سپاٹ سینے میں آگ کی تپش چھپی سو رہی ہے صرف جگانے کی دیر ہے اور پھر وہ ساری اونگھتی ہوئی طاقتیں پورے جوش سے ابل پڑیں گی۔ شمن کو اپنی ہستی کے اس انوکھے ٹکڑے کے وجود کا علم بھی نہ تھا وہ اس نئی شمشاد کے تخیل کو پہلے تو واہمہ سمجھی۔ مگر پھر اس نے اسے شخصی طور پر دیکھ لیا۔ وہ خود اس کی جگمگاتی ہوئی لپک سے آنکھوں میں چکاچوند سی محسوس کرنے لگی۔ اور بہت جلد نئی پود نے اس نئی چیز کو کھرے سے دیکھا۔ باد مخالف کے ان تند تھپیڑوں کے سامنے دشمنوں کی فوج سے مقابلہ کرتی ہوئی یہ مقدس طاقت اب تک کہاں پوشیدہ تھی۔ وہ پرانی شمن اس کے سامنے کس قدر بودی اور حقیر معلوم ہو رہی تھی۔

وہ کوئی چیز ہے جو عام لوگوں کو چھوڑ کر صرف اسے بخشی گئی ہے! اور بہت جلد اس نے اپنے آپ میں ایک پر اسرار کشش، ایک خاموش دبدبہ اور چھپی ہوئی شان پائی۔ سیتل کی رائے سے اس نے

اس نئی شخصیت کو جس کا انکشاف اسے ہو چکا چھوڑ گیا تھا سمجھنے اور پہچاننے کی کوشش کی ادب اور فلسفے کا مطالعہ کرنا شروع کیا شاعری سے دلچسپی پیدا کی اور بہت تیزی سے وہ پرانا خول کہ چھلکے کی طرح کھنچ گیا اور اندر سے ٹھوس مینگ نکل آئی۔ اس بھر بھرے چھلکے کو اس نے مسل کر دور پھینکدیا اور مینگ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر جتنا جتنا وہ اسے پہچانتی گئی معمہ اور پیچیدہ اور خمدار ہوتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا نئی شمن اس سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ جونہی وہ اسے چھونا چاہتی وہ ہوا میں تحلیل ہو کر پرے چلی جاتی۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا اس نے اسے پکڑ ہی لیا مگر قبل اس کے وہ ٹھیک سے اس کا ناک نقشہ پہچان سکے وہ ہاتھ چھڑا کر غوطہ مار جاتی پھر وہ دوگنے شوق سے اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتی مگر بعض وقت اس دوڑ میں وہ کسی ایسے بھیانک اور سنسان گوشے میں پہنچ جاتی جہاں وہ خود اکیلی رہ جاتی اور وہ تخیل کی شمن دھواں بن کر پگھل جاتی۔ اس بنجر اور غیر مانوس فضا سے اس پر خوف طاری ہو جاتا اور وہ الٹے پیروں بھاگ آتی جیسے غلط راستے پر جانے سے انسان پریشان ہو جاتا ہے اسی طرح وہ بھی وہاں سے کبیدہ خاطر لوٹ آتی۔

شمن بستیل کو کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا! گوشت پوست کی شاندار پہاڑ کی تہوں میں ایک فلسفی شاعر پوشیدہ تھا جس کا دل انسانیت سے لبریز اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا جس کی اندرونی زندگی قوم اور ملک کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لیے بے قرار تھی ظاہر میں وہ دنیادار اور کھیل کود کا شوقین نظر آتا تھا مگر کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان مسکراہٹوں میں کتنے آنسو جذب تھے ان قہقہوں میں الجھی ہوئی آہیں صرف سننے والے کانوں کو ہی سنائی دے سکتی تھیں وہ خوف جو شمن ہمیشہ اس کے وجود سے محسوس کیا کرتی تھی قطعی بے بنیاد ثابت ہوا وہ صرف دیکھنے میں بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ یوں تو کتنے ہی سانپ دیکھنے میں زہریلے معلوم ہوتے ہیں مگر کیچوے سے بھی زیادہ بے ضرر ہوتے ہیں۔

وہ بدمذاق بھی نہ تھا بعض وقت تو لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہنستے بے تاب ہو جاتے تھے پریزیڈنٹ ہونے کی وجہ سے اُسے ہر ایک کو خوش رکھنا پڑتا تھا۔ مس لوگا جو کھلے بندوں اس پر انوکھے قسم کا عشق برسایا کرتی تھیں اس کے ساتھ بڑے تن دہی سے کام کر گیا ہر سنجیدہ اور

غیر سنجیدہ مجمع میں ان کی موجودگی لازمی تھی۔ جب تک سوکھی اور مشکل باتیں ہوتی رہتیں وہ فرمانبردار بچے کی طرح خاموش بیٹھی سنا کرتیں نہایت انہماک سے وہ مقرر کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو سننے کے بجائے دیکھنے کی کوشش کرتیں ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو پریشان ہو کر شی شی کرنے لگتیں اگر سخت ضرورت سے اٹھنا ہوتا تو اپنی ننھی سی گرگابی کے نازک پنجوں پر لنگڑے کوّے کی طرح بغیر آواز کیے پھدکنے کی کوشش کرتیں۔ کوئی بات کہنا ہوتی تو بالکل کان کے سوراخ سے منہ چپکا کر ہمی ہولی گھس پھسا دیتیں لیکن ان کی یہ ساری احتیاطیں حاضرینِ جلسہ کی توجہ کو اور بھی منتشر کرتیں وہ مقرر کے مزاحیہ جملے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتیں اور جونہی موقع ملتا سب سے پہلے تالیاں اور قہقہہ شروع کر کے سب سے آخر میں بند کرتیں۔ بعض وقت کوئی دلچسپ بات سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو بچوں کی طرح پریشان ہو کر " اوہ اوہ " کر کے پاس بیٹھنے والوں سے اس کا مطلب پوچھنے لگتیں۔ اس طرح ان کا قہقہہ ذرا ذرا دیر سے ظہور میں آتا۔ سبتل انھیں بڑے پیار سے جھڑکتا تو کمسن بچیوں کی طرح زبان نکال کر شرمانے لگتیں۔

یونیورسٹی میں بہت سے مذاقیہ لطیفے انہی کی شخصیت سے ایجاد کیے گئے تھے اور ہر چھوٹا بڑا ان سے بے تکلف تھا۔ کچھ دنوں سے وہ فرسٹ ایر کے نئے لڑکوں کی چر مقرر کر لی گئی تھیں کتنی ہی فاختائیں مس یوگا سے وابستہ کر کے اڑائی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ برا مان جاتیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ روتے میں وہ بڑی تیز انگریزی میں خود اپنی حالت پر رحم کھاتیں اور دوسروں کو شرمندہ ہونے کی رائے دیتیں۔

کچھ دن سے یعنی افتخار کے زوال سے اور سبتل کے عروج کے بعد سے وہ عوام کی نظروں میں کچھ گر گئیں تھیں۔ افتخار کی تو اور بات تھی پر سبتل تو ان کا اپنا آدمی تھا۔ اسے تو ان کی عزت افزائی کرنا لازمی تھا۔ اس کے انتخاب میں سب سے بڑی مدد مس یوگا کی تھی۔ ووٹ جمع کرتے وقت وہ ہر ایک کی جان کو آگئی تھیں اپنے خرچ سے پمفلٹ چھپوا کر بانٹے اور جب اسے فتح نصیب ہوئی تو کسی کو خاص حیرت نہ ہوئی۔ پر وہ خوشی کے مارے پاگل ہو گئیں۔ لوگ چھیڑنے کے لیے مٹھائی مانگنے لگے تو انھوں نے سچ مچ ہی کھلا دی۔

ترقی پسند گروہ اب اور شدت سے اشتراکی رنگ میں رنگتا گیا۔ ممبروں کی تعداد بڑھ

گئی ہمس بوگا نے ایک دم گجراتی اطلس چھوڑ کر کھدّر پہننا شروع کر دیا۔ اور بے چاری ہر وقت کھدّر اور اپنی پیٹھ پر نکلے ہوئے گرمی دانوں کو انگریزی کی گالیاں دیا کرتیں دیکھنے میں ان کا جسم بے مصرف گوشت کا لوتھڑا تھا مگر ذرا سی ٹھیس سے چھل جاتا اور فرصت کے لمحات عموماً ہر ایک کو گھاؤ اور پھنسیاں دکھانے میں صرف کرتیں۔ نیز ہزاروں قسم کے پاؤڈر اور مرہموں کے نام انھیں یاد ہوگئے تھے۔ ان کا جسم تو ایک ہی تھا مگر ہندوستان کے خطوں کی طرح زمین اور آب و ہوا مختلف تھی۔ اگر ایک مقام کی پھنسی زمبک سے اچھی ہوتی تو دوسرے حصے کی کیوٹی کیورہ سے۔ اگر پیٹھ کے دانے ڈسٹنگ پاؤڈر سے سوکھتے تو بغلوں میں بورک چھڑکنے سے شفا ہوتی جتنا وہ دیسی مال کی سرپرستی میں بچا لیتیں اتنا ہی بدیسی دواؤں پر خرچ ہو جاتا۔ بعض لوگوں کی رائے سے انھوں نے نیم کی چھال اور ہندوستانی لیپ وغیرہ استعمال کیے مگر ان سے اور بھی بدحواس ہونا پڑا۔

ان کے برخلاف ششی ایک نئی لڑکی ہر چیز دیسی استعمال کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے برتن خاص گوالیار چینی کے اور کمرے کا پورا فرنیچر کشمیر اور میسور کی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ مرشد آباد کی سلک میسور کی جارجٹ اور مدراس کی ساڑھیاں پہنتی۔ اس کا سارا خاندان لیڈروں کا خاندان کہلاتا تھا۔ اس کے پتا جی بڑے پکے قوم پرست تھے اور ہر قومی جلسے میں اسے ساتھ لے جاتے تھے جہاں وہ مائکروفون کے سامنے بندے ماترم گایا کرتی تھی۔ اس کی شادی ہوگئی تھی اور میاں انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ باوجود دیش بھگت ہونے کے فیشن گھر میں کافی تھا۔ انگریزی زبان مادری بنی ہوئی تھی "ماما" "پاپا" اور "آنٹی" کا رواج تھا۔ سب لڑکیاں فراک پہنتی تھیں اور بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر ایک تار بھی بدیسی نہیں استعمال ہوتا تھا۔ گو ذہنیں یورپ زدہ ہو چکی تھیں۔ مگر خول دیسی تھے۔

اس کے خاندان میں کوئی سرکاری نوکری نہیں کرتا تھا۔ تایا جی نے تو خطاب بھی لوٹا دیا تھا اور کئی بار جیل میں گئے تھے۔ بمبئی میں روئی کا بیوپار ہوتا تھا جس میں خاندان بھر کھپا چلا جاتا تھا۔ پھر غلامی کی نوکری کون کرتا۔ دوسرے بیوپار میں بھارت کے مال کی اُنتی بھی ہوتی ہے گو بعض بدمذاقوں کا خیال تھا کہ لالہ جی کو بھارت کی اُنتی سے زیادہ اپنے بیوپار کی اُنتی کی فکر تھی۔ کھدّر کے پرچار سے بھارت ورش کے بیوپاری بے شک وزنی ہو گئے مگر مزدور ویسے ہی

ننگے بھوکے رہے، وہ پہلے بھی موٹا جھوٹا پہنتے تھے اور اب بھی وہی ملتا رہا، ہاں ذرا جاپان کے سستے مال نے ریشم پہنوا دیا۔ غریب بھی اطلس کے لمس سے واقف ہو گئے، بھنگی چمار بھی جاپانی کھلونوں سے کھیل لیے چینی کے سیٹ اور شیشے کے گلاس چپراسیوں کی لڑکیوں تک کو جہیز میں ملنے لگے مگر یہ جاپانی مال کب تک؟

ترقی پسند گروہ کی ہر میٹنگ زیادہ دلچسپ ہوتی گئی جتنے ممبر تھے سب ہی ہتھیلی پر جان رکھے "کام" کو تیار تھے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے واقف ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی۔ رحمان اپنی چچا زاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اُسے صرف اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا عزم کر چکا تھا۔ تین سال وہ متواتر مختلف مقابلوں میں شریک ہوا لیکن صرف خاندان والوں کی زبردستی سے، قوم کی خدمت سے اُسے اتنی فرصت نہ ملی جو ان لغویات کی طرف توجہ دیتا۔

انور زنانہ کالج کی ایک توبہ شکن لڑکی سے محبت کرتا تھا جس کی خمیدہ زلفوں اور لچکتی کمر نے اسے شاعر بنا دیا تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ بہت جلد وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر ہو جائے گا۔ اس کی شاعری بالکل انوکھی تھی، وہ پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستوں پر گامزن تھی۔ اس کی رومانی ہیروئن، زہرِ عشق، گل بکاؤلی وغیرہ کی فرسودہ محبوبہ سے بالکل مختلف ایک کالج کی روشن خیال حسینہ تھی جو بجائے ظلم و ستم ڈھانے کے خود اس پر پروانہ وار فدا تھی مگر ظالم سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک آئی۔سی۔ایس کے پلّے بندھ چکی تھی لیکن انور کی شاعری پیش گوئی کرتی تھی کہ انقلاب آئے گا جب یہ ساری پابندیاں ٹوٹ جائیں گی۔ سماج کو ملیا میٹ کر رکھ دیا جائے گا شفق خون برسائے گی اور زمین و آسمان سرخ ہو جائیں گے۔ اور سرخ آندھیاں چلیں گی پھر اسی سرخی کے شعلوں میں ساری بلائیں بھسم ہو جائیں گی ——— آزادی کا قرمزی جھنڈا لہرائے گا، مزدور کا راج ہوگا .... اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی مشکیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر

فضا میں خوشبو پھیلا دے گا۔ پھر کیا ہو گا! پھر پتہ نہیں کیا ہو گا۔

اس کے علاوہ آنند تھا جس پر شہر کی کل طوائفیں عاشق تھیں وہ ان کے یہاں مفت جاتا تھا شراب ہر فن کار کے لیے ضروری ہوتی ہے اور وہ ایک سچّا فن کار تھا۔ اس نے روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے بعد وہ اور طبع زاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آثار کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بلند مرتبہ مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا۔

برکت عجب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس تو اس کے روحانی دیوتا تھے۔ جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا۔ اور جنسی آزادی کو سوراج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔ اس کی زبان میں بڑی روانی تھی اور عام طور پر لوگ قائل ہو جایا کرتے تھے شمّن کو اس سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور اس کے اصولوں کی بھی کچھ شدّت سے مخالف نہ تھی۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں جب اکیلے میں وہ مختلف نفسیاتی نکات کی تشریح کرتا تو پسینے چھوٹ جاتے۔

"انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہو گیا کہ جب تک اسے مذہباً رسماً اور قانوناً ساری فلیٹ نہ دیا جائے محبت ہی نہ کرے" لفظ محبت وہ بہت ہی پر معنی طور پر استعمال کرتا تھا۔ وہ ایسے پھُسپھُسے عشق کا قائل نہ تھا جس میں ٹھنڈی سانسیں اور شب بیداری شامل ہوتی ہے اسے تو بس خالص عشق پسند تھا۔ اسے طوائفوں سے بڑی شدّت کی ہمدردی تھی۔ ان کی زندگی اور رہن سہن، ان کی مالی مشکلات گندے مکانات مختلف انواع و اقسام کی بیماریوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سناتا تھا کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ کبھی تو شمّن کو اس سے گھن آنے لگتی کہ کم بخت نہ جانے کن غلاظتوں میں غوطے مار کر آتا ہے اور کبھی اسے طوائفوں پر غصّہ آتا کہ مردیاں کیوں اتنی گندی ہوتی ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ ارے بھئی چکّی پیسیں کپڑے سئیں اور عزّت سے رہیں............ مگر اسے خوب معلوم تھا کہ یہ طوائفیں اتنی اُلّو نہیں۔ اگر چولہا چکّی اتنا آسان کام ہوتا تو وہ کبھی کا شروع کر دیتیں۔

"اس کا علاج" وہ کبھی برکت سے پوچھتی

"سرمایہ داری کا خاتمہ"

"وہ کس طرح"

"جس طرح روس میں ہوا" اور وہ دونوں گھنٹوں روس کے انقلاب کی پرچھائیاں ناپا کرتے۔ غرض جو کوئی بھی اس ترقی پسند گروہ میں تھا پہنچا ہوا تھا۔ عشق و محبت بے وفائی اور جفا کاری مفلسی اور بے کاری نے سب کو مجذوب بنا دیا تھا۔

شمن ایک دم جو کالج سے لوٹی تو ایلما کو پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھے پایا۔

"ارے تم دیر سے بیٹھی ہو؟" اس نے کچھ خجل ہو کر پوچھا اور پاس بیٹھ گئی اس کا ضمیر ایلما کو خاموش دیکھ کر ملامت کرنے لگا۔ افتخار کے جانے کے بعد کیسے کیسے دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے مگر اس نئے انتخاب کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور اب تو یہ حال تھا کہ یہ سڑک کے اس کنارے پر تو وہ دوسرے پر کبھی بھولے بھٹکے نگاہیں ملیں بھی تو جلدی سے بچا لیں۔ گویا دیکھا ہی نہیں یونہی وہم ہوا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیوں شمن نے اس کے گرد باہیں لپیٹ کر چمٹا لیا اور دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی۔

یہ ایلما کو کیا ہو گیا تھا وہ ایلما ہی نہ تھی آنکھیں اور زیادہ بوڑھی ہو گئی تھیں جیسے ان پر سیلولائڈ کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو گالوں کی ہڈیاں زیادہ ابھر آئی تھیں اور بال پہلے سے بھی زیادہ گھنیرے معلوم ہو رہے تھے بجائے جھنجھلاتے ہوئے قہقہے لگانے کے وہ خاموش تلخی سے مسکرائے جا رہی تھی جو بجائے دلی حالات کی آئینہ داری کے بالکل ایک مصنوعی خول کی طرح منڈھی ہوئی تھی۔ اس مسکراہٹ میں نہ کڑواہٹ تھی نہ مٹھاس اور نہ ہی کوئی طنز پوشیدہ تھا۔

پھر وہ باتیں کرنے لگیں دیر تک ایک دوسرے کے قریب لیٹی وہ وقت سے غافل بکواس کرتی رہیں۔ افتخار کی باتیں جلسوں کی باتیں اور نہ جانے کیا کیا؟

"بعض وقت ہمارا ہر پانسہ الٹا ہی پڑتا ہے" ایلما ایک دم سے بولی

"کیا کہا تم نے؟" شمن نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

"میں نے کہا ...... ہم کیا سوچتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"شمن؟"

"ہاں!"

"کیا میں کچھ بدل گئی ہوں؟"

"کیوں؟ نہیں تو!" شمن نے ایلما کو سر سے پیر تک دیکھا، ایک دھوکا سا ہوا مگر مٹ گیا۔

"مگر ڈاکٹروں کا خیال ہے میں امتحان میں شریک نہیں ہو سکتی" وہ اور پھیل گئی۔

"تم .... تم .... ایلما؟" وہ ہکلا گئی۔

"ڈرو مت .... میری بیماری چھوت دار نہیں، وہ تمھیں نہیں لگ سکتی" ایلما نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ وہ اس عرصے میں صرف ایک بار ہنسی اور یہ قہقہہ ایسا کھڑکھڑاتا ہوا شمن کے کانوں میں گونجا جیسے کسی نے بہت سے پتھر ٹین کے خالی ڈبے میں ڈال کر جھکول دیے اس کے دانت بالکل زہر میں بجھے ہوئے کیلوں کی طرح چمکے اور آنکھوں میں گھٹا ہوا دھواں اٹھنے لگا۔ اب شمن کو معلوم ہوا کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں کیوں ابھر آئی تھیں اور بال چہرے کی مناسبت سے زیادہ گھنے دار معلوم ہو رہے تھے۔

"تم مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟" اس نے بہت کچھ جان کر پوچھا

"بتانے کو ہے ہی کیا میرے پیٹ میں بچہ ہے۔" شمن ایسی بری طرح جھجکی جیسے اس کے سر پر چھت آن پڑی مگر فوراً ہی کھسیانی ہو کر سنبھل گئی نہ جانے کیوں سماجی اصولوں کے آگے قدرت کے بنائے ہوئے اصول کمزور اور ناقص ہو جاتے ہیں۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جاتا تو قدرت کی طرف سے ماں بننے کی مکمل آزادی تھی مگر سماج اس سے پروانۂ راہ داری مانگتا تھا شمن کو خود اپنی روشن خیالی پر ناز تھا مگر روشن خیال بننے سے پہلے ہمیں عادت ڈالنی پڑتی ہے شمن جلد ہی سنبھل گئی اس کے خیالات جنگلی ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگے۔ اب سے بہت پہلے جب پکنک سے واپس آکر دونوں سہیلیوں نے باتیں کی تھیں اس وقت شمن اور بھی بیوقوف تھی مگر اب تو وہ ان الفاظ کے معنی خوب سمجھتی تھی پھر اسے کیمپ کی وہ رات یاد آگئی جب اس نے ایک نئے موڑ کی طرف قدم اٹھائے تھے افتخار کے کوٹ کی خوشبو کوشش کرنے سے وہ دوبارہ دماغ میں کھینچ لا سکتی تھی اور پھر اسے اپنی وہ رضائی یاد آئی جو افتخار نے اس سے مانگ لی تھی۔

" مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو۔" ایلما نے ہولے سے کہا

" میں ؟"

" ہاں تم سوچ رہی ہو کہ ـــــ میں بڑی بدنصیب ہوں میں نے پاپ کیا ہے یہ بات نہیں میں اسے پاپ نہیں سمجھتی۔ مگر" ـــــ اس کے چہرے پر پھر وہی بے معنی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ " تم نہیں سمجھ سکتیں ـــــ میں نے واقعی پاپ کیا ہے۔"

" ایلما !"

" میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے ـــ میں نے اپنی روح کو دھوکا دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔"

" کیا بک رہی ہو ایلما۔ کیا مطلب ؟"

" ہیں ؟ نہیں ـــ میں بہک گئی تھی ـــ " وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گئی پھر بولی " تم نہیں سمجھتیں ـــ تم بھول گئیں ـــ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ـــ "

" ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم انتحار کا ...... "

" ہاں ہاں ـــ یہی تو مصیبت ہے اگر ایسا ہوتا تو۔" وہ پھر کچھ سوچنے لگی۔ " اگر ایسا ہوتا تو میں اس کی امانت اپنے سینے سے لگا کر رکھتی ـــ " وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اونچی آواز سے بکنے لگی۔

" اس وقت جو شیطان میرے جسم میں سانس بھرنا سیکھ رہا ہے وہ سینتل کا تحفہ ہے ـــ اور میں نے اپنی جسم کی آرزو پوری کر دی مگر میری روح ابھی بھوکی ہے میں اسی ہفتے بنگلور جا رہی ہوں۔ وہاں آپریشن کرا دوں گی۔"

آنکھیں پھاڑے سانس روکے شمن سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ " کیوں ؟ "

" تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں کیونکہ مجھے سینتل سے نفرت ہے اور اسے مجھ سے۔ ہم کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ بھلا تم ہی سوچو میں اس کا یہ گناہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں۔ آپریشن کے ذریعہ سے میں اپنی انتہائی نفرت کا ثبوت دے سکتی ہوں کہ اس کا یہ قیمتی تحفہ ٹھکرا دوں۔

" بھلا اس کم بخت کو کیا رنج ہو گا۔"

"اوہ — یہی تو تم نہیں جانتیں. فرض کرو تم نے میری دعوت کی میرے منہ میں تر بتر نوالہ دیا. اب اگر میں اسے تمہارے منہ پر تھوک دوں تو کیا حال ہو گا تمہارا؟"

"اوہ. ایلما"

مگر ایلما نے وہی زور زور کے قہقہے لگانے شروع کر دیئے.

"مگر — تمہارا بھی تو کچھ حصّہ ہے اس میں"

"ہاں ہاں. مگر جب کوئی چیز زمین پر گر کر مٹی میں لتھڑ جائے تو اسے پونچھ کر کھانے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنے نقصان پر صبر کر کے اسے پھینک دینے میں ہی مصلحت ہے."

"سیتل کو معلوم ہے؟" تھوڑی دیر خاموش رہ کر شمن نے پوچھا.

"ہاں — جب اسے معلوم ہوا تو ناول کے ہیرو کی طرح دوڑا سینہ چوڑا کر کے — کہنے لگا مجھ سے شادی کر لو"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا. میں تم سے چار پیسے کا سودا کرنے کو تو تیار نہیں پھر بھلا زندگی بھر کا پٹا کیسے لکھ دوں. پھر وہ اور وعدے کرنے لگا تو میں نے کہا میں بنگلور آپریشن کے لیے جا رہی ہوں بے چارے کا منہ اتر گیا" وہ دل کھول کر ہنسی.

ایلما چلی گئی. شمن دیر تک بیٹھی سوچتی رہی سیتل کا مزاج کچھ دن سے بگڑا ہوا تھا. کچھ جھنجھلایا سا رہتا اس کا بے اختیار جی چاہا کہ جا کر اس کے دل کی باتیں پوچھے سیتل جیسا لاپرواہ بے رحم انسان کیا واقعی ایلما کے رویّے سے کچھ ہتک محسوس کر رہا تھا شادی بیاہ کو چھوڑ کر تخلیق انسان کا پہلا فرض ہے. خدا نے انسان کو یونیورسٹی سے ڈگریاں لے کر دفتروں میں جھک مارنے کے لیے تو یقیناً نہیں پیدا کیا ہو گا. تخلیق. خواہ وہ کسی صورت میں انسان کی بہترین کمائی ہے. تو شاید اپنی کمائی کو ضائع جاتا دیکھ کر اسے کچھ دکھ ہو رہا تھا! عیش و عشرت اور آوارہ گردی کا زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی وہ خصلتِ انسانی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا. شاید اگر ایلما عام عورتوں کی طرح روتی بیٹھتی تو اس کے احساسات کچھ مختلف ہوتے. تھوڑا سا قانون اور سماج کا بھی ڈر ہوتا اور پھر وہ خود ہی یہ تجویز ایلما کے

سامنے پیش کرتا۔ مگر اب تو وہ اس کی حقارت بھری بے رحمی پر بھنّا رہا تھا ویسے اُسے اپنے حصّے کے ضائع جانے کی پروانہ ہوتی۔ مگر یوں ایک بد دماغ لڑکی کو اُسے ذلیل کرنے کا کیا حق تھا؟ یہ نہیں کہ اس نامکمل شئے سے اسے کچھ اُنس ہو گیا تھا یا اس کی آئندہ نسل کا انحصار اسی کی ذات سے وابستہ تھا پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ شاید ایلما کی جگہ مس بوگا ہوتیں تو اس کی اس قدر بے قدری نہ ہوتی اور پھر شاید وہ اس قدر حسّاس بھی نہ ہوتا۔

دو تین دن بعد ایلما جنوبی ہند روانہ ہو گئی۔ شمن کو اس کی جدائی کا بڑا رنج ہوا اپنی واپسی کے متعلق اس نے نہایت مبہم سے جملے کہے نہ ہاں نہ نا۔ وہ عجیب فلسفیانہ جواب دے گئی چلتے وقت اسٹیشن پر اس نے شمن کو بھینچ کر بڑے جوش سے پیار کیا۔

افتخار سے پیار

"میں اب افتخار سے تو مل نہ سکوں گی۔ اگر اتفاق ہو ملنے کا تو یہ پیار تم میری طرف سے پہنچا دینا۔ نہ جانے کیوں' مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔"

"کیا بکتی ہو!"

"پگلی میرا مطلب یہ نہیں۔۔ جسمانی طور پر تو میں واقعی ابھی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے!"

"تمہارے خیالات اور اتنے تاریک!"

"میں جانتی تھی تم اسے بکواس کہو گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ایک مقررہ حد سے آگے بڑھتے تو ہیں مگر فوراً دھکا کھا کر لوٹ آتے ہیں یہ تاریکی ہمارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ جہاں تک تخیل کی دوڑ کا سوال ہے کوئی ہماری گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ خوابوں میں تو ہم بڑی آسانی سے پاتال تک کو فتح کر لیتے ہیں لیکن جہاں عمل کا سوال آیا ہم پیچھے گرے یہی دیکھو افتخار کتنا جوشیلا' کتنا سچا ہے مگر صرف وہاں تک جہاں تک تصوری کا سوال ہے۔ وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی عملی کی صورت میں ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت ہوتا نہ جانے کیا ہو جاتا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ میں نے۔۔۔۔۔۔۔"

گرد پا

"افتخار روشن دماغ ہے!" شمن نے کیمپ کی آخری ملاقات کو یاد کر کے کہا۔

"کتنا بھی روشن دماغ ہو، یہ سیاہی ایک دفعہ تو وہاں بھی اندھیرا کر دے گی میری زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے، صرف اپنے ضمیر کی ملامتیں۔"

"قوم کی خدمت جس کا تم بیڑا اٹھا چکی ہو۔"

"اس بیڑے سے بھی منہ جل گیا...... کچھ نہیں دنیا میں ہر چیز ذلیل ہے ہم لوگ ایک چیز بڑی شان سے شروع کرتے ہیں۔ مگر جلد ہی آپس کی پھوٹ، خود غرضیاں، پست خواہشات اور چھچھورے خیالات درمیان میں آکر سب کچھ میٹ دیتے ہیں۔ سوائے زبانی بکواس اور تالیاں پیٹنے کے ہمیں اور کچھ بھی تو کرنا نہیں آتا۔"

"لیکن اس کی کوئی تو وجہ ہے۔"

"وجہ؟ ہماری آبائی توہم پرستی...... ہم خواہ کہیں چلے جائیں، کچھ سیکھ جائیں اپنے خون سے اس پست مادے کو دور نہیں کر سکتے جو جنم جنم سے ہماری تمام تباہیوں کا باعث بنتا چلا آ رہا ہے۔ ہم پیدائشی غلامی اور دوسروں کو سجدہ کرنے کے لیے ہوئے ہیں گاندھی نے ہمیں غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہم نے الٹا اسے مہاتما بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ سارا قومی جذبہ ایک دیوتا کی مہمل پرستش بن کر رہ گیا۔" واہ!

پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے ایلما فلاسفر بن گئی۔ شمن حیرت سے جز بز خاموش رہی۔

"جب ہم ایک دیوتا کو پوجتے پوجتے اکتا جاتے ہیں تو دوسرا بنا لیتے ہیں۔ ہماری بلا سے اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ اگر کوئی ہم سے دنیا میں بغیر دیوتا کے رہنے کو کہے تو ہم کبھی تیار نہ ہوں۔ میں نے تمہارے مذہب کے بارے میں بھی پڑھا ہے مگر مشرقی اور مغربی مذہب میں بھی فرق ہے، اتنا جتنا دیسی اور فرانسیسی شراب میں۔ ایک سلجھی ہوئی فلاسفی کا خمار ہے تو دوسرا ٹھرّے کا جنگلی نشہ۔ ایک میں عقل ہے تو دوسرے میں سانڈ کا جوش۔ یہاں ہندوستان میں کوئی مذہب سلامت نہیں رہ سکتا اس پر فوراً بھوانی میّا اور راکھشوں کی حکومت شروع ہو جاتی ہے۔"

"مگر تم لوگ تو...... عیسائی؟"

"سب واہیات، ہم تم، وہ سب ایک ہی ناؤ میں جھولتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے

جوش سے میلے کپڑے اتار کر نیا چولا پہنتے ہیں مگر دم بھر میں کیچڑ میں مچل جاتے ہیں۔ ہم ہر نئی چیز پر جھپٹتے ہیں خود دنیا بننے کے لیے نہیں، بلکہ اسے بوسیدہ بنانے کے لیے۔ ہم بالکل مکڑی کی طرح ہیں، جو حسین سے حسین پروانے کو اپنے جالے میں لتھیڑ کر فنا کر دیتی ہے، ایسے کہ پہچانا بھی نہیں جا سکتا، نمک کی کان میں جو کچھ بھی گر جائے نمک بن جاتا ہے۔

"تو تمھارے خیال میں ہندوستان کا مرض لاعلاج ہے؟"

"مرض تو کوئی لاعلاج نہیں" وہ تھوڑی دیر سوچ کر بولی۔ "مگر ہمارے طبیب ابھی تک مریض کے سرہانے کھڑے مرض کی تشخیص کر رہے ہیں۔ کسی نے گٹھیا تجویز کی ہے کوئی کہتا ہے صرف فسادِ خون ہے ہاں یہ سچ بھی ہے" یہ خون، ہندوستانی خون بہت ہی سیاہ ہو گیا ہے!" وہ اپنی سا دھوؤں جیسی آنکھوں سے نہ جانے کس سمت گھورنے لگی گو ایلما کی صحت گر رہی تھی۔ مگر جسم پر پھل دار درخت کی سی بھاری بھرکم لطافت چھائی ہوئی تھی۔ شمس اُسے خاموش پا کر غور سے دیکھنے لگی، نہ جانے کیوں اس کا گلا بھر آیا۔ اگر ایک درخت قدرت سے جنگ شروع کر دے تو وہ کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے آم بور لگتے ہی جل جائے اور پھل پیدا کرنے سے انکار کر دے تو؟ مگر ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بغاوت کا حق تو صرف اشرف المخلوقات کو ہی حاصل ہے کہ اگر وہ قدرت کی ضدیں پوری کرنے کو تیار نہ ہو تو کوئی اُسے مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بغاوت اس نے سیکھی کہاں سے؟

ایلما کی ٹرین روانہ ہو گئی تو ہزاروں سوال اس کے دماغ میں گورکھ دھندوں کی طرح الجھتے سلجھتے رہ گئے دل ایک بھاری سے بوجھ کی شدّت سے دھنسنے لگا۔ وہ پُر حسرت بوسہ جو ایلما افتخار کے لیے اس کے ہونٹوں پر چھوڑ گئی تھی انگارے کی طرح کی دہکنے لگا اس کی امانت محفوظ رہے گی؟ کاش انسان اتنا بزدل نہ ہوتا!

واپسی پر اس نے لان کی بنچ پر سیتل کو بیٹھے پایا۔ وہ گھاس کے درمیان جھلکتی ہوئی خشک زمین پر کسی گزرے ہوئے نقشِ پا کے نقش پا ڈھونڈھ رہا تھا

"گھاس کی جڑ تک کھا جاتے ہیں یہ کیڑے! اس نے زنجیر نما لہریے کی طرف اشارہ

کر کے کہا۔

"کیا بوٹنی کا مطالعہ شروع کر دیا ہے" ۔ شمن نے آواز میں طنز کی جھنکار پیدا کر کے جواب دیا۔

"نہیں نہیں، ابھی میں نے مالی سے پوچھا یہ ٹینس کورٹ کیوں گنجا ہوتا چلا جاتا ہے .... تو ......" مگر شمن کے چہرے پر روہانسی مسکراہٹ دیکھ کر وہ چپ ہو گیا

"اسے بھیجا کر آرہی ہیں، یہاں بیٹھ جائیے"۔ اس نے ایسے لجاجت سے کہا کہ شمن کو ہنسی آگئی۔ یہ مرد بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں آگ کو ہمیشہ بھوبل میں دبانے کی کوشش کرتے ہیں ہنسی ہنسی میں جیسے کانچ کا گلاس توڑ کر بیٹھا منہ بسور رہا ہو شمن اس کے پاس بیٹھ گئی۔

ظالم اور مظلوم کا فرق بھی بالکل وہم کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ اگر ایلما بھی ستیل کو مقررہ سزا دے دیتی تو وہ یوں خود اپنے ضمیر کی جوتیاں نہ کھاتا اس کی بے نیازی نے تو خاموش گھٹن کو اور بھی بڑھا دیا۔ کاش سزا پر طمانچہ مار دیا جائے تاکہ احساس تو ٹھوکریں کھانے سے بچے!

"میں نے اس سے کہا بھی کہ میں پتا جی کی دھمکیوں کی پروا نہیں کرتا۔ میری ماتا کی جائداد کافی ہے"۔ وہ شکایتاً بولا اور شمن کو اس پر ترس آگیا، لوگ ابھی تک جائدادوں اور والدین کی دھمکیوں کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ گویا پیسہ ہی تو ضمیر کا مول ہے۔ مگر ستیل یہ عذر شمن کے سامنے کیوں پیش کر رہا تھا۔ شاید خودداری مظلومیت کی پناہ میں شکست خوردہ ریزوں کو دوبارہ جوڑنا چاہتی تھی۔

"ٹینس نہیں کھیلیں گی؟" اس نے شمن کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر روکا۔ جیسے اسے تنہائی سے خوف آرہا ہو۔

"میرا ریکٹ تو کمرے پر ہے ـــ" گو وہ ارادہ کر کے آئی تھی کہ ستیل کی جی بھر کے درگت بنائے گی۔ مگر نہ جانے ماما کی کون سی رگ بھڑک اٹھی کہ وہ بالکل ہی پگھل گئی۔ روتے کو اور کیا چھیڑنا۔

ٹینس کے تین سیٹ ختم کر کے جب وہ ہلکی پھلکی کمرے پر پہونچی تو اس کا ضمیر اس پر پھٹکار برسانے لگا۔ حیف ہے کہ وہ اپنی سب سے پیاری سہیلی کے دشمن کی دل جوئی کر رہی تھی! وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ جیسے ایلما کی چتا پر ناچ کر آ رہی ہو۔ خوف زدہ ہو کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے خوب چھینٹے دیئے۔ آئندہ سے وہ سیتل سے بات بھی نہ کرے گی۔

لیکن یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یونین کی اتنی اہم عہدہ دار ہوتے ہوئے اُسے سیتل سے نجات ملنا مشکل تھی وہ جب چاہتا اس سے ضروری معاملات کے متعلق مشورہ کرنے آن دھمکتا۔ کلاس میں، کلاس سے باہر، لائبریری میں، ٹینس لان پر، کھانے کے کمرے میں، اور یونیورسٹی کے ہر کونے سے سیتل نے اُس پر بادلوں کی طرح امنڈنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک ننھے سے نکتے میں کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ یہ گھراؤ اس کا دم کیوں گھونٹے دیتا ہے؟ قوّت مقابلہ اتنی سست اور بدمست کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ سیتل نے تین گھنٹے لائبریری میں اسے لغو شاعری سنائی وہ سنتی رہی۔

وہ پیر سکیڑے آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھی بڑھتی ہوئی تاریکی کو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے محسوس کر رہی تھی ڈوبے ہوئے سورج کی آخری جھلک کمرے کو مسحور کن رنگ میں ڈبوئے ہوئے تھی کہ اچانک اس کے دماغ میں گھس کر پنسلین اور لوینڈر میں ملی جلی ایک شیریں لسائند کے چھپاکے نے چونکا دیا۔ وہ اس نشیلی لپٹ سے دماغ کو چھڑا کر پیچھے مڑی۔ سیتل ورزش کے بعد پسینے میں نہایا ہوا اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال بکھرے بازو عریاں تھے اور پنڈلیاں پسینے سے چمک رہی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا کہ شمتن کا دم گھٹنے لگا معلوم ہوا کسی نے اسے گوشت و پوست کے انبار میں لپیٹ کر جکڑ دیا۔ لمبی لمبی سانسیں بھر کے وہ سنبھلی اور بدحواسوں کی طرح بھاگی۔

غسل خانے کے نل سے اس نے گٹ گٹا کے پانی پیا اور دیوار سے لگ کر بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹنے لگی۔ دیر تک ایک ابکائی کا احساس اس کے دماغ میں پھنسا رہا اور وہ نڈھال پلنگ پر پڑی رہی۔

کھانے کی میز پر باوجود سیتل کے شدید اصرار کے وہ وہاں سے اپنے بھاگنے کی کو

معقول وجہ نہ بتا سکی نہ ہی اسے کچھ معلوم تھا اس کے وجود نے بھاگنا چاہا اور بغیر کہے سنے بھاگ نکلا۔ کہتے ہیں بہت سے حیوان طوفان کی آمد سے پہلے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔

اور افتخار؟ اس کے خیال ہی سے غرور سے اس کا سر بھاری ہو جاتا، کیا بات تھی جو افتخار میں سیتل سے مختلف تھی جس نے اس کے وجود میں اس بلا کی کشش پیدا کر دی تھی؟ جہاں تک صورت شکل اور دولت کا سوال تھا وہ سیتل سے میلوں مارا ہوا تھا۔ پھر بھی سوائے مس بوگا کے اس سے سب لڑکیاں چڑتی تھیں۔ کیا عجب جو ایلما نے بھی سیتل کے جسم میں افتخار ہی کی جستجو کی ہو اور ناامید ہو کر لوٹ پڑی۔ امتحان سر پر آگئے اور سیتل کی ساری نفرت خوف اور کشش کو بھول کر اس نے کتابیں سنبھال لیں۔

۳۲

امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے سستی اور بے کاری کے لمبے چوڑے دن گپ بازی میں کاٹنے دشوار ہو گئے۔ بورڈنگ میں رہتے رہتے اسے گھر سرائے معلوم ہونے لگا تھا۔ بی۔ اے کے بعد ایک طرح تعلیمی جنکشن پر اتر کر ذرا ادھر اُدھر نگاہ ڈالنے کی فرصت ملی گھر میں بچوں کی تعداد چوگنی ہو گئی تھی۔ بھائی کمانے میں جٹے ہوئے تھے اور بھاوجیں پود بڑھانے میں مشغول، معلوم ہوتا تھا زندگی کو ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی طرح ہر ایک آگے گھسیٹنے میں مشغول ہے، کوئی بھی تو مرمت کے لیے دم نہیں لیتا، چولیں ڈھیلی، پھٹے بھاگ نکلنے کو تیار، چھت غائب، پیندے میں چھلنی جیسے چھید مگر بیل کی گردن پر جُوا مضبوط اور لاٹھیوں کے ٹھوکے جاری جو کسی کے روک کر پوچھنا چاہو کہ "بھئی کہاں کا قصد ہے؟" تو ہکّا بکّا ہو کر جواب ملتا ہے "کہیں کا نہیں!" اس دنیا میں ایک دفعہ

آنے کے بعد سوائے قبر کے اور کہاں جایا جا سکتا ہے گرتے پڑتے سب ایک ہی نشان کی طرف دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اس امید میں کہ وہاں جنت ملے گی۔ دفتر سے بے فکر مزے سے گزرے گی، حوریں ملیں گی اور جواہرات کے محل، جو کچھ سمیٹا جا سکے وہیں کے لیے اٹھا لو۔ ٹھوسم ٹھاس ایک بار وہاں پہنچ جائیں۔ تو پھر وارے نیارے ہیں اگر جنت کی تاک میں دنیا دوزخ بنتی ہے تو کچھ پروا نہیں۔"

چھٹیوں میں انور، برکت، عباس اور سبیل کے خط آئے۔ افتخار اور آلما خاموش رہے۔ ششی کا میاں انگلینڈ سے مغربی بنیا بن کر آ گیا۔ مس بوگا نے فلسفے میں ریسرچ شروع کر دی اور شمن؟ نتیجہ سننے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس شمن کا کیا کرے؟ زندگی کی گاڑی گھسٹوانے کے لیے کئی وضع دار بیٹھے ساتھ دینے کے لیے موجود تھے مگر کسی کا دھرا کمزور، کسی کا ہال ڈھیلا، ڈپٹی کلکٹریاں محدود، پولیس کا دائرہ مقرر، جنگلات میں پیالہ لبریز، زمانے کی افراتفری کو دیکھتے ہوئے مس شمشاد نے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول فرمالی۔

اسکول کی عمارت ایک دریا دل رئیس کی بے کار کوٹھی تھی جو انھوں نے بدزبان لوگوں کی بکواس سے بچنے کے لیے اپنی منہ چڑھی طوائف کے لیے آبادی سے ہٹ کر بنوائی تھی اور جہاں سے ہر کرایہ دار چھپکلیوں اور مچھروں سے تنگ آ کر بھاگ چکا تھا۔ اسکول کا باقی سامان کرسی اور بگڑے دل رئیس کی ناٹک کی بنچوں اور نیلام کی میزوں پر مشتمل تھا۔ ایک اور رئیس جن کے باپ دادا کو ادب سے لگاؤ تھا لائبریری مہیا کرنے پر تل گئے تھے۔ چونکہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے کوئی کنواں میونسپلٹی کی زیادتی سے دست یاب نہ ہو سکا اس لیے دنیا بھر کی واہیات اور لغو کتابیں جنھیں مصنف کے بعد شاید کاتب ہی نے پڑھا ہو اپنی تمام بھیانک ضعیفی کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔ جتنی لڑکیاں رجسٹر میں درج تھیں اس کی نصف تو شاید کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ چار اسسٹنٹ معلمات تھیں جنھیں بیس روپیہ مہینہ دے کر تیس روپے کی رسید لی جاتی تھی۔ بے چاریاں غربت اور بیوگی کی لعنت میں گرفتار تھیں۔ ورنہ محکمہ تعلیم سے ان

دکھیارئیوں کا تو دور کا بھی واسطہ تھا۔ دو چپراسنیں تھیں جو خوش حال دنوں میں نائکہ کی لطیف خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکی تھیں۔ ایک چپراسی تھا جو منیجر صاحب کا باورچی، بیرا، فراش اور بچوں کی گورنس کی خدمات کے علاوہ انسپکٹرس کے آنے پر بھورا کوٹ اور سفید صافہ باندھ کر مؤدب کھڑے ہونے کے کام بھی آتا تھا۔ اسکول کی تمام کارآمد کرسیاں اور میزیں خالی اوقات میں منیجر صاحب کے ڈرائینگ روم کو زینت بخشتی تھیں۔ چاروں استانیاں زیادہ تر ان کے بچوں کی مرزئیاں لحاف اور ململ کے کرتے سیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں کشیدے کے کام سے بہت لگاؤ تھا اور یہ استانیاں پچ رنگے ڈوروں سے ان کے غلافوں پر "سویٹ ڈریم" اور "فور گٹ می نوٹ" بہت صفائی سے کاڑھا کرتی تھیں۔

ان میں سے ایک استانی رضیہ بیگم کو تیس روپے کی رسید پر پینتیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ہر ماہ منیجر صاحب یہ زائد پانچ روپے اپنی جیب سے ادا کرنے کی دھمکی دیتے مگر پوری نہ کرتے۔ ان کی آمد پر مسز منیجر نے فینائل اور ٹنکچر آیوڈین وغیرہ پینے کی عملی دھمکیاں دی تھیں۔ رضیہ بیگم بھاری جسم کی ادھیڑ عمر بیوہ تھیں۔ قرآن شریف کے علاوہ اردو اور رسمی فارسی سے بھی واقفیت رکھتی تھیں کبھی خاصی قبول صورت ہوں گی مگر برص کے سفید داغوں نے ذرا بدہیئت کر دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ داغ پرانے تھے مگر مسز منیجر کا خیال تھا کہ یہ ان کے وظیفوں اور ان کے پیر کی دعاؤں کا ہلکا سا عکس تھا جو رضیہ بیگم پر پھٹکار بن کر برس رہا تھا۔

رضیہ بیگم سے سوائے خرانٹ چپراسنوں کے سب ہی مرعوب تھے یہ چپراسنیں ان کی گزشتہ زندگی کی بہترین رازدار تھیں۔ ان سے بہت بے تکلفی تھی اور بڑی والی بڑھیا تو انھیں رجو بی ہی کہا کرتی تھی۔ رجو بی کا زیادہ وقت مونگ پھلیاں ٹونگنے اور منیجر صاحب کے سوئٹر بننے میں صرف ہوتا تھا۔ یہ سوئٹر وہ اس قدر پیچیدہ نمونوں کے بنا کرتی تھیں کہ دماغ الجھ کر رہ جاتا پڑھاتی خاک تھیں۔ لڑکیاں بیٹھی یا تو اون سلجھایا کرتیں یا ان کے سر میں چٹکیاں بھرا کرتیں اور چپراسنیں بیٹھی انھیں محلے ٹولے کی عاشقیوں کے قصے سنایا کرتیں

یا بڑی استانی جی یعنی شمن کی بدحواسیوں پر مباحثہ کیا کرتیں. شمن سے پہلے بھی دو ہیڈ مسٹریس میٹرک پاس آئیں مگر تین مہینے بعد بھاگ نکلیں. شمن کی آمد پر نہ جانے کیوں مسلم گھرانوں کی توجہ تعلیم کی طرف تیزی سے مبذول ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو عیسائی عورتوں کا اضافہ ہو گیا. داخلے بھی تیزی سے ہونے لگے. ایک گریجویٹ ہیڈ مسٹریس کا لاسہ لگا کر منیجر صاحب اعلیٰ خاندان کی لڑکیاں بھی پھانس لائے مگر یہ اعلیٰ خاندان صاحبزادیاں. دو اوٗں اناڑی اور ایسی ہی گھنی گھنائی بڑھیوں کی نگرانی میں کانچ کے گلاس بن کر آتیں، چاروں طرف اٹھلاتی پھرتیں اور پھر ان کی موٹریں نگھیاں آجاتیں اور وہ چل دیتیں.

شمن کی آمد سے پورا انقلاب آگیا. آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے منیجر صاحب اسے عجوبۂ روزگار بنائے لیے پھرتے.

"صاحب مسلمانوں میں کہاں تعلیم یافتہ لڑکیاں" اور لوگ بھی اسے ایسے گھورتے گویا اس کے منہ پر سونڈ لٹک رہی ہے. کام کی بات یہ ہوئی کہ انسپکٹریس شمن کے کالج کی پرانی طالبہ نکلیں اور یہ رشتہ اس قدر موثر ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کی گرانٹ بڑھ گئی اور منیجر صاحب گھنٹوں برآمدے میں سوکھنے کے بجائے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے لگے مگر وہاں بیچارے حد درجہ بدحواس رہتے اور انسپکٹریس یا ان کا کتا آجاتا تو ہڑبڑا کر کھڑے ہو جاتے. ویسے بھی اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھ گئی.

آن واحد میں دنیا بدل گئی. اسکول میں نیا فرنیچر، نقشے اور تصویریں نظر آنے لگیں ٹاٹ پر بیٹھنے کی عادی لڑکیاں بنچوں پر اکڑوں بیٹھنے کی مشق کرنے لگیں. اور شمن نے بڑی شد و مد سے عمارت کو پیوند پارے لگا کر درست کرنا شروع کیا. چھپکلیوں کے خلاف جہاد بول دیا. مس ٹامس اور مس الگزنڈر نیلی اور سرخ روشنائی سے پیچ پیچ کے ٹائم ٹیبل بنانے لگیں. لائبریری کی بھربھری بوسیدہ کتابوں کی سنبھال سنبھال کر ٹانکہ زنی کی گئی.

دو چار دن تو بہ جبر سینے پر پتھر رکھ کر چپراسنیں بھی مقررہ بنچوں پر بڈھے طوطوں کی طرح جمی رہیں رضیہ بیگم نے بھی مونگ پھلیاں ڈیسک میں چھپا دیں اور چپراسی نے دفعتاً دروازے کے بیچ میں لٹکے ہوئے گھنٹے کو پیٹ دیا. گھنٹہ بجاتے وقت شدتِ احساس سے اس کے کان

سرخ ہوجاتے اور گاڑی والے اپنی گپ بازی اور چلمیں چھوڑ کر ٹوٹتے ہوئے موٹر خانے سے اُسے بغور دیکھ کر مسکرانے لگتے۔

مگر کچھ دن بعد ہی ان بندشوں کا جادو فنا ہو گیا۔ رضیہ بیگم کرسی پر پالتی مار کر منیجر صاحب کے پیچیدہ سوئٹر بننے لگیں۔ چپراسنیں حسب معمول دہلیز پر پھسکڑا مار کر بیڑا ری لگا بیٹھیں۔ گھنٹہ بجانے کی موگری نقشے کی کیل ٹھوکنے لے جائی گئی اور پھر قرآن والی استانی کے کمرے میں ان کی چھالیاں کی ڈبیاں توڑنے کے لیے محفوظ ملی۔ شمن نے مغربی بردباری اور سنجیدگی سے بکھرتے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر وہاں تو جیسے نمک ستیہ گرہ شروع ہو گئی ہر چیز اس کی آنکھ بچتے ہی کھسل پڑتی اور مچل کر قابو سے باہر ہو جاتی۔ کرسیاں اور میزیں اور گملے منیجر صاحب کے یہاں دعوت میں مستعار گئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے چپراسی پھر باقاعدہ اپنے پرانے عہدے پر واپس چلا گیا اور دونوں عیسائی استانیاں پڑوس کے قومی اسکول کے ماسٹروں سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ لائبریری کی کل جاندار کتابیں مسز منیجر اور ان کی سہیلیاں پڑھنے کو لے گئیں جو پھر اگر واپس آئیں تو چیتھڑے اور دال سالن میں لتھڑی ہوئی۔

رضیہ بیگم نے تو ایک مستقل محاذ قائم کر لیا جس میں دونوں چپراسنیں بڑے جوش و خروش سے شریک ہو گئیں۔ لڑکیاں دن بھر آم اور بیر کے درختوں کے نیچے کشتیاں لڑتیں اور شمن کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ اس کے بنائے ہوئے گھروندوں کو ڈھانے پر مصر ہے جتنی جتنی اس نے سختی برتی عملہ پھرتا ہی گیا۔

رضیہ بیگم اور اتحادیوں کی کوشش نے اُسے بدحواس کر ہی رکھا تھا کہ مسز منیجر مع اپنے غلیظ اور نامعقول بچوں کی فوج کے اسکول کے معائنہ کو آدھمکیں پتہ نہیں یہ عہدہ انھیں کب اور کیوں دیا گیا تھا اصل وجہ کچھ اور ہی تھی۔ انھیں بڑے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا کہ لڑکیاں کچی امیاں بڑی بے رحمی سے کھانے میں مشغول تھیں۔ یہ قیمتی امیاں علاوہ اچار چٹنی کے ان کے گھر کا سال بھر کا کھٹائی کا اسٹور مہیا کرتی تھیں اور خود منیجر صاحب کو ان کی حفاظت کی فکر گھن بن کر کھائے جاتی تھی۔

"یہ تو ہونے سے رہا کہ میں لمبا سا بانس لے کر نگرانی شروع کردوں"۔ اس نے اُن کا دکھڑا سن کر رُکھائی سے کہا۔ "بچیوں کو تو میں نے منع کر دیا ہے مگر استانیوں کو کیا کہوں جو سکھانے کے لیے توڑتی ہیں"۔

"ہاں بہن یہی تو مصیبت ہے میں نے کتنی دفعہ کہا ان کمبختوں سے مگر نہیں مانتیں یہ رضیہ بیگم تو سب سے پیش پیش ہیں۔ بھلا تم ہی بتاؤ بہن، بھلا ان کی عمر اب کچی امیوں کی ہے بڈھی گھوڑی!"

"میں نے منع کیا تو انھوں نے کہا وہ آپ کے لیے اچار بنا رہی ہیں"۔

"خاک میرے لیے اچار بنا رہی ہے۔ اس کا بس چلے تو میرا ہی اچار بنا دے....

.... آپ کو نہیں معلوم ......" وہ رازدارانہ انداز میں پاس سرک آئیں

"بہن کیا بتاؤں ....." بڑی حسرت سے بولیں۔ "یہ اسکول کا تو اللہ مارا بہانہ ہے، چھ بچوں کے باپ مگر گن دیکھو تو اللہ توبہ۔ اس رضیہ کے پیچھے دنیا زمانے کے غنڈے لگے پھرتے ہیں اور اللہ کے بندے نے اس کے سپرد شریف بچیوں کو کر رکھا ہے، میں نے تو کہہ دیا ایک دفعہ کہ پڑھنا وڑھنا تو خاک نہیں، ہاں دو چار آنکھ لڑانے کے گر، بے شک سکھا دیں گی"۔

شمن ہنسی دبائے ان کی باتیں سنتی رہی۔ امیوں کی رکھوالی کا پختہ وعدہ لے کر مسز منیجر چلی گئیں تو دیر تک شمن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی رہی ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی تھی جس نے مسز منیجر کو بدحواس کر رکھا تھا اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر ایک بات بھی تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بدصورت عورت میں انھیں کہاں سے خطرہ نظر آرہا تھا۔

"اچار میں بھی خاصہ ڈالتی ہوں مگر انھیں تو اسی مردار کے ہاتھ کا پسند ہے اُسی کی چٹنی پہ دم جاتا ہے۔ دیکھ لینا ایک دن اُن کی چٹنی نہ بنا کر رکھ دے تو نام پلٹ کے رکھ دینا"، وہ کس وثوق سے کہہ گئی تھیں۔ تو کیا منیجر صاحب رضیہ کی چٹنی پہ عاشق تھے، شمن کو ہنسی آگئی۔ یقیناً عشق نرالا تھا اور چٹ پٹا بھی۔ یعنی اچار چٹنیوں کے ذریعہ بھی

عاشق پھنسائے جا سکتے ہیں۔ چٹنی کھاتے وقت اسے کبھی شبہ بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کا اتنا رومان انگیز مصرف بھی ہو سکتا ہے۔

شمن کا کمرہ اسکول سے ملحق ذرا جان دار حصے میں تھا۔ سامنے اس نے چھوٹا سا باغیچہ بھی بنا لیا تھا۔ جہاں وہ شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر سامنے میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا کرتی تھی۔ بازو کے برآمدے سے گزر کر ایک چھوٹی سی کوٹھری سی تھی جو رضیہ بیگم کو دے دی گئی تھی۔ ایک چپراسن دوسرا ہٹ کے لیے ان کے ساتھ رہتی تھی۔ اسکول کے بعد وہ کوٹھری کے سامنے پلنگڑی پر بیٹھ کر منیجر صاحب کے تکیوں کا غلاف کاڑھا کرتیں۔ نہ جانے انھیں اتنے غلافوں کی کیوں ضرورت پڑتی تھی۔ ضرور بیوی پار کر دیتی ہوں گی رضیہ بی کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" سے ان کی بےچاری کی اپنی نیند اڑ جاتی ہوگی۔ اب جیسے آموں کا موسم شروع ہوا تھا وہ امیاں چھیل کر چٹنیاں پکایا کرتی تھیں کتاب اور اخبار کو بھول کر شمن ان کے افسانے کو پڑھنے کی کوشش کرتی۔ رضیہ بیگم صورت سے کافی ہوشیار اور تیکی معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی زندگی کچھ معصوم نہ گزری ہوگی۔ کاش کوئی ان کی کتاب زندگی کے دو چار ورق الٹ دیتا۔ منیجر صاحب کو وہ بھائی جان کہتی تھیں۔ مگر اس ٹھکے سے کہ لفظ "جان" پر بےچاری مسز منیجر کی جان ہی تو نکل جاتی۔ کہتے ہیں عورت عورت کو پہچان لیتی ہے مگر پھر یہ کیا چیز تھی جو انھیں ڈرائے ہوئے تھی۔ اور شمن کو وہم معلوم ہوتا تھا۔ انداز درد

داخلے اور روزانہ حاضری کے رجسٹر بنانے کے لیے اسے کسی مددگار کی ضرورت ہوئی تو منیجر صاحب نے اپنے جان پہچان والے دو ماسٹروں کو بھیج دیا جو روز شام کو آکر اسے اور دونوں نئی عیسائی استانیوں کو جمع تفریق کی مشقیں از سر نو کرانے لگتے۔ ضرورت سے زیادہ بے کار خانوں کو نکتوں سے بھرنا۔ مہینہ بھر کی حاضری جوڑ کر لیے سال بھر کی حاضری میں سے گھٹانا اور پھر دنیا بھر کی الابلا کو گڈمڈ کر دینا۔ کتنی لڑکیاں ڈرائنگ لیتی ہیں اور کتنی فارسی، چونکہ یہ دونوں مضمون اسکول میں سکھائے جاتے تھے اس لیے یہ خانے نکتوں سے پُر کرنا۔

کبھی تو حبیب اور اکرم دونوں آتے اور کبھی حبیب اکیلا۔ اور جب رجسٹروں کا جھگڑا ختم ہو گیا تب بھی کسی نہ کسی بہانے سے پھیرا لگاتے رہے۔ کچھ کتابوں وغیرہ کا لین دین شروع کر دیا۔ ان کی ضرورت کی کتاب ساری لائبریریوں کو چھوڑ کر صرف شمن کی لائبریری ہی میں ملتی۔ حد یہ کہ حبیب کی توجہ ناقابل برداشت حد کو پہنچ گئی۔ لہٰذا آہستہ آہستہ ان کے پنجے ڈھیلے کرنے شروع کیے ایسے کہ وہ محسوس نہ کریں مگر انھوں نے تو ہزار پایہ کی صفت اختیار کر لی اور جتنا اکھاڑا جمتے ہی چلے گئے وہ آتے اور ہکلاتے ہوئے بدحواس سے بیٹھے رہتے ان کی اس قابل رحم گھبراہٹوں پر شمن مسکرایا کرتی۔ ضرورت سے زیادہ مہنگے سنگھار کر کے آنا شروع کیا اور شمن کی رکھائی پر مکمل مریض عشق بن گئے۔ مگر خاموش اور مسکین ایسے کہ مجسم سوال ہیں مگر زبان بند۔ یہ بوکھلاہٹ بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہ تھی۔

اس میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا۔ جاہل خاندان کا تعلیم یافتہ۔ عمر میں شاید پہلی مرتبہ ایک غیر اور شریف عورت سے آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ویسے لڑکیاں تو بہت دیکھی تھیں مگر تاک جھانک کر، اب جو یہ جیتی جاگتی بولتی چالتی عورت دیکھی تو سوائے عاشق ہونے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سیدھے سادے آدمیوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن نٹ کو بانس کی نوک پر قلابازی لگاتے دیکھ کر ششدر رہ جانا ہی پڑتا ہے تو شمن نے بے چارے کو بازی گر کی طرح مسحور کر کے گنگ کر دیا تھا۔ اس الجھے ہوئے جذبے کو وہ عشق سمجھ رہا تھا اور اس بغیر معقول وجہ کے عاشق ہو جانے سے شمن کو جلن۔ جنس مخالف ہونا معشوقہ بننے پر تو مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ہی ہر مرد کو ہر عورت پر عاشق ہونے کا حق ہے۔

شمن کو اس پر ترس بھی آتا اور غصہ بھی اس نے تخیل ہی میں اس کی آئندہ زندگی، ایک مختصر مکان میں معمولی سی بیوی اور غیر معمولی تعداد میں بچے غربت کی گود میں پلتے دیکھ لیے۔ یہ لوگ بس زندگی میں ایک بار اپنے طبقے کو چھوڑ کر عشق رچا لیتے ہیں خواہ وہ یک طرفہ چیز ہو مگر ناکامی لازمی نتیجہ ہے اور شاید ایسا عشق کر کے ناکام ہونا ہی اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ یہ درمیانہ طبقہ کا کم حیثیت لڑکا چھانٹ کر اپنے آسودہ

حال پروفیسروں کی لڑکیوں یا جس سیٹھ کے دفتر میں وہ چالیس روپے کا نوکر ہو اس کی اکلوتی لڑکی پر وہ عاشق ہو بیٹھتا ہے۔ اگر اچانک کبھی ایسے عشق میں کامیاب ہو جائے تو بھونچکا سا رہ جاتا ہے اسے بھگا کرلے جانے سے بھی خواب چورا چورا ہو جاتا ہے ذریا میں ڈوب کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے۔ وہ تو عشق صرف نام رہنے کے لیے کرتا ہے تاکہ اس کے قصے اپنی نئی دلہن کو ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کر سنایا کرے۔ رنڈی کو اپنی بیوی کا رقیب بنانے میں وہ ہتک محسوس کرتا ہے۔ نچلے طبقے کا ہوتے ہوئے بھی وہ عشق جیسے بلند جذبے کو بلندی ہی پر رکھنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی سے کبھی محبت نہیں کرتا مگر اس کے جنے ہوئے کیڑوں کی پرورش میں انسان سے چرخا بن جاتا ہے۔ اس کی بیماری پر ہاتھ پیر پھیلا لیتا ہے اور ذرا دردِ اٹھ جاتی ہے تو ہاتھ جوڑ کر منا لیتا ہے اپنی محبوبہ کا رتبہ بہت بلند سمجھتا ہے مگر اسے اپنی بیوی سے کم معصوم اور پارسا جانتا ہے۔

اس محبوبہ کو وہ روحانی تمازت کے لیے اپنی شخصیت میں چھپا لیتا ہے اگر اصلی نہیں تو خیالی ہی سہی وہ ہر طرح اس سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ جب بیوی حاملہ ہوتی ہے یا میکے چلی جاتی ہے تو اسے بڑی احتیاط سے نکال کر عشق حقیقی سے جی بہلاتا ہے اور یہی خیالی رقیب دور بچھڑی ہوئی بیوی کے سینے میں رشک کی آگ بھڑکا کر اس کی محبت کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔

جی گھبرا اٹھا تو وہ ٹہلتی ہوئی آم کے پیڑوں کی طرف نکل گئی۔ رضیہ بیگم بان کے پلنگ پر کھڑی چھڑی سے آم جھاڑنے میں مصروف نظر آئیں۔ نہ جانے کیوں وہ اس ادھیڑ عمر عورت کو بوالہوس لومڑی کی طرح کچی امیوں کی تاک میں دبھد کتا دیکھ کر چڑ گئی۔ سچ کہتی تھیں مسز منیجر کہ کچی امیاں کھانے کی بھی ایک بالغین کی عمر ہوتی ہے۔ واقعی بوڑھی گھوڑیوں کو ایسے بلک کر آموں پر ٹوٹ پڑنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ تو منیجر صاحب کی چٹنی بنانے کے لیے توڑ رہی تھیں۔

شمن کو دیکھ کر وہ سوئے ادب پلنگ سے اتر آئیں اور کنواری لڑکیوں کی طرح جھینپ کر سر ڈھانکنے لگیں۔ ان کی یہ چہرے پر کے آثار پیدا کرنے والی ادا کا مطلب

اب تک اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اتنی بڑی تھیں مگر بہت کم عمر اور چھوٹی سی بن کر "دیکھیے دیکھیے" کر کے اٹھلانے لگتیں اور گھبرا گھبرا کر بار بار سر ڈھانکتیں اور نیچی نظروں سے شرما کر مسکرانے لگتیں ان کی اس ادا سے آگ لگ اٹھتی مگر شاید ان کی یہی ادا منیجر صاحب کے کلیجے پر چھری چلا گئی ہو۔

بڑے پیار سے انھوں نے گری ہوئی کیریاں جمع کیں اور اپنی کوٹھری کی طرف چلی گئیں۔ رضیہ بیگم بڑی سگھڑ تھیں یہ مختصر سی کوٹھی ان کی صفائی اور خوش مذاقی کا نمونہ بنی رہتی۔ سامنے در کے اوپر گلابی پھولوں کی بیل چڑھا رکھی تھی۔ کیاریوں میں ساگ اور دھنیا پودینہ بو لیا تھا۔ دو چار گملے بھی رکھے تھے شام کو چھڑکاؤ کر کے ہلکی پلنگڑی پر بیگم کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر بیٹھتیں اور چپراسن سے محلے کی خبریں سنا کرتیں گو وہ فیشن ایبل نہ تھیں پھر بھی اپنی حیثیت بھر تازہ ترین تراش کے جمپر پہنتیں پیجامہ تنگ ہی رہتا مگر کرتے کے بجائے قمیص یا جمپر پہنتیں۔ تندرستی اچھی تھی کپڑا خوب کھلتا تھا۔ عموماً ہلکے خوش گوار عطر میں بسی رہتیں ان کے برخلاف مسز منیجر بے چاری حد درجہ کی پھوہڑ اور ہمیشہ بدحواس رہتیں۔ ایک بچہ کسی نہ کسی صورت میں ان پر چھایا رہتا۔ نہ تو انھیں کرتوں کے بجائے جمپر پہننے کی مہلت اور نہ اچار چٹنیاں بنانا جانیں۔ شادی کے بعد سے وہ خود ایک مستقل اچار بن کر رہ گئی تھیں جیسے گودڑ کی پوٹلی جس میں صرف چیتھڑے اور الجھے ہوئے تاگے تھے۔ گو منیجر صاحب نہایت اجڈ قسم کے بد وضع انسان تھے مگر پھر بھی کبھی کبھی گھبرا اٹھتے اور اسکول کی عمارت کے معائنے کا بہانہ بنا کر رضیہ بیگم کی صاف ستھری پلنگڑی پر آن بیٹھتے اور اپنے خسابوں کسی شان دار کلب کا لطف اٹھا لیتے رضیہ بیگم ان سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ مگر عجیب معشوقانہ انداز سے ہمیشہ کسی چیز کی آڑ سے ایسے کھڑی ہو کر باتیں کرتیں کہ صاف نظر آتیں نیز کپڑوں کی بھینی خوشبو بھی تھوڑی بہت پہونچ سکتی۔ منیجر صاحب نہایت کھرّے اور اپنی صاف گوئی کی بدولت بڑے غیر مقبول تھے مگر انھیں دیکھتے ہی مذاقیہ چٹکلے کسنے شروع کر دیتے۔

"کہیے کیا حال ہے آپ کی بدمزاجی کا؟" وہ ہمیشہ اسی طرح ان کی مزاج پرسی کرتے۔

"کوئی تازہ جھڑپ ہوئی مہترانی سے"؟

"میری کیوں جھڑپ ہوتی، وہ ہے ہی آپ کی منہ چڑھی، میری تو بات بھی نہیں سنتی"۔

اسکول کی عام صفائی رضیہ بیگم کے سپرد تھی، منیجر صاحب کہتے تھے کہ جب اسکول بڑھ جائے گا تو بورڈنگ کی منتظمہ رضیہ بیگم ہی بنائی جائیں گی۔

"وہ آپ کے کرتے تیار رکھے ہیں چپراسی کو دیدوں یا آپ خود لیتے جائیں گے"۔ وہ جھلا کر پوچھتیں۔

"نہیں، میں خود ہی لے جاؤں گا" وہ نہ جانے کیوں سٹ پٹا جاتے۔

"وہ اچار دانی آپ کے گھر میں توڑ ڈالی گئی۔ اب اگر اچار کھانا ہو تو گھر سے برتن بھجوائیے"

"ہاں وہ بچوں نے توڑ ڈالی ہیں دوسری بھجوا دوں گا"۔

"پرانا سوئٹر بھیج دیجئے گا ادھیڑ کر نیا نمونہ ڈال دوں گی"

"ہیں بنا بنایا ادھیڑ دوگی؟" وہ حیرت سے مسکراتے

"تو کیا ہوا، کام ہی کیا ہے اور مجھے؟" وہ ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہتیں حالانکہ چند روز پہلے شمن نے ان سے لائبریری کی کتابوں پر نمبر لگانے کو کہا تھا تو کام کی زیادتی کی شکایت شروع کر دی تھی۔ اور آج کس مزے سے سوئٹروں کی ادھیڑ بن کو تیار تھیں۔

ادھر حبیب کا رویہ صبر آزما ہوتا گیا اب اگر وہ ٹال دیتی اور مل نہ سکتا تو پرچہ ہی دے جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پرچے کی صورت چند لائنوں سے صفحوں میں تبدیل ہو گئی اور علاوہ دستی آنے کے ڈاک سے بھی آنے لگے۔ کئی بار کی شدید کوششوں کے بعد اگر کبھی ملنے کا موقع بھی ملتا تو غریب بدحواس اور مبہوت سا بیٹھا رہتا۔ شمن کو اس سے کوفت ہونے لگی نہ جانے دل کے کس کونے کی خوشنودی کے لیے اسے اٹکا رکھا تھا اس سے کسی قسم کا لین دین کرنے کا قصد نہ تھا مگر اس کے وجود سے ایک طرح کی قلبی طمانیت ضرور حاصل تھی۔ جب وہ آتا تو نہ ہی اس کا دل الٹا سیدھا دھڑکتا اور نہ

خون میں سنسنیاں پیدا ہوتیں پھر بھی بعض وقت تو اُسے ملاقات سے محروم کرنے کے لیے ہی اس کا انتظار کرتی۔

"کہہ دو۔ آرام کر رہی ہیں۔" وہ آتا تو کہلوا دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی انتظار میں ٹھیرنے کی دھمکی دیتا تو وہ جل کر خاک ہو جاتی۔ اسے یہ ربڑ کی گیند کی طرح ہر بار چوٹ کھا کر لوٹ آنے والی خاصیت سے اور بھی نفرت تھی۔ اسے چاہیئے تھا کہ فرمانبرداری سے سر جھکا دے۔ خیر اس کی حماقت کی سزا وہ یوں دیتی کہ اسے بٹھا کر دوسرے دروازے سے سینما یا خرید و فروخت کو چل دیتی۔ وہاں سے آتے ہی وہ سب سے پہلے یہ معلوم کرتی کہ طبیب کتنی دیر تک انتظار میں بیٹھا رہا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں، ہاتھ پیر سن ہو گئے تھے تو وہ اطمینان سے مسکرا کر دو چار پیار بھری ملامتیں اپنے آپ کو سنا لیتی ورنہ بات ہی ٹل جاتی۔

ایک دن چپراسی نے آکر کہا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں وہ حسب معمول کہنے ہی والی تھی کہ کہہ دو نہیں مل سکتیں کہ چق ہٹی اور ہاتھ میں تہہ کیا ہوا کمبل لیے افتخار کھڑا تھا۔ نہ تو وہ چونکی اور نہ ہی حیرت کے بے پناہ طوفان کو اپنے کسی انداز سے ظاہر ہونے دیا۔ اس زبردست بھونچال کے جھٹکے کو اس نے ایک معمولی "ارے" کے ساتھ سہہ لیا۔

افتخار پہلے سے زیادہ دبلا اور بدصورت ہو گیا تھا اس کے بال روکھے اور بے تکے پن سے بکھرے ہوئے تھے جسم پر گھسی گھسائی قمیص اور روئی کی مرزئی تھی گلے میں ایک میلا سا مفلر لپٹا ہوا تھا بہت بدل چکا تھا مگر اس کے جاننے والوں کے لیے پہچانتا اور بھی آسان ہو گیا تھا اس نے اب وہ چھلکا اپنے چہرے پر سے اتار پھینکا تھا جو یونیورسٹی میں مجبوراً چڑھائے رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے نقش و نگار دلی جذبات کا عکس بن کر رہ گئے تھے۔ وہ باغی آنکھیں اب کھلے بندوں تلخیاں بکھیرتی تھیں اور ہونٹ مستقل طنزیہ مسکراہٹ میں ڈوب چکے تھے۔ نسبتاً زیادہ بیمار اور چڑچڑا معلوم ہوتا تھا ہنسی میں کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ دیوانگی بھی برسنے لگی تھی جیسے وہ قطعی چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

"تم اب بھی ویسے ہی ڈرپوک اور دبو ہو۔" اس نے بزرگانہ انداز سے پوچھا

"میرے کپڑوں میں بد بو آرہی ہے اور شاید جوئیں بھی ہوں۔ تمہارے پلنگ پر بیٹھ جاؤں؟"

مگر وہ بغیر اجازت ہی بیٹھ گیا۔

"آپ کب آئے پہاڑ سے؟"

"ایں؟ پہاڑ سے؟ اوہ...... ہاں بھولا میں پہاڑ پر ہی اپنی صحت درست کرنے گیا ہوا تھا نا۔ ہاں......" وہ ہنسا "تو تمھیں کچھ نہیں معلوم؟"

"نہیں!"

"مگر مجھے تمہاری ہر بات معلوم ہوتی رہی۔" وہ کچھ جز بز ہو کر بولا "میں نے لغا میں تمھارے یہاں آنے کی خبر بھی سن لی سوچا چلو تم سے ہی مل آؤں تمہیں نہیں معلوم کہ اب ہمارا پہاڑ پونا میں قائم ہو گیا ہے جہاں دن میں چھ گھنٹے چکی چار گھنٹے......"

"ہیں؟ آپ جیل میں تھے؟"

"اور کیا ہوتا؟ خان بہادری کا خطاب ملتا؟"

"اور سب کا کیا ہوا؟"

"سارا گروہ پکڑا گیا!"

شمن حیرت سے منہ پھاڑے رہ گئی۔ کیسا گروہ؟ کیوں گروہ پکڑا گیا؟ یہ اسے ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ مگر خودداری نے اسے پوچھنے بھی نہ دیا۔ اتنا وہ جانتی تھی کہ افتخار اشتراکی تھا اور مشتبہ، مگر یہ اسے آج ہی معلوم ہوا کہ وہ دہشت پسند بھی ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ کو اس کی بزدل فطرت دہشت پسندی کے تخیل سے جھک گئی۔ مگر پھر فوراً اس کی بھاگی ہوئی ہمت لوٹ آئی۔ افتخار اپنی قوم اور ملک کی خاطر مٹ رہا تھا۔ اس نے اپنی جوانی اور زندگی کی بازی لگا کر آزادی چھین لینے کا عہد کیا تھا اس کے ہم خیالوں کا حلقہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور یہ مختصر حلقہ سارے ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے کو تیزی سے پھیل رہا تھا۔ بیداری بڑھتی جا رہی تھی۔ کسان اور زمیندار کا پرانا رشتہ نیا چولا بدل رہا ہے۔ اس کے سارے خواب عملی جامہ پہنتے جا رہے تھے مگر اس قدر سست رفتاری سے جیسے جوں کی چال۔ یہ ہندوستان کی ہر چیز رینگنے کی

کیوں عادی ہے صدیاں چاہئیں ایک طرف سے دوسری طرف گردن پھیرنے کے لیے۔

کھانے پر افتخار نے بڑی تیزی سے سونگھ سونگھ کر نگلنے اور بچانے کی کوشش کی مگر اس کی بھوک مر چکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"شلجم گوشت"

"شلجم؟ اور مجھے یاد ہے کہ کبھی یہ میری مرغوب ترین غذا تھی، میری اماں تانبے کی رکابی میں موٹی موٹی گھی لگی روٹی کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ ہم چولھے کے پاس ہی بیٹھ کر کھایا کرتے تھے، اور جب گھی جمنے لگتا تھا تو چولھے میں سے سلگتے ہوئے اُپلے کا ٹکڑا نکال کر اس پر رکابی رکھ لیا کرتے تھے۔ میری بہن کو نیبو بہت پسند تھے" وہ گزرے ہوئے زمانے کی سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نیبو منگواؤں؟"

"نہیں نہیں مجھے نہیں میری بہن بنّو کو پسند تھے"۔ پھر وہ خاموش ہو کر بڑے بڑے نوالے نگلنے لگا گویا کہہ رہا ہو کہ نیبو منگوانے سے روٹھا ہوا زمانہ تو واپس نہیں لایا جا سکتا۔ بنّو مٹی کی قبر سے ہم آغوش ہو گئی، اب شلجم اور نیبو کیا کر سکتے ہیں۔

"ایلما نے کوئی خط لکھا؟"

"نہیں تو"

"وہ ایک اسکول میں کچھ الا بلا پڑھانے پر نوکر ہو گئی ہے۔ پہلے تو ایک اسکول سے کچھ الٹی سیدھی تعلیم دینے کی وجہ سے نکال دی گئی تھی"۔ وہ مسکرایا۔ "پیٹ کی پکار ہاتھ پیر کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی تو جکڑ دیتی ہے۔ جب تک کالج میں رہے والدین کے پیسے یا تعلیمی وظیفوں سے عیش اڑا لیے پھر یا تو کلرکی کر و یا بھوکے مرو۔ ساری ہیکڑی ختم ہو جاتی ہے۔ جانتی ہو کہ دلیپ کہاں گیا؟ پکڑا گیا اور اب اسی وائسرائے کے دفتر میں نوکر ہے جس کی موٹر پر بم پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ جب وائسرائے کی موٹر گزر جاتی ہے تو وہ پہیوں کے نشانوں اور دھول کو سلامی دیتا رہ جاتا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ یہ خاک اس کی

بغاوت کو دفن کر سکے گی نہیں۔ یہ جذبہ اندر ہی اندر پلتا رہے گا، جب وہ مر جائے گا تو یہ نا مکمل آرزو اس کی اولاد میں خصلت بن کر باقی رہ جائے گی۔ محبوب کو اس کے باپ نے نہ جانے کیسے بچا لیا اور اُسے سرکاری وظیفے سے بیرونجات بھیج دیا گیا وہاں سے وہ پروفیسر بن کر آیا ہے اور کسی کالج میں پروفیسر ہے"۔

"کچھ مس لوگا کا حال معلوم ہے ؟"

"اوہ، ہاں بھول گیا، انھوں نے نرسنگ کا کورس کنگ جارج ہاسپٹل میں لے رکھا ہے۔ جیل کے ایک حسین تحفے کے سلسلے میں مجھے بھی پندرہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا، ذرا بھی نہیں بدلی ہیں۔ بڑی تن دہی سے کورس پورا کرنے میں لگی ہیں"۔

"سنا تھا شادی کر رہی ہیں ؟"

"ایں ؟ شادی، ارے وہ شادی نہیں کرے گی جب تک ......"

"کیا ؟"

"کچھ نہیں۔ یہی کہ جب تک کوئی رحم دل ان کا کنوار پن نہ ختم کر دے"

"توبہ ؟" شمن جھینپ گئی۔

"ہاں ہاں تم نہیں سمجھتیں، وہ .... وہ ...... عجیب چیز ہے وہ ان عورتوں میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی ماں بن جاتی ہیں مگر شادی سے کانپتی ہیں"۔

"ارے! یہ کیسے ؟" شمن کچھ نہ سمجھی

"ماں بننے سے میرا مطلب ہے کہ جذبۂ مادری ان میں شدّت سے موجود ہوتا ہے، مگر شادی کو ایک گھناؤنا فعل سمجھتی ہیں، جب تک کہ ......"

"اچھا چھوڑیئے، نہ جانے کیا لے کر بیٹھ گئے، یہ بتایئے کیا پروگرام ہے"۔

"شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا۔ جب تک کے لیے تم ہی بنا دو پروگرام"

"سینما چلیئے گا ؟"

"کہہ تو دیا کہ جیسی تمھاری مرضی۔ مگر سینما سے ذرا کم دلچسپی ہے۔ سوائے جذبات کو بھڑکانے کے اور تو کوئی مصرف نہیں ان کا۔ میں ویسے ہی گرم مزاج ہوں"۔

"چہ آج نہ جانے کیا ٹھان کر آئے ہیں جی میں"۔

"بھئی ٹھیک تو کہہ رہا ہوں .... بھلا خود ہی سوچو کسی کو عشق لڑاتے دیکھ کر مجھے کیا طمانیت قلب حاصل ہو سکتی ہے۔ سچ پوچھو تو کامیڈی دیکھ کر غصہ آتا ہے وہ سالا ہیرو کوڑی کام کا نہیں مگر عیش اڑا رہا ہے اور ہم ہیں کہ ...."

"خیر چلیے ٹریجڈی ہی دیکھ لیں ...... دلیو داس پسند ہے"۔

"واہیات۔ ٹریجڈی پر تو اور بھی جھنجھلاہٹ آتی ہے، اور دیو داس کو تو ٹھونکنے کو دل چاہتا ہے"۔

"یا اللہ یہ کیوں؟"

"بیچڑ کم بخت، بھاگ جاتا لڑکی کو لے کر"۔

"اونہہ تو نہ جائیے، یہ کیوں نہیں کہتے"

"یہاں ایک پارک بھی تو ہے"۔

"ہاں"۔

"اگر تمہارے ساتھ میرے جانے سے تمہیں اسکول سے نکال نہ دیا جائے تو چلو ذرا کھلی ہوا ملے گی، نہ جانے کب سے مقبروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں"۔

"مگر ایک فائدہ تو ہے ان فلموں سے"۔

"شکر ہے کہ کچھ تو ملا آپ کو"۔

"ہاں ہمارے پوشیدہ امراض کی دواؤں کی تو خوب ترقی ہو رہی ہے یہ دیکھو کہ ہر فلم کے اشتہار کے ساتھ اس کی دوا موجود ہے ..... نہیں سمجھیں؟" شمن کے اکتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنسا۔ "تم لوگ بنتی ہو یا واقعی بے وقوف ہو"۔

"جو کچھ بھی سمجھ لیجیے"۔

"ارے بھائی فلم کا آخری شو دیکھ کر چونی کا ٹھرا چڑھانے کے بعد سڑک کے کنارے نالیوں میں کیا ہوتا ہے مزے سے لیٹ کر فلمی ڈرامہ دہرایا جاتا ہے"۔

شمن چپ رہی۔

"بعض خوش نصیب تو بازارِ حسن میں اپنی سلوچنا اور مادھوری ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور بعض ......"

"کیا؟"

"کچھ نہیں، تمہیں کراہت آئے گی۔ جانے دو ان باتوں کو۔ دوسرے یہ باتیں یا تو ضرورت سے زائد مقدس ہیں یا فحش کہ ان کا ذکر معیوب سمجھا جاتا ہے۔ نہ جانے ہم اپنے عیوب کا ذکر سن کر اس قدر چراغ پا کیوں ہو جاتے ہیں۔ اونہہ جانے دو..... ہاں بتاؤ کچھ اپنے اسکول کا حال، استانیوں پر بڑا رُعب گانٹھتی ہو گی۔"

"نہیں تو، بے کار اترانے کی مجھے عادت نہیں۔"

"دھیمی دھیمی چاندنی پھیلی ہوئی خاموشی کو اور بھی پُراسرار بنا رہی تھی۔ پارک میں چاروں طرف زندگی کا احساس موجود تھا، مگر خاموش اور دھندلا معلوم ہوتا تھا نیم خفتہ روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں چاندنی اور خاموشی نے مل کر آوازوں کو بھاری اور دھیما کر دیا تھا۔"

"تمہیں تعجب ہو گا؟" فضا سے مسحور ہو کر افتخار نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"اگر میں کہوں کہ مجھے تم بہت پسند ہو۔"

"نہیں!" شمین نے قلابازیاں کھاتے ہوئے دل کو دبوچ کر کہا۔

"اور کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے اس حد تک متاثر کیا ہے۔"

"لیکن یہ سب کیوں؟"

"پتہ نہیں!" وہ متحیر سا تھا۔ "پتہ نہیں میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں، تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار محبت کی ہے، کم از کم یقین تو یہی کیا ہے اور یقین دلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر تمہیں..... تمہیں میں کچھ یقین نہیں دلانا چاہتا۔"

"اور نہ ہی مجھے کچھ یقین کرانے کا حق ہے۔" شمن کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"شاید"

"اور یہ بھی ایک وہم ہی ہو!"

"ہو سکتا ہے!"

"تو پھر میں جیل سے چھوٹ کر سیدھا تمھاری طرف کیوں بھاگا۔ جیسے میرے برسوں کے سڑے بسے زخم کا مرہم تمھارے ہی پاس ہے۔ تم سے ملتے ہی شفا ہو جائے گی!"

"شاید یہ بھی وہم ہو!"

"اونہہ، مجھے جلاؤ مت ..... شمن خدا کے لیے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو اور اگر کچھ سمجھ میں آجائے تو مجھے بھی سمجھا دو میں کیا ہوں اور کیوں ہوں؟" وہ بھولے بچوں کی طرح التجا بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ شمن کا دل بھر آیا۔ وہ کیا دے سکتی ہے اُسے۔ اس کے پاس افتخار کے دکھوں کا علاج کہاں ہے؟ وہ اس سے کچھ مانگ بھی تو نہیں رہا۔ اس کی حالت اس لاوارث بچے کی سی ہے جو گھر سے بھٹک آیا ہو اور والدین کا نام و نشان بھی نہ دے سکے۔ کون کر سکتا ہے ان گم شدہ لوگوں کی رہنمائی!

"شمن، جانے کیوں میری آرزو ہے میں کسی سے محبت کروں۔ جی بھر کے محبت کروں مگر میرے دل سے ہر چیز کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اس نے بنائی، تو ہم پر کیا احسان کیا، اُسے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے؟ اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلانے کی دھمکی دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کیڑی بھینگی دنیا تمھیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ، پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر خشکی ہے تو وہ کم بخت بے تکی۔ جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو دونوں ہاتھوں سے گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سُبک اور نفیس دنیا بناؤں کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔" شمن کو اس کے بچپن پر ہنسی آئی۔

"مگر آپ تو کہتے تھے ہر مرض کا علاج ہو سکتا ہے، آپ اشتراکی ہو کر ہمت ہار جاتے ہیں"۔

"میں اشتراکی تو ہوں مگر میری روح تو فاشزم کی عادی ہو چکی ہے۔ اشتراکیت ہم سے اتنی دور ہے جتنا یہ آسمان زمین سے"۔

"کیا یہ فاصلہ کبھی کم نہ ہو گا؟"

"ممکن ہے کسی دن ہو جائے مگر میں کہاں زندہ رہوں گا"۔

"ارے وہ تو آپ کی اسکیم؟"

"دو چار بم پھٹے تین چار ریلیں لڑیں، وائسرائے کی موٹر میں پنکچر ہوتے ہوتے بچ گیا۔ وہ زور سے ہنسا۔" نصف سے زیادہ کام کرنے والے جیل میں چکیوں پر جٹ گئے۔ اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ گٹے دیکھو"۔ اس نے ہاتھ پھیلائے۔

"چہ اے ہے، نہ جانے کیوں جاتے ہیں جیل میں"۔

"کہتے ہیں بغیر جیل میں گئے عوام کو قوم پرستی کا یقین نہیں آتا جیسے یونیورسٹی کی مہر کے بغیر سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جب تک جیل کا سارٹی فیکٹ نہ ہو قومی اسٹیج پر نہیں ناچا جا سکتا۔ اس لیے بعض وقت تو بڑی کوششوں سے جیل جانا پڑتا ہے"۔

"چہ بے کار میں"

"جی ہاں بے کار کا ڈھکوسلا، بات یہ ہے کہ ہمارے لیڈروں کے پاس سوائے جیل جانے کے کوئی عملی ثبوت ہے بھی تو نہیں قوم پرستی کا۔ اب یہ لکھ پتی دو چار مہینے کی جیل نہ کاٹ آئیں تو عوام الّو کیسے بنیں اور ان پر پھول ہار کی بارش کیسے ہو"؟

"مگر سب تو لکھ پتی نہیں"۔

"ہاں اور ان کے پاس کوئی حربہ بھی تو نہیں جسے استعمال کریں سوائے سڑک پر مچل جانے کے اور اس کی سزائیں" اماں جان" کوٹھری میں بند کر دیتی ہیں۔ ارے یہ باتیں زبانی نہیں سمجھی جاتیں، سمجھنا ہے تو آجاؤ میدان میں۔ پر کھدر پہننا ہو گا یہ ململ نہیں چلے گی"۔ وہ اس کی ساڑھی کے آنچل کو جھٹکنے لگا۔ "آبلے پڑ جائیں گے"۔

آبلوں کے ذکر سے اسے مس بو گا یاد آ گئیں۔

یہ مس بوگا نرس کیوں بن رہی ہیں؟"

"دل کی بھڑاس نکالنے کو، میاں اور بچے نہ سہی، مریض ہی سہی!"

"ہشت، وہ تو پاک محبت کی ہمیشہ سے قائل ہے۔"

"پاک محبت سے تمہارا کیا مطلب؟ ماں اور بیٹے کی محبت" آج افتخار لکچر بازی پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں، بلکہ ایک۔ ایک دوست سے ہمدردی!"

"دوستی کوئی چیز نہیں، ایک عورت اور مرد کی صرف ایک مقصد کے لیے دوستی ہو سکتی ہے اور وہ......"

"اونہہ جانے بھی دیجیے۔ دنیا میں ہر عورت کو بیوی نہیں بنایا جا سکتا۔"

"تم سچ کہتی ہو ہر عورت کو —— بیوی تو نہیں بنایا جا سکتا......
مگر......" وہ الفاظ ڈھونڈھنے کے لیے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگا۔ "مگر مس بوگا کی محبت ہی نہیں، نہ تو اس میں ماں کا سا معصوم پیار ہے اور نہ محبوبہ کی پر جوش گرمی وہ تو ایک بجھے ہوئے شعلے کی بے حقیقت گرمی بھی نہیں برف کی طرح ٹھنڈی اور مٹی کی طرح بے جان ہے کچھ بوسیدہ اور گھسی ہوئی سی وحشت ہے۔"
وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"اور میری...... میری محبت کس قسم کی ہے؟" اس نے سرگوشی میں خود سے پوچھا "یہ میں کس قسم کی محبت کرتا ہوں؟ یہاں کس قدر حسین اندھیرا ہے، تم ہو اور میری صدیوں کی پیاسی روح مگر ایک لمحے کو بھی میں یہ گوارا نہ کر سکوں گا کہ تم کو اس بلندی پر سے گھسیٹ کر نیچے لے آؤں جہاں میرے تخیل نے تمہیں بٹھا رکھا ہے کیا میں اتنا شریف ہوں؟ ہنہ!" اس نے لفظ شریف کو حقارت سے تھوکا۔

"یہ آپ اپنی ہر خوبی کو کمزوری اور طاقتوں کو غلطیاں کہہ کر گویا بڑا بھاری احسان کرتے ہیں!"

"لاحول ولا قوۃ، مگر میں شرافت کو اپنے لیے توہین سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھتی ہو۔

میں تم سے اپنی پارسائی کا سارٹیفکیٹ لینا چاہتا ہوں۔" وہ واقعی جھلا اٹھا۔" ابھی یہاں اس سنسان کونے میں اگر میں چاہوں تو....."

" آپ کچھ نہیں کر سکتے۔"

" کیوں؟" افتخار کا منہ اتر گیا۔

" اس لیے کہ آپ اتنے برے نہیں جتنا آپ کے وہم نے بنا رکھا ہے۔"

" کیوں؟"

" اطمینان قلب کے لیے آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جنھیں خود پر پھٹکار بھیج کر یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس طرح ان کے گناہ دُھل گئے۔"

" گناہ؟ مگر کون بے وقوف گناہ و ثواب کا قائل ہے؟"

" آپ کا ضمیر!"

" ہشت غلط۔ ضمیر ایک غلط فہمی ہے اور کچھ نہیں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں....."

" برا سمجھ کر کرتے ہیں اور اچھا ہوتا ہے۔"

" ایں؟" وہ چونکا

" آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ دل کے برے نہیں۔"

" یعنی زبردستی۔"

" جی ہاں، اگر مجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے ساتھ کبھی نہ بیٹھتی۔"

" بڑی تنگ خیال ہو!"

" جو کچھ بھی سمجھ لیجیے! چلیے اب خنکی بڑھ رہی ہے آپ کو کچھ ہو گیا تو....."

" تمہاری بلا سے!"

" جی نہیں۔ آپ کی زندگی میری نظروں میں اتنی سستی نہیں جتنی آپ نے بنا رکھی ہے۔ ابھی آپ کو دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے، اور دنیا کے لیے مجھے آپ کو زندہ رکھنا ہے۔"

" ہوں، دنیا کے لیے؟ اور کسی کے لیے نہیں۔" وہ مردہ دل ہو گیا۔" دنیا کے لیے جیتے جیتے تو اب دل اچاٹ ہو چکا ہے، تمھیں کیا غرض مجھے دنیا کے لیے جلانے کی؟"

"میں بھی تو دنیا ہی میں ہوں!" شمن کو اپنی ہمت پر سخت حیرت ہوئی۔

"اوہ!" وہ دیر تک خاموش سر جھکائے کچھ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

افتخار چلا گیا تو وہ دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ اس نے امتحان کے دو پلڑوں میں افتخار اور سیتل کو تولنا شروع کیا ایک کے تخیل ہی سے پہلے کو دھکا لگتا تھا اور دوسرا ایک مست کن غبار کی طرح چاروں طرف سے اسے مسحور کرتا جا رہا تھا اتنی دیر ساتھ بیٹھی مگر ایک مرتبہ بھی تو اُسے وہ نیم وحشیانہ احساس نہ ہوا جو آخری مرتبہ سیتل سے مل کر ہوا تھا یہ کیا؟ جس نے اس کی زندگی میں اتنی خاموش مل چل مچا رکھی تھی۔ یہ نامعلوم سی بے چین کسک جو بیک وقت شیریں بھی تھی اور تلخ بھی — وہ اس کے ہر اشارے پر سب کچھ دے ڈالنے کی زبردست آرزو اس کا لفظ بھوکے کی پکار بن کر دماغ میں پنجے گڑا لیتا ہر سانس فقیر کی صدا بن کر گونج اٹھتا۔ یہ سب، کیوں؟ کیوں؟ وہ کوئی جواب نہ پا سکی۔

۳۳

اسکول کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ بالکل پاگل ہو گئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھ آنو یا بوٹی چپراسنیں نکال کر اڑا جاتیں باقی میں استانیاں حصہ لگاتیں۔ بے چاری بچیاں بھوکی مرتیں۔ پہلے تو چپراسنوں نے سنی ان سنی کر دی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہہ دیا۔ "خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصہ ضرور چھوڑنا"۔ لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی۔ اور ایک دن چپراسنوں کے مظالم کی شکایت کے بعد باز پرس پر چپراسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"کیا کریں مس صاحب چھ روپیہ اور تین بچے ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے

گزرے ہو یہ اللہ مارا پیٹ بھی نہیں بھر جاتا۔"

"جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپراسنوں کا کہاں سے کلہ گرم کریں۔" لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی۔

"بیس روپے مکان کا کرایہ ادا کیا اور چار بندوں کا کھانا کپڑا کیسے پورا کریں۔" استانیاں چیخیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے۔ اس نے دونوں چپراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کیے جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی مگر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے سرخ روئی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپراسنیں محلے ٹولے میں بھیک ہی مانگ لاتیں۔ استانیاں نہ بےچاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر رنڈی کے پیشے کے لائق گھر نہ بار۔ سوائے اسکول کی اخیرات کے اور کیا وسیلہ زندگی گزارنے کا ہوتا۔ ہر وقت ایسے لرزتیں جیسے قصائی سے گائے۔

مگر رضیہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انھوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لیے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے منیجر صاحب نظر ثانی کے لیے لے گئے اور ان کی شکایت ہی گول مال کر دی۔ رضیہ بیگم شدت سے حاوی ہو گئیں۔ شمن کا یہ ابتلا دیکھ کر وہ استانیوں پر قابو جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انھوں نے اسکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کر دی۔ شمن کو معلوم بھی نہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کی ملنے جلنے والوں کی رپورٹ پہنچائی اور منیجر صاحب قوم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انھیں شریف خاندانوں کی لڑکیو

کے اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے۔ کے بجے اٹھتی ہے، کب سوتی ہے، کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے ؟

"کس نے کہا آپ سے" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی

"مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب" وہ نہایت پر اسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے۔ گویا اسکول کے منیجر کو سی آئی ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا۔ "مجھے عوام کے قومی جذبے کو ابھار کر چندہ جمع کرنا ہے لہٰذا استانیوں کا چال چلن......"

لفظ چال چلن پر شمن جل کر رہ گئی۔ پتہ نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجرّد اینک چلن ہیں مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے۔

"دیکھیے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں"۔

"کیسی چٹھیاں ؟" شمن نے ضبط سے کام لیا

"اجی یہی خرافات پرچے غنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجیے۔ ایسی سب لڑکیاں جن کے پاس خطوط آتے ہیں جمع کر کے انھیں ڈانٹیے"۔

"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائے تب نا"۔

"تو صاحب پکڑیے"۔ گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپہ مار کر پکڑ لی جائیں دوسرے یہ چڑی مار تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور چھ روپے میں گزر کرنے پر مجبور چپراسنیں اگر پان تمباکو کا خرچہ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ بھلا ان کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں۔ اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں۔ حد درجہ کی ہوشیار ہوتی ہیں۔ کم از کم وہ گروہ جن کی

رہنمائی میں یہ فعل کرتی ہیں معصوم نہیں ہوتے ۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں ۔ عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں جن باز پرسش کرنے کے لیے غیبؔ داں بلانا ہوتا ہے ۔

ساتھ ہی امتحان آگئے بنچیں لگوانا اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں ۔ کاپیاں بانٹنا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا ۔ انسپکشن کا زمانہ بھی آگیا اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر بھوٹی بچی کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں ، لائبریری کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو منیجر صاحب نے اپنی ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لیپا پوتی میں کون سے گُر استعمال کیے جائیں منیجر صاحب بھی کچھ بکڈر سے رہ گئے ۔

" اچھا صاحب یہ کیجیے کہ لکھ دیجیے رجسٹر میں ...... کہ گملے اور پھولوں کے بیج خرید لیے گئے ، چلیے چھٹی ہوئی " رائے دینے لگے

" مگر ہیں کہاں گملے اور بیج ۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو ؟ "

" کہہ دیجیے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ میں چنگی کے افسر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا ۔ باغ عام میں بہت بے کار پڑے ہیں کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا ۔ اور آپ .... آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں ؟ "

" اپنے میں نے تقسیم کر دیے کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا ؟ "

" اور بیج ؟ "

" اوہ لکھ دیجیے اُگے نہیں ، خراب تھے اور یہ کم بخت ہوتے بھی ہیں گھٹیے گھٹیائے واہیات کہیے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں "

" مگر یہ پورے روپے کا تو حساب نہ ہوا "

" کچھ بُننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا "

" بہت اچھا "

" اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگوائے دیتا ہوں ، خراب نہ ہونے پائیں نہایت

احتیاط سے واپس کرنا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام؟"

"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ اس کا کیا ہوگا۔ اس کے لیے باقاعدہ رقم ملتی ہے؟"

"آپ فکر نہ کیجیے ایسا ہے کہ اس کا میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چارپائیاں ڈلوا دوں گا ..... بستروں کا بھی انتظام گھر میں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تکیے ہوں تو آپ دیدیجیے گا۔"

"مگر یہ تو سراسر دھوکہ دینا ہے۔ اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اسے کسی طرح پتہ چل گیا!"

"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے ...... خیر .... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کے لیے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے صاحب مجبوری ہے، یہ دیکھیے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ ..... ارے ہاں وہ نظم؟!"

"نظم"

"جی ہاں نظم ...... تیار کی آپ نے؟"

"میں نے؟ کیوں؟"

"لیجیے صاحب۔ اجی وہی انسپکٹرس کی شان میں ...... بخدا بھول گیا دیکھیے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجیے گا عمدہ صاف کپڑے ہوں سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی ٹھیک رہے گی میں اُسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔"

"اجی سب چلتا ہے، کوئی نام بہ نام تھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ کیجیے گا کہ صبح سے بلوا لیجیے گا ...... ہاں۔"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اور ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم ...... چہ لاحول ولاقوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی"۔

"میں نے عرض کیا ناکہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی"۔

"چہ تو یہ ایسی مشکل ہی کیا ہے، پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی" اگر مل جائے تو وہی چلا دیجیے۔ دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا .... ورنہ ٹھیریے میں ہی کچھ سوچوں گا!" اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کر کے کی کوشش کرنے لگے۔" ایں؟ ... ہیں؟"۔ انھیں سوجھ ہی گئی۔ "وہ دیکھیے پاس جو قومی اسکول ہے اس میں جو جلسے ہوتے رہتے ہیں وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں۔ منگواتا ہوں میں ..... ابے نتھے ...... او ..... سالے ..... اوہ معاف کیجیے گا ..... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا لیک کر کہنا منیجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں"۔

"بجیں؟"

"ابے ہاں گدھے ..... کہیو ..... چہ الو ہے الو ..... معاف کیجیے گا ... خیر میں خود ہی لے آؤں گا ..... اور کل تک پہنچ جائے گی آپ اس میں ردوبدل کر دیجیے گا اسکول میں ایک دن پہلے سے سجوا دوں گا۔ اور امتحان پیر سے شروع کرا دیجیے گا اردو کا پرچہ رکھ دیجیے گا"۔ انسپکٹرس کو اردو نہیں آتی تھی تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آگئے کسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہو گیا۔ کتب فروش نے دس روپیے کر پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ استاد دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں زیادہ تر سستے بازاری ناول "میاں بیوی" "شادی کی راتیں" اور مستند کوک شاستر تھے جنھیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا۔ ساتھ ساتھ اور ادھر ادھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا پہلے پرانے میگزین جنتریاں، ٹیلی فون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام

پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے تھرا کر رہ جائے نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے، کواڑوں اور کھڑکیوں پر تیل اور پانی چڑھا گیا۔ جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بری کے جوڑے نکال کر پہن آئیں جھانجھن اور چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پر آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تھا کہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پر بضد ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو ان میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کیے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے۔ کوئی چال ان کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش، پاندانوں کے کور، سلمے کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" اور "گڈ نائٹ" سجا دیے گئے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور بیرونجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں۔ مگر ایسے ہنرمندوں سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا۔ مگر پہنچ سے دور تھا، ہی نہیں، کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الا بلا ٹھونس کر تکیے لگا دیے گئے اوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں لیجیے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انھیں بلایا جائے تو حاضر ہو کر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کر کے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹرس اتریں۔ گیٹ کے پاس جہاں لمبا چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں منیجر، ہیڈ مسٹرس نے مع چپراسی اور دو

دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شان لاٹ صاحب کی سوان کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟ ..... یہ اینٹ کیسی؟ یہ گڑھا کس لیے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کون سی قیامت آ گئی سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو، تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں جھینٹ کے لیے منگا رکھی ہیں وہ چکھو، کچھ تمہارے ساتھ چھکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بری رپورٹ سے چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو؟ آتی ہے اس سرسری معائنے کی سرسری ہی رپورٹ ہو ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہوگا۔ اول تو ہم ہندوستانی ہیں۔ بدانتظامی، دھوکا، جعل سازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے اب تو چڑی اور دو دوا تم بے کار مغز پاشی کر رہی ہو، تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جھوٹے دستخط ہیں جو منیجر صاحب نے خود الٹے ہاتھ سے کر لیے ہیں اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپراسنوں کے لگوا لیے ہیں تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں۔

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعہ تمہارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور سیروں کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی زیادہ نہیں، چار پانچ روپے کا خرچ ہے۔ سحر البیان ایڈیٹر تمہاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جھانسے تم کو دے رہے ہیں بس عین مین یہی لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معائنے کے اچھے شکریے کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟" پیار سے پوچھا۔

"اوں، ہنہ" لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور منیجر صاحب کی روح قبض۔

"اوہو ہو...... شرماتی ہے..... بولو..... بیٹی نام بتاؤ..... بولو"

بے چارے مدرّس کو ڈورے اصل میں وہ خود بچّی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ" کسی نے سہارا دیا

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو..... بولو بیٹی وحیدہ..... پنجم..... ہاں ڈرو مت..... ڈرتی کیوں ہو؟" حالانکہ بچّی نہایت گستاخی سے انسپکٹریس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی اور ادھر مارے خوف کے دراصل منیجر صاحب پسیلے ہوئے جا رہے تھے مگر بچّی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں..... بڑے آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمّت افزائی ہوتی ہے" منیجر کو تمام گر یاد تھے۔

چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا ضرور کسی نے کان بھر دیے ہیں گزشتہ سال جو انسپکٹریس آئی تھی بے چاری کتنی اچھی تھی مزے سے بیٹھی نظم سُن سُن کر گائے کی طرح چارہ سانی کرتی رہی، پر یہ تو پوری آفت تھی۔

"ہیں، ہیں، ہیں، آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں..... جی....." منیجر اپنے سوکھے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چنگی کے گملے ہیں" صاف تاڑ گئی۔

"ہیں چنگی!..... چنگی واللہ!..... منیجر صاحب مصنوعی حیرت اور خوف کے ملے جلے حملے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھلاہٹ چھپانے کو گملے میں پینٹ کئے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کم بخت چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ! جی چنگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے "سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں" لیجیے ایک مد اور رجسٹر سے کم ہو گئی درد سری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُراسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہوگئی۔ مگر انسپکٹریس تو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

"یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں ــــ روپیہ واپس لے لیا جائے۔" اس نے گملوں کی باڑ پر چھڑی پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹریس کو گھیر کر بدحواس کر لو تو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کروالو اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی پھٹکی سے تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیان کر دے گی اور یہ نئی انسپکٹریس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں طرف ٹاپیں ڈالنے لگی مگر منیجر صاحب بڑے بڑے جن کھلا چکے تھے نہ جانے کدھر سے کتابیں اڑا دیں کچھ رہ گئیں وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی دست کاری اس نے باوجود شدت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔

امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کاپیاں دیکھیں، منتی سے کھسر پھسر کی پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہو رہا ہے تعلیمی معائنہ پھر ہوگا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں بے کہے گولہ آن گرے گا۔

اس کے بعد اُس نے قطعی ہلاکو خاں والی پالیسی اختیار کی بجائے لڑکیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب رہے گا۔ منیجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ نازک سے سہارے سے ٹکا دیے تھے پھسل پڑے۔ اور "ویل کم" مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر نچھاور ہوگیا۔ رضیہ بیگم کا پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض ابھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو رانڈ ہو گئیں صرف عیسائی استانیاں پھنسیں مگر وہ تھیں بھی غنیمت۔

اسی سلسلے میں گھبرا کے منیجر صاحب نظم خوانی کے لیے لڑکیاں بلا لائے۔ شاید

ڈھول تاشے سے معاملے کی ٹریجڈی کم ہوجائے۔ کہتے ہیں سنگیت میں بلا کی طاقت ہے اور جادو سے بجھی ہوئی شمعیں جل اٹھتی ہیں۔ بدمست ہاتھی ماتھا ٹیک دیتے ہیں مگر غضب ہوگیا نظم کے بند بغیر تبدیلی کیے لڑکیوں کے سپرد کر دیے گیے اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بڑے صوبے کے کمشنر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہوگیا۔ مگر بجائے غصے ہونے کے وہ بڑے زور شور سے قہقہے لگانے لگی۔ منیجر صاحب جواب تک بے قابو ٹانگوں کو صرف قوت متخیلہ کے ذریعہ روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہوکر ہنسنے لگے

"کوئی دوسری چیز گاؤ" رسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ...... وہ گاؤ لب پہ آتی ہے...... چلو کم بختو منہ کیا دیکھ رہی ہو...... شروع کرو" منیجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے۔ "گاؤ..... ہاں لب پہ" مگر لڑکیاں مبہوت اور شرمائی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں

"یہ....... یہ دیکھیے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے۔ یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے اوہ...... ارے خدا کے واسطے......" لڑکیوں نے ان کی رقت آمیز ادا سے ڈر کر "لب پہ آتی ہے" شروع کی مگر باوجود کوشش کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

"اچھا یہی گادو، سارے جہاں سے اچھا...... چلو شروع کرو"

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنچم سر کو گھسیٹ کر تار سر کی بے پر گلے کی آخری جھنجھناہٹ ختم کردی۔ سر بہت اونچا تھا ایسا معلوم ہوا جیل انڈا چھوڑ کر اونچی اور منڈلا کر واپس گر رہی۔ پھر لاکھ خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر دوپٹوں میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سر نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے

یہاں سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم بولا اٹھا۔

"بس کرو!" انسپکٹرس اٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح الجھتی۔ الجھتی گرتی بھاگیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے۔ لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے۔ ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں۔" رپورٹ پر اس نے "اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور منیجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ خیر سے بلا ٹلی اور بری نہیں ٹلی۔ جلدی سے انھوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہ تھی۔

"اجی یہ اجڈ کیا جانیں ان لقموں کا مزہ!" انھوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نیچے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے۔ کم زور ہیں جاہل ہیں ناکارہ ہیں اس لیے خیرات کے حقدار ہیں تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہی اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے کیوں نہیں انھیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح اسپرٹ ڈال کر جلا دیتے یوں نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حیوانیت ہے۔ کہتے ہیں اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں یا خدا تو پھر وہ وہ طوفان کب اٹھے گا جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح دھو کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا۔ پھر لوگ یوں پستی کو اور پستی کی طرف ڈھکیلنا تو چھوڑ دیں گے۔

۱؎ مروج الذہب ۱/۳۲-۳۶ (قاہرہ ۱۳۰۳ھ) ۲؎ التنبیہ والاشراف (بیروت ۱۹۶۵)

۳۴

انسپکٹرس نے رپورٹ تو نہایت معصوم دے دی. مگر کچھ زبانی گفتگو ہوگئی کہ گرانٹ ملنے میں مہینوں لگ گئے۔ نئے معائنوں کی آئے دن دھمکیاں آنے لگیں. منیجر صاحب کا دوڑتے دوڑتے برا حال ہوگیا۔ اس سال جڑاول بھی بچوں کی نہ بنی' بیوی نے لاکھ خوشامد کی کہ بھاڑ میں ڈالو یہ قومی خدمت اور وہی اپنی پرانی وکالت سنبھالو جو کچھ آئے گا تنگی ترشی سے گزر تو ہو جائے گی یہ تو نہیں کہ اپنے بچے ویران' سوانگ۔ دوسرے لوگ چاروں طرف سے بوٹیاں نوچ رہے ہیں' استانیوں کی چار ماہ کی تنخواہ چڑھ گئی چپراسی نے ایک دم بغاوت کر دی۔ استعفا دے دیا اور پیشہ ہی بدل کر اینٹیں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ چوکیدار مہتر اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والا نوکر بھاگ ہی نہیں گیا. بلکہ کچھ فرنیچر بھی غائب کر گیا. وہ لے دے مچی کہ توبہ بھلی منیجر صاحب بے چارے ہکا بکا چاروں طرف منہ پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگے. جیسے جنگلی کبوتروں کی پھٹکی یکایک کھل جائے تو چڑیمار کبھی ادھر کبھی اُدھر جھپٹتا ہے اور جب ایک بھی چڑیا ہاتھ نہیں آتی تو تھک کر نہایت اطمینان سے پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور مزے سے ان کی پرواز دیکھتا ہے۔

"اڑو' میری بلا سے جہاں جی چاہے اڑ جاؤ' اور مجھے بھی اڑا لے جاؤ!"

منیجر صاحب بھی تھک کر رضیہ بیگم کی پلنگڑی پر لیٹ گئے اور مزے سے اسکول کی بربادی دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر تو شمن اس طوفان کی بدحواسی پر بھونچکی کھڑی سمت ٹٹولتی رہی گو اس کے لیے اس سے بہتر اسکول بہتر مشاہرہ لیے موجود تھا مگر جہاں ایک ہی بار سرائے ہی کی طرح تھوڑی دیر کو قدم رکھا وہاں سے آگ لگتے ہی بھاگ نکلنا انتہائی بزدلی معلوم ہوئی۔
اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ کیا کرنا چاہئے. اور کیونکر کرنا چاہیے بغیر سوچے سمجھے وہ الٰہ آباد ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ چل دی۔

محکمہ تعلیم کی عظیم الشان عمارت سے ذرا سی بھی علم کی ضو پاشی نظر نہ آئی۔ تعلیمی کام کو کوئی کاروباری ڈیپارٹمنٹ ہے ایک حصے پر اسپتال کا شبہ ہوتا تھا۔ گیلری میں ایک قطار سہمی ہوئی عورتوں کی بیٹھی تھی جو کسی نوکری یا وظیفے کی امیدواری میں آئی تھیں سب کی سب نہایت لاغر بیمار دکھیا اور نادار نظر آ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر شعبے میں ناکام ہونے کے بعد پیٹ پالنے کا آخری سہارا محکمۂ تعلیم ہی میں ملتا ہے یا تو بدصورتی اور غربت کی وجہ سے میاں نہ ملا یا بیوہ ہو گئیں۔ اور جن پر دبا کے پڑیں انھوں نے نکال دیا۔ بال بچوں کی خاطر یہ پیشہ کر رہی ہیں۔ چاہے تعلیم کا رتی بھر شوق نہیں دماغ گوڈے ہے۔ پڑھانا تو درکنار پڑھنے ہی کی طاقت نہیں مگر چلی آ رہی ہیں۔ اور محکمۂ تعلیم کو بھی کسی نہ کسی طرح تعلیم نسواں کو ترقی دینا ہے۔ پہلے گھٹیا انسانی میل کچیل اور کوڑا کرکٹ ہی سہی اچھا مال بھی آنے لگے گا۔

ان میں سے ایک بیٹھی اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھیں اور اونچی آواز میں اپنے سسرال والوں کے دکھڑے سناتی جا رہی تھیں۔ جنھوں نے انھیں کچوکے دے دے کر اس کام پر مجبور کیا۔ دوسری بیٹھی اپنی بچی کی اصلاح کر رہی تھیں اور پاس بیٹھی ہوئی تیسری عورت سے زمانے کی تنگیوں کا دکھڑا رو رہی تھیں۔ تین چار اونچی آواز میں ملنے والی نوکری میں مین میخ نکال رہی تھیں۔ اور یہ سب استانیاں بننے آئی تھیں۔ اور دوسرے معنوں میں آنے والی نسلوں کا نقشہ کھنچا ہوا تھا۔ کچھ ہو جائے کیسی بھی تعلیم دی جائے۔ برسوں ٹریننگ پلائی جائے یہ گھٹی میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمزوریاں نسلاً بعد نسلٍ چلتی جائیں گی۔ شمن کا جی چاہا ایسی تعلیم کے لیے کوشش کرنے سے تو بہتر ہے کہ لوٹ چلے، گھر جائے اور شادی کر لے۔ ننگوں بھوکوں کی تعداد بڑھانے لگے۔ جو اس کا قومی ورثہ ہے کیا حاصل اس مغز پاشی سے؟ جب بیج ہی گھنا ہوا ہے تو پودے کے اگنے اور پھل دینے کی آس لگانا فضول ہے...... مگر......

وہ اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ چپراسی نے آ کر اس سے چلنے کو کہا کئی گھنٹے کی مغز ماری کے بعد یہ طے ہوا کہ اسکول کو گورنمنٹ اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔ ہیڈ مسٹریس وہی

رہیے باقی اسٹاف بدل دیا جائے۔ سوال یہ تھا کہ منیجر صاحب جو اپنا روپیہ قومی اسکول کی ترقی کے لیے لگا چکے تھے اس کا کیا جائے۔ رسیدوں سے تو ان کا کافی روپیہ نکلتا تھا۔ خیر یہ سوال بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ اسکول پر سے قومی ٹھپہ ہٹا کر گورنمنٹ کا بنا دیا گیا۔

اسکول نیا چولا پہن کر جو اٹھا تو تھوڑی ہی دیر میں لوگوں کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول ہوئی۔ داخلہ بڑھا۔ منیجر صاحب عرصے تک اپنا روپیہ وصول کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ معلوم ہوتا تھا ان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ بیوی نے اور زندگی تلخ کرنا شروع کی۔ اسی مد و جزر کی رو میں گڑبڑا کر انھوں نے رضیہ بیگم سے نکاح کر کے دو مستقل محاذ قائم کر لیے جہاں انھیں آم کی چٹنی سے بھی زیادہ چٹ پٹی زندگی سے دست و گریباں ہونا پڑتا۔ پھر سنا ان پر مالیخولیا کے مرض کے خفیف سے حملے ہونے شروع ہو گئے۔

اسکول میں ہندو اور عیسائی لڑکیوں کی تعداد بڑھی مگر مسلمان لڑکیاں اور کم ہو گئیں۔ اسکول جب تک اسلامی نہ ہو اسلامی پانی کی طرح اس کی طہارت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

استانیوں کا نیا گروہ کچھ اس شان سے وارد ہوا کہ پہلے تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کاہل ہیں یا چست، اچھا پڑھاتی ہیں یا برا کیونکہ یہ استانیاں گرگ باراں دیدہ تھیں ایک ایک محکمے میں بیس بیس سال سے جمی ہوئی تھیں۔ ایک چھٹی ہوئی، جن کا بیس سال کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں گزارہ نہ ہو سکا چونکہ گورنمنٹ کا معاملہ دھینگٹ ہی ہوتا ہے۔ بس ایک اسکول میں دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور جو وہاں بھی بہت جوتم پیزار ہوئی تو چوتھے اور پانچویں میں ایک جگہ جم کر رہنے کی نہ تو عادت اور نہ شوق باقی رہ گیا تھا۔ جب ایک اسکول ہیڈ مسٹرس سے لے کر چپراسن تک سے مارکٹائی تک نوبت پہونچ جاتی اور مفت سودا دینے والے مارے تقاضوں کے جینا دوبھر کر دیتے تو یہ روتی پیٹتی انسپکٹرس کے پاس جاتیں اور تبادلہ کروا لیتیں۔ بھلا وہ شمن کو کس گنتی میں شمار کرتیں۔

ان میں سے ایک باقری بیگم تو بس معلوم ہوتا تھا کہ جھوا اور ککھر ہیں۔ عمر کی بڑی تھیں
اور کئی انسپکٹرولیسیں بھگتا چکی تھیں کسی کا کہا ماننا بہت کم سمجھتی تھیں اور پابندیوں کو بگاڑ کی زیادتیاں۔ بہت جلد انھوں نے کنایوں اور اشاروں میں جتا دیا کہ اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو انسپکٹرس سے جڑ دیں گی۔ انھیں اپنی قسم پر بڑا ناز تھا اور جس کو نہیں کرنے کی قسم کھائی پوری ہو گئی۔

دوسری مسز سارکس عجیب پٹی ہوئی روتی سی اُدھیڑ عمر عورت تھیں۔ ذرا سی بات پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتیں۔ اور پھر گھنٹوں منافسے کرواتیں ایک دوست مسز شرما ہر اسکول میں ان کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔ مسز شرما اتری ہوئی عمر کی مریضہ مشکل غصہ ور عورت تھیں۔ یہ دونوں ہمیشہ انگریزی میں ایک دوسرے سے پیار محبت کی باتیں کرتیں اور لڑتیں بھی انگریزی میں۔ جونہی لڑائی شروع ہوتی مسز شرما مفت رہنے کا طعنہ دے کر فوراً کھانے پینے کا خرچہ دینے کی دھمکیاں دیتیں اور مسز سارکس رو دیتیں۔ دنیا میں معلوم ہوتا تھا ان دونوں کا کوئی اور نہ تھا۔ ساری محبت اور غصہ ایک دوسرے پر اتارتیں ان کی لڑائیوں کے چرچے دور دور پھیلے ہوئے تھے اور محبت بھی کچھ کم مشہور نہ تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے اسکول کا رہٹ رواں رواں ایک لطیف نغمے کی روانی سے چل رہا تھا۔ داخلہ اطمینان بخش تھا، نتیجہ اطمینان بخش، تعلیم اطمینان بخش۔ اس اطمینان بخش فضا نے دل میں ایک ناقابل اطمینان تکان، سستی اور مردہ پن پیدا کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے پرشور ندی دوڑتے دوڑتے سیدھے اور سپاٹ میدان میں رینگنے لگی۔ ان گھٹتی ہوئی دنیا میں سب آنکھیں بند کیے عمر کی لکیر پر خاموش چلتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکر ہو گئی تو بھی کاندھا بچا کر آگے گھسٹ گئے۔ زندگی دھیرے دھیرے کھسک رہی ہے دیکھو نیم خفتہ ٹنن ٹنن گھنٹہ وقت مقررہ پر جاگ کر انگڑائی لیتا ہے اور پھر اونگھ جاتا ہے اس کی ہر کروٹ دو قدم آگے یا دو قدم پیچھے گھسیٹ لاتی ہے وہ اداس سویا ہوا فرنیچر جس پر جماہیاں لیتی ہوئی استانیاں جن کا بس نہیں چلتا کہ اس سست رفتار گھنٹے کو جھنجھوڑ کر جلدی جلدی دوڑنے پر مجبور کر دیں یہ منٹ کی سوئی اتنی بوجھل کیوں ہے

کیا عاقبت کا توشہ ساتھ لے جانا ہے اور اگر یہ سکنڈ کی سوئی ذرا لپک کر چلے تو شاید دنیا اس کے ہکوروں سے جاگ اٹھے۔ یہ وقت اس قدر رہوئے ہوئے چوری چھپے نہ چلتا تو انسان اتنا کاہل کبھی نہ ہوتا۔ ٹک ٹک وہ بھی جلدی جلدی مشین کے پرزوں کی طرح چلتا۔

خوب! حسن بیان

اور فضا بھی تو بھاری بھاری ہے! جیسے کوئی طوفان تلا کھڑا ہے۔ بھیس لگی اور بند ٹوٹا۔ پھر کوئی نہیں جانتا کہ امرت برسے گا یا شعلے مگر ایک خاموش بے اختیار سے انتظار نے ہر ایک کو تھکا رکھا ہے۔ ایک نامعلوم بوجھ سے کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں۔ کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم! مگر ہوگا ضرور کچھ نہ کچھ! کپڑا سستا، اناج کوڑیوں کے مول مگر کوڑیاں خون کے مول بھی نہیں! یہ آخر دنیا میں پیسہ اتنا کم کیوں بنایا جاتا ہے یہ جو گھروں میں تانبے کی پتیلیاں ہیں انھیں گلا کر پیسہ بنایا جا سکتا ہے۔

بہت خوب

غربت ہی آدمی کا عذاب

دنیا سستی، انسانیت سستی، حیوانیت سستی، پھر بھی یہ کنگالوں کی تعداد میں کمی کیوں نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اناج کے ہر دانے کے ساتھ دس بھوکے لپٹے ہوئے زمین ہی سے اگتے ہیں، اور ان کی ساری عمر اسی ایک دانے کی چھین جھپٹ میں گزر جاتی ہے۔ اتنا وقت کہاں جو کسی اور چیز کے لیے بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔ کہتے ہیں اور لوگ لوٹ کھسوٹ زر و جواہر اور عزت کی خاطر خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں، مگر یہاں تو عزت چھوڑ اپنی کیچڑ بھی نہیں جس کے لیے یہ بھوکے بھی کسی سے لڑ پڑیں۔

فضا کی گھٹن اور بڑھ گئی لوگ ہوا کو سونگھ سونگھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگے جیسے طوفان کی بو پا کر کیڑے مکوڑے پناہ گاہوں کو بھاگ نکلتے ہیں۔ اسی طرح بازار میں بھگدڑ سی پڑ گئی بنیوں نے سونا چاندی سمیٹ کر دھرتی ماتا کی چھاتی میں چھپانا شروع کر دیا۔ طوفان کا دھماکہ اتنا گہرا نہیں ہوگا کہ ماتا ان کی امانت بھی اگل دے۔ آسمان پر سرخ ستارہ یکایک تازہ زخم کی طرح پھوٹ نکلا اور لوگوں نے اس میں سے لہو ٹپکتا دیکھا۔ چاروں طرف سے غیر مرئی گھٹائیں امڈنے لگیں اور خاموش گرج نے دلوں

دماغ ہلا دیے۔

پکا پھوڑا پھوٹا اور مواد کا ریلا بہہ نکلا۔ دیکھنا ہے اپنی رَو میں کس کس کو گھسیٹتا ہے اور کون بچ نکلتا ہے۔ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ بنیوں نے جلدی جلدی رنگ اور سونا سمیٹنا شروع کر دیا۔ کچھ کہا نہ سنا بیٹھے بٹھلائے جرمنی کے دانتوں میں کیوں کھجلی اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرانس اور انگلینڈ، کمزوروں کے طرفدار، صلح کے پرچم لے کر دوڑ پڑے۔

"آج سے ہماری تمہاری کٹّی"۔ جرمنی کو صاف بتا دیا۔ مگر وہ تو مچلے ہوئے بچے کی طرح بکھرتا ہی چلا گیا۔ ادھر روس کی بھی پسلی پھڑکی اور خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گیا۔ میاں ہٹلر کو من چلی دنیا نے یورپ کا گُرو رکھ دیا۔ دیکھتے دیکھتے دو نڈّے بچوں نے پولینڈ کو میٹھی ٹکیا کی طرح بانٹ کر کھایا۔ چلیے چھٹی ہوئی۔

جرمنی نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا، اوہو یہ تو بڑی بری بات کی۔ دنیا بھر کا نقصان ہو گیا یہ لوگ قبضہ کرنے کے اتنے شوقین کیوں ہیں حالانکہ یہ بالکل اچھی بات نہیں، گلوب پر کتنا حصہ گلابی ہے جیسے تازہ کوڑھ پر اب یہ جرمنی کو تارکا ڈبّہ لے کر چلا ہے نہ جانے یہ لوگ لیپ پوت کر اس گول مول نارنگی کا کیا حال کریں گے۔

اور پھر کیا ہوگا؟ پولینڈ بھی غلام بن جائے۔ ہندوستانی تو خیر صدیوں سے غلامی کرتے چلے آرہے ہیں، بھوکے رہنے سے روح بڑھتی ہے اور موسم کے اثرات جسم کو توانائی بخشتے ہیں۔ یہ پھٹی پھٹی آنکھوں والے سڑک کے کتے جنھیں ہر راہ گیر کی ٹھوکروں اور فاقہ کشی کی جھڑکیوں نے گیانی بنا دیا ہے۔ یہ تو اسی میں مگن ہیں۔ گوشت پوست تو بے کار کا فضلہ ہے۔ اصل چیز ہے ہڈی اور اسے سمیٹے رہنے کے لیے اوپر سے کھال کا غلاف۔ یہ انسانی پنجر، سیاہ اور ٹیڑھے بینگے کھجلی اور پھوڑیوں سے لدے ہوئے مرقعے جنھیں قدرت نے اپنے دستِ خاص سے گڑھا ہے اور پھر جلتی دھوپ اور لو کے تھپیڑوں سے دہکا کر خاک اور دھول میں لتھیڑ کر پکی کھرنجہ اینٹ کی طرح مضبوط کر دیا ہے ان پر غلامی بھی اثر نہیں کر سکتی مگر یورپ کے وہ کومل بدن جو تیز نگاہ سے بھی کمھلا جاتے ہیں، وہ کیسے تاب لائیں گے ان مظالم کی۔

رفتہ رفتہ بیکار کانوں سے سر مارتے وقت شمّن کے خیالات دور دور بھٹک جاتے۔ کھڑکی میں نیلی زین کا بادہ لٹکا ہوا پردہ سڑک پر چلنے والوں کی نظر بازیوں سے پناہ میں لیے ہوئے تھا۔ مگر اس سے نچلے حصّے سے چلنے والوں کی ٹانگیں نظر آتیں اور وہ گھنٹوں بیٹھی ان ٹانگوں کی رفتار دیکھا کرتی۔ کالی پیلی ٹیڑھی اور خشک ٹانگیں کچھ میلی دھوتیوں میں الجھی ہوئی مرگھلی ٹانگیں کیچڑ اور میل میں لتھڑی ہوئی کمزور ٹانگیں اور کبھی بھاری توند کے وزن سے کراہتی ہوئی مجروح ٹانگیں۔ اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرا کرتیں کبھی کبھی چکنے پتلون اور اجلے موزوں میں لپٹی ہوئی بھی ٹانگوں کی ایک آدھ جوڑی گزر جاتی مگر بہت کم۔ بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتی۔ دنیا مجسم ٹانگیں بن کر اسی کھڑکی کے نیچے چلتی رہتی اسے ان پر ترس آتا۔ تھک نہیں جاتیں، کب سے چل رہی ہیں اور نہ جانے کتنے دن اور چلیں گی۔ انھیں ٹھنڈ میں بھی کوئی نہیں ڈھکتا، پالے سے کوئی نہیں بچاتا، دھوپ کی آنچ سے کوئی نہیں ہٹاتا۔۔۔۔۔ یورپ میں تو شوقین مزاجوں نے ننگے کلب نکالے ہیں۔ اور یہاں تین چوتھائی مخلوق جنم سے ہی برہنہ رہنے کا بندوبست کر کے آتی ہے۔ ایسے بھی ملک ہیں جہاں مفید خوراک مہیا کرنے والے محکمے قائم ہیں۔ پنیر، مکھن دودھ اور گھی نے جو انسانوں کو چربی کی پوٹلیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا کچھ تو علاج ہونا چاہیے۔ دولت کا جتنا حصّہ گوشت اور چربی تھوپنے میں صرف ہوتا ہے، کم از کم اس کا نصف تو ایسی مشینیں ایجاد کرنے میں صرف ہونا چاہیے۔ جو موٹاپے سے عاجز بےچاروں کو ذرا ہلکا کر دیں۔ کتنے مزے کی بات ہے جب کہ دنیا کے ایک حصّے میں گوشت اور پوست کی اس قدر قلت ہے دوسرے حصّوں میں انھی عناصر کی زیادتی کو کل پرزوں سے چھیل چھیل کر دور کیا جاتا ہے۔ کاش ان خوش نصیب انسانوں کے جسم کی چھیلن ہی ان انسانی ڈھانچوں پر منڈھ دی جائے۔ جو یہاں گھوم رہے ہیں تو ترازو کے دو پلڑوں میں کچھ تو توازن پیدا ہو جائے۔

روز دوپہر کے بعد ٹانگوں کا نیا طوفان بہنا شروع ہو جاتا یہ طوفان پاس کی [illegible] سے اٹھا کرتا تھا اور شہر کی طرف بڑھ جاتا۔ یہ بدبودار غریب اور مری ہوئی [illegible]

ن بوڑھی ٹانگوں کا تھکا ہوا ریلا اپنی ان تھک نڈھال روانی سے روز بہا کرتا۔ پٹی
ہونے سے ذرا پہلے ایک یکہ و تنہا ٹانگ ایک لکڑی کی ہمراہی میں رکتی تھمتی کانپتی تھر
تھراتی گنند جاتی۔ شمن کا معمول تھا کہ وہ اس ٹانگ کی ہمدم لکڑی کی مسلسل ٹھک
ٹھک کے قریب آتا سن کر ایک پیسہ کھڑکی سے نیچے ٹپکا دیتی اور منتظر رہتی کہ ایک سوکھے
ہڈ بھرے جیسا سیاہ ہاتھ اسے کس صفائی سے غلاظت کی نالی میں سے نکال لیتا
ہے جیسے اسے نالیاں ہی ٹٹولتے بیتی ہو اور پھر وہ سست اور مکدر اس ٹانگ کو دور
جاتا دیکھتی رہ جاتی۔ کیوں؟ آخر کیوں پیدا ہوئی ہیں یہ بھیانک ٹانگیں اور کالے سیاہ
ڈھانچے۔ پھر اسے خیال آتا اگر یہ ڈھانچے اتنے سوکھے نہ ہوتے تو تاج محل دنیا کا
آٹھواں عجوبہ کیسے نظر آتا! اگر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اتنے فقیر اور مکھیاں نہ بھنبھنائیں تو
شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت کا ثبوت کیسے ملے؟

اگر خدا نخواستہ جرمنوں کا دماغ خلل نکلے اور وہ پولینڈ کی طرح ہندوستان پر
بھی تاخون تیر کرنے لگیں تو شاندار عمارتیں یہ بلند الوقت مقبرے اور یہ مقدس مٹی جہاں
ہم صرف بونے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے ہری بھری کھیتیاں سجاتے ہیں۔ یہ لمبی لمبی سڑکیں
جنھیں ہم موٹروں کی دھول پھانکنے کے لیے خون پسینے کی نمی پہنچا کر کوٹتے ہیں کہاں جائیں
گے۔ کارخانے سے نکل کر گرما گرم کباب اڑانے کے لیے یہ جامع مسجد کی سیڑھیاں کہاں
نصیب ہوں گی اور جب بادل امڈ گھمنڈ کر آئیں گے ابرِ رحمت رم جھم برسنے لگے گا، کوئلیں
پکار اٹھیں گی اور پپیہے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگیں گے تو نزاری پریم کی پیاس بجھانے
انھیں عظیم الشان مقبروں کی آغوش میں چھپ جائیں گے لیکن یہ فاشسٹ ہماری ان جشن
گاہوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے ہمارے باپ دادا کی مقدس ہڈیاں اکھاڑ کر لے
جائیں گے، وہ ہڈیاں جن کی خاطر ہم جنم جنم سے خون کی ندیاں بہاتے آئے ہیں، وہ مانک
موتی سے بھی زیادہ انمول ہڈیاں جن پر ہند کو ناز ہے۔ ہر ہندی کا فرض ہے کہ ان کی حفاظت
میں خون اور پانی ایک کر دے یہ ہڈیوں کا پجاری خود بھی تو ہڈیوں کی ایک مالا ہے
اور ورثے میں یہی مالا اپنے بچوں کو بخش جاتا ہے۔ جیتے جی تو کچھ نہیں مگر مرنے کے بعد

اندر میں اتنی خشکی پیدا ہو جاتی ہے کہ بانجھ کو بیٹا اور مردے کو زندگی بانٹنے لگتا ہے۔ گو زندگی بھر جسم کا کوئی کونہ مستور نہ رہ سکا مگر مرنے کے بعد اطلس و کمخواب کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور صندل مل کر عرقِ گلاب اور کیوڑے سے غسل کرتا ہے۔ زندگی بھر جو میل کی پپڑیاں اور جوئیں اس پر چھائی رہیں ان کا کچھ تو بدلہ مل ہی جاتا ہے زندگی میں جسم کو نہ سہی مرنے کے بعد ہڈیوں کو ہی سہی!

یہ ہڈیاں! کیا مرنے کے بعد ان ہڈیوں میں دل نہیں رہتا۔ کاش دل بھی ہڈی کا مضبوط ٹکڑا ہوتا جو صدیوں زندہ رہ سکتا۔ تو اگر ہندوستان کی زمین پر جنم لینا ہے تو روحوں کو چاہیے ہڈیاں بن کر جنم لیں اور اگر جینے کی خواہش ہو، تو جتنی جلدی ہو سکے مر جاؤ، اس قبرستان میں زندگی کا کوئی مصرف نہیں۔

پولینڈ کا لقمہ تراونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہو کر رہ گیا اور فرانس کی حسینہ بھی جھپٹ میں آگئی، شرم نہیں آتی ان حیوانوں کو عورت ذات پر ہاتھ اٹھاتے۔ رانی جھانسی بھی تو عورت تھی کس قدر نسوانیت تھی اس جی دار حسینہ میں بجھی ہوئی چتا کی آخری چنگاری... مگر ابرِ رحمت نے ایک بار ہی برس کر اسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ اس ہڈیوں کے دیش میں ان چنگاریوں کا کیا کام؟

گھٹائیں برسیں اور خوب برسیں۔ بند کھل گئے۔ سوتے جاری ہو گئے۔ لیکن یہ ہندوستان کیوں خشک پڑا ہے کیا ہندوستانی خون کی بو ابھی تک اژدہے کی ناک میں نہیں پہونچی؟ یہ سیاہ خون ہے بھی بہت لیساندہ گو سفید ذرات نے مل کر کچھ خاکی حسن پیدا تو کر دیا ہے، مگر ابھی اسے بہت سے انجکشنوں کی ضرورت ہے۔ یہ "سارے جہاں سے اچھا" ہندوستان سواستکا 卐 کے چکر سے کیوں بچا ہوا ہے۔ ہر قوم کو اس پہ پیار آ چکا ہے۔ سب ہی کو اس کے سدھار کی فکر نے ستایا۔ سیاہ دراوڑوں کو انسانیت سکھانے آریہ آئے، سکندر تک کی نسلی پھڑکی، ایران و افغانستان کو محبت چرائی تاتاریوں نے دانت کچکچا کر بوسے لیے۔ مغلوں نے عشق و محبت کے میدان گرم کیے اور پھر یورپ کے بنیوں کی ترازو کے پلڑے جھولنے لگے۔ ہندوستان کی مہمان نوازی ہر ایک،

کی خدمت میں خوانِ نعمت بچھایا ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی، "یہ سب کچھ حاضر ہے داتا! میوہ اور پھوڑے کا حصّہ باندھ کر لے جاؤ، ہم بھوکے سو رہیں گے پر تمہاری کمتی نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں تو بس اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے پیرے اور آیا کا عہدہ پا کر تمہاری سفیدی کے آگے اپنی سیاہی کا ماتھا ٹیک دیں۔

موسم بدلنے لگا۔ شمن کے جی پر خفقان سا اٹھنے لگا۔ یہ الجھی الجھی فضا جس نے دم گھونٹ رکھا تھا کچھ اور بھی غلیظ ہوتی جا رہی تھی۔ جی بری طرح گھبراتا، غصّہ آتا کسی پر؟ یہ اسے نہ معلوم تھا۔ استانیوں کی سستی پریشانی میں بدل گئی تھی۔ کون جانے کیسی ہوا چلے کدھر سے چلے اور کس کس کو اڑائے جائے۔ بے چین بھاگم بھاگ شروع ہو گئی تھی۔ جنگ کوسوں دور تھی۔ مگر خطرہ دلوں میں چھپا ہوا تھا۔

ناقابلِ یقین
[illegible]

پھر اگر اس نے پندرہ دن کی چھٹی لی اور کہیں دور جانے کا ارادہ کر لیا؟ کہاں؟ یہ اس نے اسٹیشن پر پہونچ کر بھی فیصلہ نہ کیا۔ سب سے پہلی ٹرین مدراس کلکتہ میل تھی، اس نے وہی پکڑ لی۔ کہاں جا رہی ہے؟ کس کے پاس؟ یہ اس نے سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی۔ کیا ضرورت تھی کسی منزل کی، جب جانا ہی ٹھیرا تو پھر کیا حاجت ہے کسی مقررہ لکیر پر چلنے کی۔ اس کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ تھا ایک ہندوستانی کے نقطۂ نظر سے سفر کو مکمل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کافی سامان ہے۔ ریل کی افراتفری نے تھوڑی ہی دیر میں سفرِ آخرت کا مزا چکھا دیا۔ بیمار ٹوٹے پھوٹے بے ہنگم انسان میلے اور بدبودار چیتھڑوں میں الجھے ہوئے پتہ نہیں کہاں اور کیوں جا رہے تھے؟ شاید انھیں بھی اپنی منزل کا پتہ نہ تھا۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی، کیا حماقت ہے؟ سفر کرنا اور وہ بھی تھرڈ کلاس میں! کبھی تو اکتا کر جی چاہتا کہ لوٹ پڑے۔ یا اتر کر ریل کی پٹری پر لیٹ جائے تا کہ ایک بار ہی یہ لمبا چوڑا تھکا دینے والا سفر ختم ہو جائے ...... مگر پھر سوچتی اس میں بات ہی کیا ہے؟ اور لوگوں کا کیا ٹھیک عجیب اوٹ پٹانگ سا سلسلہ ہے دنیا میں۔ بار بار تھوڑی ریل کے دھکے یہ پھیر یہ سڑے بسے کھانے اور بدبو سونگھنے کو تو نصیب ہو گا جو کچھ بھی ہے جیسا بھی ہے اسی زندگی میں دونوں ہاتھوں سے لپک کر

گاڑی بدلنے میں بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا لطف آ گیا۔ تھرڈ کلاس والوں کے لیے بیلوں کے باڑے سے بھی بدتر جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ اُسے پلیٹ فارم پر بستر سے لگ کر چار لمبے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے گھنٹے گذارنے پڑے۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر خانے میں تالا پڑا ہوا تھا اور فرسٹ میں کوئی انگریز ٹھہرا ہوا تھا۔ سوائے اس ایک سفید انسان کے باقی سارے کالے پیلے نیلے جانور تلے اوپر پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ پلیٹ فارم بھی ایک قسم کی گورنمنٹ ہوتی ہے جہاں چند فرسٹ کلاس انسانوں کے علاوہ ساری رعایا گوڈری نظر آتی ہے حالانکہ آمدنی اسی تیسرے درجے والے سے ہوتی ہے مگر آرام کبھی کبھی مجبوراً سفر کرنے والا اوّل نمبری لے جاتا ہے۔

ہر سودے والا سارا سودا اسی کے ہاتھ بیچنے پر تل گیا۔ منع کرتے کرتے بھی تو تھک گئی۔ فقیروں کے علاوہ یتیم خانوں بیوہ آشرموں اور گئو رکھشا کا پوتر کام کرنے والوں نے بھی ہلّہ بول دیا۔ وہ جل اٹھی۔ یتیم خانوں میں جاؤ تو یتیم آنکھ میں لگانے کو کرائے پر بھی نہیں ملتے۔ اور بیوہ آشرم اتنے مردوں کی موجودگی مدِ فاضل سے زیادہ نہیں اور ان پناہ گاہوں کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب تک یتیموں کے لیے سڑک اور عورتوں کے لیے کوٹھے موجود ہیں، ان بے کار جھگڑوں میں پڑنا ہی حماقت ہے۔ رہیں یہ گائیں تو جب بچوں کے لیے مائیں اور مٹھائی میں ڈالنے کے لیے گھاس کا گھی اور سنگھاڑے کا آٹا موجود ہے تو پھر یہ گائیں کس کی چربی بڑھانے کے لیے پالی جائیں۔

بار بار اس کی نظر ایک ننھے کی طرف بھٹک جاتی جو بڑے غور سے کبھی ان کیلوں کو تک رہا تھا جو اس کی ٹوکری سے دل کش بیواؤں کی طرح جھانک کر ابھار رہے تھے اور کبھی اُن کتوں کو جو چہار طرف نہایت ضروری کام سے دوڑتے پھر رہے تھے۔ بچہ نہایت چلبلا تھا اس کی نوزائیدہ آیا قابو میں کرنے کے لیے برابر اس سے کشتی لڑ رہی تھی۔ بار بار اس کی ممی سے ڈانٹ بھی کھاتی جو نہ جانے کس کام کو گئی ہوئی تھی مگر بچے میں بلا کی پرواز تھی بیٹھے بیٹھے اچھل کر لوٹ لگاتا اور پاس رکھی ہوئی ہر چیز کو جھنجھوڑ ڈالتا۔

"بُری بات بابا" آپا کہتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا۔ مگر پھر [illegible]
[illegible] کی لہر اُنہیں پہلے ٹانگوں کو بستر سے ٹکراتا پھر ننھی ہتھیلیاں تسموں سے چھونے لگتیں۔
سر کو کسی بھرے کھلونے کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں مٹکنے لگتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ
ننھا سا جیتا جاگتا بھونچال بن جاتا۔

کیلوں کو وہ پیار بھری حسرت سے تکتا "بُری بات" کی مُہر نے انھیں اور بھی دلکش
اور جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے شیریں اور لذیز کیلوں کی پاک
خواہش میں "بُری بات" جیسی تلخی کہاں سے آسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا آپا بڑی جھوٹی
ہے اور ہمیشہ اُسے اسی ناگوار قسم کے جھانسے دیا کرتی ہے۔ کتنی ہی بار وہ دوڑ دوڑ کر انجن
کی طرف گیا ہے کو کو کرتا دیو ہیکل بھوت اتنی بہت سی گاڑیوں کو گھسیٹ لے جاتا ہے۔
اُسے وہ نیا بیاہتا جوڑا ابھی بہت جاذبِ نظر معلوم ہو رہا تھا۔ آگے آگے دولہا اور اسکے
پیچھے دوپٹے کے کونے سے بندھی ہوئی عورت۔ اگر آپا اجازت دیتی تو وہ ایک بار ذرا
اُس دوپٹے کے جھولے میں دو ایک پینگیں لے کر دیکھتا۔ آپا نے اُسے وزن کرنے کی مشین
پر بھی نہیں کودنے دیا اور صندوقوں کی قطار پر لیفٹ رائٹ کرنے پر بھی معترض ہوئی
[illegible] کبھی کبھی وہ ساکت ہو کر آنے جانے والوں کے مُنہ تکنے لگتا اور بے خبری میں اُن
مُنہ اُن کی نقل میں نئی نئی شکلیں بناتا۔

"کیلا لو گے؟" شمّن نے تنہائی سے اکتا کر بچے سے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے چپکے سے آپا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پرائی چیز بُری ہوتی ہے،
ہیں نا آپا؟" وہ جوش سے بولا اور کیلوں کی طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر فوراً اپنی توجہ
پاس رکھے ہوئے سامان کو بکھیرنے میں لگا دی۔

کتنی ہی دیر سے کئی دق مارے نوجوان گنگناتے لطیف اشارے کرتے شمّن کے
سامنے سے گذر رہے تھے دبی کچلی خواہشات ننگی ہو ہو کر ان کے چہروں پر ناچ رہی تھیں
دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ ایک دوسرے کو قطعی ناممکن العمل گالیاں دے رہے تھے
پلیٹ فارم پر کئی بدقطع پوشش گٹھریاں بھی ان کے مفلوج دماغوں [illegible] فٹ بال [illegible]

رہی تھیں پاس ہی ایک قبول صورت چنچل سی دلہن گھونگھٹ کاڑھے ان پر بمباری میں مصروف تھی۔ ایک مجروح شکل لڑکا ایک انگریزی کاکوک شاستر اس رخ سے لیے بیٹھا تھا کہ شمن کی نظر ہر بار اس کے باتصویر عنوان پر پڑتی۔ گھنٹہ بھر سے وہ اسی ایک تصویر کو حفظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو وہ یہ تصویر نہایت انجان طریقہ پر دکھاتا اور جونہی کسی سے نظر مل جاتی عجیب برہنہ سی مسکراہٹ آنکھوں میں پیدا کر کے نہال ہو جاتا۔ اسی خاموش لاسلکی پیغام کے ذریعے وہ ساری گھڑیوں سے بھی راز و نیاز میں مشغول تھا جواب بھی مل رہے تھے۔ کچھ پریشان کچھ نفرت میں ڈوبے اور کچھ حد درجہ متحیر! اس چلبلی دلہن کا منہ تو چھپا ہوا تھا مگر تھکن سے نڈھال انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔ بچے کی معصوم آنکھیں جو کیلوں سے عشق لڑانے میں مشغول تھیں ان نوجوانوں جیسی فحش اور گستاخ ہوتی جا رہی تھیں وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخ رہا تھا اور غصہ سے زمین پر تھوک رہا تھا۔ کئی بار اس نے آیا پر بھی تھوکا اور پھر اسے جلانے کے لیے خوب ناک میں انگلیاں گھنگھولیں۔ سوٹ کے بٹن چوسے اور جوتے کے بند کھول ڈالے۔

منچلے نوجوانوں میں کسی بات پر کشتم کشتا شروع ہو گئی۔ گالیوں کی جدت میں ترقی ہو گئی۔ کیلوں کی ٹوکری اور کئی صراحیاں لپیٹ میں آگئیں اور بدحواس ٹانگیں مختلف زاویوں میں پھیلنے لگیں۔ بچہ یہ حالت دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گیا۔ پھر اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں، گال سرخ ہو گئے اور چیخ چیخ کر ہنسنے لگا۔

"کیلے کیلے..... آیا کیلے.....!" وہ کچلے ہوئے کیلے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور کشتی میں حصہ لینے دوڑا مگر آیا نے اسے پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

جب ذرا سکون ہوا اور بچہ بستر پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا تو پلیٹ فارم بھی سونا ہو گیا۔ شمن نے ڈبہ کھول کر کچھ پیٹیز اور بسکٹ نکالے۔

"بری بات!" بچہ بغیر ہانپے ہی چلا آیا۔

"آیا بچے کو میرے پاس لے آؤ" شمن نے حکم دیا۔

"میم صاحب! آنا نہیں مانگتا۔ اس کا ممی نا مانگے گا۔ بولا دیکھا اجنبی آئے گا

پھر کون جانے کبھی آئے گا۔" جبراً آیا نے بچے کو آنے دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" شمن نے بہت سے چاکلیٹ اس کے دونوں ہاتھوں میں بھر دیے۔

"میم صاحب اکھا دن مستی کرتا..... پڑھتا کو چھ نئیں.... نائی.... وری ناٹی" بچے نے چاکلیٹ کھائے نہیں بلکہ انھیں صندوق پر قطاریں جما کر تالیاں بجانے لگا۔ آیا اس کی شرارتوں کا رونا روتی رہی۔ شمن بغور بچے کو دیکھتی رہی۔ چاکلیٹ کی برجیاں بنا کر زور سے ایک تھپڑ مار کر بکھیر دیتا اور اپنی اس فاتحانہ تخریب پر قہقہے لگانے لگتا۔

"جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو کیا ہو گے؟" شمن نے ایک بچے کا مرغوب ترین سوال بچے سے پوچھ ہی لیا۔

"ہم..... ہم سپاہی بنے گے۔" اس نے کانسٹبل کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو تھوڑی دیر ہوئی فساد فرد کر کے مزے سے کھمبے سے پیٹھ لگائے دوسرے فساد کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اگر یہ فساد نہ ہوں تو دنیا کتنی سونی ہو جائے۔ پھر کانسٹبل سوائے کھمبوں سے پیٹھ لگا کر اونگھنے کے کیا کریں گے۔ اگر بچہ چاکلیٹ کی برجیاں بنا کر نہ ڈھائے تو سوائے اسباب کی توڑ پھوڑ اور آیا پر تھوکنے کے اور کیا کرے۔ کاش ان کانسٹبلوں اور بچوں کو بھی کچھ کام ہوتا۔

"تمہیں ممی مارتی تو نہیں۔" نہ جانے اُسے کیوں خیال آیا کہ بچے کو پٹنے کی اشد ضرورت ہوتی ہوگی۔ کئی بار اس کا خود جی چاہا کہ اس کے پیارے پیارے سرخ گالوں میں چٹکی بھرے اور بے اختیار اسے بھینچ ڈالے۔ یقیناً وہ بڑا گدگدا اور گرم ہوگا۔ اس کی آغوش میں اسے جکڑنے کی ناقابلِ بیان ٹھگی ہوئی سی خواہش جاگ اٹھی۔ بچے نے ممی کے نام پر فکرمند ہو کر تیوریاں چڑھائیں۔

"وہ بڑی ناٹی ہے.... ممی!" بچے نے جھلا کر کہا تو اسے ایسا معلوم ہوا وہ اس بچے کو بہت دن سے جانتی ہے اس نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے

ہونٹ کتنے شگفتہ تھے۔ بعض انسان پھلوں اور مٹھائیوں سے کتنے مشابہ ہوتے ہیں دیکھتے ہی بھنے ہوئے چنوں جیسی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں میں آنے لگتی ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو تازہ انگوروں اور انناس کی قاشوں کی طرح مہک دیتے ہیں۔ یہ دلکش گوشت کا لطیف کھلونا جسے دیکھ کر بے اختیار نارنگی کی پھانک کی طرح چکھنے کو جی چاہنے لگا۔

"ہمارے پاس بندوق ہے بستر میں لپیٹ دی آپا نے دیکھو گی؟" بچے نے مستعدی سے بستر پر حملہ کیا۔

"نا ئیں۔ نا ئیں بابا بیڈنگ کیسے کرکے کھولنے کا۔" انگلش ٹھپّہ لگی ہوئی آپا نے بغاوت کی۔

"ہم پھاڑ ڈالیں گے۔" بچے نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا پھاڑے گا؟ ... ممی تم کو اتنا کر کے مارے گا کہ بس!"

"ہم ممی کو گولی سے مار دیں گے .... ٹھائیں۔" شکست خوردہ سپاہی نے سرخ گالوں کو پھلا کر کہا۔

"چہ .... بُری بات!" شمّن نے چمکارا۔ بچے نے اس پر بھی ایک بے اختیاری کی نگاہ ڈالی۔

"تم بھی ناٹی ہو .... ممی اور آپا سب ناٹی .... ہم سب کو ٹھائیں ٹھائیں مار دیں گے۔" بچے کے غصے پر شمن کو پیار آگیا۔ اتنا سا بچہ اور اتنے دشمن .... چہ بیچارہ۔ کاش یہ ٹھائیں ٹھائیں ٹھائیں مارنے کی دھمکی میں کچھ اصلیت رہے اور یہ جذبہ پروان چڑھ سکے۔

"آئی ایم سوری!" بچے کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ آنے والی خاتون کو اس نے ڈانٹ کر کہا اور غصہ اور بغاوت کا ننھا منا دیو بستر پر سر بلند ہو کر ڈٹ گیا۔

"ہیں! تم!" بھرے پلیٹ فارم پر دو بدحواس سہیلیاں شنٹ کرتے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

"ایلما .... تم!"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"چھٹی گزارنے، اور تم؟" شمّن نے پوچھا۔

"گھر جا رہی ہوں ..... تو چلو ہمارے ساتھ ....."

"میرے خطوں کا جواب ..... اتنے میں ریل آ گئی اور شمّن بھی دوڑ پڑا

ایک گارڈ سے کہہ کر شمّن ایلما کے ساتھ انٹر میں بیٹھ گئی۔

بچھڑی ہوئی سہیلیوں نے بالکل ننھی بچیوں کی طرح بہت سا وقت ایک دوسرے سے سوال پر سوال کرنے میں صرف کر دیا۔ جواب سننے کی کسے مہلت تھی۔ ایلما بانکی پور جا رہی تھی۔ شمّن نے چھٹیاں وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ریل میں نہ اتنی فرصت اور نہ کہانیاں اتنی مختصر کہ سنانے والا سنائے اور سننے والا جی بھر کر سنے۔

چٹاخ سے ایلما نے بچے کے گال پر تھپڑ لگایا، وہ کپڑے بدلنے میں پیر ٹیڑھے کر رہا تھا۔ ایک بار زور سے اس نے منہ پھاڑ کر دہاڑ نکالی اور چپ ہو گیا۔ ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ سرخ انگاروں جیسی دہکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے ایک بار نہایت گستاخ آنکھوں سے کچھ کہا۔ شدتِ ضبط سے نتھنے پھڑکے، کان سرخ ہو گئے مگر دو دھ اُبلتے اُبلتے تھم گیا۔ خاموشی سے اس نے کپڑے اُتروا لیے۔

گویا کوئی اس کی کھال اتار رہا ہو۔ شاید کھال اُتارتے میں بھی اتنی شدت سے جذبات نہ دکھتے ہوں گے۔

"ہمیں بھوک لگی ہے۔" بچے نے ڈانٹ بتائی۔

"آیا بسکٹ دے دو۔"

"ہم بسکٹ پھینک دیں گے، چاول کھائیں گے۔" دانت کچکچا کر ایلما نے پھر تھپڑ اٹھایا۔ مگر شمّن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں مارتی ہو؟"

"تم ..... تم نہیں جانتیں ..... یہ ....." ایلما کا گلا گھٹ گیا اور پٹے ہوئے بچے کی طرح بسور دی۔ شمّن نے کچھ نہ کہا خاموش سر موڑے کچھ سوچتی رہی اور ریل دوڑا رہی

۳۵

"تم کہتی ہو میں اسے کیوں مارتی ہوں؟" ایلمانے سونے سے پہلے اپنے مختصر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ بچہ آیا کے پاس سوتا تھا۔ گھر صاف ستھرا تھا مگر نہ جانے کیوں قیدخانے کا سا حبس تھا۔ کمرے کچھ پرانے اور برسوں سے بند پڑے تھے۔

"میں اسے مار ڈالنا چاہتی ہوں ..... جانتی ہو میں نے اسے ختم کر دینے کی پوری کوشش کی۔ اسے پھینکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو کئی بار موت کے کنوئیں میں دھکیل دیا مگر میری تندرستی سخت جانی بن کر آڑے آگئی۔ میں نے ایک گھناونے مرض کی طرح اسے شکم میں برداشت کیا ہر لحظہ میں نے اس کے وجود پر پھٹکار دی اور بدہضمی کی قے سمجھ کر جنم دیا۔" وہ بڑے جوش سے بکتی رہی۔ اس کی آنکھیں اب بھی اتنی ہی دہکتی ہوئی اور سیاہ تھیں مگر ان پر ہلکا سا تھکان کا پردہ پڑا تھا جو بہت غور سے کبھی کبھی ایک جھلک سی دکھا جاتا تھا۔ جسم ذرا بھاری ہو گیا تھا اور چیتے جیسی کھنچی ہوئی کمر بھدی پڑ گئی تھی وہ سبک شاخ گل اب بھیل اتری ڈال ہو گئی تھی۔ وہ بے رونقی کے دھندلے نقوش جو مٹ کر بھی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں ..... پھر بھی اس کا دماغ ابھی کنوارا تھا اور کنوارا رہنا چاہتا تھا، گو جسم ماں بن چکا تھا۔

"میں نے اس تھوہر کے پودے کو سینچنے سے انکار کر دیا مگر دودھ کی زیادتی سے اندیشہ پیدا ہو گیا اور ..... اوہ ..... وہ سہم کر شمن کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔ جیسے اس کی آغوش میں پناہ لینا چاہتی ہو۔" یقین مانو شمن میں نے نرک کے دکھ بھوگے ہیں جیسے سانپ کو چھاتی سے لگا یا کہتے ہیں کہ جب نیکے کے پوتر ہونٹ ماں کے جسم کو چھوتے ہیں

تو سورگ کی اپسرائیں رشک کی آگ میں جل مرتی ہیں گر وہ ماں نہیں بن سکتیں.....

مگر شمن لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔ جیسے اس سپنولیے کے پیٹ کی آگ میں نے بجھائی میں ہی جانتی ہوں جتنے دن یہ میرا خون چوستا رہا میری آتما جنم میں تھوکتی رہی۔

"اتنی پریشان نہ ہو پگلی!" شمن نے پیار سے اسے پاس گھسیٹ لیا۔

"تم نہیں جانتیں..... اوہ تم نہیں جانتی!"

"ایلما تم اتنی پریشان ہو...... کیا یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ ناجائز ہے؟"

"ہشت پگلی! اگر سیتل کا بچہ دیوتاؤں کے اپنے ہردے کی جلائی ہوئی آگ سے بھی پوتر ہو کر آتا تب بھی مجھے سولی جیسا دکھ دیتا...... کوئی منتر کوئی پوجا اسے پاک نہیں کر سکتی...... جب میرا ضمیر ایک حیوان کے جسم سے چوٹ کھا گیا تو۔"

"مگر اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟ ..... ہنہ تم نے دیکھا نہیں، یہ وہی ہے!" وہ اور خوف زدہ ہو گئی۔ "وہی بالکل وہی سانپ!" اور شمن کو یاد آیا کہ بچے کو دیکھ کر جو اسے دھوکہ ہوتا تھا کہ وہ اسے کہیں دیکھ چکی ہے وہ وہم نہیں تھا۔ بچہ بالکل چھوٹا سا سیتل تھا وہی تومند جسم اور مستانہ چال وہی زندہ دلی اور جوش! تو پھر ایلما حق بجانب تھی۔ قدرت اسے چڑھا رہی تھی۔ اگر بچہ ایلما سے مشابہ ہوتا تو شاید خود دیکھ سکتی اٹھتے آجاتی مگر وہی شخص جو ہمیشہ اس کی نفرت کی آماجگاہ بنا رہا غیر اختیاری طور پر ایسا چھایا کہ اس کے خون میں بھی رچ گیا۔ محبت اور نفرت اپنی بلندی پر پہنچ کر ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ انھیں پہچاننا مشکل ہے۔ دیوتا اور شیطان دونوں کی پرستش ایک نکتے پر جا کر ٹک جاتی ہے۔ کتنا باریک ہے یہ نکتہ کہ تخیل کی نگاہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

"لیکن ایلما تم تو بڑی ترقی پسند ہو اور اگر سماج ایک ایسے بچے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے تو تم اسے ظالم کہو گی۔"

"سماج ایسے بچے کو صرف اس لیے بُرا سمجھتا ہے کہ وہ بیاہ کے منتروں کے چھینٹوں میں نہائے بغیر دنیا میں آجاتا ہے اور میں......"

"نہیں .... سوسائٹی کی اجازت بغیر دنیا میں آجاتا ہے .... تمہیں روکی سے اسلیے نفرت ہے کہ وہ تمہارے حکم بغیر دنیا میں آیا۔ اسی طرح سوسائٹی کو بھی ...."

"مگر کیوں؟ سوسائٹی کو کیا مطلب؟"

"اس لیے کہ ایسے انسانوں کی تعداد دنیا میں نہ بڑھے جو بن وارث کے ہوں... تم جانتی ہو عورت ہی تنہا ذمہ دار رہ جاتی ہے باپ کے منہ پر کوئی مہر نہیں پڑتی.... اب ذرا سوچو اگر شادی کا اسٹامپ نہ لگایا جائے تو عورت جس کی اقتصادی حیثیت صفر کے برابر ہے کیا کرے ...."

"ہوں تو تمہاری رائے میں ناجائز بچے صرف مالی مشکلات کی وجہ سے دو بھر معلوم ہوتے ہیں؟"

"اور کیا خود سوچو ایک ماں قدرت کے بنائے ہوئے اصول کے مطابق آنے والے بچے سے کیوں نہ محبت کرے؟ کیا وہ اس کے جسم کا ایک ٹکڑا نہیں۔ دینے والے نے نعمت دی اور لینے والے نے پائی پھر باپ کیوں ڈرے اور ماں کیوں ٹھکرائے؟ صرف اس لیے کہ اس کا پالنا پوسنا "دردِ سر" ہے۔"

"اور شادی کے بعد؟"

"تب مرد اسے اپنا فرض سمجھ کر برداشت کر لیتا ہے۔"

"سوسائٹی کا باندھا ہوا فرض۔"

"ہاں مگر.... مگر اس کا اب وہ اس درجے تک عادی ہو چکا ہے کہ اس بار کو اپنا سمجھتا ہے۔ لفظ "اپنا" اس کی خود پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔"

"اور ناجائز کو اپنا نہیں سمجھتا؟"

"مجبور نہیں .... قانوناً بھی تو اس کا نہیں .... قانون کے بغیر اس کی ماں بھی غیر ہوئی۔"

"اور ماں؟ ماں کیوں نفرت کرے۔"

"کیونکہ وہ کوئی کمانے والا ساتھ نہیں لاتا۔ اس کی پرورش کا بار اس کی زندگی

کے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ جاتا ہے۔"

"ہشت یہ سب واہیات ہے۔ مائیں ایسے بچوں کو صرف ایک وجہ سے فنا کر دینا چاہتی ہیں کہ وہ اس کے لانے والے سے نفرت کرتی ہیں۔ اس نفرت کا انتقام وہ اُس کی گردن مروڑ کر لیتی ہیں۔"

"توبہ توبہ میں تو ایسی عورت کو حیوان سمجھتی ہوں!"

"تم بے وقوف ہو..... حیوان اتنے بے رحم نہیں ہوتے اور نہ بیوقوف انکے یہاں نہ بھاوریں پڑیں نہ بیاہ رچے..... سنا ہے تم نے کسی گدھے کو سہرا باندھا ہے"

دونوں کھِل کھلا کر ہنس پڑیں اور سیاہ بادل چھٹ گئے۔

"ایلما تم بھی سنٹرن ہی ہو..... وہ کسی کا ہو ہے تو اتنا پیارا!"

"خاک! دماغ تو ہے ہی نہیں بس جیسے گوشت کا دھما۔ میں تو اس کی پرچھائی کی طرف بھی نہیں دیکھتی نہ جانے کیا جھک مار کر آتا ہے"۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا اس کے مستقبل کے بارے میں؟"

"میرا ارادہ....." اس کی آنکھوں میں پھر آگ سلگی۔

ایک فلک شگاف چیخ بچے کے کمرے سے آئی اور پھر پے در پے آوازوں سے سنسان گھر گونج اٹھا۔ دونوں لپکیں، ایلما آگے اور شمن پیچھے!

"نہیں.... نائیں....." بچہ مسہری پر اوندھا لیٹا ہوا تھا تیزی سے ایلما نے اسے اٹھایا تھوڑی دیر کو شمن کو شبہ ہوا کہ اس کی آنکھیں نرم نرم روشنی سے چمکیں۔ لیکن فوراً ہی ایک دردناک چیخ مار کر اس کے بازوؤں سے پھسل پڑا۔

"آئی ایم سوری.... سوری...." وہ ہیبت زدہ ہو کر چلانے لگا۔ ایک ہلکی سی پریشانی ایلما کے چہرے پر آئی اور غائب ہو گئی۔

"چپ.... خاموش..... چپ" اس نے تھپڑوں کی بارش کر دی اور اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا اگر شمن اور آیا اسے دھکیل کر کمرے سے باہر جاتیں۔ شدتِ جذبات سے وہ دیر تک لرزا کی، معلوم ہوتا تھا ایک بچے سے نہیں کسی دیو سے کشتی لڑ کر آئی ہے۔

"میں ایک دن اسے ختم کر دوں گی ..... میں موت سے نہیں ڈرتی مگر یہ عمر قید..
میری زندگی .... جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وہ بل کھا کھا کر مختصر سے کمرے میں ڈگ بھرنے لگی۔ بگڑ بگڑ کر وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں چٹکا لیتی اور پھر خود ہی اس گرفت سے زور آزمائی شروع کر دیتی۔ معلوم ہوتا اس کے دماغ کے گرد بھی کسی نے جال بن دیا ہے۔ ایسے کہ جتنا جتنا وہ زور لگاتی ہے بندش کستی ہی جاتی ہے مگر اس "بچے" کا ......"

"یہ بچہ "نہیں ہے ....." اس نے بلند آواز سے کہا .... "یہ وہ خود ہے .... مجھے آزار پہنچانے، تباہ کرنے کے لیے وہ خود جنم لے کر آیا ہے۔ اس نے اسی ذلت کو کافی نہ سمجھا اور مجھے ایڑی تلے مسلنے ....."

"تم پاگل ہو گئی ہو تم اس کی ماں ہو۔"

"نہیں میں اس کی ماں نہیں۔ اگر جنم دینے سے ماں ہو جاتی ہے تو .... تو .... ہرگز نہیں اگر چنبیلی کی بیل سے تھوہر کا پودا لپٹ جائے تو تم اسے بھی تھوہر کہنے لگو گی؟ اگر اس گلدان میں کہیں سے سانپ گھس آئے تو وہ بانبی بن جائے گا؟ ....."

اس نے آتش دان پر رکھے ہوئے گلدان کو دونوں ہتھیلیوں سے بھینچا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں میرے دکھ کو۔" وہ زور سے مڑی اور گلدان ایک غمگین چھناکے سے زمین پر آ رہا۔ ایلما دہشت زدہ ہو کر ان پریشان کیڑوں کو دیکھنے لگی جو اس میں سے نکل کر چاروں طرف کونوں میں پناہ لینے بھاگ گئے۔

"نہیں نہیں یہ نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا .... یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی ہو گئی۔ اور گھبرا گھبرا کر گلدان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے لگی۔ شمن کو اس سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اس نے چاہا اسے گھسیٹ کر پلنگ پر بٹھائے مگر وہ بگڑ گئی۔

اس طرح ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے میں اسے خاک میں روند کر پھینک دوں گی"
آہستہ دانت پیس کر اس نے کہا۔ اس کی شکل بالکل مکار چڑیلوں جیسی ہو گئی۔ شمن کو

اس سے کراہت آنے لگی۔

"تم بن رہی ہو ایلما!" اس نے حقارت سے کہا۔

"ایں؟" وہ غصے سے مڑی۔

"ہاں، تمہیں ایکٹنگ میں مزا آ رہا ہے، تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"شمشی!"

"بس اترا ؤ مت، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اور میرے سامنے اتنی عجیب باتیں کرو گی۔ تمہیں اپنے بچے سے محبت ہے اور مجھے الو بنا رہی ہو۔"

"کیا؟ ..... محبت؟" ایلما بپھری۔

"مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ اتنی سی دیر میں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔ تمہیں اس سے شدید محبت ہے مگر اسے جھوٹی نفرت کے بھیانک روپ میں لپیٹ کر دکھانا چاہتی ہو۔"

"تم!"

"چپ رہو، میں تمہیں اتنا کم ہمت نہ سمجھتی تھی، افسوس تم نے میرے سارے حسین خوابوں کو آج اس گلدان کے ریزوں کے ساتھ چکنا چور کر دیا۔ تم بزدل اور دھوکے باز ہو، روشن خیال ہو، ناجائز کو جائز کہہ تو دیا لیکن تخیل کے بنائے ہوئے ڈھکوسلے کی آڑ لینے لگیں مجھ سے جھوٹ بول بول کر اپنی عزت اور کم نہ کرو۔ سچ بتاؤ تم نے اپنی ماتا کو ہوا نہیں بنا ڈالا۔ بڑی آئیڈیل والی بنتی ہو۔ مگر یہ تمہارا آئیڈیل تمہارا ..... تمہارا ضمیر تمہاری ذہانت تمہاری ماتا کے آگے مات کھا گئے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں کبھی بھی سیتل سے نفرت تھی!"

"شمشاد ....."

"بکو مت تم اس کی پرستار تھیں ..... لیکن تمہاری خود پرستی نے کبھی تمہیں اقبال نہ کرنے دیا۔ تمہارا یہ فلسفہ بالکل بے بنیاد اور پوچ ہے کہ جسم اور روح جدا جدا ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیتل کو تمہارے جسم نے چاہا اور روح نے نفرت کی۔

پگلی دل، دماغ دھوکہ کھا سکتے ہیں مگر جسم دھوکے میں نہیں رہتا، وہ وقت آنے پر سچ بول دیتا ہے۔ لیکن تم نہیں مانتیں کہ تم سیتل سے محبت کرتی تھیں۔ اور اب بھی تمہارے آتما اس کی خواہش میں تمہیں یہ سزا دے رہی ہے کیونکہ وہ تمہیں نہیں ملتا۔ اس لیے اس فراق کی جلن تم اس کے بچے سے انتقام لے کر بجھانا چاہتی ہو اور یہ بھولنا چاہتی ہو کہ یہ تمہارا بھی ہے۔ اری دیوانی ذرا غور تو کر اس طاقت کے مظاہرے میں کتنی کمزوریاں پوشیدہ ہیں۔"

"مجھے کسی کا ڈر تھا جو محبت کو چھپاتی؟" ایلما کی آواز شکست خوردہ ہو کر بھرا گئی۔

"خود اپنا، ایلما جتنا تم اپنے آپ سے ڈرتی ہو کسی سے نہیں ڈرتیں۔ تم کو خود اپنے سامنے سچ بولنے کی ہمت نہیں۔ اس کے علاوہ تمہاری ایک اور کمزوری ہے جسے تم کبھی تسلیم نہ کرو گی...... تم ویسے بڑی مضبوط بنتی ہو..... مگر تم سماج سے بھی ڈرتی ہو۔"

"منہ سے تم کہو اور دنیا مان لے۔" ایلما نے وثوق سے کہا۔

"تم جھوٹ بہت بولنے لگی ہو۔ زندگی کو جنتر منتر بنا رکھا ہے۔ سچ بتاؤ تم نے بچے کا کیا نام لکھوایا ہے اسکول میں؟"

"رولف.... کیوں پوچھا تم نے؟"

"نہیں پورا نام بتاؤ۔"

"کیا کرو گی؟" ایلما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"دیکھا باپ کے نام پر کھسیا گئیں!"

"مطلب کیا ہے؟ یہ میری نجی باتیں ہیں!"

"بالکل، اور مجھے دخل دینے کا کیا حق؟.... معافی چاہتی ہوں اب کچھ نہ بولوں گی۔"

"اس کا باپ اس لائق نہ تھا..... دوسرے....."

"دوسرے تمہارے پاس اس کے نام کا سرٹیفکیٹ بھی تو نہیں تھا۔"

"ہاں!" ایلما کچھ خوفزدہ سی خاموش ہوگئی۔

"بس اسی کا سارا غصہ ہے۔ آگئیں نا اپنی اصلیت پر، دیکھا اپنے آئیڈیل کا حشر؟"

تھوڑی دیر بے تکی خاموشی چھائی رہی جس میں دو بے چین سہیلیوں کی تھکی ہوئی سانسیں گونجا کیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا دونوں تھک گئی ہیں۔ باہر دریچے میں سے چاند ایک بادل کے نیچے سے گھسٹ گھسٹ کر نکل رہا تھا۔ اور ہوا ٹہنیوں میں سرسرا رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ صرف دور بہت دور جنگلی سیار خواب آلودہ قہقہے لگا رہے تھے۔

"تم ہمیشہ سے بزدل تھیں جبھی تو ہر ایک پر غرا کر جھپٹ پڑتی تھیں اور یہ بچہ کے متعلق تمہارے خیالات ہیں یہ کچھ نہیں سوائے تمہاری مفلوج مامتا کے انتقام کے تم اس جذبے سے زور آزمائی نہ کرو، بری طرح شکست کھا جاؤ گی۔"

پلنگ پر خاموش بیٹھی ایلما اپنے ہاتھوں سے کشتی لڑتی رہی۔ اس کے تھکے ہوئے چہرے پر کرب اور لاچاری طاری ہوگئی۔ سادھوؤں جیسی گیانی آنکھیں بسورتے ہوئے بچوں کی طرح رو پڑیں۔ سیاہ گھٹے ہوئے گالوں پر سے لمبے لمبے خاموش آنسو چھلچھلاتی ندیوں کی طرح رسنے لگے۔ عضلات کی کھینچ تان سے اس کا بالائی ہونٹ دانتوں پر سے سرک گیا وہ اب بھی اتنے ہی دھار دار تھے مگر زہریلے نہیں!

"اس وہم کو دماغ سے نکال دو۔" ایلما کا سر تکیے سے لگا کر اس نے کہنا شروع کیا.... "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ رولف کتنا پیارا بچہ ہے۔ میں تو کبھی سوچتی بھی نہیں کہ اس کی تخلیق میں کچھ سٹنل کا بھی حصہ ہے، مجھے تو وہ میری پیاری ایلما کا ننھا منا کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ سنو ایلما۔"

مگر ایلما سننے والی دنیا سے بہت دور گہری نیند میں غرق تھی۔ شمن کی لوری نے اس کی برسوں کی اچاٹ نیند کو بلا لیا اور وہ معصوم بچے کی طرح ایک ہی جھپکی میں غافل ہوگئی۔ مگر شمن کی نیند اچاٹ ہوگئی۔ آہستہ سے اس نے ایلما کے پیر سیدھے کیے

اور خود بھی جا کر دیوان پر لیٹ رہی۔ خیالات کے گھوڑے لگامیں تڑا کر بھاگ نکلے۔

ایک ہی بچے نے ایلما کو بوڑھا کر دیا تھا۔ ایک ہی پودے کی سنچائی میں وہ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی، کمر کے وہ خم، جسم کا وہ ٹھوس پن مرجھا چکا تھا۔ شمن نے اپنے جسم پر نظر ڈالی مہکتے ہوئے تیار انگوروں کی تیز خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی۔ اور اسے وہ انگور یاد آگیا جو بہت دن ہوئے ایلما نے اس کے گال پر کھینچ مارا تھا تو اس کا سارا منہ نہا گیا تھا۔ اور ایلما؟ اس نے گردن گھما کر دیکھا، جیسے چوسی ہوئی گٹھلی! اس نے اپنی کیا گت بنا لی تھی! دو چار انگڑائیاں لے کر اس نے سونے کی کوشش کی مگر پکے انگوروں کی خوشبو نے اسے بے چین رکھا۔

اسے سنیل کا خیال آیا جب وہ پکنک میں سوکھی ہوئی پتیوں پر اینڈ رہا تھا اور پھر اس نے ایلما کے مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھا۔ اس کا جی دکھ گیا۔ چاہا چپکے سے اٹھ کر ان شبنم میں ڈوبے اداس گالوں کو چوم لے۔ سوتے میں وہ ایلما جس پر جاگتی ہوئی ایلما ہر وقت بھتنی کی طرح تنی لیے تیار رہتی تھی۔ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ ابروؤں کا طنز آمیز کھنچاؤ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اور بجائے اورا کی دیو داسی کے وہ بالکل معمولی عورت لگ رہی تھی۔ اس کا سیدھا سادا سینہ معصوم مامتا سے دھڑک رہا تھا شاید وہ خواب میں اس بچے کو چوم رہی تھی۔ جس پر بیداری میں خود اس نے اپنے وہم کا پاسبان بٹھا رکھا تھا۔

صبح اٹھ کر شمن نے روی سے دوستی شروع کر دی۔ بچہ بلا کا ذہین تھا۔ اور شاید ایلما کو جلانے کے لیے اس نے سنیل کی ذہانت چرالی تھی۔ بات کرنے میں وہ بالکل اس کی طرح بھویں چڑھا کر گہری آنکھوں سے دیکھنے لگتا۔ ماں کا ٹھکرایا ہوا بچہ شمن سے پورے جوش سے لپٹ پڑا۔ ایلما کی طرح وہ بھی جھکی تھا۔ اور جس بات کے پیچھے پڑ جاتا عاجز کر دیتا۔ ایلما خاموش کن انکھیوں سے اسے دیکھتی مگر محبت جتاتے ایسی شرماتی جیسے بھرے بازار میں ننگی ہو گئی ہو۔ چار سال کی دبی ہوئی کونپل زرد اور بے جان ہو چکی تھی۔ خوب

آہستہ آہستہ شرم بھی ٹوٹی۔ بچّہ پہلے بے اعتباری سے بھڑکا اور غصّہ ہوا پھر متحیر ہو کر مانوس ہو گیا۔ ندی کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ امڈتے ہوئے طوفان کو جیسے پہل کی روک نے اور بھی تہ زور بنا دیا ہو۔ روکنا آسان کام نہیں۔ دن بھر ایلما کی آنکھیں چھپے چوری رولف کے پیچھے بھاگتیں اور ذرا دور جاتا تو اس کی تلاش میں جھکنے لگتیں

جب شمن دو دن چھٹیوں کے علاوہ رہ کر چلنے لگی تو ایلما اس سے لپٹ کر رو دی وہ بڑی نرم دل ہو چلی تھی۔ ندی کا دھارا جب خشک زمین پر پورے زور سے گرتا ہے تو اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بکھیر دیتا ہے۔ ایلما کی پیاسی ممتا پر بھی یہ محبت کا دھارا اس شان سے گرا کہ کنواں بن گیا۔ اور وہ اس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لینے لگی۔ ماں بیٹے اسٹیشن تک اسے الوداع کہنے آئے۔ جب ریل چل دی تو شمن نے اطمینان سے سانس بھری۔ وہ خوش تھی اس نے دو روٹھے ہوئے پنچھیوں کا میل کرا دیا تھا۔

۳۶

گرمی شباب پر تھی۔ معلوم ہوتا تھا سورج گھومتے گھومتے راستہ بھول کر قریب آتا جا رہا ہے۔ دنیا چکرائی جا رہی ہے۔ جرمنی نے فرانس کو بھون کر رکھ دیا۔۔۔ صدیوں سے آزادی کا جھنڈا لے کر بڑھنے والی حسینہ کان میں کوڑی ڈال کر جھک گئی۔ ادب اور فن کی دیوی زہرہ پر نازی عقاب پنکھ پھیلا کر ٹوٹ پڑا۔ یہ کیسی مجبو لائی تھی کہ اپنی اپنے پیروں میں بیڑی بن کر الجھ گئی۔ وہ تکیہ جس سے پیٹھ لگائے مزے سے لیٹے تھے۔ الٹا دم گھوٹنے لگا۔ غلام فرانس کو نازی چنگل میں سسکتا چھوڑ کر آزاد فرانس انگلستان میں جا بیٹھا جتنے ملک نازیوں کے پنجے کے نیچے دبتے گئے ان کے آزاد والے انگلستان میں جمع ہوتے گئے۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو یہ فرزند

دولت انگلشیہ نے ہندوستان بھی ایک بار اس جان چھڑکنے والی ماں کی گود سے چھوٹ کر آزادی کی انگڑائی لے سکے اور اس کے کسی کونے میں آزاد ہندوستان پیدا ہو جائے۔

اسکول کے رمنٹ سے عاجز آکر اس نے کلب جانا شروع کر دیا۔ مگر وہاں بھی جی کچھ اکھڑا سا رہتا۔ سکونِ قلب نہ جانے کہاں جاکر سو رہا تھا۔ عمر اونگھتی، ٹھٹھکتی چلی جا رہی تھی۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات منصور صاحب سے ہو گئی۔ منصور کھاتے پیتے رئیس تھے مگر دل میں قوم کا درد بھرا تھا۔ کھدر پہنتے تھے اور شہر میں کئی کھدر کی دکانیں تھیں۔

ان کے ساتھ کچھ گاؤں سدھار کے سلسلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پُرلطف پکنک کا مزا آگیا۔ زمیندار صاحب خود ترقی پسند تھے اور منصور کے پکے دوست گو سنسکاری وحشت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ گاؤں والے متحیر آنکھیں پھاڑے اپنے ملنے والوں کو جوق در جوق دیکھنے آنے لگے۔ مارے عقیدت کے بدحواس ہو گئے تھے۔ جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ سدھار بھی کوئی چیز ہے۔ اس کی ضرورت انھیں کسی طرح محسوس ہی نہ ہوتی تھی۔ جیسے شائی کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ احساس بھی سُن ہو گیا تھا۔ یہ کسان جن کی دولت ہل ہے اور بیل، جو دھرتی کا سینہ چیر کر اناج نکالتے آئے ہیں اپنے پیٹوں کے لیے نہیں بلکہ غاروں میں جھونکنے کے لیے یہ تو بس یوں کے قائل ہیں اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے ہی میں مکتی ہے۔

لیکن بھولے بھالے گنوار بھی عجیب خصلت رکھتے ہیں یہ بہت جلد ایک مالک سے اکتا جاتے ہیں اور جب ایک رُخ سے ناک رگڑتے رگڑتے گھس جاتی ہے تو سانس لینے کو دوسرے دیوتا کے آگے دوسرے رخ سے ناک گھسنے لگتے ہیں جبھی تو ان کی ناکوں میں اتنی کھنڈی دھار ہے۔ انھیں رتی بھر بھی تو احساس نہیں کہ جرمن بھیجے کا چکہ گھوما تو کیا ہوگا۔ پستے رہنے کی عادت نے انھیں بالکل نڈر بنا دیا ہے۔ انھیں ذرا بھی تو نہیں معلوم کہ جرمنوں نے انگلستان پر بمباری شروع کر دی ہے۔ سکھ چین کے عادی نازک طبع

کیسے جھیلیں گے اس آگ کی بارش کو؟ کیا حال ہوگا ان کا جب انھیں معلوم ہوگا کہ دنیا میں آرام دہ کمرے ہی نہیں سورج کی تپش، برف کی ٹھنڈک اور ہوا کے بگولے بھی رہتے ہیں۔

مگر یہ ننگے بھوکے فقیر کسی کے نہیں، ہندوستان کی دولت اور دولت مند خریدے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کے سسکتے ہوئے گداگر اور ان کے خاموش منتظر دل کوئی نہیں جیت سکتا۔

شام کو سرکار کی طرف سے سارے گاؤں کو سرکار کی بہبود کی دعائیں مانگنے کا حکم ملا۔ مندروں میں گھڑیال جھنجھنا اٹھے اور مسجدوں میں اذانیں گونجیں مگر ان مجبور دل کسانوں کے دل خاموش رہے وہ کیا کسی کے دشمن کو کوستے۔ جو خود اپنے دشمنوں کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگنے آئے ہوں۔ رات کا کھانا پُرلطف رہا۔ زمیندار صاحب نے شکار بھنوالیا تھا اور تازہ گھی کی روٹیاں موجود تھیں رات گئے تک گراموفون بجتا رہا اور صبح ہوتے ہی واپس لوٹ آئے۔ پہلی قسط قوم سدھار کی بڑی نذر رہی۔

تنہائی نے اخبار کو دنیا بنا دیا۔ ویسے اخبار ہو بھی تو گئے تھے دلچسپ۔ یورپ میں جو الٹ پلٹ ہو رہا تھا اس کے بارے میں چھوٹی سی خبر بھی ہلچل مچا دیتی۔ جرمنی کے لمبے چوڑے دانے میں یورپ پر ملک پھیلتے جا رہے تھے۔ سرکاری گلابی افق پر سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر کی ہوس بڑھتی جا رہی تھی۔ دنیا کی ہر قوم اور سرکار گھبرائی ہوئی تھی۔ برسوں میں جو کچھ کیا دھرا تھا اس پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا۔ کسی کا بھروسہ نہیں۔ یہی جرمنی جسے بیس بائیس سال پہلے حق پرستوں نے ناک رگڑوائی تھی آج مست ہاتھی کی طرح روندتا چلا آ رہا تھا۔

سہ ماہی امتحان سر پر آ گئے۔ نہ جانے یہ امتحان کا سلسلہ کس نے شروع کیا۔ طالب علم اور ممتحن دونوں کو بندھی بندھائی دینے کا آسان طریقہ اور کچھ نہیں۔ بس پندرہ دن کی پڑھائی اور کاغذ کی ڈھیریوں کا ستیاناس لگ جاتا ہے۔ کیا لکھا، پوچھے کچھ الٹا، کا اور نہ اور اس پر نمبر دینا ممتحن کا کام۔ نہ جانے ان نمبروں کی تعین دینے کا مقصد کیا ہے

امتحان کے کمرے میں چکر لگاتے لگاتے پیر سوج گئے۔ اسے پانی پلادو تو اسے سیاہی لاکر دو۔ ایک قلم بھول آئی تو دوسری کا نب ٹیڑھا ہو گیا۔ سارے وقت سپاہی تو جاذب اِدھر سے اُدھر پہنچاؤ۔ یہ عاریتاً مانگنے کی عادت بھی خوب ہے۔ تعجب ہے لوگ قلم دوات کاغذ پنسل کے ساتھ آنکھ کان ناک اُدھار نہیں مانگ لیتے۔

دسمبر کی چھٹیوں میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو اپنا سامان درست کر کے آرام کرسی پر جماہیاں لیتے لیٹ گئی کہ کب شام ہو اور کب چڑیا بسیرا لینے اُڑ جائے۔ اس دفعہ گھر کی یاد کچھ زیادہ ستا رہی تھی۔ پورا سال گذر گیا تھا۔ نہ جانے گھر کا کیا حال ہو گا۔ اماں کے کتنے دانت اور ٹوٹ گئے ہوں گے؟ مصنوعی لگ جائیں تو اچھی ہو۔ منجھو بی کے کتنے بچے ہوں گے کوئی؟ چھوٹا تو شاید لڑکا تھا یا لڑکی...... چار سال کی بات ہے کیسے یاد ہو۔ نہ جانے اتنے دنوں میں تعداد کہاں سے کہاں پہنچی ہو۔ منجھو تھی بھی تو بلا کی زرخیز۔ سنجھلو نے کتنے جتن کر ڈالے۔ چھوٹے کا بچہ بھی نہ جن سکی۔ اب تو ان کا میاں بھی سو کن کر بیٹھا ہے۔" بھاوجیں بھی کسی سے کم نہیں میاں سے گھڑی بھر کو نہیں بنتی پر بچوں کا سلسلہ ذرا دیر کو نہیں رکتا! خیر آج کل تو بچوں کی ضرورت بھی ہے۔ جنگ کا زمانہ ہے لڑکے سپاہی بن کر گھاٹیاں تیار کریں گے اور لڑکیاں ان گھاٹیوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ نہ جانے اس توڑ پھوڑ اور مرمت میں کیا لطف آتا ہے انسانوں کو۔

چپراسی نے ایک تار لا کر دیا اور شمن کے خیالات منتشر ہو گئے۔

"آن لو"
افتخار"

بے اختیار دل دھڑکا۔ دو لفظوں نے دفتر کے دفتر کھول کر بکھیر دیے۔ کئی بار پڑھا کہ کوئی لکیر کوئی نقطہ نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ جی جل گیا۔ پیاسے کے منہ پر چھینٹا اور وہ بھی اوس بجلی کے ساتھ کہ اور پیاس بھڑک اٹھی۔ اسی شام کو وہ بھوپال روانہ ہو گئی۔

وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ وہ بہت جلد بھول گئی۔ پتنگ کی ڈور کھینچ رہی ہے اور فاصلے سے اس دھمکیوں دھڑالی وہ چلی ہے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہوئی آرزوئیں اور تمنائیں جیسے خواب رسّیاں تڑا کر طرارے بھرنے لگے۔ ان چند
سالوں کی خشک زندگی نے اس کے جذبات پر کاروباری سیمنٹ کی ایک تہ چڑھا
دی تھی۔ سوائے سادہ بھدی ساری اور بد وضع جمپر کے اس نے لباس بھی تو کوئی نہیں
رکھا تھا۔ لڑکیوں کی اخلاقی حالت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ فیشن سے پرہیز کرنے لگی
تھی۔ اس کی زندگی مسلسل اداسی اور خشکی میں ڈوب گئی تھی۔ مگر آج اسے ایسا
محسوس ہو رہا تھا کہ سیمنٹ کی تہہ کو توڑ کر ایک دبا دبایا کلّہ سر اٹھا رہا تھا۔
مرجھائی ہوئی زرد زرد کونپل ایک نئی حرارت کے احساس سے چونک رہی تھی۔

گذشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے تھے۔ کچھ طاقت
کی دوائیں جن کا ذکر اس کے خط میں بے خیالی سے کر دیا گیا تھا۔ اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا
سوئٹر تو حال ہی میں بھیجا تھا۔ اسے وہ وقت یاد تھا جب افتخار کی کھانسی کے دھماکے
اس کے دماغ میں گونج اٹھتے تھے۔ اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو گرم کرنے کے لیے
اگر ممکن ہوتا تو وہ اپنی کھال اتار کر دے دیتی۔ اب تو ایک جسم کا خون دوسرے جسم
میں آسانی سے پہونچایا جا سکتا ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ اس مرتبہ وہ پوری کوشش
کرے گی کہ تھوڑا سا اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا دے۔ اور آنکھیں بند کر کے تخیل میں
افتخار کی نسوں میں خون بن کر بہنے لگی۔ شرمائی ہوئی سرخ پوش دلہن! وہاں کیسی
آزادی سے وہ یک جان ہو سکتی تھی۔ یہ خونی جوڑا پہنے دلہن دبے پاؤں اس کے
دل میں رینگ جاتی اور پھر اس طرح پھیل جاتی اور گالوں کو چومتی ہوئی ہونٹوں پر ناچ
اٹھتی! افتخار کتنا مہذب تھا اس نے کبھی اس کا ہاتھ بھی تو نہ چھوا۔ ایک مقناطیسی
کشش سے وہ اپنی طرف کھینچتا ضرور تھا مگر صرف اتنے قریب کی دھیمی
دھیمی سی ہوش کن آنچ۔ برداشت نہ ہو سکے ...... اور پھر ڈھیل دے دیتا
ایسے کہ کھینچنے والا دھکا کھا کر پرے جا گرتا۔ اگر وہ بھی دست دراز ہوتا اور
سینل کی طرح اس کا جسم بھی حاصل کر لینا چاہتا تو وہ گردن پھیر کر بھی اسکی
طرف نہ دیکھتی۔ یہ مدبھرا امرت کا گھڑا اس کے اوپر الٹ دیا جاتا تو پھر یہ خیال

شدتِ جذبات کا اظہار

کہاں سے آتا!

کتنا مقدس تھا ان دونوں کا ناتا۔ اس دن الٰہ آباد کے کیمپ میں جب اپنی ریشمی رضائی افتخار کو سونپی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے خوابوں کی دنیا کو بھی لپیٹ دیا تھا۔ تنہائی کی اتھاہ گہری راتوں میں چاروں طرف سے مہیب آوازیں پکار پکار کر قہقہہ لگاتیں اور کہتیں ..... اکیلی ..... اکیلی" تو وہ اپنی ٹھٹھرتی ہوئی لاوارث روح کو جھٹکے سے دور اس رضائی میں سرکا دیتی۔

اس کے پاس افتخار کی ایک پرانی تصویر تھی۔ جس میں وہ دور کہیں غیر فانی بلندیوں کی طرف گھور رہا تھا۔ بالائی نصف حصہ روشن تھا اور داہنا رخ تاریکی میں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر استقلال ناچ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا تاریکی کا تھپڑ اس کا منہ موڑنا چاہتا ہے مگر وہ استقلال سے دھارا کے بہاؤ سے مقابلہ کر رہا تھا۔ یہ تصویر ہمیشہ اس کے بہت قریب ہوتی۔

ابھی حال ہی میں افتخار نے اسے چند اشعار بھیجے تھے۔ جلتے جلتے باغیانہ اشعار کے ساتھ اس کا دل محبت کے شیریں نغمے بھی گا اٹھتا تھا۔ ان رنگین اشعار میں اس نے نشیمن کی اس بستی ساری کو لہراتا دیکھا تھا جو اس کے دل و دماغ پر ایک رنگین خواب بن کر چھا گئی تھی جسے مصور نے قوس قزح کو بکھیر کر واپس ایک نقطے پر سمیٹ دیا تھا اور اس دن سے سونی سونی راتوں میں وہ اپنے غمگین دل سے باتیں کیا کرتا تھا اس سے پہلے بھی وہ اس کے خوابوں میں نور برساتی آچکی تھی یہ گیت اس نے اتنی مرتبہ گنگنائے تھے کہ لوحِ دماغ پر گہری گہری لکیروں کی طرح کھنچ گئے تھے کاغذ اس کے دھڑکتے ہوئے سینے کی نمی سے نم بھیگے ہو گئے تھے۔ اسکول کی اس خشک اور چٹیل فضا میں یہ آبِ حیات کے چند چھینٹے اس کو ہمیشہ تازہ دم بنائے رہے جو ناقدری سے مرجھا چلی تھی افتخار کے خطوں نے اسکی نسوانیت کو جلائے رکھا ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جسکے رعب سے دوسری استانیاں لرزتیں اور لڑکیاں کانپ اٹھتیں۔ کامیاب معلمہ وہی ہے جو مؤنث اور مذکر کے سوال بھول کر لکیر پیٹنے کا مشین بن جائے۔ اقلیدس کے اصول غیر شاعرانہ آنے کو دیکھ کر ہنسی نہ کھو جائے

پھرے مودب ہو جائیں اور کندھے نہ جھکیں۔ قلم دوڑنے لگیں اور کاپیاں سیدھی ہو جائیں
ہر چہار طرف فوجی نظام قائم ہو جائے اور قواعد حکمراں ہو جائیں۔ مگر ان گیتوں کی دھیمی دھیمی
پھوار نے پودے کو سوکھنے سے بچا لیا۔"

کسی تہوار یا میلے کی وجہ سے ریل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ تیسرے درجے میں قیامت
جیسی بھیڑ اور غل تھا لوگ مکھیوں کی طرح چھتے کے چھتے بنا کر لٹکے ہوئے تھے۔ ریل ڈیڑھ
گھنٹے لیٹ تھی اور بالکل گھریلو حساب کتاب سے چل رہی تھی۔

سینی ٹوریم کے روشن برآمدے میں افتخار اس کی دی ہوئی رضائی پیروں پر ڈالے
اور اسی کا ہی بنا ہوا سوئٹر پہنے بیٹھا تھا۔ اور بہت سے کاغذ اس کے سامنے پھیلے ہوئے
تھے۔ نہایت تکلف سے اس نے شمن سے ہاتھ ملایا یہ پہلی گستاخی تھی جو نہ جانے آج کیسے
روا ہو گئی اس نے جائز سمجھی۔ جلدی سے اس سے ہاتھ چھڑا کر وہ پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور کاغذ
دیکھنے لگی۔

"تمہارے کام کے نہیں۔" شمن نے دیکھا وہ ہسپتال کے بل اور نسخے ہیں۔

"کیوں؟"

"دیکھتے ہی عورتیں چوہوں تک سے ڈر جاتی ہیں۔"

"میں ان عورتوں میں سے نہیں۔"

"مگر اس میں چوہیاں نہیں اژدہے ہیں۔" مگر شمن نے نہ سنا۔

"ہاں بھئی وہ نیا پل اوور تو آ چکا ہم اسی بچارے پرانے دوست کو سینے سے
لگائے بیٹھے ہیں۔" افتخار نے پیار سے پل اوور کو سہلایا یہ وہی تو سوئٹر تھا جس کے ایک
ایک پھندے کے ساتھ شمن نے اپنے ہزاروں سپنوں کو بن دیا تھا۔ کس شان سے اس کے
سینے سے چپکا تھا۔ وہی سوکھا ہارا نحیف سینہ، پیار اور لطیف جذبات کا لبالب خزانہ
جس کے قرب کے وہم سے ہی اس پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی تھی۔

"تھوڑا اون کم ہو گیا ہے ...... یہاں سے جا کر پارسل کر دوں گی۔"

"دق کے مریض کی چھوٹی ہوئی چیزیں کھانا نہیں چاہئیں مگر یہ پھل بالکل تازہ

ہیں تم خود اٹھا لو ...... مجھے بھی دو۔ چاقو دراز میں ہو گا۔"

"میں اس قدر وہمی نہیں اگر آپ کو مہمانوں کی خاطر کرنی نہیں آتی تو رہنے دیجئے"

"اچھا تو آپ مہمان ہیں!"

"جی۔"

"ہنہ! اس نے اٹھ کر میز سے چاقو نکالا اور نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا، "جو ہر لمحہ دل و دماغ پر سوار رہیں، خوابوں میں بھی پیچھا نہ چھوڑیں، نیندیں اڑا دیں۔ موقع ملے تو کیا مزے سے مہمان بن بیٹھتے ہیں، ...... نفرت ہے مجھے ایسے مہمانوں سے!" افتخار نے مصنوعی غصے سے کہا اور شمن کا دل اچھل پڑا۔

میں نے ایک کہانی میں پڑھا تھا کہ تازہ پھل کھانے کا مزہ تو جب ہے کہ انھیں دانتوں سے بھنبھوڑا جائے اور دو کے بجائے چار ہونٹ ایک ساتھ رس چوسیں۔" افتخار آج شاعری پر تلا ہوا تھا۔

"سنا کچھ؟"

"کیا۔"

"ہٹلر نے کتنے ملک ہیٹ لیے۔ اب ان کی باری آنے والی ہے۔"

"تو یہ ہے، انسان انسان کو چبائے ڈالتا ہے۔"

"یہی ہو گا، اگر شیر کو بھوکا رکھا جائے گا تو موقع پاتے ہی پہلے اپنے سدھانے والے کو چبائے گا۔ یہ نازی شیر ہنٹر ڈھیلا پڑنے کے انتظار میں تھا اب موقع آگیا ہے!"

خوب!

"مگر بے چارہ پولینڈ۔"

"گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑتا ہے مگر اب ان کا وقت آگیا ہے ان کو بھی دنیا مٹی کا تودہ نہ بنا دے تو بات نہیں۔ بہت پیس لیا ہے گناہوں کو اب ذرا چکی کے دور گرے خود بھی آزما لیں، وہ بم جو سالہا سال سے یہ اور دل پر برساتے آئے تھے قدرت نے جمع کر کے آتشیں گولوں کی صورت میں انھیں کو لوٹا دینے کا فیصلہ کر دیا تو بزدل کیڑوں کی طرح بلوں میں گھسے جا رہے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ ہمیں دکھ نہ ہو۔ ان سے

ہمدردی ہو، ان کے دشمنوں کو کوسیں گے۔ مگر نہیں ہمیں کوئی نہیں جانتا..... ہم بہت جلدی ایک مالک سے گھبرا جاتے ہیں اور اب ہسٹری نئے فرمان بنا رہی ہے نئے سرے سے حصے بانٹے جائیں گے۔ جو بویا ہے اس کا نتیجہ بھوگنا پڑے گا۔ اوروں کے خون سے ہولی کھیلنے والے ذرا خود اپنے خون کی سرخی بھی تو دیکھ لیں۔ اس مغرور سر کو بھی تھوڑی سی نکسیر بہانی پڑے گی۔"

"مگر یہ کم بخت بڑے طاقتور ہیں!"

"خاک نہیں۔ شیخی خورے خالی ڈینگیں مارتے ہیں۔ ننگے ہیں۔ سر پیر سے تبھی تو چچا جی کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ دیکھ لینا ناکیں رگڑ دیں گے ایک ایک ڈالر پہ۔ اور چچا بھی معصوم نہیں۔ چچا بھتیجے کی ملی بھگت سے تو یہ راج قائم ہیں اور جیب تک یہ زندہ ہیں بھوکے اور لکھ پتی رہیں گے۔"

"اب کے یہ مدد نہیں کریں گے۔"

"ارے کریں گے کیسے نہیں آخر کو بنیے ہیں روٹی کا بیوپار نہیں لاشوں کا ہی سہی دوسرے چچیتے کے خوف سے خود ان کی گھگھی گم ہے۔"

"ہٹیے کیا رکھا ہے جاپان میں کم بخت کوئی چیز بھی تو ڈھنگ کی نہیں بناتے۔"

"ارے تو تم اس جاپانی مال سے ان کی طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ دیوانی یہ تو ہندوستانیوں کے لیے ہے اور بہت ہے ان بچاروں کے لیے تم نہیں جانتیں۔ کیا حال ہے۔" وہ چاقو سے سیب کے چھلکے کا قیمہ کرنے لگا۔

"اور تم دیکھنا آخر میں مزدور کا پھاوڑا ہی جیتے گا۔ اور یہ پھاوڑا اس جھوٹے نظام کو چکنا چور کر دے گا۔ بے گناہوں کا خون ضائع نہیں ہوا۔ اس خون سے اُگی ہوئی روٹی چبا کر سرخ قوم پیدا ہوگی۔ سکون کا دامن چاک ہو جائے گا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگا۔ سینۂ گیتی شق ہو جائے گا! پھر کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ لیکن شاید کبھی میں اس کا جواب دے سکوں۔" جوش کی شدت سے افتخار کا زرد چہرہ تمتما اٹھا۔

"ظلم کے علمبردار آج تہذیب اور انصاف کی حفاظت کو چلے ہیں۔ یہی جذبہ ۱۸۵۷ء میں کسی حسینہ کی گود میں سو رہا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے!...... اور ہٹلر فولاد"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے اُن کی طاقت ...."

"شیر کے آگے گیدڑ کی بھبکیاں، صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے یہ۔ تم خود دیکھو گی"

"مگر ہندوستان کو کیا واسطہ ان باتوں سے، یورپ والے تو ہمیشہ ہی بات بے بات جو تو تو میں میں میں مشغول رہتے ہیں ہمیں کیا ہم تو ویسے ہی غلام کے غلام۔"

"ٹھیک کہتی ہو، ہمیں کیا ہم کیوں بیٹھے بیٹھے پیر اڑائیں، لیکن تم بھول رہی ہو ہم غلام ہیں اور آقا کے ساتھ بلکہ آقا سے پہلے ہمیں اپنے خون کی بھینٹ چڑھانی ہوگی.... لیکن وہ دن جلد آنے والا ہے جب لفظ غلامی تمہیں لغت میں بھی نہ ملے گا۔ میں نے تمہیں کس لیے بلایا ہے۔ یاد ہے وہ کیمپ والا معاہدہ یا بھول گئیں!"

"اتنی کند ذہن نہیں ہوں۔"

"معلوم ہے مجھے جبھی میں نے سب سے پہلے تمہیں چنا تھا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہاری قربانی کی ملک کو کتنی ضرورت ہے۔ اور تم میں ہمت بھی ہے اور ذہانت بھی۔ تم مضبوط دل و دماغ کی مالک ہو بولو کیا دے سکتی ہو۔"

"میرے پاس ہے کیا؟"

"جو کچھ بھی ہے ایک پیسہ 'ایک پھوٹی کوڑی'، سنو ہماری جماعت کو فنڈ کی ضرورت ہے۔ چاروں طرف سے نرغے میں ہے۔ کام جو تیزی سے جاری تھا بکھرتا جا رہا ہے مگر ڈر ہے رک نہ جائے۔ کانپور سنٹر سخت مصیبت میں ہے۔ تمام کاغذات ضبط کر لیے گئے ہیں، ہمارے بہت سے کام کرنے والے جیل میں سڑ رہے ہیں مگر پھر بھی جو آزاد ہیں چمگادڑوں کی طرح کھنڈروں کے کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جانتی ہو سب سے بہتر پناہ گاہیں کہاں قائم ہیں؟"

"نہیں!"

"نہ ہنڈولوں سے کہو، ٹھیلوں پر تم بڑی متفکر ہو رہی ہو۔ کسی شریف عورت میں نہ ایسے

زخموں کو چھپانے کا سلیقہ اور نہ ہمت ۔ رنڈی کے کوٹھے پر شراب میں دھت انسان کو کون پہچان سکتا ہے ۔ لوگ سمجھتے ہیں غنڈا ہے پرلے درجے کا ۔"

"لیکن نقشہ کیا ہوگا آپ کے کام کا؟"

"یہ ایک شدید راز ہے جو میں یہاں چھپا بیٹھا ہوں کس لیے؟ یہاں کسی کی نگاہ نہیں پڑتی ۔ میری خیریت پوچھنے میرے ساتھی بہ آسانی آ سکتے ہیں ۔ میرے رشتہ دار ..... معاف کرنا میں نے تمہارا نام بھی رشتہ داروں میں لکھا دیا ہے ۔ گستاخی تو نہیں ہوئی؟"

"بس بیٹے ہمت ۔"

شکر اور قند کی قلت کی وجہ سے یہ بل ....." وہ ایک دم چپ ہو کر کاغذات چھپانے لگا ۔"

"آپ میری ہتک کر رہے ہیں!"

"کون میں؟"

"جی!"

"توبہ ہے چہ ..... ارے بابا کھال ادھیڑ دو مگر ایسی ٹیڑھی نظروں سے نہ دیکھو"

شمن ہنس پڑی ۔

"تو لائیے وہ کاغذات ۔"

"تمہارے کام کے نہیں ۔" افتخار نے ٹالنا چاہا مگر شمن نے چھین لیے پورے دو سو پچھتر روپے کا بل اگر ادا نہ ہوا تو چوبیس گھنٹے کا نوٹس ۔

"اب پتہ چلا آپ مجھے کیسا رشتہ دار سمجھتے ہیں ۔"

"تو بھی ....."

"رہنے دیجیے ، مجھے آپ کے اوپر اعتبار نہیں ۔"

"کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟"

"جی" شمن نے اس کی دھیمی آواز کی تپش سے پگھل کر زبردستی کہا ۔

"کچھ جرمانہ نہیں ادا کیا جا سکتا۔ کان پکڑ کر اُٹھک بیٹھک۔"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ہم نے بھی فیصلہ کر لیا۔ پوچھو کیا؟"

"نہیں پوچھتی۔"

"جی۔۔۔۔ جی چاہتا ہے مالش کی دوا پی کر اس جھگڑے ہی کو ختم کر دیں۔"

"بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں بچے بنتے!"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو۔ مجھ سے دنیا خفا ہو چکی ہے اور اب۔۔۔ اب اس نئی دنیا کی خفگی نہیں۔ تمہیں بتاؤ ایک بے کار انسان لوگوں کی نفرت کی آماجگاہ بن کر کیوں ٹھونس ٹھاس جیسے جائے۔"

"تو پھر آپ نے مجھ سے کیوں چھپایا۔"

"غلطی ہوئی۔۔۔۔ بس۔" کان کی لو اینٹھ کر کہا۔ "معاف کر دو۔"

"ایک شرط پر۔"

"اوہو کوئی شرط ایسی بھی رہ گئی ہے تمہاری جسے ماننے نہ ماننے کا اختیار میں نے غضب کر رکھا ہے!"

"جی ہاں ورنہ یہ کاغذ میرے تجسس سے چھپائے نہ جاتے بلکہ اگر آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں تو آپ کو چاہیئے تھا مجھے بل پکڑا کر حکم دیتے کہ انہیں ادا کرو۔"

"اوہ" افتخار نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا سر جھک گیا اور باوجود ضبط کے آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ "لیکن۔۔۔۔"

"پرائشچت؟"

"سنو تو۔"

"جی نہیں۔۔۔۔ آداب عرض،" شمن جل کر اٹھی اور جانے کو مڑی۔

"بیٹھو۔۔۔۔ بخدا اس تیکھے پن پر کہیں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔۔۔۔" افتخار نے بہکی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "تم آگ سے کھیلنے کی کیوں اتنی شوقین ہو

کہیں خود ایک آدھ چرکا نہ کھا جاؤ۔" افتخار نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ شمن بے سہارا ہو کر واپس کرسی پر گر پڑی۔ ایک دم بے تکی خاموشی چھا گئی جیسے دونوں کی دھڑکن ٹوٹتی رہی۔

سو سو کے چند نوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیے۔

"میرا قرض رہا..... مع سود واپس کر دیجیے گا۔"

"اچھا تو یہ سلسلہ بھی چلتا ہے؟"

"کیوں نہیں آپ جیسوں کو کیوں چھوڑا جائے۔"

"جو نہ ادا کر سکا تو؟"

"تو حشر کے دن ایک کے ستّر وصول کر لوں گی۔"

"مذاق نہ کرو..... میرا کام اور پھر یہ بیماری۔"

"اللہ اس کم بخت بے چاری کو چھوڑیے۔"

"میں اسے بہت چھوڑنا چاہتا ہوں پر یہ بھی مجھے چھوڑے..... ہونٹوں کے کھانوں اور رفت پانی پر سونے کا اس سے زیادہ حسین تحفہ اور کیا مل سکتا ہے۔"

اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پھر وہ پرانی سلگتی ہوئی بغاوت چھا گئی۔ "انتقام انتقام" اس کے چہرے کی کرخت سلوٹیں پکار اٹھیں سنبھل کر اس نے دوا پی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"یہ کم بخت جراثیم قدم قدم پر بیڑیاں....." اس نے حسرت سے شمن کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اب کب آؤ گی؟ ویسے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ تمہاری عنایت کا محتاج نہیں....." شمن کا منہ اتر گیا۔ "کیونکہ جب چاہوں تخیل کے زور سے گھسیٹ لاتا ہوں اور اس وقت نہ تم اتنا جھجکتی ہو اور نہ مجھے جراثیم کا خطرہ رہتا ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

۳۷

واپسی پر اسے ایک تار ملا" فوراً آؤ" ایلما نے لکھا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ڈاک کے متعلق کوئی ہدایت نہیں دے گئی تھی۔ ارادہ تھا بھوالی سے لوٹ کر سامان لیتی ہوئی گھر روانہ ہو جائے گی۔ تار کئی دن دیر سے ملا۔ پھر بھی وہ فوراً روانہ ہو گئی۔ رولف کے لیے اس نے ایک بندوق، رنگین گولیوں کا ڈبہ اور تھوڑے سے چاکلیٹ لے لیے۔

وہ برآمدے ہی میں تھی کہ بوڑھی آیا نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر روک لیا

"اندر جانے کا نہیں! ابھی کر کے سویا ہے۔"

"سویا ہے تو سونے دو میں اسے جگاؤں گی نہیں۔ میم صاحب کہاں ہیں؟"

"اور ہی سوتا..... اکھا دن ایسا ایسا کرتا" آیا غم کا مجسمہ بن گئی۔ یقیناً تھک گئی تھی۔ ایلما سے کہکر نئی آیا کا انتظام ہونا چاہیئے وہ آگے بڑھی۔

"بولتا کہ بائی نہیں جانے کا۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟ اوہ کیوں؟" اندر سے مردہ آہوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی کیوں؟ آخر کیوں؟ پردہ ہٹا کر ایلما باہر آگئی۔ عجیب وحشیوں کی سی حالت۔ آنکھیں پھٹی ہوئی بال بکھرے مردے سے بدتر! بخار میں جل رہی تھی۔

"ایلما کیا ہوا؟" پہلے تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی لیکن شاید اب بھی دماغ کی کوئی رگ سلامت تھی۔

"تم..... تم آگئیں؟ اسے بھی لے آئیں..... میں نے اس کے لیے دودھ ابال دیا ہے اور....."

"کیا ہے ایلما!"

"چہ چہ ...... بولا تمہارے کو ... کیسا فرپم پینڈ ہے ..... ڈاکٹر آوے تبھی بولے گا۔ ہم اس کو ..... " آیا نے پھر ڈانٹنا شروع کیا۔ " بالی کو شوک لگ گیا ..." اس نے کان میں چپکے سے کہا۔

"تم کیوں ہے گیئش میرے روفی کو ..... چلو ادھر لاؤ ..... بڑی شریر ہو تم" ایلیا شرما کر مسکرائی۔

"ایں؟" شمن چکرائی۔

"او ہو ..... بندوق بھی ہے آئیں اس کی .... اچھا کیا .... بچارا روتا ..."

"ڈیتھ ہو گیا بے بی کا ..... !" آیا نے روہانسی آواز سے کہا اور سر ہلانے لگی۔

"کیا ردلعن !"

"جھوٹ ..... بالکل جھوٹ ..... یہ سب جھوٹے ہیں ... دھوکا دیتے ہیں مجھے ..... میں ان سب پر کیس چلا دوں گی ... ٹھائیں ٹھائیں ... وہ مارا" ہوائی بندوق داغ کے وہ کلکاریاں مارنے لگی۔

لمو نیا ہوئے .... تین روز ج میں .... کھلاس !" چندھی بٹو جیسی آنکھوں والی بڑھیا اپنی سکڑی ہوئی ناک چڑھا کر بسورنے لگی۔" ادھر میم صاحب ایکدم پاگل سری کا ہو گیا ہم بولا کوئی کا زبردستی نہیں۔ بیبو سی کا بھیڑ .... اُو لنے بلا لیا پن ہم کو تو دھکا مارتے ! بولتے جاؤ نیں مانگتا تمہارے کو .... ہم بولا کہاں بی جائے .... پن مانتا بی نئیں ایں؟ .... بولو کون دوسرا ہے اپنا .... صاحب بھی مر گیا ......"

"او جو باجو میں صاحب رہتا .... بولا مسج پال ان لکی ... ایکدم کر کے ان لکی !

"اونہہ ... ذرا جا کر اسباب اتر واؤ .... آیا۔" شمن نے آیا کی بکواس سے بوکھلا کر کہا اور ایلیا کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

"لاؤ نا .... کہاں چھپا دیا ہے اُسے" اس نے شرارت سے مسکا کر کہا۔

"ایلما..." شمّن کا جی چاہا اسے کلیجے سے لگا کر جی بھر کے روئے۔

"تم بولتی کیوں نہیں.... دیکھو مجھ سے کوئی چال مت چلنا......

ورنہ یاد رکھو میں نے وکیل کر لیا ہے۔ اور سب کے اوپر کیس چلانا.. اوہ..."

وہ کچھ سوچ کر رک گئی اور منہ پر ہاتھوں کا کٹورا ڈھک کر پکارا۔

"آ.... یو.... آیو۔"

"آتا میم صاحب!"

"آیا..... ہوٹ واٹر مانگتا ہے بی کے واسطے ایک دم اچھا ہونا....

گسل ہونا۔"

"کیا میم صاحب بولتا! بے بی پکّا گسل کر لیا! اب....." اس نے ٹھنڈا

سانس بھر کر کہا۔

"اس کو اینجل ہولی واٹر کا گسل دیتا۔ لیسوسی...."

"غارت ہو کم بخت.... چلو یہاں سے" ایلما نے ڈانٹا اور جھپٹی اس پر

مگر آیا نہایت لاپروائی سے کھڑی بکتی رہی۔ "ایسا ایسا کیا چلّاتا میم صاحب...

ہم ڈاکٹر کو بولنے مانگتا۔"

"چپ رہو آیا.... ایلما صبر کرو یہ کیا حال بنا لیا ہے۔" وہ پیار سے

اس کے بال سنوارنے لگی۔

"تو پھر لاؤ اس کو" ایلما نے بچّے کی طرح آس بھری آواز میں التجا کی۔

"کون مانتا.... ہم کتنا کتنا بولتا پن.... جب بے بی مر گیا تو کیا ہونا۔

پن اکھّا دن مارا ماری کرتا...."

"جھوٹ جھوٹ!"

"اب لیسوسی کی بات کو جھوٹا بولتا.... کیا ہونا ایسے!"

"آیا....."

"لیسو کا گسہ......"

"باہر چلو .... نکلو ...." شمن نے اسے زبردستی باہر گھسیٹا

"جاتا یا جاتا۔ .... پن یہ دیکھنے کا کہ اپنے کو بیسو بلا دے تو .... ادر میم صاحب کھاتا پیتا کو چھ نئیں .... کھدا باپ گسّہ ہوتا۔" شمن نے دروازہ بند کر لیا۔

"یہ تمھیں اور بوکھلائے دیتی ہے۔ یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے ...."

"سب کہتے ہیں وہ چلا گیا .... تم لے گئی ہو؟"

"نہیں۔"

"ایمان سے!" ایلما سہم گئی۔

"یہ دوائی بے بی پینے کا .... پن ہم بولتا ڈیتھ کا کوئی دوائی ہی نئیں۔" آیا دوا کی شیشی کے بہانے پھر اندر آ گئی۔ بڑھیا کو وحشت ہو رہی تھی اور تنہائی سے خوف زدہ ہو رہی تھی۔

"کیسی دوا ہے؟"

"ڈاکٹر دیتا .... فرسٹ کلاس ڈاکٹر .... ہم مدوائف کا کام کیا اس کے انڈر میں بچے آنکھی بگڑا۔ ہم بولا دیکھتا ہی نئیں .... بولا آیا اب تم کوئی اور کام کرو۔ ہم بولا ڈاکٹر کیسا کام کرتا .... بولا نرس کا کام ہونا .... بے بی کا نرس .... ہم بولا کوئی بات نئیں جرور سے کرتا۔ بولا یو یہ بے بی .... جو ڈیتھ ہوا نا .... ہسپتال میں دو روز زیر ہوا .... ایسا .... ایسا بالکل لکڑی کے مافک ٹیڑھا بے بی۔" آیا اپنے چپکے ہوئے پیٹ پر اڑے بچے کا نقشہ کھینچنے لگی۔ "اکھا واٹر کھلاس۔ ایک دم ڈس چارج!"

"اے ہے چپ رہ کم بخت بڑھیا .... چلو باہر بیٹھو میں دوا پلا دوں گی۔"

دوا پلا کر شمن نے ایلما کو کمبل اڑھا دیا اور وہ بخار سے بے ہوش ہو کر سو گئی۔

آٹھ دن ایلما موت اور زندگی کی کشمکش میں گرفتار رہی۔ نویں روز بخار ٹوٹا کمزوری دیر تک قابض رہی۔ دونوں نے بیتے ہوئے حادثے کا جان بوجھ کر ذکر نہ کیا حالانکہ سارے وقت انھیں احساس رہتا کہ وہ دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی ہیں۔ ایلما نے اسے وجود میں لا کر پالا پوسا تھا، مگر شمن کو بھی اُس سے کچھ کم محبت

نہ تھی۔ گزشتہ دسہرے کی چھٹیوں میں دونوں نے بڑے جوش و خروش سے مل کر اس کے لیے تعلیمی کھلونے خریدے تھے

”ہوں .... آنٹی کہو۔“ ایلما اُسے ڈانٹتی۔

”نہیں .... چمن!“ وہ شرارت سے آنکھیں چمکاتا اور دور بھاگ جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے ”چمن“ سُن کر اسے رلف صاحب یاد آجاتے ... وہ بھی تو ایسے ہی وجیہہ تھے اور شریر بھی ..... یہ چلبلے انسانوں سے خدا کو کیوں اتنا بیر ہے!

جب سے ماں بیٹے میں ملاپ ہوا تھا ایلما نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ بچے کی غلاظت کو بھول کر پودے کی سیوا میں مست تھی۔ اس کی ہزاروں تصویریں خود کھینچی اور کھنچوائی تھیں جن کی ایک ایک کاپی شمن کو ملی تھی۔ دور رہ کر بھی وہ اس کی پرورش میں حصّہ لے رہی تھی۔ جہاں کوئی مفید کتاب یا کھلونا نظر آجاتا اور خرید کر پارسل کر دیتی۔ خاص اس کی خاطر بچوں کی نفسیات پر کتابیں پڑھیں۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی اسے دلچسپ پہیلی کی طرح بوجھنے کی کوشش کر کے لطف اندوز ہوتیں۔

اور جب تک اس کھلونے کو مٹا دینے کی کوشش کی، بال بھی بیکا نہ ہوا لیکن جونہی اس نے چاہنا شروع کیا، اس کی ممتا کا خون کرنے کے لیے وہ روٹھ گیا۔ بخار اترا تو ایلما کی وحشت بھی کچھ دب گئی۔ رولف کی زندگی سے نا امید ہو کر اس نے شمن کو پکارا تھا۔ اسی نے تو رولف سے ملایا تھا۔ سمجھی تھی وہ اُسے موت کے جنگل سے بھی چھین لے گی کہتے ہیں ناجائز بچے بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ تو رولف کیوں ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گم ہو گیا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو تسلّی دی جاتی کہ صبر کرو خدا اور دے گا۔ مگر ناجائز بچے کی ماں کے لیے تو گالی ہوئی۔

”ایلما شادی کر ڈالو۔“ شمن نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہنہ، نئے رولف پیدا کرنے کے لیے.... تم کیا جانو.... اپنے جسم سے گوشت

کانگڑا کات کر یوں پھینک دینا مذاق نہیں۔ اوہ شمن وہ دکھ جو میں نے اُسے جنم دینے میں سہا آج اس کی موت سے دس گنا ہو گیا۔ اُف وہ موت سے بڑھ کر دم گھوٹنے والا دکھ۔"

"شاید تمہارا دکھ اس لیے بہت معلوم ہوا کہ تمہاری پوزیشن اور ماڈرن سے مختلف تھی۔ اگر کسی کا بچہ" محبت بھری نگرانی میں جنم لے تو شاید اتنا دشوار نہ ہو"

"ہو سکتا ہے، ممکن ہے ایسا وقت آوے اور میں اتنا نہ ڈروں۔ یہاں ایک پروفیسر میرے پیچھے بہت دن سے پڑے ہیں انھیں رولف کا حال معلوم ہے۔ بچارے اُسے بہت پیار کرتے تھے اور بڑے روشن خیال ہیں۔ ویسے میں ایسی بزدل نہیں جو طعنہ نہ سہار سکوں اور نہ ہی اب مجھے رولف کی ماں بننے میں شرم آتی ہے ...." وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتیں؟"

"اس لیے کہ مجھے ڈر تھا کہ میں رولف کے ساتھ پھر ناانصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر میں نے ڈائن کے سے سلوک کیے، مگر بقول تمہارے اپنے کو بھول کر، اب دوبارہ میں یہ بھول نہیں کرنا چاہتی ___ میں نے پھر بھی اسے اتنا نہیں دیا جتنا اس کا حق تھا۔"

ایلما سے رخصت ہو کر وہ سیدھی گھر روانہ ہو گئی۔ اتنے دن دور رہنے کی وجہ سے وہ بالکل غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی آنے والے مہمانوں کی طرح اُسکی بھی خاطر کی جاتی۔ مگر کوئی خاص جگہ اس کی مقرر نہ تھی۔ یہ دو مہینے کی چھٹیاں وہ اٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں گزار دیتی۔ وہ جو گھر کی سہولتیں ہوتی ہیں وہ نہ مل سکتیں اپنے حسابوں تو وہ بیاہی جا چکی تھی۔

یہ کمرہ بھی بالکل ویٹنگ روم معلوم ہوتا۔ اس کی چیزیں عجائب روزگار سمجھ کر دیکھی جاتیں اور بالکل شارع عام پر رہنے کا لطف آجاتا۔ ہزاروں بندشوں کے بعد بھی وہ خلوت نہ نصیب ہوتی جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ لوگ بھی اسے عادتاً

رکاوٹ سمجھ کر اپنے دلوں پر جبر کرتے اور اپنی عادتوں کی لگامیں روکنے کی کوشش کرتے اس کا وجود بار بھی گذرتا تو بالکل مہمان سمجھ کر برداشت کر لیتے۔ قدرتی طور پر اس کا کمرہ گھر بھر میں سب سے غنیمت ہوتا لہٰذا بچوں کی ساری دلچسپی اسی طرف مبذول رہتی۔ کوئی مہمان آتا تو اسی کے کمرے میں مہمان نوازی کی جاتی۔ اسی کے پیڈ لفافوں اور قلم سے گھر بھر کی حاجتیں پوری کی جاتیں۔ دنیا اتنی ترقی کر گئی تھی مگر اس کے گھر میں وہی افراتفری مچی تھی۔ قسمت سے اور سب [illegible] بھی ایسے ہی گھرانوں کی تھیں۔ جہاں کھانے کی میز پر بچوں کو پوتڑے سکھائے جاتے ہیں۔ اور کھانا باورچی خانے میں اکڑوں بیٹھ کر کھایا جاتا ہے۔ غسل خانوں میں اناج کے مٹکے رکھے جاتے ہیں اور الگنی پر پردہ ڈال کر غسل کیے جاتے ہیں۔ نشست و برخاست کا کمرہ اس کی غیر موجودگی میں ٹوٹی چارپائیوں ردی کرسیوں، بے کار مونڈھوں اور ڈگمگاتے اسٹول رکھنے کے کام آتا۔ الماریوں میں چینی کے برتن اور چاندنیاں وغیرہ بھی یہیں رکھی جاتیں جب وہ آتی تو جھاڑ پونچھ کر دو چار تخت کرسیاں بیٹھنے کے قابل بنا لیتی۔

جب سے باوا کی پنشن ہو گئی تھی گھر کی ہر چیز صرف استعمال کے لیے رہ گئی تھی جو چیز بے کار ہو جاتی کوئی مرمت نہ کراتا اور لاوارث بنا کر کوڑے میں جمع کر دی جاتی ان پنشن یافتہ چیزوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ سارے گھر کا گھر کوڑا خانہ بنا ہوا تھا ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اسے ہندوستان کی عام حالت کا اندازہ ہونے لگا۔ جیسے سرکاری راج میں دفتروں میں چارپائیاں ڈالے افسر گپیں مارا کرتے ہیں۔ میزوں پر دیسی ٹرے کی چاٹ پکوڑیاں اور چائے کے خوان لگتے ہیں۔ سالن اور گھی کے دھبے لگے اوٹ پٹانگ رجسٹر سوکھی ہوئی دواتیں الٹے نب مڑے ہوئے ہولڈر جن سے لکھنے سے زیادہ ازار بند ڈالنے کی خدمت لی جاتی ہے۔

ادھر جرمنی نے دنیا کو خون سے نہلا کر پوتر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولینڈ کا بٹوارہ تو ہو گیا۔ رہ گئی باقی کی دنیا تو کتنے دن کی ہے یہ مثلث بھی پرکار کے ایک چکر میں سواستکا بنا جاتا ہے۔ ترسے ہوئے لوگ ملاقاتیں کرتے رہ جائیں گے۔ ہندوستان لوٹیے!

یا سالم رب۔ بات ہی کیا ہے۔ اس سالم دنیا میں کیا کم پھوٹ ہے کبھی تو جی چاہتا کوئی بڑی سی ہوگری ہے کہ اس تکونے کے پرخچے اڑا دے اور اس کے بھی ایسے ہی ذرے بکھر جائیں جیسے برطانی جزائر اور جاپان کے۔

خود اس کے گھر کو ایک زبردست چوٹ کی ضرورت تھی۔ یہ ایک انوکھا خاندان تھا جہاں کھانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی اور کمانے والے تھک کر بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔ سامان روز بروز ڈھیلا اور بے کار ہوتا جا رہا تھا سیڑھیاں خطرناک حد تک ٹوٹ گئی تھیں اور سیمنٹ جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ کاش اس کھنڈر کے کاہل باسیوں کو کوئی سانحہ گھسیٹ کر لق و دق صحرا میں لے جا پٹختا جہاں اس گھر کی اندھیر پناہ سے آزاد ہو کر وہ خود اپنے ہاتھوں سے نئی پناہ گاہیں بنانے پر مجبور ہو جاتے ہر چیز کو تخریب* کی ضرورت تھی۔

جرمنی نے لندن پر آگ برسانی شروع کر دی جن بھوکوں کا خون نچوڑ کر یہ شاندار شہر سجایا گیا تھا ان کے کچلے ہوئے دلوں میں مسرت کی لہر آگ کے شعلوں کی طرح دوڑ گئی۔ آہا کیا مزا آ رہا ہوگا۔ یہ جو پربت جیسی اونچی اور جنت جیسی حسین عمارتیں نظر آتی ہیں۔ بھوسے کی گٹھریوں کی طرح بکھر جائیں گی۔ نازک اندام میمیں اور پھول جیسے بابا لوگ قصائی کی دوکان سے پھینکا ہوا ملغوبہ بن جائیں گے، جنھیں کتے بھنبھوڑیں گے اور گدھ نوچیں گے۔ آسمان سے خدا کا قہر برسے گا اور زمین لاوا اگلے گی، بڑی بڑی سڑکیں ریگستان اور ہوٹل کھنڈر بن جائیں گے۔ ۱۸۵۷ء کا خون چھلکے گا۔ اور یہ سیاہ خون اندھیرا بن کر چھا جائے گا۔

ہٹلر بھی تو آرین ہے! وہی آرین جنھوں نے ہندوستان بنایا۔ اب پھر وہی آریہ یہاں آئیں گے۔ جیسے ہنومان جی دُم میں آگ لگا لنکا کو پھونکنے گئے تھے اسی طرح یہاں بھی آگ برسے گی جیسے راکھشس بھسم ہو جائیں گے۔ اور دیوتا سونے کی مورتیوں کی طرح تپائے ہوئے نکل آئیں گے پھر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گلے میں پھول کے ہار ڈالیں گے۔ ہندو مسجدوں کو پوجیں گے اور مسلمان مندروں کو

سجدہ کریں گے دو بھائی گلے مل کر جی کا غبار نکالیں گے۔

اس بم باری سے گھبرانا کیسا؟ قحط اور بیماریوں کے ساتھ مفلسی اور لاچاری کی مار سہے ہوئے کیڑوں کے سامنے ان پٹاخوں کی کیا حقیقت ہے آئے دن موڑ ول ہی سے اتنے کچل کر خاک زادہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ راہ مردہ نہیں بگولے بن بن کر ایک بے قرار روح کی طرح برسوں رقصاں رہے گی اور دنیا کی آنکھ میں کھٹکے جائے گی کتنی بار یہ ہندوستان کا مثلث فتح ہوا لیکن اس کے دکھے ہوئے مفلس دل کسی کے نہ ہو سکے۔ یہ دل ان ہی حضور کے سینے میں نہیں جو حاکموں کے دربار میں ان کی اتر ن پہنے عجائب زور نگار بنے بیٹھے ہیں یہ دل ان بڑی نیچی جھونپڑیوں میں ہیں جو آریوں کے راج میں ٹھکتی رہیں، مغلوں کی حکومت میں بھی روتا کیں۔ اور اب بھی ان میں ان گنت سوراخ ہیں ان چھلنیوں میں کوئی جھال نہیں لگا سکا یہ دل کیا متاثر ہوں گے کسی چوٹ سے جنہیں صدیوں کی ٹھوکر خوری نے بے حس چٹان بنا دیا ہے اب تو انھیں یہ بھی فکر نہیں کہ ٹھوکر سلیم شاہی جوتی سے زیادہ لگتی ہے یا فرنگی بوٹ سے دکھ کا اثر ہی زائل ہو چکا ہے۔

سیاسی الجھنیں زندگی پر خاموش جنگ بن کر چھا گئیں مگر اس شدت سے نہیں کہ برسوں کی رچی ہوئی عصبی غنودگی سے جگا سکیں۔ جب مغرب ٹینکوں کی جھنکار اور توپوں کی گرج سے گونج اٹھا ہندوستان نے اہنسا کا ڈرامہ کھیل دیا جی جلانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے کہ کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر جگائے اور سونے والے افیم کا انٹا نگل کر کروٹ بدل لیں۔

اسکول کا میدان بھی سیاسی اکھاڑہ بن گیا آپس میں بحث مباحثے ہوتے پھر بیٹھ کر ایک دوسرے کو کوسا جاتا اور آنسو بہائے جاتے ہندو لڑکیاں دل و جان سے اہنسا کی قائل۔ عیسائی ایسی پریشان گویا اسلام اور ہندو دھرم کے ساتھ ساتھ اب ان کی صلیب کو بھی خطرے میں پڑنا آگیا۔ اگر سرکار کا ساتھ نہ دیا اور یہ سفید راج اڑ گیا تو کیا ہوگا۔ صرف رنگ ہی کا تو فرق ہے ورنہ یہ کالی پیلی بھی یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں اور ویسے بھی لباس، رہن سہن کے ساتھ ساتھ بچے ماما، پاپا، آنٹی اور سسٹر کتنی شستہ زبان

ہی بول لیتے ہیں۔ ہندوستانی کسی کو آتی کب ہے۔ خواہ تھیلیوں کی شکل کی ہوں مگر ہیں تو فراکیں، کالی بکری جیسی ٹانگوں میں پھنسے ہوئے نیلام کے جوتے ہیں مگر اونچی ایڑی موجود ہے۔ مانگیں ٹیڑھی اور پچکے ہوئے گھونگریالوں میں مغربی فرق بھی ہے اگر صاحب لوگ کو ہندوستان سے جانا پڑا تو پھر یہ بیرا لوگ اور آیا لوگ کیا کریں گی؟ بھلا کالا آدمی اتنی اونچی تنخواہ دے سکتا ہے؟ وہ تو باورچی خانے ہی میں بھیگڑا مار کر لنچ اور ڈنر نگل لیتا ہے اور بچے نانیاں دادیاں پال لیتی ہیں دو چار رکھتے ہیں سو وہ بھی ایسا جی کھول کر نہیں دیتے دوسرے جب یہ چلے جائیں گے تو نہ جانے کون آئے پھر بیرے اور آیا کا فیشن رہے یا نہ رہے یہ چرخے کی بات اور بھی ٹیڑھی کھیر ہے کہتے ہیں گاندھی جی سب کو ایک ایک بکری اور چرخہ پکڑا کر کہہ دیں گے جاؤ سوت کاتو اور دودھ پیو۔ نہ ٹی نہ چاکلیٹ اور نہ بسکٹ!

مسلمان لڑکیوں کو نہ بکری سے دلچسپی اور نہ چرخے کاتنے کا شوق، ان کا تو پاکستان الگ بننے والا تھا۔ مع تاج محل، موتی محل اور لال قلعے کے ساری پاک دنیا روپہلے چاند کے سائے میں مزے سے روزے نماز میں غرق جنت کی طرف کھسکتی چلی جائے گی۔ کوئی دم میں حصہ بخرہ ہونے ہی والا تھا۔ پٹیل کی "پی" (P) تو ہر پان والے کی دکان پر بکنے ہی لگی تھی بس خاموش بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔

مگر یہ کانگریسی حصہ دینے میں بخل کر رہے ہیں اگر پاکستان کی حرص میں سکھستان مہاسبھستان بھی بن گئے تو چٹاخ سے بھارت ورش کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اور یہ ہمالیہ کے ماتھے پر لٹکا ہوا نگونا جھومر موتی موتی ہو کر بکھر جائے گا اور پھر کہیں پاکستانی ادھر سے خان بھائیوں کی دعوت کر کے پھر محمود غزنوی جیسی چھیڑ خانیاں نہ شروع کر دیں۔

زمانہ تیزی سے ترقی کا پرچم لے کر آگے دوڑنے لگا۔ جلسوں میں نیا جوش پیدا ہو گیا پروگرام بنے پُرجوش نظمیں پڑھی گئیں کھانے اور شرابیں اڑیں ترقی پسند اخبار، ترقی پسند انجمنیں، ترقی پسند مضمون نگار اور شاعر پیدا ہوئے اور پورے زور و شور سے انقلاب ہونے لگا۔ آزاد زندگی اور آزاد محبت، آزاد موت اور آزاد پیدائش کے حقوق کی حمایت ہونے لگی۔ پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے زاویے کھینچے گئے۔ ہر وہ انسان ترقی پسند

بن گیا جس کے بال بے تکے اور آنکھیں وحشت انگیز ہوں لباس ذرا انوکھا اور طرح کا ہو ہاتھ
میں ایچی کیس جس میں کچھ پھٹکتی ہوئی نظمیں اور سلگتے ہوئے افسانے، دمکتے ہوئے مضامین اور
لطیف فوٹو، معصوم یادگاریں اور شیریں خطوط ہوں۔ بات کرنے میں کچھ کھویا سا جائے۔ لڑکیوں سے
انتہائی بے تکلفی، قدرے لاپرواہی اور کنجی سے بات کرے۔ چھوٹتے ہی پیار کا نام لینے لگے
چھوٹے سے زنانہ کپڑوں پر ہاتھ ڈال دے۔ پھر انکو ایسے دیکھے گویا عمر میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔
پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جھینپ جائے ان کی ساخت اور اہمیت پر گفتگو کرنے پر
آمادگی ظاہر کرے۔ اس کے علاوہ ہر قابل ذکر لڑکی کا ذکر کرتے وقت اس کی جنسی کشش
اور جسمانی ساخت پر روشنی ڈالے اس کی لطیف جنبشوں پر نچھاور ہو چکا ہو، اس کے تمام
گذشتہ سے پیوستہ عاشقوں کی تعداد اس کے جائز و ناجائز تعلقات اور اس کے ادھورے
اور سالم بچوں کی تفصیل جانتا ہو۔ تمام انقلابی روسی، فرانسیسی امریکی ادیبوں کے نام اور
اُن کے تراجم ازبر ہوں ان کے تراجم پیش کر کے ادب کی خدمت بھی کر چکا ہو۔ لازم ہے
کہ وہ خود بھی فن کار ہو یعنی شاعر یا مضمون نگار ہو نام کو جوڑ توڑ سے گھما پھرا کے لکھتا ہو۔
احساس کمتری جس نے نپولین اور ہٹلر جیسے مدبر پیدا کیے بخوبی رکھتا ہو۔ ساتھ ساتھ تدبر - تدابیر - تدبیر
لازمی طور پر دکھی ہو، بھوکا اور حساس ہو۔ دوستوں کے خرچ سے پیٹ بھر شراب اور
نفیس کپڑے پہنتا ہو۔ ڈھٹائی سے میزبانی پر مجبور کرتا ہو اور اُن حسابوں اشتراکی ہو کر
"جو کچھ تمہارا وہ میرا اور جو کچھ میرا وہ تمہارا . . . . نہیں !"
یہی نہیں بلکہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور تعلیم یافتہ لڑکیوں کی مکاری کا بھی
تجربہ رکھتا ہو۔ مٹی ہوئی عورت جوتیوں میں مسلی ہوئی رنڈی کا طرفدار ہو، دولت مند
شریف زادیوں کے جسم پر تھوکے مگر انھیں رئیس زادیوں کے عشق میں ناکام رہ کر مجذوبیت
کا درجہ پا چکا ہو، والدین کی ناسمجھی اور غلط طریقۂ تعلیم کی وجہ سے کوئی ڈگری نہ حاصل
کر سکا ہو، زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر مفت کی پینے اور نالی میں گرنے کا عادی ہو چکا ہو
ایک اور شاخ بھی ترقی پسندوں کی ہو سکتی ہے وہ بے چارے جو مجبوراً لمبی چوڑی
جائدادوں کے مالک بنا دیے گئے ہوں۔ تمام مقابلوں اور انتخابوں میں باوجود کچی سفارش کے

ناکام رہ گئے ہوں۔ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں، کیسے وقت کاٹیں، باپ دادا کے بنائے ہوئے محلوں میں جبراً رہنا پڑے، اعلیٰ قسم کا فرنیچر استعمال کرنا پڑے، بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری جلسوں کی شرکت لازمی ہو جس کے لیے دیش کے لباس کو چھوڑ کر مغربی درزیوں کے ہاتھ کا سلا ہوا سوٹ پہننا پڑے، وقتاً فوقتاً عالیشان ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اٹلی کے چائے کے سیٹ میں چائے پی کر انتہائی انقلابی ادب سے ادیبوں اور شعراء کی پرورش کرتا ہو ان کی ضیافت کر کے ان کی برخواسیوں سے لطف اٹھائے۔ مشاعروں اور ادبی جلسوں میں حسین لڑکیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے اور انقلاب کے برسنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔

زندگی کی دوسری گاڑیوں کی طرح یہ انقلاب کا چھکڑا بھی اکیلے بیل سے نہیں گھسیٹتا صنفِ نازک کا وجود لازمی ہے۔ کوئی آزاد خود مختار خاتون جو دنیا کی بکواس کا خیال نہ کرے یہی وجہ تھی کہ شمّن پر ہر چہار طرف سے ترقی پسند برس پڑے۔ گو اس نے اب تک کوئی کارہائے نمایاں نہیں کیے تھے۔ پر نہ جانے کیوں اس کی قوم پرستی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جیسے چیونٹیاں مٹھاس کی خوشبو سونگھ کر پہنچ جاتی ہیں، اسی طرح قومی جذبے کی مہک چھپائے نہیں چھپتی اور لوگ ڈھونڈ ہی لاتے ہیں۔ پہلے روز نواب زادہ صمد مع چند جوشیلے کارکنوں کے تشریف لائے۔ دیر تک چائے کا بے تکلف دور چلا اور پُرجوش مباحثے ہوئے پھر چند روز بعد ہونے والے جلسے میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئے نواب زادہ صمد نہایت جوشیلے اور سجیلے جوان تھے۔ بے چارے کو مجبوراً یہ غیر انقلابی لفظ اپنے نام کے ساتھ لگانا پڑتا تھا ورنہ اپنے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں تو کامریڈ صمد ہی کہلاتے تھے دوسرے کوئی انقلابی شاعر تھے جنھوں نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر لیلیٰ مجنوں کے بجائے نرس، ڈاکٹرنی اور اسکول مسٹرس سے ناکام محبتیں کی تھیں اور بجائے گھوڑے اور شمشیر کے ریل اور موٹر کی شان میں قصیدہ خوانی کی تھی۔

تیسرے ایک پروفیسر تھے جن کی تحریریں حکومت نے مخربِ اخلاق قرار دی تھیں وہ نہایت فخر یہ بتاتے تھے کہ ان کے مضامین پڑھ کر لوگ لرز اٹھتے ہیں۔ عریانی کی دھاک بیٹھی

ہوئی تھی ان کا کہنا تھا کہ عورت پر نظر ڈالتے ہی ان کے تخیل میں اس کے کپڑے دھواں بن کر غائب ہو جاتے ہیں اور نگاہیں سات پردوں کو چیر کر آر پار تیر جاتی ہیں انجمن کو بھی یہ سن کر پھریری آگئی اور اس کا جی چاہا کہ کاش اس کے کپڑے ذرا موٹے اور مضبوط تاروں سے بنے ہوئے ہوتے۔

ایک انجینیر تھے سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے بے چارے چھپ کر انقلاب لاتے تھے۔ جدی گاؤں کی آمدنی سے عاجز تھے۔ جب تک انگلستان میں رہے برابر وہاں کے قومی مظاہروں میں کھدر پہن کر اور جھنڈے لے کر نکلتے رہے خاص طور پر وہ ہندوستان سے کھدر کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ لے گئے تھے جو ان پر بے طرح سجتا تھا۔ گو جلوس جلسے ہوتے اور ان کی روح تک سردی کے مارے گنگ ہو جاتی مگر اس دن وہ بدیسی چیز نہ پہنتے واپسی پر ان کی لینڈ لیڈی گرم پانی کی بوتلیں اور چائے تیار رکھتی وہ خود بے چاری ان انگریزوں کو گالیاں دیتی تھی جو بے چارے ہندوستانیوں کو ذرا سے سوراج کے لیے اتنی تکلیفیں دے رہے تھے اسے ان لڑکوں سے خاص ہمدردی تھی جن کی بدولت اس کی تین لڑکیاں ناداری سے نجات پا کر ہندوستانی رانیاں بن گئی تھیں اسے کتنا ارمان تھا کہ ان کالے دامادوں کے کالے ملک میں جا کر ہاتھیوں پر سوار ہو کر اژدہوں اور ببر شیروں کا شکار کھیلے۔ سونے چاندی کی رکابیوں میں پلاؤ اور کباب کھائے اور کوٹھریوں میں بھرے ہوئے ہیرے جواہرات اپنے ہاتھوں سے چھوئے۔

جلسے کے دن کامریڈ صمد مع چند چیلوں کے آکر اپنی موٹر میں اسے لے گئے۔ مجمع خاصہ تھا اور روداد دلچسپ۔ انقلابی عشق کی پرزور نظمیں پڑھی گئیں۔ ترقی پسند انقلابی شاعر نشے میں دھت ذہانت اور فن کاری کا مجسمہ بنا چہک رہا تھا نظم کا ایک ایک بند شعلہ بن کر لپک رہا تھا۔ زوردار مضامین پڑھے گئے۔ جن میں ظاہر کیا گیا کہ موجودہ ادبی عریانی قدیم عریاں نگاروں کی تحریر کے آگے صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب باپ دادا اتنے "گلچھرے" تھے تو کیا وجہ ہے کہ سپوت پیچھے رہ جائیں۔ اس ادبی ورثے کی قدر نہ کرنا حد سے زیادہ نامعقولیت کا ثبوت ہوتا۔ اگر کوڑھ بھی باپ دادا سے ورثے میں ملے

تو کلیجے سے لگا رکھنا چاہیے"۔

ویسے تو کئی خواتین موجود تھیں مگر ان میں سے ایک قوم پرستی میں بلند مرتبہ رکھتی تھیں اور کئی قصائی ان کی ناک تراشنے کی فکر میں تھے جس پر بجائے خوفزدہ ہونے کے انھیں اور فخر تھا نواب زادے کی شمع محبت کا خاص شعلہ تھیں کچھ سنائی نہ پڑا کہ انھوں نے کیا کہا کیونکہ پورے ہال میں کھسر پھسر گونج رہی تھی لوگ ان کے متعلق اڑی ہوئی افواہوں پر ناقدانہ مباحثے کرنے میں غرق تھے۔ ان کے بعد دوسری خاتون آئیں مگر یہ کچھ پھیکی سی رہیں۔ بچاری اس شعلے کے سامنے صورت شکل کے لحاظ سے بھی مٹی کے تیل کی کپی معلوم ہو رہی تھیں۔ الجھے ہوئے پریشان بال اور بہکی بہکی نظریں۔ انتہائی چوٹ کھائی اور پٹی سی صورت نہ جانے انھوں نے کیا کہا مگر مواد یقیناً انقلابی تھا۔ نہ وہ ہاں کی طرفدار تھیں اور نہ نہیں کی۔ ایک سرے سے انھوں نے ہر چیز کی مخالفت کی یہاں تک کہ خود اپنی مخالفت کی مخالفت کر دی لوگ انھیں جھکی اور بدحواس کہتے تھے۔

جلسے کے بعد انجینیر صاحب اور کامریڈ صمد کی طرف سے پرتکلف ڈنر ملا گھر واپس پہنچتے پہنچتے مس شمشاد کئی ہونٹوں پر شمن بن گئیں۔ کامریڈ صمد نے تو کئی مرتبہ اس طرح اس کے کان میں کچھ کہا کہ ان کے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے کان کی لو سے چھو گئے۔ انقلابی شاعر مع اپنے بدبودار کپڑوں اور عقاب جیسی بھوکی آنکھوں کے اس کے قریب تر آتا رہا۔

جلسے کی تھکن نے جلد ہی تھپک تھپک کر سلا دیا۔ مگر قریب ایک بجے اسکی آنکھ کسی نامعلوم کھٹکے سے خود بخود کھل گئی۔ چوروں سے اُسے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت تو شاہوں کا سے بھی کلیجہ کانپ اٹھتا۔ ہمت کر کے اس نے زور سے پکارا کون؟ کوئی جواب نہ ملا۔ خاموش لیٹ کر بغور سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دماغ پر زور ڈالنے سے جسم بھی تن کر معلق سا ہو گیا۔ ایک ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح شیشے پر سرسرا رہی ہو۔

"شمن!" ہوا سرگوشیاں کرتی ہوا اس کے کان کے پاس رینگی جیسے کسی کی جانی پہچانی سی آواز اُسے پکار رہی ہو۔ مگر یہ آواز تو اُسے بار بار دھوکے دے چکی تھی۔

"شمن" اس بار شبہ مٹ گیا۔ واقعی کوئی کھڑکی کے ادھر سے اُسے پکار رہا تھا۔

"کون!"

"میں!.... ڈرو نہیں۔ میں ہوں افتخار۔ کھڑکی کھولو۔"

"ایں!" شمن نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی کھولی مگر اس کا وہم جسمانی صورت میں موجود تھا۔
"آپ؟"
"اندر آسکتا ہوں۔"
"آیئے" وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔
"مگر سوچ لو...... میرے پیچھے خطرہ ہے۔"
"خطـــرہ!"
"جلدی بولو...... تاکہ میں اور کہیں۔"
"آیئے اندر" اس نے جھلا کر کہا اور کھڑکی کے پٹ پھیلا دیے۔
"پھر پچھتا نا مت! اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر رک کر کہا۔ مگر پھر اندر آ گیا۔
"کیا بات ہے؟" شمن نے مضبوطی سے کھڑکی بند کرکے کہا۔
"ذرا سانس لینے دو۔" وہ خاموش کوچ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا شمن لبادہ اوڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی"
"یہ کمبخت بھیڑیے!" اس نے کلیجہ بھینچ کر کہا "دو قدم نہیں چلنے دیتے۔ بال بال بچا۔"
"کیا ہوا؟"
"وہی، وہی...... اور کون اس بری طرح بھگانے کا شوقین ہے زندگی ایک مسلسل
دوڑ بن کر رہ گئی ہے۔"
"پولیس۔"
"ایں؟...." وہ چونکا مگر پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔
"نہیں میں نے آج تک نہیں بتایا.... اور فائدہ بھی کیا۔ تم گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹرس تھیں"
"میں ڈرتی نہیں ہوں کسی سے نوکر ہوں غلام نہیں!" واہ!
"مگر...."
"رہنے دیجیے یہ بتایئے کچھ کھائیں گے؟" جواب میں افتخار نے اسے ایکبار دیکھا اور خاموشی سے جیب میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شمن باورچی خانہ ٹٹولنے چلی گئی۔
"جانتی ہو یہ کیا ہو رہا ہے اس نے جلدی جلدی لقمے چباتے ہوئے کہا "دس کو

پگھلنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔ یہ سٹیٹس کیوں کودا ہے؟ روس فن لینڈ سے دبک گیا نا...

کم بخت یہ دانت نکلوانے پڑیں گے بیکار ہو گئے.... یہ امپیریلسٹ مل کر روس کو نگلنا چاہتے

ہیں۔ اگر کہیں پانسہ پڑ گیا تو بس!" وہ تخیل میں بھیانک شکلیں دیکھ کر پھریریاں لینے لگا۔

"مگر جرمنی.... جرمنی اتنا تو نہیں کہ ان کے گھسے ہی آ جائے۔" اس نے جیسے خود کو سمجھایا۔

"مگر سٹیٹس؟ اس ہیس کا کیا کریں گے؟" شمن خود اپنے بچوں جیسے سوال پر جھینپ گئی۔ یہ

سیاست ہے بھی تو عجب کھیل، گھڑی میں بڑی بڑی اہم سرگرمیاں اور گھڑی میں بچوں جیسی

شرارتیں!"

"میں جا رہا ہوں... شمن.... مجھے یاد رکھنے کی کوشش کرنا اگر بھول بھی جاؤ تو

مجھے نہ بتانا۔ میں برداشت نہ کر سکوں گا۔ نہ جانے کیوں میرا یقین ہے کہ تمہارے بھلائے

سے جی رہا ہوں۔ نامرادیوں میں تمہارا ہی خیال سہارا دیتا ہے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا

ہے میں نے تمہاری ہی آنکھوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے...... اور یہ میں کیا

بک رہا ہوں" اس نے نگاہیں زمین پر گڑو دیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"کسی سوال کے لیے تشاری نہمانداری...."

"مگر کس قصور میں۔"

"اخبار میں پڑھ لینا وہی پرانا کیس ہے... کانپور کی اسٹرائک کے بعد کا۔ چھوڑو ان

ناگوار باتوں کو.... میں ان لغویات سے تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا بلکہ... بلکہ۔" وہ

خاموش ہو گیا۔

"جانے سے پہلے مضبوطی اور ہمت مانگنے آیا ہوں..... دعا کرنا کہ کہیں بڑھیا

راستے میں ہی نہ لیٹ جائے۔" شمن کا گلا گھٹنے لگا۔

"ذرا سی چھپا لیا دو۔"

"اچھا تو میں جاؤں؟" مگر وہ کھڑا ایسی دبیش میں ہاتھ ملتا رہا۔

"خدا حافظ!" مگر پھر بھی غیر فیصلہ کن انداز میں پریشان کھڑا رہا۔ شمن کا دل بے ترتیبی

ہے دھڑکتا رہا۔

"اچھا خدا حافظ!" وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف مڑا اور سُست ہاتھوں پٹ ڈور کیے۔

"میں جا رہا ہوں..... تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ..... ڈاکٹروں نے کہہ دیا ہے۔ اب میرا مرض خطرناک نہیں رہا..... اب جراثیم....." وہ بُری طرح لڑکھڑا گیا۔ اور ایک دم کھڑکی میں سے غوطہ مار کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شمن نے ایک جھلک اس کے تمتمائے ہوئے چہرے کی دیکھی۔ وہ آنسو روکنے کے لیے ہونٹ چبا رہا تھا اس کے نتھنے چوڑے ہو گئے تھے اور گردن کی رگیں شدّتِ ضبط سے تنی ہوئی تھیں۔ ایضاً

دونوں ہاتھوں میں مُنہ چھپائے وہ خاموش کھڑی رہی پھر پلنگ پر اوندھی گر کر گہری گہری سِسکیاں لینے لگی۔ ایضاً

۳۸

اختیاری والدہ کی آمد

انقلابی جلسوں کی غیر انقلابی حرکتوں سے وہ جلد ہی عاجز آ گئی دو چار جلسوں کی صدارت بھی کی اور نہایت جوش سے کام میں حصّہ لیا۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جاتا تو اس کا حصّہ بس نام کا تھا۔ عام قاعدہ تھا کہ خواتین کے لیے منتظمین خود ہی تقریریں لکھتے ریزولیوشن تجویز کرتے اور تمام کاغذات تیار کرتے اور وہاں جا کر کٹھ پتلیوں کی طرح بتائی ہوئی لکیروں پر چلنے کی کوشش کرتیں وہ بھی ایسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کہ عین وقت پر مددگار کو آ کر پنسل اور کھویا ہوا اشد ضروری پرچہ مہیا کرنا پڑتا یہ عورت ذات بھی کس قدر غیر ذمّہ دار جنس ہے۔ وہ لکچر دینے کا وعدہ کر کے بالکل بھول جاتی۔

عین وقت پر لوگ اُسے لینے بھاگتے اور یاد آتا کہ جو اسپیچ اُسے تیار کرنے کو دی گئی تھی اس کا سرسری طور پر بھی مطالعہ نہیں کیا۔

"کیا بتاؤں بالکل بھول گئی"۔ بڑی سے بڑی غلطی کرنے کے بعد مُسکرا کر کہہ دیتی یہ اس کا جنسی حق تھا جس کا استعمال نہ کرنا حماقت تھی۔ کتنا ہی ضروری مرحلہ ہو ان کا رویہ نہیں بدلے گا۔ بس یہ سمجھیں گی باداجی کا گھر ہے مزے سے بیٹھی ہیں۔ کھانا دیر میں پھیکا سیٹھا پکے باورچی کا قصور، گھر میلا ہو، نوکروں کا قصور، کپڑے گندے ہوں، دھوبی کا قصور، کسی بات میں بھی تو اُن کا اپنا قصور نہیں، رنڈی بن جائیں، سماج کا قصور، دھوکہ کھا جائیں، نسوانیت اور بھولپن کا قصور، لُٹ جائیں، چوری چلی جائیں۔ بھگائی جائیں، لونڈی بنا کر بیچ دی جائیں، سب ظالموں کا قصور،

کئی اصحاب نے اُس کے نام سے مضامین اور نظمیں لکھ کر چھپوائیں۔ کتابیں چھپوانے پر تیار ہو گئے مگر اس خشک تحفے کی طرف اُس نے اتنی بھی توجہ نہ دی جتنی چاندی کے بُندے پاکر اُن کی چمک پر ہوتی۔۔ نئے زمانے کی نئی اُلجھنوں نے لوگوں کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے سوائے حسّاس دلوں اور بے چین دماغوں کے، پہلے لوگ ساڑیاں، بُندے، جھومر، ٹیکہ تحفے میں دیا کرتے تھے اب اشعار و مضامین اور افسانے حاضر ہیں، دولت سے مطلب، سودا پٹانے کے لیے کچھ تو چاہیے۔ کبھی ان سب پر ترس آجاتا۔ وہ بھی تو انسان تھے، جوان تھے، خواب دیکھنا جانتے تھے قصور یہ تھا کہ بٹوارے کے وقت اُن کے حصّے میں احساس زیادہ اور دولتیں کم پڑی تھیں۔ اگر امیر پیسے کے زور سے دس عورتیں رکھ سکتا ہے تو قلم والا قلم کو کیوں زنگ لگائے۔ قلم بھی تو ویسے شمشیر کا توام بھائی ہے وہ کیوں نہ ملک گیری کرے؟

چھٹی کا دن تھا اور فرصت تھی ویسے ہیڈ مسٹرس کو کام کرنے کی ضرورت نہیں اس میں تو تھانے داری کا مادّہ ہونا چاہیے اگر وہ چار استانیوں سے گھما پھرا کر آٹھ کا کام لے سکے تو وہ صحیح معنوں میں محکمۂ تعلیم کی بہی خواہ ہے۔ مختلف تھیوریاں چپکا کر اُلّو بنا کر زیادہ سے زیادہ بیگار لینا وقت مقررہ کے بعد بھی کام کرانا اور پھر بھی استانیوں میں انتہائی درجہ کا احساس کمتری پیدا کر دینا کہ انھیں اپنے دماغ اور قوّتِ متخیلہ پر بھروسہ نہ رہے اور بالکل ہی

پس کر رہ جائیں مگر اُف نہ کریں۔ سارے الزامات اُن کے سر تھوپنا اور سُرخروئی اپنے لیے رکھ لینا بد انتظامی، جنگلی لڑکیوں اور نالائق استانیوں کے حصّے میں قبرستان جیسی خاموشی اور سرکس کے جانوروں جیسی سدھائی ہوئی طالبات ہیڈ مسٹرس کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ!

چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی عورت ملنا چاہتی ہے۔ کہلوا دیا نہیں مل سکتی۔ اِن عورتوں کی آمد بھی کسی قسم کی آفتیں لاتی ہے۔ کہیں دشمن کی جاسوس تو نہیں کہ جا کر لگائی بجھائی کر دیں۔ کسی لڑکی کی ماں یا بہن ہوئی تو یا تو فیس معاف کروائے گی یا زبردستی درجہ چڑھانے کو کہے گی نہ جانے یہ جاہل مائیں درجوں کو بانس کی سیڑھیاں کیوں سمجھتی ہیں جنھیں پار کرانا ہیڈ مسٹرس کا کام ہے جہاں سالانہ امتحان شروع ہوئے اور کمزور اور بدشوق لڑکیوں کی ماؤں کو ہیڈ مسٹرس کی محبت چرائی مٹھائیاں چلی آ رہی ہیں تحفے نازل ہو رہے ہیں ہاتھ پیر جوڑے جا رہے ہیں اگر نہیں مانتیں تو دھمکیاں اور گالیاں بھی موجود ہیں۔

چپراسی نے آکر کہا کہ عجیب ٹیڑھے قسم کی عورت ہے نہیں مانتی۔ ساتھ ساتھ وہ خود بھی آ گئی مجبوراً ملنا پڑا۔ برقعہ اتار کر گھڑی کی طرح ہو بیٹھی۔

"آپ مس گپتا ہیں؟" چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"نہیں!"

"نہیں تو شاید مسز نورانی!"

"جی نہیں!" ذرا سختی سے کہا گیا۔

"کامنی دیوی؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں....."

"تو آپ یقیناً زہرہ ہونگی...... کیوں؟"

"جی..... نہیں! مطلب کیا ہے آپ کا؟" جل کر کہا۔

"یا اللہ تو پھر آپ کون ہیں؟"

"آپ کی بلا سے آپ کو کچھ کہنا ہو تو......"

"اری بھنو کہنا تو بہتیرا ہے۔ پر یہ بھی تو معلوم ہو کہ کون سی ہو.... چہ...... اچھا آپ.... اوں۔ وہ..... وہی..... اے وہ کیا بھلا سا نام ہے اللہ مارا.... چہ ہاں تسنیم ..... تسنیم ..... خدا کی مار اس یاد پر۔"

"نہیں میں نے کہا نا آپ کو غلط فہمی ہوئی...."

"نہیں جی۔ ایسی بھی کیا غلط فہمی۔ اس حلقے میں تو.... یہی نام ہیں اچھا جانے دو یہ بتاؤ کوئی سن تو نہیں رہا ہے۔"

"جی نہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیے اور براہِ کرم تشریف لے جائیے۔"

"ہاں ہاں گھبراؤ مت تشریف بھی لے ہی جاؤں گی مگر..... خیر جو کچھ بھی ہو تمہارا نام خاک پڑے مجھے کیا۔ تم اُسے تو جانتی ہوگی۔ افتخار احمد کو۔"

"ایں؟" تسنیم سمجھ گئی سی۔ آئی۔ ڈی سے پالا پڑا۔ مگر وہ بچہ نہ تھی۔

"منکر نامت۔ تمہیں قرآن پاک کی قسم.... پاک پنجتن کا واسطہ.... دیکھو بہن خدا کو بھی منہ دکھانا ہے.......... اپنے پیاروں کی قسم!"

"کیا مطلب ہے تمہارا..... فوراً چلی جاؤ ورنہ......"

"بیوی مجھے ان گیدڑ بھبکیوں سے تو دھمکاؤ مت تم سے زیادہ زمانہ دیکھا ہے اور بھگتا بھی ہے جوان جلے نصیبوں میں لکھا تھا پھر کیا فائدہ یہ تو بتاؤ اس نے تمہیں ماں بنایا تھا یا بہن یا معشوقہ!"

"تم دیوانی معلوم ہوتی ہو...... جانتی ہو کہ پھر......"

"انداز سے تو یہی معلوم پڑتا ہے کہ.... کہ.... بہن خوبصورت نہیں غنیمت ہو۔"

"تم نہیں جاؤ گی؟"

"جاؤں گی کیوں نہیں بیٹی گھبراؤ اور تمہاری سن کر.... تو میرے خیال میں معشوقہ ہی ہوگی.... ڈھنگ بھی بتاتے ہیں۔ اللہ رکھے شرم آگئی؟" وہ طنز سے مسکرائی۔

"تمہیں ان باتوں سے کیا واسطہ؟"

"کچھ بھی نہیں مجھ اجڑی کو کیا واسطہ ہوتا.... بس یہی کہ میں اس بدذات کی بیوی ہوں"

"تم.... تم؟"

"ہاں میں یقین نہ آئے تو لو یہ سرٹیفکٹ دیکھ لو.... میں جانتی تھی کہ تم یہی کہو گی جھوٹ، تو لو یہ ..... حسین بی زوجہ افتخار احمد..... قوم سیّد....."

"تم کیا چاہتی ہو؟" آنکھیں جھک گئیں۔

"یوں کہو..... تو بن بیاہی ہو یا ماشاءاللہ....."

"تم اپنی کہو..... کیا کہنا ہے۔"

"تو ماشاءاللہ کنواری ہو۔ منہ سے تو یہی لگتا ہے۔ غیب کا حال اللہ جانے۔ آج کل کنواری بیاہی میں اللہ مارا فرق ہی کیا رہ گیا ہے....."

"بکواس بند کر کے اپنا مطلب بیان کرو۔"

"تو بہن مطلب یہ کہ تمہیں اس کیڑوں بھرے کباب میں کیا دکھائی دیا جو ریجھ گئیں برا نہ ماننا۔ اگر منہ سے کوئی بات نکل جائے تو چودہ برس کی عمر سے تو میں اُسے بھگت رہی ہوں۔ ایک گھڑی بھی سکھ چین کی گذاری ہو تو بارہ اماموں کی مار.... دیدار نصیب نہ ہو تین بچے ہیں.... تیرے میرے گھر اتنی عمر گذاری.... باپ کے حقے بھر بھتیجیوں کے گو موت کیے بھاوجوں کی پھٹکاریں سہیں۔ اللہ نے جیسا کچھ بھی ڈالا بھگتا.... پر اب بھی تو میری.... دشمن کے ہاتھ پیر پھول گئے اس کی ہچکیوں نے تو اوسان غائب کر دیے!

"میں ہار گئی پر تم ماشاءاللہ پڑھی لکھیاں اُسے بھگت رہی ہو۔ تمہارا اس میں قصور نہیں وہ ہے ہی ایسا خدا کی پھٹکار اس پر صورت نہ شکل اللہ جانے یہ عورتیں اس پر کیوں لٹو ہوئی جاتی ہیں اے اور تو اور بوڑھی بوڑھی ڈھڈو کوئی بیٹا بنا کر کلیجے سے لگائے لیتی ہے کسی کا بیرن بنا ہوا ہے۔ سنتی ہوں کہیں نکاح بھی کر رہا تھا۔"

"تم یہ کس افتخار کا ذکر کر رہی ہو؟"

"ایسا دیوانہ نہ سمجھو میں خوب سمجھتی ہوں، کالج میں پڑھتا تھا تمہارے سنگ..... شمشاد ہے نا تمہارا نام..... خوب یاد آیا..... فوٹو بھی ہے اس کے پاس اور..... تم

جھوٹ نہ سمجھو میں پکا ثبوت دے دوں گی۔ پہلے سن لو۔ یہ جو نواب ...... ہیں نا اُن کی بیوی کا بھائی بنا ہوا ہے اور میں ننھی نادان نہیں کہ ان بہنوں اور اماؤں کے کھیل تَتے نہ پہچانوں، اللہ ماریاں اماں بھینا کے رشتے کو شرماتی ہیں ارے کام کرو تو کھلے بندوں کرو خبط جائیں۔"

"خیر...... آپ کیا چاہتی ہیں۔"

"یہ بتائیے آپ اُسے روپیہ دیتی رہی ہیں؟"

"نہیں!"

"جھوٹ نہ بولو...... میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں جن میں حوالے دیے گئے ہیں۔ یہی نہیں بہن معاف کرنا۔ آپ نے اس کے لیے بیٹھ کر سویٹر بنے ہیں، ہاتھ جلا جلا کر حلوے تیار کیے ہیں

...... اور......"

"میرے خط دکھا سکتی ہو......"

"مجھے پہچان تو نہیں مگر آپ کے شہر کی مہر سے شاید...... وہ مداری کی طرح تھیلے میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ اور خطوں کے بنڈل نکال کر گود میں رکھ لیے......"

"میں...... آپ چھیننے کی کوشش نہ کرنا......" اس نے بے اعتباری سے ایک طرف مڑ کر کہا۔ اور شمن شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ کیونکہ ایک ثانیے کو اس کے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیوں نہ جھپٹا مار کر ظالم سے اپنی بے وقوفیاں چھین لے اور......

"یہ ہیں...... نیلے لفافوں میں...... آپ خود دیکھ لیجیے۔ یہ شمن نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ لے لیا۔ کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت ننگی ہو کر ناچ رہی تھی۔

"خاطر جمع رکھو...... میں نے کوئی خط نہیں پڑھا۔ میرے بھیجے میں کہاں اتنا بوتا کہ چھیلے کے محبت نامے پڑھوں اور بنو شروع شروع میں اُچرائے بھی بڑھے بھی جلائے بھی پر اب تو سب چیزوں پر خاک ڈال دی...... اسے لکھنے والیاں نہ تھکیں پر میں تو ہار گئی۔"

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" شمن نے بھیگی بلی سی میاؤں کی۔

"اری بھینا میں کیا چاہوں گی۔ تم خود سوچ لو۔" پلنگ پر آلتی پالتی مار کر کہا۔

"یہ دیکھو کہ نکھٹو کو تو آنکھ کا تارا بنا کر رکھا ہے اور مجھ دکھیاری کو لوگ گھر میں نہیں گھسنے

دیتے۔" چلو چلو ہٹی کٹی بھیک مانگ رہی ہو" وہ بھی جیسے ہمیں شوق ہی تو ہے در در ٹھوکریں کھانے کا۔ لوگوں کے آگے ہاتھ پسارنے کا کبھی ہمارا بھی زمانہ تھا۔ ان کا گھر خاک ہو گیا سُسر کی آنکھیں بند ہو گئیں تھیں کوڑی کوڑی پھونک دی، اور یہ کنگال بیٹا بیکسی میں پٹخ۔ خود نکل کھڑا ہوا ویسے بچے دلانے برس کے برس پہنچ جائے ابھی گئے مہینے تمہارے پاس آیا تھا رات گئے میں نے اسٹیشن پر پکڑا اور وہ ویٹنگ روم میں سے ہوا ہو گیا۔ پر میں بھلا چھوڑنے والی تھی۔ پھاٹک کے پاس چھپ گئی جیسے ہی باہر نکلا میں ساتھ چلی کہ پتہ تو لگاؤں اس کے ٹھکانوں کا جب وہ تمہاری کھڑکی میں کودا تو میں سنگ تھی، وہ تو میں اسی وقت آجاتی پر فائدہ کیا تھا دوسرے سُنا ہے یار کے ساتھ مل کے عورتیں کام تمام کرنے سے کبھی نہیں چوکتیں۔ وہ تو خاک بچاتا مجھے اس کا بس نہیں، جو گلا گھونٹ دے خود۔ مگر بہن جب تک میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا برا اب معلوم ہوا۔ اگر اندازہ غلط نہیں تو شریف گھرانے کی بیٹی معلوم ہوتی ہو۔ آنکھوں میں شرم ہے"

شمن کا جی چاہا کاش وہ اندھی ہوتی اور کان بھی پھوٹے ہوئے ہوتے!

"تم کیا جانو اس کے کتنے سلسلے چلتے ہیں۔ زمانے بھر کی عورتوں نے وظیفے باندھ رکھے ہیں حکومت کو الگ تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ یہ جو بھولا گیا تھا یہ بھی کوئی چال تھی میں تو خوش ہو گئی تھی کہ اللہ مارا اب تو مرے گا۔ بلا سے رانڈ ہو جاؤں تو خیر خیرات کی تو حقدار ہو جاؤں بچوں کا پیٹ تو پلے۔"

"آپ فرمائیے بھی کچھ......" شمن نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

"یا اللہ اتنا جو فرمایا تو کچھ بھی نہیں ماشاء اللہ اتنے دن باپ کو بھر تھوڑا بہت بچوں کا حق بھی سمجھ لو۔ اگر نہیں تو تمہاری مرضی تم سے مل لی۔ جی خوش ہو گیا۔ شریف ہو شرافت کو ہاتھ سے نہ دو گی۔ یہ نہیں کہ سپوڈنٹ صاحب کی بیوی کی طرح لگیں غرّے ڈبّے دکھانے۔ میں نے کہا ہوش میں رہ کر بات کرو بیگم، کس بھلاوے میں ہو پرائے مرد سے آنکھ لگاتے شرم نہیں آتی، اپنا چھ ہاتھ کا اچھا بھلا چھوڑ کر اس قبر تو میری دہنی میں بیٹھیں بھرا وہ بڑے اینٹھو تو بندی بھی ایسی ویسی نہیں، صاف کہہ دیا کہ خطوں کا بنڈل جاتا ہے سپوڈنٹ کے پاس کہ میاں دوسروں کے ہتھکڑیاں پڑواتے پھرتے ہو، گھر میں کیا مزے سے خود اپنی عزت پر ڈاکہ ڈلوا رہے ہو۔ آستین میں سانپ پال رہے ہو۔ بس نکل گئی ساری ہیکڑی۔ جھٹ ہاتھ سے کڑے اتار کے دینے لگیں۔

میں نے کہا بیوی ایسی کچی گوٹیاں کسی اور کو کھلوانا، الّو نہیں ہوں ایسا بھی کیا کہ گڑے لے جاؤں جو کل کو خصم سے کہہ کر جیل میں دھروا دو تو کیسی ہو۔ ذرا پانی منگوا دو..... خدا کی پھٹکار حلق بھی تو سوکھ گیا۔" شمن نے پانی انڈیل کر برف ڈالی اور پیش کیا۔

"جگ جگ جیو بہن، دکھیاری کی خاطر داری کا اجر ملے گا۔"

"یہ میری بنک کی کتاب ہے، یہ بندے اور چوڑیاں...... اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کو نظر آرہا ہے...... آپ کو جو کچھ چاہیے لے جائیے۔" دیر تک حسین بی بیٹھی کتاب کے ورق الٹا کیں۔

"کچھ تم نے جمع ہی نہیں کیا۔"

"جو کچھ بھی ہے یہی ہے۔"

"ہوں" وہ سوچنے لگی۔ "مگر میں تو کل جا رہی ہوں۔"

"آج تو چھٹی کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔" شمن نے سوکھی آواز سے کہا

"یہ بندے تو اچھی وضع کے ہیں۔ بہن یوں کان بوچے لگتے ہیں۔ چوڑیاں دلی کی بنی معلوم ہوتی ہیں کیوں؟"

"ہاں" شمن نے خبرا کہا۔

"اچھی ہیں قدسیہ کے لیے ایسی ہی بنواؤں گی۔ بن باپ کی بچی ہے۔ پر دیکھ لینا جو کچھ بھی کمی رہ جائے۔ اسے تو وہ خدائی خوار بھی جا[illegible]۔ پار سال سو روپے دے گیا تھا۔ دے کیا جاتا میں نے اینٹھ لیے وہ زندگی اجیرن کی کل اگلنا ہی پڑے، دو سوئٹر بھی دیے تھے۔ کہ ادھیڑ کر بچوں کے بنائے تو میں نے منے اور اسلم کے لیے بنا دیے۔ اتنا سا اون بچ گیا۔ خدا کی سنوار ان عورتوں پر کیا دریا دلی سے اس بدنصیب کے لیے بنتی ہیں۔ اون بھی تو مہنگا ہے۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"اچھا بہن تو میں چلی...... یہ لو اپنے خط پتر گن لو سنبھال کر۔"

"اور روپیہ۔"

"اب جانے بھی دو روپے میرے آگے بھی کنواری بیٹھی ہے۔" بیری کی طرح بڑھ رہی ہے"

بڑی دنیا نہیں دیکھی تم نے۔ ایسا ہی ہے تو کچھ اوپر بڑا ہو تو دے دو"۔ شمن نے بٹوہ جھاڑ کر ایک سو چالیس روپے گنا دیے۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم بھی بیاہ کر ڈالو بنّو، باپ دادا کا نام اچھالنے سے کیا فائدہ، یہ منہ پہ مہاسے نکل رہے ہیں سرسوں دودھ میں گھس کر لگاؤ، اللہ نے چاہا چٹی کھال نکل آئے گی ...... تو میں چلی ......"

دروازہ کھلا اور وہ تیز تیز قدم مارتی نکل گئی ...... شمن مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان بیٹھی خطوں کے لاوارث بنڈل کو تکتی رہی تو یہ تھی اس کے گلشن محبت کی عمر بھر کی کمائی۔

چپراسی نے آکر بتایا کہ جلسے کی کار انتظار کر رہی ہے اُسے آج ایک فروری لکچر دینا تھا۔

"کہہ دو نہیں تریں!"

اور واقعی اس وقت اسکی حقیقت "نہیں" سے بھی کم ہو رہی تھی۔

۳۹

چونک کر اُس نے دیکھا تو شام کی دھندلی سیاہی کمرے کو مختصر بناتی جا رہی تھی دہشت زدہ ہو کر وہ پیچھے سمٹ گئی۔ یہ اتنی دیر وہ کہاں رہی؟ جب حسین بی اُسے چھوڑ کر گئی تو خاصی دھوپ تھی تو پھر یہ تین چار گھنٹے اس کے وجود نے کس طبقے میں ڈوب کر گذارے احساسات کے ساتھ اس کا دماغ بھی سُن ہو گیا تھا! نہ ہلی نہ جلی مگر دل دھڑکتا رہا پھیپھڑے

پھولتے چمکتے رہے خون کا دوران قائم رہا۔ مگر خود نہ سوئی نہ جاگی۔ نہ ہی اتنی دیر کچھ سُنا۔ دیکھا اور سوچا۔ نہ ہی کوئی خواب دیکھا، تو پھر کیا کرتی رہی؟

ضبط کے تناؤ سے جملہ حواس معدوم ہو کر کسی نامعلوم گہرائی میں غوطہ مار گئے اور اب وہاں آہستہ آہستہ اُبھر رہے تھے۔ دفعتاً اُن کی رفتار تیز ہوئی جیسے سطح کی کشش بڑھ گئی اور وہ اوپر کی طرف دوڑنے لگے۔ سڑک پر لالٹینیں جل اُٹھیں تانگے آگے پیچھے دوڑنے لگے دور کہیں ریل کی سیٹی بھی گونجی کینکر کوٹنے کا انجن دن بھر کی جانفشانی کے بعد بھاری قدموں سے اڈّے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اسکی پھولی ہوئی سانس دھونکنی کی طرح ہانپ رہی تھی پاس کے قصبوں کی طرف جانے والی ٹھسا ٹھس لاریاں ہاتھیوں کی طرح جھومتی چلی جا رہی تھیں نئے نئے سُر اور نغمے کانوں میں ٹھسّم ٹھسّم گھسنے لگے اور ایسا معلوم ہوا وہ زمین کی سانسوں کو آج پہلی بار سُن رہی ہے۔ اتنی دیر مردہ رہنے کے بعد کانوں کے پردے ان آوازوں سے نا آشنا ہو چکے تھے۔ اور بالکل بہروں کی طرح پراگندہ ہو کر ہر نئی آواز پہ چوٹ کھا کر چونک اُٹھتے۔

تو دنیا موجود تھی اور ویسی ہی جاندار اور رنگین تھی۔ صرف وہ گم ہو گئی تھی اُسے بڑا دکھ ہوا اُس کی غیر موجودگی سے کچھ بھی تو نظام درہم برہم نہ ہوا۔ مشین کے لکھو کھا پرزوں میں سے اگر ایک ننھا سا بے حقیقت پیچ تھوڑی دیر کو ڈھیلا ہو کر گر گیا تو سفر رک نہیں گیا کچھ بھی تو نہ ہوا۔ جملہ عناصر کی موجودگی میں صرف اُس کی خاطر یہ کاروانِ حیات کیوں سُست پڑ جاتا روز مرّہ کا بھیانک انجن تو اسی طرح سیٹی بجاتا پٹریاں بدلتا روندتا رہا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ امتحان کے لیے دو چار قدم اٹھائے ہاتھ پیر ہلا کر دیکھے ہر ٹکڑا سالم تھا پرزے چل رہے تھے، کلیں درست تھیں کھوتے وقت تو پتہ نہیں چلا کھٹ سے بجلی کا بٹن دب گیا ہوگا۔ مگر پاتے وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کس طرح اس کی بھٹکی ہوئی ہستی جھجکتی شرماتی واپس لوٹ رہی تھی کسی نے کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی ادب کی وجہ سے کوئی اس کے کمرے میں آ بھی نہ سکتا تھا اور جو اسی طرح وہ بالکل ہی کھو جاتی تو یہ مؤدب خادم اُسے ڈھونڈنے بھی نہ آتے اور شاید ڈھونڈتے بھی تو اتنی دیر سے کہ پانے کا وقت گذر چکا ہوتا۔ یہیں اس بستر پر وہ کھو جاتی کیڑے مکوڑے اپنا حصّہ بٹورنے آ پہنچتے۔

مارے دہشت کے وہ کانپنے لگی۔ جی چاہا اُس گھٹے ہوئے ننھے سے ڈبے میں سے بھاگ کر جسم غفیر سے لپٹ جائے۔ انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لے اور کہے "مجھے خود میں جذب کر لو... چھپا لو چاروں طرف سے گھیر کر اس ڈراؤنے اکیلے پن کو مار بھگاؤ.... اور اب مجھے نہ کھونے دینا!" اور پھر شاید ان کی زندگی کے مس سے یہ مردنی چھٹ جائے گی جو اس پر برسوں کی پڑی خاک کی طرح ذرّہ ذرّہ گر کر جمع ہو گئی تھی۔

یہ اس کے کمرے میں قبرستان جیسی پرانی اور ٹھنڈی بو کیسی؟ جیسے برسوں سے بند پڑا ہو جبھی اسی نے آج لوبان بھی نہیں جلایا۔ مگر پھر اُسے ایک دم لوبان کی خوشبو سے ڈر لگنے لگا اُس کی مردہ خوشبو سے تو یہ کمرہ بالکل پرانی قبر بن جائے گا۔ وہ کیا کرے؟.... کیا کرے؟... کہاں جائے؟... کس کے پاس؟ دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ اب اپنے اِس ٹوٹے پھوٹے وجود کا کیا کرے کِس طرح اُن بکھرے ہوئے ذرّوں کو سمیٹ کر جوڑ ڈالے۔

"ماں.... ماں" وہ خاموشی سے پکارنے لگی اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر ماں کو پکارے اُس ماں کو نہیں جو اُس کے باپ کے گھر میں بیٹھی اس کی خواہشات کو تسکین پہنچایا کرتی تھی اور جس نے اُسے جنم دے کر دوسرا جی پیٹ میں ڈال لیا تھا پھر اُسے فراموش کر دیا تھا بلکہ وہ ماں جس کی پیار بھری گرم آغوش میں گول مول ہو کر وہ روح کی اُس گھٹن کو دور کر سکے جس کے نرم و نازک ہاتھ اس کی تھکی ہوئی کمر کو سہلائیں اور دہکتی ہوئی آنکھوں کو بھینچ کر اُن آنسوؤں کو نکال دیں جو مئی جون کے بادلوں کی طرح اس کی کنپٹیوں میں پھنسے ہوئے تھے گرم گرم لو جیسے تھپیڑے کانوں کے پیچھے سے اُٹھ کر انھیں جھلا رہے تھے۔ پر برسنے نہیں دیتے تھے۔

"ٹھیرو.... ٹھیر و ذرا دیر ٹھیرو" اس نے خود کو نرمی سے چمکارا۔ "ذرا سی دیر ٹھیرو، سب کچھ گذر جائے گا..... یہ دھول بھری آندھی بیٹھ جائے گی۔ طوفان اتر جائے گا..... ایک گلاس پانی پی لو..... ٹھنڈا ٹھنڈا!"

فرمانبردار بچے کی طرح چل کر اُس نے احتیاط سے تھرماس کھولا۔ برف کے ٹکڑے مچھلیوں کی طرح پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے کھڑکی میں سے آتی ہوئی کمزور روشنی انھیں آبگینوں

کی طرح چمکا رہی تھی خود اس کی سانس تھرماس کے خالی حصے سے ٹکرا کر بیروں کو چومتی ہوئی واپس اُس کے چہرے پر پھیل گئی۔ چہرے کے عضلات خود بخود مسکراہٹ میں ڈوب کر ڈھیلے پڑ گئے۔ جان بوجھ کر اس نے تھرماس سے مُنہ لگا کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنا شروع کیں۔ ارے! ٹھنڈی ہوا کی چادریں سی حلق سے سینے میں اتر گئیں ڈرتے ڈرتے اس نے ایک چمکیلی شفاف ڈلی کو چھوا ارے! ایک ٹھنڈا بوسہ سارے جسم میں بچھّو کے زہر کی طرح چڑھ گیا، اور ہمّت بڑھی، انگلی لپکا کر اُس نے ایک ڈلی کو پکڑ لیا جو پھسلتی مچھلی کی طرح زور مارنے لگی مگر جھٹ سے اس نے ہتھیلی پر ڈال دیا جلد میں سے ہوتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدی کہنی تک پھیل گئی۔ شفاف ڈلی آنسوؤں میں تیرنے لگی، ہتھیلی کی گرمی سے بے چین ہو کر وہ اِدھر اُدھر مچلنے لگی نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے برسوں کے پیاسے ہونٹ اُس پر چپکا دیئے۔ اتنی دیر بے کار پڑے رہنے سے زبان بے مزہ ہو گئی تھی۔ سارا مُنہ کڑوا ہو گیا تھا جیسے کسی نے کچا کچّا خون لیکر حلق میں پوت دیا۔ ہاتھ ڈال کر اُس نے بھاگتے ہوئے ٹکڑوں کو مٹھی میں بھینچ لیا اور مُنہ میں بھر کر چبا ڈالا۔ یہاں تک کہ اُس کا حلق، زبان اور خوراک کی نالی سُن ہو گئی۔ مگر وہ برفیلے چنے چباتی رہی۔ ڈلیاں ختم کر کے اُس نے گدلا پانی گلاس میں انڈیلا۔ ندیدے شرابی کی طرح ایک ایک گھونٹ نچوڑ لینا چاہتی تھی تھرماس چھوڑ کر اس نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ذرا او چھا پڑا اور ــــ گلاس ایک جھنجھنا کے سے اُچھل کر زمین پر گرا۔ ٹکڑے بالکل جاندار پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔

وہ سچ مچ بسور دی جیسے کسی نے ننھّے سے کا دودھ لڑھکا دیا اور وہ اس وقت بہت حسّاس اور ننھی بن گئی تھی! بچپن اور ممتا کے سارے جذبات گڈمڈ ہو کر نہ جانے کیا بن گئے تھے۔ غم و غصّے کا جوش سوڈے کے اُبال کی طرح فوراً بجھ گیا۔ ایک بار بے اختیار جی تڑپا۔ کہ گلاس کے بلوریں ٹکڑوں کو بھی ٹھنڈے چنوں کی طرح چبا کر نگل جائے۔ مگر "بری بات" کسی نے اندر سے ٹوکا اور وہ چڑے ہوئے بچّے کی طرح بگڑ کھڑی ہوئی۔ دانت پیس کر اُس نے پوری طاقت سے ٹکڑوں میں ٹھوکر مار کر انھیں سارے کمرے میں بکھیر دیا۔ چمکیلے ذرّے ہوا میں نیم مردہ چنگاریوں کی طرح چٹخ کر تیر گئے۔

بڑا لطف آیا! جیسے کنپٹیوں میں اُڑتے ہوئے بادل ڈھیلے ہو کر بہہ گئے۔ میز پر سے

اُس نے دوسرا گلاس اُٹھایا پہلے روشنی کی طرف کر کے اس کے آر پار جھانکا۔ بوندوں کے چاروں طرف قوسِ قزح کی گوٹ آگے پیچھے دوڑتے ہوئے رنگوں کے ذرّے، دور رکھی ہوئی میز...... کتنی ننھی سی بالشتیوں جیسی لگ رہی تھی۔ پلنگ اور کرسی بھی...... ارے وہ خود بھی تو ننھی ہی منّی سی ہو گئی۔ جبھی تو ان چھوٹی چھوٹی کھلونوں جیسی چیزوں پر سوتی اور بیٹھتی ہے اور یہ ساری دُنیا اس گلاس میں آ کر کس گئی ہے...... وہ خربوزے کے بیجوں برابر کتابیں، بٹن برابر اسٹول اور کپڑوں کی کھونٹی! کیا اچھا ہوتا جو وہ خود بھی ننھی سی گڑیا کی طرح کرسی پر دراز نظر آتی یہ باریک دُنیا اسکی رسائی سے کیوں دور تھی وہ کس دروازے سے گھُسے اندر جل کر اس نے گلاس چھوڑ دیا۔ الماری کھول کر جلدی سے نیا سٹ نکالا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے گلاس اس نے ایک ایک کر کے روپہلی قہقہوں میں غرق کر دیے۔

"تو کیا ہوا وہ کل اور نیا سٹ لے آئے گی۔ نیلا، پیلا، گلابی ہر رنگ کا گلاس اور پھر ان کے ٹکڑوں کے ساتھ خود بھی قہقہے لگائے گی کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا وہ ڈر کر وہ ٹکڑوں کو چھپانے لگی۔

"ستار ماسٹر آئے ہیں!" چپراسی نے کہا۔

"بھگاؤ کم بخت کو!" اس نے کہنا چاہا مگر خیال بدل گیا۔

"آتی ہوں" اس نے اپنے کھوئے ہوئے رعب کو ڈھونڈھ کر کہا۔

جلدی جلدی ساڑی کی شکنوں کو ہاتھوں سے دور کیا۔ چپل پہن کر آئینہ کے پاس گئی روئے ہوئے شریر بچے جیسے چہرے کو جلدی سے پاؤڈر تھوپ کر دھندلا کرتے ہیں زائد پاؤڈر تولیہ سے پونچھ کر اس نے بال کنگھی سے اونچے کیے۔ بائیں آنکھ کے پپوٹے پر سے پاؤڈر رگڑ کر وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

ستار پر جب وہ نئی گت کے توڑے لیتے وقت اس کی نظر پیر کے انگوٹھے پہ پڑی خون سے تر کر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔

ٹھوکر لگاتے وقت مضبوط ٹو کا جوتا پہننا چاہیے اس نے خون کو قالین پر رگڑ دیا۔

سونے سے پہلے اُس نے دونوں دروازے احتیاط سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی کھڑکی کا سارا پردہ بھی کھینچ دیا ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ دبے پیر پلنگ کے پاس آئی آہستہ سے بستر گھسیٹ کر

زمین پر ڈال دیا۔ چھت کا پنکھا کھول کر چت لیٹ گئی ریڑھ کی ہڈی خاص خموں میں جھکنے کی عادی سیدھے فرش پر لیٹنے لگی۔

"نہیں ...... ہر خم مٹا دیا جائے گا اس لہریے کو سیدھا ہونا پڑے گا۔" اس نے حکم دیا اور ایسی گہری نیند میں ڈوب گئی جو برسوں سے حسرت آرزو بن کر رہ گئی تھی۔

۴۰

سو کر اٹھی تو معلوم ہوا دن بہت چڑھ آیا ہے۔ خبروں کا وقت نکل چکا تھا ریڈیو پر کوئی دھیمے سروں میں کسی تازہ نرم راگ کا الاپ کر رہا تھا اطمینان سے چائے کی پیالی ختم کی اور صبح کا اخبار اٹھا لیا۔

"جرمنی نے روس پر حملہ بول دیا"

وہ جلدی سے تکیے کا سہارا لیکر بیٹھ گئی اور دوبارہ ان موٹے موٹے حرفوں کو پڑھا جو ~~تاریخ~~ تاریخ کے ماتھے پر خونیں لکیروں کی طرح کھنچ چکے تھے۔ ایسے حسین بی کو دیکھ کر اتنا تعجب ہوا تھا جتنا اس خبر کو پڑھ کر ہوا۔ مگر نہ جانے وہ کیوں مسکرا دی خبریں اگر نئی صورتیں اختیار کر کے آئیں تو انسان مسکرا ہی پڑتا ہے۔ کل تک روس اور جرمنی گلے میں بانہیں ڈالے ایک دوسرے کو چمکار رہے تھے۔ اور آج یہ جو تم بیزار شروع ہو گئی۔ شبہ تو تھا مگر اتنا قریب نہیں ۲۲ جون بھی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں کہ روس کے علاوہ کسی اور کی سلطنت کو بھی تاراج کر دیا گیا تھا آنے والی پود اس تاریخ کو رٹتے وقت اس سلطنت کی شکست خوردہ رانی کے خواب سے بھی واقف نہ ہو گی مگر پھر بھی یہ دن کسی نہ کسی صورت میں

دُنیا کے دماغ میں بسا رہے گا۔ اور اِس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلّی ہو گئی جو کچھ بھی کیا ہٹلر نے ٹھیک کیا ورنہ یادداشت کے لیے اُسے اپنی ڈائری خراب کرنی پڑتی۔ اس حسین خوابوں کی ڈائری میں یہ دھبّہ کتنا بدنما معلوم ہوتا!

اب اُسے اُٹھنا چاہیے۔ دکانیں کُھل گئی ہوں گی جنگ کا یہ نیا رُخ ضرور قیمتوں پر اثر ڈالے گا۔ جاڑے کا سامان بھی اگر خرید لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہ فوراً اسکول کی لاری میں بازار چل دی۔

آج اُسے ذرا شوخ رنگ پسند آ رہے تھے اس دن نہ جانے کس نے کہا تھا کہ سانولے رنگ پر گدلا سبز رنگ بہت زیب دیتا ہے۔ کاسنی نفاست کا پتہ دیتا ہے اور سنہرا شاہی کہلاتا ہے بنارسی فیتے آگے چل کر ضرور مہنگے ہو جائیں گے ساٹن بھی چڑھ رہی ہے۔ دو کوٹ جلد ہی بیکار ہو جائیں گے۔ ہر چیز دو گنی خریدنی چاہیے۔ نصف سے زیادہ پونجی کپڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ باقی کچھ نئے سٹ کٹلری اور حیٹ بنٹ میں اُڑ گئی۔ اس نے ایک خاتون کو زرد پیلا روغن ناخنوں پر چڑھائے دیکھا۔ کالے سیاہ ہاتھ روان کی بہن جیسے نوکدار لگ رہے تھے باقی کے چار پانچ رنگ اسے پسند آئے۔ ٹینی ردّی ہوتی ہے۔ بلیک بیچک کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر میکس فیکٹر کا پورا سیٹ کیا برا رہے گا عمر میں پہلی مرتبہ ایک ماہ کے کل خرچ کے برابر روپیہ اس نے انھیں لوازمات میں جھونک دیا سنگھار میں دیسی بدیسی سب چلتا ہے اور کپڑوں میں بھی کون پوچھتا ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ پہلے کا خریدا ہوا پڑا ہے ترقی پسند بننے سے پہلے کا ہے۔ جلانا بے وقوفی ہے مجبوراً پہن ہی ڈالا جائے۔

ترقی پسندگی

بغیر آستین کے بلاؤز میں کتنے ہی فائدے ہیں کپڑا کم گرمی کم۔ اور آرام زیادہ۔ جاڑوں میں بھی کوٹ کے نیچے پہن لو تو کندھے بہت نہیں بھولتے بازوؤں کی عادت نہیں اور جلد بھی دو رنگی ہے۔ کہنی تک گہری اور جہاں چھپی رہی وہاں ہلکی ٹھیک ہو جائے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ نیا نیا سیکھا ہے تو بلاؤ سے کر کیا لیں گے؟

۵ کامریڈ صمد شاعر انقلاب [illegible] سے عشق

وہی کامریڈ صمد کی پانچ سیٹ جس میں ہمیشہ دم گھٹتا تھا۔ آج ضرورت سے زیادہ وسیع معلوم ہوئی۔ ایک طرف کامریڈ اور دوسری طرف شاعر انقلاب پھر بھی

کافی جگہ تھی اور اُسے ذرا بھی اعتراض نہ ہوا جب وہ دونوں بار بار ایک دوسرے کی سگرٹ جلانے
یا کسی اور بہانے سے اُسے دونوں طرف سے بھینچنے لگتے ان کی گرم سانسیں گردن اور
بازوؤں کو سینکتیں یا اُن کی بیکل پنڈلیاں اس کی ساری سے ٹکرائیں تو وہ بالکل انجان
بن کر باہر دیکھنے لگتی ایسے کہ اس کے دونوں رُخ حسین زاویے پیش کر سکیں۔

ساٹھن کی صدری میں یہ بڑا عیب ہے کہ آنچل بہت پھسلتا ہے اور انقلابی
شاعر کی آنکھیں لٹو کی طرح ناچتی ہیں۔ صمد کی گردن میں بار بار کیا چیز رینگتی ہے کہ جیسے
ہٹانے کے لیے اُسے اپنی کہنی شمن کے پہلو میں اڑانا پڑتی ہے اور شاعر کی رانوں میں کھجلی
ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم سے زیادہ قریب بیٹھنے والے کے جسم کو کھجا ڈالتا ہے۔ آگے جھک کر
وہ پروفیسر رحمان سے وقت پوچھنے لگی گو کامریڈ اور شاعر دونوں گھڑیاں باندھے تھے
مگر رحمان کے سر پر جا کر نئے قدموں سے دوڑ رہی تھی۔

جلسے میں زور شور کا مباحثہ رہا۔ مگر سب کچھ بوکھلائے سے تھے سمجھ میں نہیں آتا
تھا کہ کسے بُرا کہیں اور کسے اچھا۔ جتنے مُنہ اتنے بول۔

"بے وقوف ہے روس کو چاہیے تھا جرمنی سے مل کر امپیریلزم کا خاتمہ کرتا۔"

"دکھاوے کی ہے لڑائی اڑا دی ہے دشمنوں نے۔"

"نہیں جی خبر سچی ہے، پڑوس میں رات بھر گورے خوشی سے ناچتے رہے اپنی بلا دشمن
کے سر، سب سے پرانا دشمن ہے۔ اب دیکھو جرمنی کے ساتھ مل کر خوب پیٹیں گے اسے"

"ارے آج تو یہ امن کے ٹھیکیدار دونی چڑھائیں گے۔ برسوں کی مراد بر آئی۔"

"نہیں جی روس کا ساتھ دیں گے۔ عملاً نہ سہی زبانی ہی سہی۔ اور خود چمگادڑ کی طرح
دور کھڑے جیتنے والی پارٹی کا انتظار کریں گے۔"

"آخر میں پٹے ہوئے روس اور جرمنی کو سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔"

"فی الحال تو یہ روس کی طرف داری کریں گے اور کرنا بھی چاہیے۔ روس کی موت
انسانیت کی موت ہوگی اور معلوم ہوتا ہے انسانیت کا بڑھاپا آن پہنچا۔"

"زیادہ سے زیادہ دو ماہ لگیں گے روس کو پٹنے میں۔"

ادھر سواستکا لٹو کی طرح گھومتا اپنا دائرہ بڑھاتا رہا ادھر شمشاد نے پٹہ بازی شروع
کر دی آج کامریڈ صمد کی موٹر میں کل انجینیئر صاحب کے ساتھ میں ایک دن شاعر کے شعروں میں
رچ کر کسی بوسیدہ رسٹوران میں تو دوسرے دن پروفیسر رحمان کی نیم تاریک لائبریری میں! ایک
ہفتہ سپرنٹنڈنٹ کے خیمے میں تیتروں کا شکار تو دوسرے ہفتے نہر کے کنارے ننھی سی جھول داری
میں کافی کے گھونٹوں کے ساتھ اونچے اونچے قہقہے وہ بڑی ڈرپوک ہو گئی تھی۔ کمزوری سے جسم بھی
ہلکا ہو گیا تھا۔ انگلیاں دراز اور لوچ دار ہو گئی تھیں اور پیروں کے جوڑ نازک، ذرا سی دور
چلنے سے ٹخنوں میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور مسلنے سے اتنی گدگدی ہوتی کہ وہ اپنے روغنی ناخنوں
سے مسیحا کے ہاتھ کی کھال اتار لیتی۔ کامریڈ صمد ان گہرے نشانوں کو تنہائی میں چومتے تھے انقلابی
شاعر نے ان ننھے ننھے گڑھوں کو کنوئیں سے تشبیہ دی تھی۔ جہاں ان کا اداس دل شام کی تنہائیوں
ڈوبا اُچھلا کرتا تھا۔ انجنیئر صاحب کا خیال تھا کہ یہ نشان، بہت دن بعد جب زندگی انھیں
ایک دوسرے سے بہت دور بھگالے جائے گی تو صحرا میں گرے ہوئے ڈھانچوں کی طرح کسی شاندار
کارواں کی یاد دلائیں گے۔ پروفیسر ادیب تھے اور ان کے ہر جملے سے ادب ٹپکتا تھا۔ وہ انھیں پروفیسر رحمان
ایک گمراہ روح کے قدموں کے نشانوں سے تعبیر کرتے تھے کہاں کہاں پہنچ چکے تھے یہ اچھوتے
چھاپے! ان کا تخیل بھی تو ان کا پیچھا کرتے کرتے بھٹک جاتی تھی۔ دوران خون بھی اپنی گرمی سے
انھیں نہیں پگھلا سکتا۔ یہی سارے کھروچے ان کے دل و دماغ پر بھی تو کھنچے ہوئے تھے مرنے
کے بعد ان کی ہڈیاں بھی ان داغوں کی گواہی دیں گی۔ وہ ان سب سے بے تکلف تھی۔ وہ اس کے
کمرے میں بغیر اجازت گھس آتے پھر اس کی پریشانی پر جھینپ جاتے اس کے بستروں پر مینوں
کی طرح کلیلیں کرتے، مذاق میں اس کی ساڑیاں اوڑھتے اس کی چوڑیوں سے جوا کھیلتے ایک
ایک چوڑی دس دس روپے کا نوٹ بن کر ایک جیب سے دوسری جیب میں جاتی۔ اس کے
کپڑے ناکوں سے بھینچ کر اس کی مخصوص خوشبو دماغوں میں محفوظ کرتے جاتے۔ تاکہ اس سے
بچھڑ جانے کے بعد ہی خوشبو سونگھ کر اس کی یاد میں بے چین ہو سکیں اور گذرے زمانے
کی یاد تازہ ہو جائے
اپنی گھن دار پیچیدہ کا کلیں اس نے کتنی بار تراش کر ان کے سینے کے تعویذوں کے

لیے دے دیں یہاں تک کہ اُسے بالوں کے لنڈورے ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا جہاں کہیں اسکی چوڑی ٹوٹ جاتی تبرک کی طرح بانٹ لی جاتی۔ اشعار میں آمد کے لیے شاعر انھیں ہونٹوں پر لپ سٹک کی طرح نچایا کرتے اور گو ہونٹ بے رنگ رہتے دل و دماغ قوسِ قزح کے رنگوں میں ڈوب جاتے جوڑے کے پھولوں کی آوارہ پنکھڑیاں، میلے رومال اور ایسی ہی ایک غیر شاعرانہ دماغ کو واہیات نظر آنے والی چیزیں کتابوں میں نشانی کے طور پر رکھی جاتیں۔ نہ جانے اس نے کتنے ہی لال، سفید اور پیلے پھولوں کو اپنا کنوارا تحفہ بنا کر دے دیے! کتنے ہی سیب اور شربت کے گلاس ساتھ مل کر چار ہونٹوں نے چوسے .... مگر وہ پھر بھی پیاسی ہی رہی۔

افتخار نے اُسے ایک نایاب نسخہ سکھا دیا تھا اگر شیر کو سدھانا ہو تو بھوکا رکھو، حکومت کرنا ہو تو بھوکا رکھو، یہ جو گنتی کے سفید کرداروں کالوں پر راج کر رہے ہیں یہ سب بھوک کی ہی پالیسی کی بدولت نتھنوں میں خوشبو آئے، رال ٹپک پڑے، زبان باہر نکل آئے مگر کھانا مت دو۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو کھانے والا لقموں کا مزہ دوبارہ نہیں یاد رکھتا۔ حلق سے اترا سو گیا، بس ہونٹوں تک بات کرو حلق سے دور!

وہ اُن سے اوندھے سیدھے کام لینے سے بھی نہ چوکتی۔ رات کو دس گیارہ بجے اُسے یکایک ناریل کے خوشبودار تیل کی ضرورت ہوتی۔ موجودہ تیل یا تو بدبو دینے لگتا یا جی سے اتر جاتا وہ اسی وقت انھیں موٹر میں دوڑاتی پٹرول کی قلت کے باوجود اگر جوہی کی خوشبو کا ناپسند ہوتا تو واپس کروا کے مولسری کی مہک کا لاتے اور گورنمنٹ سے "ضروری کاموں" کے نام سے پٹرول لیتے یا پھر کالا بازار جو پٹ کھلا تھا۔ نئے نئے رنگوں کی جارجٹ کی تلاش میں انھیں دلی کلکتے تک ہلکان کر دیتی اس کے علاوہ اُن سے تکیوں کے غلاف بدلواتی گدے جھٹکواتی پردے ٹنگواتی، ننھے سے ہیئر پن سے شلوار میں کمر بند ڈلواتی اور اُلجھا ہوا اون سلجھانے کو دے دیتی۔

سر میں تیل سوائے شاعر کے کسی سے نہ ڈلواتی۔ کیوں کہ انھیں چمپی کرنی بہت مزے کی آتی تھی۔ ساتھ ساتھ کندھے بازو اور کمر بھی بڑی اچھی طرح دباتے تھے وہ انھیں اس معاملے میں چھوٹی موٹی مجرد دعائیں دے دیتی، اور کنگھی کرتے میں جب وہ ہر بال کی شان میں

فی البدیہہ آزاد نظم کہتے تو وہ حیرت زدہ ہو کر دائیں گال کے تِل کے قریب چھنگلیا کا روغنی ناخن رکھ کر بیٹھ جاتی۔ اُسے آئینے میں بغیر دیکھے اس تِل کے پاس ناخون پہنچانے کی مشق ہو گئی تھی اس صفائی سے کہ چھپ نہ جائے اور یہ حرکت بالکل غیر ارادی معلوم ہو۔

(یہ بھی اسی کی ایک ادا تھی)

اگر وہ کسی سے جل اُٹھتی تو شاعر پر اپنے لاڈ کی بارش شروع کر دیتی وہ بے چارا سب سے کمتر سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اُس کو یوں چڑھتا دیکھ کر لوگ ضبط کے دائرے سے پھسل پڑتے لیکن اگر ہنٹر بہت زور سے پڑ جاتا تو وہ فوراً بسورنے والے کو منا لیتی۔

باوجود اِن مظالم کے اس نے ہر ایک کو یہی یقین دلا رکھا تھا کہ وہ انتہائی درجے کا بے رحم سخت دل اور غصہ وَر ہے، جب چاہے بے چاری کا دِل توڑ کر لا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ سب یہی شیخی مارا کرتے تھے کہ جب چاہیں اُسے تڑپا تڑپا کر رُلا سکتے ہیں اور یہ تھا بھی ٹھیک ذرا سا کنپٹیوں پر زور ڈالتی اور آنسو چھلک پڑتے۔ سب کا یہی قول تھا کہ اس کی آنسوؤں میں تیرتی ہوئی آنکھیں بالکل جل پریاں معلوم ہوتی ہیں اور جب روتے روتے اُس کا بُرا حال ہو جاتا تو وہ خود بھی رو پڑتے۔ پھر دو محبت بھرے دلوں کے آنسو ایک ہی رومال میں جذب ہو جاتے۔

جو اصول اُس نے بنا رکھے تھے اگر کسی بے صبرے نے توڑنے کی ہمت کی تو وہ ایک دم باسی ہار کی طرح اُتار کر پھینک دیا گیا۔ اگر چاہتے ہو تو جتنا ملتا ہے کلیجے سے لگاؤ اور صبر کرو، نہیں چاہتے تو..... ٹھنڈے ٹھنڈے گھر سدھارو۔

(تشبیہ واہ!)

کون کہتا ہے کہ بے پیئے نشہ نہیں ہوتا بعض ایسے بھی ہیں جو صرف سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں، بعض اوروں کو پیتا دیکھ کر جھوم لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ شراب و کباب کے اشعار پڑھ کر ہی مدہوش ہو لیتے ہیں یہی حال جنسی زندگی کا ہے۔ بعض ایسے ہیں جنہیں قصّہ کہانیوں ہی سے چین پڑ جاتا ہے۔ چند کند ذہنوں کو تصویروں اور فلموں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اچھے بھلے تجربہ کار بھی اِن چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کون سی بچی ہوئی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ تو بس یہ لوگ بھی اس طبقے کے تھے جو پانے کی اُمید میں کمنڈل لیے دروازے پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ خواہ انھیں کتنا بھی اُلّو بنائے آج یا پھر کبھی وہ خود اپنے ضمیر سے بھی اپنی بے وقوفیوں کا اعتراف نہ کریں گے۔

مگر ایسے لوگوں کو ٹھکرا دینا بڑی حماقت ہے۔ ناامید ہو کر تو وہ فوراً ہی جو کچھ نہ پا سکے تخیل میں پالیں گے اور وقت آنے پر اصل جیسی نقل کر کے ڈینگیں ماریں گے ہزار باتیں دل سے جوڑ کر لگا دیں گے۔

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُن کی مجال نہیں جو وہ جدا ہو کر اُسے بھول سکیں۔ کم از کم اس کا خیال اُن کے اکیلے پن کو تو دور کر ہی دیا کریگا۔ اس کا ذکر کر کے وہ بیوی اور دوسری معشوقاؤں کو حسد کی آگ میں جلا لیا کریں گے۔ جب جی چاہا معشوق پولیس کے ڈنڈے کی طرح بیوی کی چاند پر دے مارا۔ موقع بے موقع کسی کی یاد میں ایک کھولتی ہوئی پھنکار مار کر نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ دُکھ بھری رنگین مسکراہٹ کے ساتھ سب کو چھوڑ کر دور رومان کی گود میں اُڑ گئے۔

"آہ کیا ساڑی پہنی تھی اس رنگین شام کو رگ رگ مہک رہی تھی بالوں میں نہ جانے کیا نشہ آور عطر چھڑک رکھا تھا کہ دل مچلا جاتا تھا۔ کئی بار میں نے چپکے سے جھک کر بالوں میں ناک گڑو دی۔"! بس کافی ہے ایک بدبودار اور بدشکل بیوی کو جلا کر بھسم کر دینے کے لیے۔

وہ ان سب پر یہ ظاہر کیے رہتی تھی کہ اوروں سے تو صرف مروّت کی وجہ سے ملتی ہے اصل چوٹ تو اس نے لگائی ہے۔ اگر ایک سے بے تکلف ہوتی تو چاہتی دوسرا بھی دیکھ لے کہ ایک چولھے پر کھانا پکے تو اُپلے کی آنچ بے کار نہ جائے! کچھ نہ کچھ وہاں بھی بھنتا رہے یہ بڑا کارگر حربہ تھا اور اس کی فتح کا سب سے بڑا راز۔

اب وہ اکیلی کہیں نہ جاتی "اِن پناہ گاہوں" کے بغیر اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ بازار بھی جاتی تو انھیں کی موٹروں میں وہ فخریہ پیچھے پیچھے خرید و فروخت کی پوٹلیاں — جوتوں کے بنڈل، بسکٹوں کے ڈبے، تازہ ترکاریوں کی گٹھریاں لاد کر چلتے پہننے کی جنس موٹر میں پہنچا جاتے۔ دھنیا گھٹیا ہوتا تو دوسرے پھیرے میں بدلوا لاتے۔ یہی نہیں وہ سیکڑوں ایسے کام کرتے جن کا اگر ان کی بیویاں ذکر بھی کر دیتیں تو مارے شرم کے ڈوب مرجانا بہتر سمجھتے۔

شاعر بے چارے کے پاس اپنے شعروں کے سوائے اور رکھا ہی کیا تھا جو اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتا۔ لہٰذا اس نے اپنی نئی تصنیف اس کے نام معنون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس

ان کے تحفے میں اُسے بڑی دلچسپی نظر آئی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اس نے خود نہایت رسیلے اور چٹ پٹے جملے ڈھونڈ کر نکالے۔

"اس کے نام، جس کا نام میں نہیں لے سکتا۔"

"شرارت بھری آنکھوں کے نام۔"

"اس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانے میں برداشت نہ کرسکا۔"

یا

"اُس برق صفت کے نام جس کی نگاہوں کے تازیانوں نے میرے دل پر گہری لکیریں کھینچ دیں۔"

"اُس شعلہ رخ کے نام جس نے میری زندگی کے تاروں کو اپنے حُسن کی مضراب سے لرزا دیا۔"

"اس سیماب وش کے نام جس نے میری رگوں میں پارہ بھر دیا۔"

گو اُسے قطعی یقین تھا کہ وہ نہ ہی برق صفت ہے اور نہ ہی سیماب وش پھر بھی اُسے بڑا لطف آیا مگر آخری جملے سے نہ جانے کیوں وہ خود ہی چڑ بیٹھی ایسا معلوم ہوا وہ کسی مشہور دواخانے کا لمبا چوڑا اشتہار ہے اُسے شاعر سے خواہ مخواہ کا بیر ہونے لگا وہ ان سب سے اکتا چکی تھی اور سمجھ میں نہ آتا تھا اب اُن بے کس رُخ ناک گھسوائے وہ ان سب کو جلد از جلد سوکھے پتوں کی طرح جھاڑ دینا چاہتی تھی مگر اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اُسے بھول نہ جائیں پھر یہ ہنٹر کوڑے سب فراموش ہو جائیں گے یہ گہری لکیریں دُھندلی پڑ جائیں گی اور رگوں میں بھرا ہوا پارہ ٹھنڈا پڑ جائے گا پھر وہ لوگوں سے اس کا ذکر بالکل بیسوا کی طرح کریں گے ناکامیاں انھیں گندہ ذہن اور دروغ گو بنا دیں گے۔ خوب

پروفیسر پروفیسر سے اس کی عموماً کٹتی چھنتی رہتی تھی وہ بے رحمی کی حد تک صاف گو اور کھکڑ انسان تھا۔ کبھی کبھی تو شمن کو شبہ ہونے لگتا کہ وہ شکار ہے یا خود شکاری بھیس بدلے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں جب وہ خاموشی سے اُسے گھورتا تو اس کا جی چاہتا وہ لوہے کی چادر میں لپٹ جائے۔ بارہا اس نے بھولے سے اس پر تیر اندازی کی مگر معلوم ہوتا تھا تیروں کی نوکیں کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ پڑتی تھیں اس پر پروفیسر کی عقابی آنکھوں کی طنزیہ

مسکراہٹ۔ وہ چراغ پا ہو کر پلٹ آتی اور پہلے سے زیادہ محتاط ہو جاتی۔

مگر اُس نے ہار تو نہ مانی غنیم کی کمزور رگ ٹٹولتی رہی ایک بار پورا اثاثہ داؤں پر لگا دینے کی ٹھان لی۔ جی دھکڑ پکڑ کرتا تھا کہ اگر اس نے اس تھال میں ٹھوکر مار دی تو؟ دو چار چکنی چپڑی باتیں کر کے ایک دن پروفیسر کو ٹٹولا۔

آپ اپنی نئی کتاب کس کے نام معنون کریں گے؟" مگر پروفیسر نے بدک کر دیکھا۔

گویا کھانے سے پہلے سونگھتا ہے

"جو بھی امتحان میں پورا اترے۔"

"کیا فیس داخلہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں اور بہت کچھ۔"

"او نہہ کبھی آپ لوگوں سے کون جیتے گا۔ بھلا یہ جواب مجذوب کی بڑ ہم کوڑھ مغزوں کے کیا سمجھ میں آئے۔"

"پھر وہی بنانے کی....."

"توبہ ہے آپ تو بڑے بے اعتبار ہیں۔" پروفیسر نے ایک گہری سی نگاہ اس پر ڈالی۔ اور شمن جلدی سے کھسک کر شاعر کے پہلو میں ہو رہی۔ نا بابا یہ سانپ کھیلنے کا نہیں مگر تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ پروفیسر بھی کندھے پر آن کھڑے ہوئے۔

"کیا بگڑ گئیں؟" انھوں نے اس کے پیر میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"پھر اس طعنے کا مطلب کتاب تو واقعی چھپ رہی ہے اور معنون....."

"کس کے نام معنون کریں گے، اپنی مری ہوئی ماں کے نام؟" جل کر پوچھا۔

"میری والدہ زندہ ہیں!" پروفیسر بُرا مان گئے۔

"اوہ معاف کیجیے گا، تو باپ کے نام؟"

"وہ مر چکے۔"

"چہ کیا مصیبت ہے جیسے مُردہ سمجھو وہ زندہ اور جسے زندہ سمجھو وہ مر جاتا ہے تو پھر اپنی

بیوی کے نام۔"

"بیوی نصیب ہی نہیں۔"

"ورنہ کرتے ضرور آپ یہ حماقت۔"

"سُننے سے پہلے بولنے سے کیا حاصل، میں کہتا ہوں بیوی ہی سراسر حماقت ہے اور اگر ہو تو پھر کتاب کیا انسان عقل و خرد سب ہی اس کے نام سے معنون کر دیتا ہے۔"

"اونہہ شوق سے کیجیے، بیوی چھوڑ ساس کے نام کر دیجیے۔"

"بگڑتی کیوں ہو، محبوبہ کے نام کیوں نہ کر دوں۔"

"ہیئے" اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"مگر بھئی میں شاعر جیسے جملے سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

"آپ نرے گودڑ ہیں۔" نرے گودڑ

"ہو سکتا ہوں مگر بھئی نہ تو میری خشک اور اُجڑی زندگی میں تار اور نہ ان پر مضرابیں مارے! معاف کرنا اگر بُرا لگے تو......" وہ مکاری سے مسکرایا۔

"مجھے کیوں بُرا لگتا" حالانکہ اُسے سخت بُرا لگ رہا تھا اور جی چاہتا تھا اس کا منہ کھسوٹ ڈالے۔ "اچھا وہ دوسرا "چھلانگ" اس کا ڈیڈی کیشن وہ تو پسند ہے"

"اجی لاحول ولا قوۃ..... خورشید تاباں فرسودہ اور تازیانے..... انحطاط پسندی"

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی کیا بگاڑا ہے اس نے آپ ہر وقت بے چارے کا مذاق اُڑاتے ہیں مانا کہ وہ آپ جیسے مکار نہیں۔"

"میں مکار ہوں۔" پروفیسر نے جھک کر کہا۔

"اور کیا اتنا تو سیدھا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں کتنا چلتا ہوا ہے۔ جانتی ہو نواب.....کی بیگم صاحبہ کا کتنا منہ چڑھا ہے۔ چار جگہ سے وظیفہ پیٹتا ہے۔ ایک دھکے کے ساتھ چند گذرے ہوئے واقعات آگے بڑھے مگر شمن نے دونوں ہاتھوں سے انہیں دور جھٹک دیا۔ شکر خدا کا کہ اس نے شاعر پر کبھی رحم نہیں کھایا تھا۔

"وہ دن یاد ہے جب آپ نے میری ساری چوڑیاں توڑ دی تھیں" وہ تیزی سے بات ٹال کر بولی۔

"یاد ہے۔" پروفیسر نے برا مان کر کہا گویا ایسے اہم واقعات کو بھول جانا جرم تھا۔

"آپ کو رنج ہوا تھا؟"

"تمہارے آنسو دیکھ کر خود کتنے بہائے تھے۔ وہ سب موتی میرے رومال میں جمع ہیں۔"

"اب تک گل گیا ہوگا۔"

"نہیں، دوسرے پانی میں تو اتنی طاقت نہیں کہ ان موتیوں کو بہا سکے۔"

"خیر تو سنئے.... سنئے آپ کبھی شاعر مجموعہ کو دیکھیے اور ایسے رکھیے تو کیسا معلوم ہو" "ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام"..... "نہیں صرف "ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام"" وہ بھی تیار بیٹھی تھی کہ اگر پروفیسر کچھ کہے گا تو فوراً مذاق کی طرف بات پلٹ دے گی۔ مگر نہ جانے آج وہ کس موڈ میں تھا۔

"بڑی تیز ہو تم۔"

"اور خاک پوش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں بکھری ہوں..... کیوں؟"

"اوہو مصوری میں بھی دخل ہے؟"

"کیوں نہیں" اس نے بات بنتے دیکھ کر پورے زور سے ہلّہ بول دیا۔ "لائیے آپ کی تصویر بنا دوں۔" اس نے پروفیسر کی کلائی پکڑ کر اس میں اپنے لمبے ناخن گڑو دیے اور قبل اس کے کہ ان کا بلبلاتا ہوا ہاتھ اسے پکڑ پاتا وہ تڑپ کر باہر روش پر نکل آئی۔ جہاں عام نوکروں کے سامنے انھیں نہایت تہذیب کے ساتھ اونچی آواز میں موسم اور سیاست کے متعلق گفتگو کرنی پڑی۔ بے چارے دیر تک پیاسے بیل کی طرح ہانپتے رہے پھر چل دیے۔

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" چھپ کر آ ہی گئی۔ مگر واقعات نے دوسری ہی کروٹ لے لی۔ شاعر فوراً کھٹک گیا۔ کچھ دن سے پروفیسر بڑے بے وقت ضروری باتیں کرنے

آنے لگے تھے۔ وہ غریب اور کوئی تحفہ نہ دے سکتا تھا۔ تو یہ گیتوں کی مالا ہی اپنی دیوی کے چرنوں پر چڑھا دی تھی مگر سبھی ایرے غیرے نتھو خیرے رومانی بننے لگے تو یہ تو زیادتی ہے بھناتا ہوا آیا۔ تھوڑی دیر تو خاموش ضبط کیے بیٹھی رہی پھر جل اٹھی۔

"مگر اس میں آپ کا کیا نقصان؟"

"نقصان تو نہیں مگر تم کو ہر ایک کو ایسے سر نہ چڑھانا چاہیے۔ گویا گویا......"

"کچھ نہیں گویا گویا اونہہ جل گئے آپ کی باریکیٔ خیال میں وہ آپ سے بہت آگے نکل گئے"

"ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے نام" اوہ کتنا حسین تخیل!

"شہ، بالکل نکما اور بے معنی، جی!"

"اونہہ، آپ خود نکمے اور بے معنی، جی!"

"آپ کا یہ حسنِ ظن ہے میرے متعلق...... چوٹی کے شعرا میں میرا نام ہے..."

"اُہنہ سب اُلو ہیں چوٹی کے شاعر......"

"مس شمشاد!"

"مسٹر شاعر!"

"آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں....."

"اور آپ کو میرا بھیجا چاٹنے کا کوئی حق نہیں۔ دماغ پک گیا آپ کے اوندھے سیدھے شعر سنتے سنتے......"

"میں..... میں..... آپ....."

"کیا میں..... آپ..... کچھ نہیں..... کوئی بات بھی ہو..... اچھی عاشقی ٹھیری کہ گز گز بھر لمبی غزلیں سنو..... سلام ایسی محبت کو..... ہم لنڈورے ہی بھلے!"

"میں آپ کو ادب پرست اور....."

"جی، معاف کیجیے میں کچھ ادب پرست نہیں۔ یونہی آپ کو اُلو بنانے کے لیے سن لیتی تھی.... تشریف لے جائیے اور آئندہ گرلز کالج کی چہار دیواری میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ شریفوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں کوئی چکلہ نہیں یہ......"

"اور اب تک ....."

"اب تک میری مرضی!"

"میں نے ...... میں نے خود اپنا گلا گھونٹ لیا......"

"بہت اچھا کیا آپ جائیے خود اپنے آپ کو دفن کر دیجیے .... جائیے...."

"جا رہا ہوں ..... مگر آپ کو اتنا انحطاط پسند نہیں سمجھتا تھا .... مگر ....."

"جائیے بھی، اور اس اگر مگر کو میری طرف سے گھورے پر ڈال دیجیے گا۔ جائیے اور دنیا والوں سے کہہ دیجیے کہ میں بدمعاش اور آوارہ تھی ..... اور آپ کی داشتہ رہی .....

جائیے ....."

شاعر کے چلے جانے کے بعد ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ شکر ہے اس دن اور کوئی ملنے نہ آیا ورنہ وہ تو شمشیر برّاں بنی بیٹھی تھی۔ ویسے فرصت بھی لوگوں کو نہ تھی۔ کامریڈ صمد کی ریاست میں سپاہیوں کی بھرتی شروع ہو گئی تھی لہٰذا وہ کامریڈی چھوڑ کر نئے سر سے نواب زادہ بن کر خان بہادری کا پودا سینچنے لگے۔ ادیب اور ترقی پسند جلسے بھی پھیکے پڑ کر درہم برہم ہو چلے۔ دو چار کو جیل میں بھرا اور پالیسی بدل گئی زیادہ تر قومی جنگ کے متعلق "کام" کرنے لگے روس کی جنگ دنیا بھر کی جنگ بن گئی۔ اور اس لیے انسان کی جنگ ہو گئی تھی۔ انجینئر صاحب بیروت چلے گئے تنخواہ پر سدھار گئے۔ دنیا کچھ سونی ہوتی گئی۔ ہٹلر چھلانگیں مارتا دوڑنے لگا۔ اِدھر جاپان کو بھی چھینکیں آنے لگیں۔ مشرقی جزائر میں جنگی بڑھ رہی تھی الاؤ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

بے بات جلی بیٹھی تھی۔ پروفیسر آن پہنچے۔ وہ کچھ حدود سے بڑھنے لگے تھے اور اب منڈی شاخ کی طرح یہیں رم گئے تھے۔ شاید چھٹی بار اس کی زلف کے بال یا اور کوئی دوسری نشانی مانگنے آئے تھے اصل میں رازِ ونیاز کے سب کل پرزے گھس گھسا چکے تھے ایک ہی رومان دس دس بار دہرائے جانے کی وجہ سے سڑ چکا تھا جملے چبیا اٹھے تھے سیاسی گرمی بھی کچھ مردہ ہو چکی تھی۔ بھوک کا سوال تیزی سے اٹھتا جا رہا تھا۔ فوجی بھرتی اندھے لولے لنگڑے کانے سب سمیٹ کر ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ جو کل

تک کوڑی کوڑی کو محتاج تھے۔ آج وردی پہنے رعب گانٹھتے پھرتے تھے جیسے دیکھو لفٹننٹ بنا اکڑ رہا ہے اور جب بھوک کم ہو گئی تو تناؤ بھی ڈھیلا پڑ گیا اور یہ زندگی کی دوڑ بھاگ ہے بھی تو اس پیٹ کے بھاڑ ہی کی خاطر۔ زیادہ سے زیادہ پیٹ بھر دو اور ان پیٹ بھرے بیٹوں کو توپ کے آگے دھر دو جیسے کبھی نہ کریں گے اس کے باوجود ایک بے غرضی اور لاپروائی چھائی ہوئی ہے جیسے لڑائی نہیں سٹے کا بازار لگا ہوا ہے جتنا ہو سکے پیسہ گھسیٹ کر لے جاؤ۔ موقع ہے لوگوں کو ضرورت ہے خریدنے کو پیسہ ہے۔ کوڑا کرکٹ بھر دو ان کی جیبوں میں ویسے وار فنڈ بھی جمع ہو رہے ہیں۔ ناچ تماشے کے ذریعہ پیسہ بھی جمع کیا جا رہا ہے۔۔۔۔ سب کچھ حاضر ہے مگر دل حاضر نہیں۔ کیوں دل لگائیں؟ کس کی خاطر لگائیں؟ اتنی بار جو خون کی ندیاں بہائیں تو اس کا کیا اجر ملا؟ یہاں تو بھوک اور برہنگی ویسی کی ویسی ہی رہی۔ جہالت ایک قدم پیچھے نہ ہٹی۔ مرض ایک انچ دور نہ ہوئے۔ جرمنی مرے یا روس، جاپان مرے یا فرانس ان ازلی سسکنے والوں کو کسی کے دکھ کا کیا احساس! دکھ سے گھبرانا کیسا؟ یہاں دکھ بھوگ لو تو وہاں جنت ملے گی۔ خیر دیکھیے جو آقا کا حکم، اپنے بس نہیں بھوک کے ڈنڈے کے بس ہی سہی۔

پروفیسر کے لاڈ ضرورت سے زیادہ ہو چکے تھے ہر چیز سے جی کبھی کا اکتا چکا تھا سب ٹل گئے تھے مگر نہ جانے کس آس میں یہ تعینات تھے۔

"نئی کتاب کے لیے کوئی نام تجویز کرو" ایک دن اٹھلا کر بولے۔

"نام؟۔۔۔۔ کیا ضرورت ہے نام کی؟ کیا بے نام کے کتاب نہیں چھپ سکتی!"

جلی تو بیٹھی ہی تھی۔

"نام سے میرا مطلب ہے ٹائیٹل!"

"جی اتنی اردو جانتی ہوں، کچھ بھی ہو ایک ہی بات ہوئی۔"

"تمہارا مطلب ہے بے نام۔۔۔۔"

"ہاں کیا حرج ہے ایسی گمنام رہنے والی کتاب کا نام رکھنا بے کار۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ لوگ چرائے ہوئے خیالات لفّاظی میں ڈبو کر مصنف بننے کی کوشش کریں تو......"

"یہ کس کے متعلق کہہ رہی ہو؟ میرے خیالات تجربات پر مبنی ہیں۔"

"ضرور...... ذرا بتائیے تو کتنے گاؤں دیکھے ہیں؟ جا کر لسّی پی ہے اور چنے کا ساگ کھا کر آگ کے ڈوڈے سونگھے ہیں؟ کتنی معصوم دیہاتنوں کی عزت لوٹی اور حرام کے بچے پیدا کروائے ہیں؟ سب بکواس بیٹھے بیٹھے بڑ ہانکنے لگے۔ بڑے قوم کو سدھارنے چلے ہیں، ہنہ۔"

"میں قوم سدھار کا قطعی قائل نہیں...... میں لیڈر نہیں ہوں۔"

"تو پھر فائدہ کاغذ کالے کرنے سے سوائے رنڈی کی حمایت کے اور منظور ہی کیا ہے آپ کو یہ آپ رنڈیوں کے کیوں اس شدّت سے طرف دار ہیں؟"

"میں......"

"آپ وہاں جاتے ہیں تو طبیعت مکدّر ہو جاتی ہے اور چاہتے ہیں گورنمنٹ بجائے جنگ سے سر مارنے کے رنڈیوں کے کمرے سجائے، وہاں ٹمٹماتی لالٹین کے بجائے بجلی کے ہنڈے لگائے۔ سستے تیل کی جگہ "ایوننگ ان پیرس" کے کنستر لنڈھائے۔"

"کیوں نہیں......"

"مگر آپ کو اپنا گھر بھول کر رنڈیوں کی بہتری کی کیوں پڑ گئی۔ دنیا میں اور بھی بھوکے ہیں سب کو چھوڑ کر بس ان بے چاریوں پر رحم آتا ہے۔"

"کچھ بھی کہو وہ دنیا کے جسم کا ایک حصّہ ہیں اور کسی عضو کو سڑتے دیکھ کر میری حسّاس طبیعت......"

"کچھ نہیں، بڑی بے چاریاں! ہنہ نہ جانے کتنی اس سے بدتر بے چاریاں گھروں میں پڑی سڑ رہی ہیں۔"

"بھلا ان کے بارے میں کیا لکھ یا جان سکتا ہوں، مجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے

کتنے رنڈی خانے قائم ہیں اور کیا ہو رہا ہے دوسرے بھئی نہ ہی مجھے اس گھریلو عورت سے کوئی دلچسپی ......"

"کیوں ہوگی، بس آپ کی ساری دلچسپی رنڈی میں جذب ہوگئی۔"

"بے شک وہ میرے کام کی ہے .... وہ میری ہے ..... یہ پردے میں چھپی ہوئی پڑی یا وہ عورت جسے ہم غلطی سے تعلیم یافتہ کہتے ہیں .... اِن سے مجھے کیا ملتا ہے۔"

"خیر یہ بھی مانا مگر آپ تو حقیقت نگار بنتے ہیں۔"

"پھر؟ کوئی اعتراض ہے؟"

"جی مجھے اعتراض کا حق تو نہیں مگر پوچھتی ہوں اِن رنڈیوں کی تو آپ رگ رگ سے واقف ہیں۔ کیا مرد ایسے ہی نہیں ہوتے ذرا انھیں بھی تو ڈھونڈھ کر سامنے گھسیٹ لائیے یا بس انھیں ہمیشہ ظالم، بے رحم، دغا باز، حرام کے بچے پیدا کرنے والا ہی دکھاتے ہیں، بڑے روشن خیال بنتے ہیں مگر آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ عزّت اور عصمت صرف عورت ہی کی ہوتی ہے مرد اِن فضولیات سے پاک ہے ...."

"ایں؟"

"جی اور آپ اپنی دانست میں عورت کی حمایت کرتے ہیں یعنی اُسے یقین دلاتے رہنا کہ وہ چیز جو مرد کے لیے باعثِ فخر ہے اس کے لیے گناہ ہے بس یہی ہے آپ کا انصاف اور ترقی پسندی ....."

"ہر بات کو اُلٹے دیتی ہو! سنتی کم ہو۔"

"کیونکہ سنوں کوئی بات بھی ہو سننے کے لیے، کچھ نہیں سب زبان کے چٹخارے کے لیے ہے۔ کیوں صاحب آپ کی عریانی عورت کے سینے تک کیوں رہ جاتی ہے؟"

"ایں؟ ....." پروفیسر زور سے ہنسے۔

"نہیں مگر کبھی اپنی عریانی پر بھی تو نظر ڈالیے .... بس بھوکے کتّوں کی طرح ...."

"آج بڑا مزاج بگڑا ہوا ہے .... پانی پی لو غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"میں بتاؤں کیوں لکھتے ہیں یہ عریاں چیزیں؟"

"میرے منع کرنے سے کیا مان جاؤ گی ...... بتاؤ؟"

"سلیم مرکز حسن ہے۔ بس اسے کھیل کر جی ٹھنڈا کرتے ہیں ......!"

"اچھا بابا! کیا بات تھی اور کہاں پہنچ گئیں ..... معلوم ہوتا ہے ....."

"کیا ..... ؟"

"کوئی تازہ چوٹ کھائی ہے؟"

"چوٹ! ہنہ آپ نے کیسے جانا۔"

"تمہاری کھسیانی صورت اور روتی ہوئی باتوں سے۔ یہ تم جی کے جلے پھپھولے میرے سر کیوں پھوڑ رہی ہو۔ کیا میری جنس کا بدلہ مجھ ہی سے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے تو بہت سنا چکیں، کچھ سننے کی بھی ہمت ہے یا صنفِ نازک کی ڈھال آگے کر دو گی۔"

"میں بزدل نہیں دوسرے آپ سے تو ....."

"تو سنو، مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے۔"

"شکریہ! مگر وجہ اس دریادلی کی؟"

"رحم بعض وقت بے وجہ بھی آتا ہے ....."

"تو مجھے آپ کی عقل پر ....."

"ہاں، شاید ہم دونوں قابلِ رحم ہیں۔ تم اپنے آپ کو ڈھونڈھنے کی کوشش میں کھو بیٹھی ہو اور میں نے تمہیں پہچاننے کی کشمکش میں اپنا بہت سا قیمتی وقت برباد کر دیا۔ ایک بار بازاری عورت کو چھوڑ بقول تمہارے شریف عورت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی تو قدم قدم پر آنکھوں میں خاک جھونکی گئی .... اور اتنے دن جھک مارنے کے بعد پتہ چلا کہ عورت خواہ وہ کوئی بھی کہیں ہو اسے سمجھنے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ وہ سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ استعمال کے لیے ہے۔ ہاں اتنا اندازہ ہو گیا کہ تم معمولی قسم کی عورت نہیں مگر بڑے رنگین مغالطوں میں مبتلا ہو اپنے

آپ کو انتہائی ذہین سمجھتی ہو، حالانکہ قطعی نہیں صرف ضرورت سے زیادہ چرب زبان ہو، بڑے پچھے دار باتیں کرتی ہو۔

"ہنہ...... اور......"

"اور زیادہ حساس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میرے خیال میں جتنے دکھ سہہ کر تم ڈھٹائی سے ہنس سکتی ہو قابلِ داد ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہادر اور مضبوط ہو۔ انتہائی بزدل ہو۔ سوئی کے زخم کو بھالا بنا لیتی ہو تم سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا رویہ جو ہم سب کے ساتھ رہا ہے یہ طاقت کا ثبوت ہے؟ قطعی نہیں یہ خوف، یہ تمہارا اپنی نسائیت کو چھوئی موئی بنا کر رکھنا یہ تمہاری سب سے بڑی بزدلی ہے۔"

"اپنی بے وقوفیوں کو میری بزدلی بنا رہے ہو۔"

"بے وقوفیاں؟ تم اسے بے وقوفی کہتی ہو تم جیسی دہکتی ہوئی آنچ کے سامنے سے برف کے ٹکڑے کی طرح صحیح و سالم نکل آنا بزدلی اور بے وقوفی نہیں بلکہ بہادری کی انتہا ہے اور یہ جو ہم نے تمہارے کانچ کے گلاس کی قدر کی اپنے جی پر پتھر رکھ کر تو تم سمجھتی ہو تم ہمیں الو بناتی ہیں حالانکہ ہم جان بوجھ کر الو بننے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہم جو کچھ تم سے لینے آتے تھے مل جاتا تھا بلکہ میرے دل میں ایک بار بھی اس سے آگے قدم بڑھانے کی خواہش پیدا نہ ہوئی اور کیوں ہوتی۔ کون سی نایاب شے تم ہمیں دے دیتیں۔ جو ہمیں باہر اس سے سستی نہ ملتی۔ ویسے تم خود جانتی ہو کہ تمہاری کشش اتنی شدید نہیں کہ مثلاً صمد کو خان بہادر کے خطاب سے زیادہ تم عزیز نہیں۔ انجنیئر تمہیں چھوڑ کر بیروت چلا گیا۔ کیا تم سمجھتی ہو تم اسے روک سکتی تھیں۔ تم جیسی نہ جانے وہ ہر اسٹیشن پر کتنی چھوڑ گیا ہو گا۔ تمہیں وہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اس کی جاہل اور بے وقوف بیوی کو ہے۔ تم شعلہ ہو۔ مگر ملک کے سینے جیسی پُرسکون گرمی تمہارے پاس نہیں تم

تم جلا سکتی ہو، مرہم نہیں لگانا جانتیں، توڑ سکتی ہو بنانا نہیں آتا... ہا ہا ہا...
... سچ بتاؤ تمہارے ماں باپ تمہیں بہت ہی چاہتے ہیں؟"

"بار و گھٹنا پھوٹے آنکھ....."

"مجھے یقین ہے بالکل نہیں چاہتے" پروفیسر نے سختی سے بات کاٹی "یقیناً تم ان کی پھوٹی آنکھ کا تارا نہیں۔ جبھی تو ملک میں اتنا خطرہ پھیل رہا ہے، لوگ اپنے پیاروں کو دور دور جا کر چھپا رہے ہیں، مگر کسی کو معلوم بھی نہیں کہ تم بھی جاندار ہو۔ تمہیں بھی حفاظت کی ضرورت ہے۔"

"میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔"

"ہاں ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم بڑی ہوشیار ہو کہ اپنے ساتھ اور اپنے چار چھ کو بچائے جاؤ گی۔ ناقدری اور دوسروں کی بے مروتی کی تم اچھی طرح عادی ہو چکی ہو۔ دنیا نے تمہارے زخم دکھا دکھا کر بے حس بنا دیا ہے اسی لیے تمہارا وار زیادہ خطرناک ہوتا ہے ضرور بشاعر سے تم نے اپنے کسی عاشق کا بدلہ لیا ہے جو تمہیں نامراد سسکتا چھوڑ گیا۔"

"بڑے عقلمند معلوم ہوتے ہیں!" جیسے دشمن کی زبان سوکھ گئی ہو۔

"چھوڑو میری عقل کو۔ اور" مجھے تمہاری تنہائی پر ترس آتا ہے۔ بالکل اس سڑک کی طرح جس کے سینے پر رات دن راہ گیر چلتے ہیں پھر بھی وہ خود اکیلی خاموش اور بے جان ہے..... معاف کرنا میں نے بارہا تمہارے چہرے پر مجمع میں تنہائی کا کرب دیکھا ہے۔ جب تمہیں دکھ ہوتا ہے، قہقہے لگاتی ہو، جب خوشی ہوتی ہے تو آنسو بہاتی ہو۔ ہر چیز کو تم نے دھوکا بنا رکھا ہے۔ خیر دنیا کو دھوکا دینے میں کوئی ہرج نہیں لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

"جی، شاید اپنی نئی کہانی کا پلاٹ بنا رہے ہیں۔"

"میری کہانیوں میں انسان ہیں مردے نہیں ہیں۔ زندہ یا قدرتی موت

مرے ہوؤں پر لکھ سکتا ہوں۔ مگر تمہارے جیسے خودکشی کیے ہوئے غیر انسانی واقعے کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ تم جیسے ہنستے کھیلتے مردے بہت کم دیکھے ۔۔۔۔ برا نہ ماننا جو کچھ کہا ہے جذبۂ رحم سے مجبور ہو کر۔۔۔۔ کل جا رہا ہوں بی بی سی سے دعوت نامہ آیا ہے ۔۔۔۔ کاش میں اس سے قبل تم سے سچ بول سکتا۔"

"تو آپ مانتے ہیں کہ آپ جھوٹے ہیں۔"

"اور کیا۔۔۔۔۔ جھوٹے کے سامنے سچا ہمیشہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے جھوٹ ہی چمکایا۔ پر آج جب تم سچ بولنے لگیں تو میرا حجاب بھی ٹوٹ گیا۔۔۔ اچھا ہی ہوا ویسے سچ بات تو یہ ہے کہ۔۔۔۔"

"کہیے کہیے۔ آپ لوگوں کی دروغ بافی نے اکتا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کسی کے ہونٹوں سے سچ سنوں، کہیے خواہ وہ سچ میرے منہ پر جوتا بن کر ہی لگے۔"

"تو سنو۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔ میں نے ۔۔۔۔ معاف کرنا تمہاری توہین ہوتی ہو تو۔۔۔۔ تم سے کبھی شادی کی درخواست تو نہیں کی، اور نہ ہی ایسے بے اصول پھکڑ انسان سے کوئی لمبا چوڑا معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ کم از کم اپنے ہوش و حواس میں تو تم جیسی غیر مستقل مزاج عورت سے سوائے وقتی دلچسپی کے کوئی گہرا تعلق قائم کرنے کی کوشش کروں گا نہیں۔ شادی تو بڑی چیز ہے۔ میں تو تمہارے پڑوس میں بھی نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ دیکھنی ہو ہماری ایک منٹ نہیں بنتی ہم ایک دوسرے کو خطرناک حد تک تاڑ چکے ہیں۔"

"اچھا تو یہی تھی آپ کی صاف گوئی جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا ڈر تھا۔"

"ہاں مگر نہ تو تمہیں نقصان پہنچا اور نہ ہی دکھ ہوا۔ میں جانتا ہوں تم احساس کی حدود سے باہر ہو چکی ہو۔ تمہاری خودداری کو اتنی ٹھوکریں لگی ہیں کہ وہ ایک بے حیا کتیا بن گئی ہے۔ تم سے اتنا چھینا گیا ہے کہ اب تم خود ہی سب کچھ اٹھا کر پھینک دیتی ہو۔"

"کوڑا جمع کرنے سے فائدہ؟"

"ہیرے بھی تمہاری نظروں میں پتھر بن چکے ہیں۔"

"ان میں سے ایک درخشاں ہیرا تو شاید آپ ہیں....." شمن نے انتقاماً قہقہہ لگایا۔

"میرا ذکر چھوڑو ہم تم ایک دوسرے کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے مگر تم نے شاعر کو ٹھکرا دیا، برا کیا۔ معلوم ہے وہ چھ سو روپے پر وار پروپیگنڈے کے سلسلے میں نوکر ہو گیا ہے۔" پروفیسر شرارت سے مسکرایا۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ چھ سو روپے نے ان کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا"

"کثافتیں کیا صرف غربت سے ہوتی ہیں ورنہ تم کیا جانو ان لونڈریوں میں بسے ہوئے سینوں میں کیا کیا گھناؤنی گندگیاں پوشیدہ ہیں۔ میں تو اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جنگ ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ ہر چیز مہنگی اور انمول ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا ہے ایک کارندہ پھانس لو، وقت بے وقت کام آئیگا میں تو بیکار انسان ہوں ویسے میں تو شدت سے طوائفوں کا حامی ..... ہوں۔"

"کبھی ان کے ہمدرد بن کر....."

"ہاں ہمدرد بن کر ہی تو چاہتا ہوں کہ ان کی حالت پیرس کی طوائفوں جیسی ہو جائے جیسے تم تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتی ہو میں....."

"تو آپ ان کے وجود پر مُصر ہیں!" شمن نے بات کاٹی۔

"میں بے چارہ کون مُصر ہونے والا۔ دنیا مُصر ہے اور رہے گی۔ انہیں دنیا سے مٹانے کی کوشش کر کے تو دیکھ لیا۔ مرض مٹا نہیں دب کر پہلے سے زیادہ سڑاندہ پھوڑا بن کر سوسائٹی کی جڑ میں چھپ رہا۔ جس کی لپیٹ میں صدہا آ چکے ہیں، اور آتے رہیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زخم کو کم سے کم کھول کر مرہم پٹی تو کریں شاید صاف ہوا سے عفونت کچھ کم ہو جائے۔"

"ایک طرف اشتراکی بنتے ہیں دوسری طرف طوائفوں کے پیغمبر!"

"اشتراکی دنیا میں ان باتوں کا جھگڑا ہی نہ ہوگا۔ ہر ایک کو حسب ضرورت راشن ....." پروفیسر مسکرایا۔

"غلط، بالکل غلط یہ آپ نے نہ جانے اشتراکیت کو کیا سمجھ رکھا ہے ..... خوب آپ کا خیال ہے۔ وہاں عورتیں مفت دال چاول کی طرح بٹا کریں گی، غلط آپ لوگ بڑے زبردست مغالطے میں ہیں۔ سمجھتے ہیں جیسے جنت میں حوریں ملیں گی۔ ویسے ہی اشتراکیت عورتیں بخشنے لگے گی ہنہ بس تھیوری پڑھ لی اور اشتراکی بن گئے۔ ایسے اشتراکی ہندوستانی اشتراکی بیشک ہو سکتے ہیں مگر اصل مقصد اشتراکیت کا کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کی کس بات کا یقین کیا جائے" اتنے بڑے اشتراکی بنتے ہیں اور اتنی زبردست تنخواہ سمیٹتے جا رہے ہیں۔"

"یہ میری قابلیت کے دام ہیں۔"

"جب آپ سے زیادہ قابل اور محنتی آپ کی تنخواہ کا پچاسواں حصہ بھی نہیں پاتے۔ آپ نے اس بیہودہ نظام میں شرکت ہی کیوں قبول کی"

"مصلحت وقت ہے ..... دیکھنا کیا ہوتا ہے!"

"کچھ نہیں بڑے بڑے دعویدار روپوں کی ڈھیریوں میں دب کر گم ہو گئے تو آپ کی کیا حقیقت ہے۔ اپنے کام سے کب فرصت ملے گی جو کچھ سوچیں یاد ہیں وہ دن جب آپ گورنمنٹ افسروں کو گالیاں دیا کرتے تھے انھیں غلام کہتے تھے اور ابھی گورنمنٹ کی نوکری کی شیخی میرے سر پر پٹختے آئے ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب تک آپ کو چالیس روپے کی نوکری ملی آپ غصہ رہے جونہی یہ قارون کی دولت ملی حکومت کے پیارے بن بیٹھے ہنہ یہ ہے ہمارے نوجوانوں کی ذہنیت کا خلاصہ یہ ساری ہائے ہائے، یہ کسان پرستی یہ گاؤں سدھار اپنی نوکری تک ہے اب تو ہر طرف آپ کو شانتی نظر

اب بحث اشتراکیت پر ہونے لگی ہے۔ موضوع ... [illegible]

فردی

مصلحت وقت ہے

اشتراکیت کو ڈھونگ جانا

آتی ہے۔ کوئی خون آشام آندھیاں اٹھاتا نہیں۔ کوئی سرخ بارش نہیں برساتا کہ
سرخی اتنی زرد کیوں پڑ گئی روس کو مار کھاتی دیکھ کر سب کے منہ اتر گئے۔ ابھی
روس جیتنے لگے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیں۔"

"روس نے حماقت کی ..... جو ہٹلر سے لڑ بیٹھا... جانے دو سیاست
میں ٹانگ اڑانا عورتوں کو نہیں بھاتا۔ مرغی اذان دینے لگے تو ذبح کر دینا ٹھیک
ہے... ہاں تو میرے خیال میں سارے کام چھوڑ کر تم جیسے معمے حل کرنا چاہیئں
تم جیسی عورتیں ہی اس نسل کی ذمہ دار ہیں جب پیٹ سے ہی بچہ تمہارے جیسے
توڑ پھوڑ اور خودغرضی کے منصوبے باندھ کر آئے گا تو دنیا میں اس کے علاوہ
اور کیا کرے گا۔ مگر تم کیا کرو.... تمہارا قصور نہیں، قصور! پس پچھلے نظام
کا ہے جہاں تم جیسے بچے پیدا ہونے پر مجبور ہیں بھلا سوچو اس ذہنیت کے
ساتھ ہمیں کیا احساس ہو سکتا ہے کہ ہمارا ملک خطرے میں ہے اس سے
قبل کہ دوسرے اس کا قیمہ کریں ہم خود ہی مٹا دینے چاہتے ہیں۔ ہم کیوں اپنے
ملک کو ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بیچتے آئے؟ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمارا
نہیں ہمارے مالکوں کا ہے اور ہم بس ادنیٰ خادم ہیں پھر مالکوں کی چیز سے محبت
کیسی اور اس کی تباہی پر دکھ کیسا؟ کیوں نہ اسے بہتر دام مول اٹھا دیں۔ بھلا
فرق ہی کیا ہے کالے نہیں پیلے، پیلے نہیں سفید کیسے ہی ہوں ہمیں تو آقا سے
مطلب ہے۔ ہمارے ملک کی حیثیت ہماری نظروں میں کبھی بھی ایک بیسوا
سے زیادہ نہ رہی خودغرضوں کے ہاتھ ہمیشہ بکتا رہا۔ ہاں گائے اور زمین کی
جتنی بے قدری یہاں ہے کہیں نہ ہوگی پھر بھی ہم ان کی پوجا کی ڈینگیں مارتے
ہیں۔ خیر تو مجھے اعجاز مسیحائی کا یقین نہیں مگر سوچتا ہوں شاید جذبوں کا ایک اعجاز مسیحائی
آدھ تار زندہ رہ گیا ہو اور بارش سے جاگ اٹھے.... اور وہ جدا ہے
ایندھن سمجھ لیا گیا ہے...."

"ایندھن؟"

"ہاں ..... تم جیسی ہستیاں دنیا کی بھٹی کو گرم رکھنے کے لیے سوائے ایندھن کے اور کس کام آسکتی ہیں۔ یہی نا کہ مرنے سے پہلے دو چار سو لڑکیوں کو چوڑیوں کے جوڑ ملانا اور ساڑھی باندھنا سکھا جاؤ گی یہی ہو گی تمہاری قومی خدمت ..... لیکن شاید ..... ایک بات پوچھوں؟"

"جلدی سے پوچھیے اور ....."

"تمہیں کبھی کسی نے پیار کیا ..... اور جواب دینے کی ضرورت نہیں تمہارے مقدس ہونٹ تمہاری پارسائی کی گواہی دے رہے ہیں ..... میں سوچ رہا ہوں ..... تمہارے اوپر تجربہ کیا جائے تو کیسا رہے۔" پروفیسر نے سگریٹ پھینک دیا اور عجیب نظروں سے تہمینہ کو دیکھا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ سوچ سکے انھوں نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر زمی سے اس کے باغی ہونٹوں کو چوم لیا۔

"ہٹیے ..... بدتمیز ..... جنگلی ..... مگر وہ کسے دھکا دے رہی تھی۔ لمبے لمبے قدم رکھتے وہ باہر اپنی سائیکل لے کر سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے "ٹھیرو ..... ٹھیرو ....." اس نے اپنے دماغ میں اندر کسی باغی گھوڑے کو نتھنے پھلائے پاکر چمکارا۔ سب ٹھیک ہو جائیگا ..... کوئی بات نہیں ..... ایسی کوئی بڑی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اب کیا ہو؟ ..... کیا ہو؟ بگڑتے ہوئے رہوار نے نگاہیں ترڑاتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں ..... اس وقت جانے دو ..... سوچنے کی بالکل گنجائش نہیں۔ رگیں بہت زور سے تن رہی ہیں ..... ذرا دباؤ ڈالا تو چٹاخ سے ٹوٹ جائیں گی ..... چپکے سے پلنگ پر لیٹ جاؤ ..... نیند پاس ہی کھڑی ہے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

پھر اچھی بچی کی طرح وہ پیر اٹھاتی پلنگ کے پاس پہنچی۔ سر سنبھال کر تکیے پر رکھا اور آنکھیں پپوٹوں سے ڈھک لیں۔

"آج تو اس نے کہنا مان لیا اور جو آئندہ نہ مانا تو مشکل ہو جائے گا اس بگڑے ہوئے دماغ کو منانا!" اس نے سونے سے پہلے فکرمند ہو کر سوچا۔ ہاتھ پیر آرام سے غنودگی میں ڈوب گئے مگر دماغ سوتے میں بھی سہمی ہوئی سبکیاں بھرتا رہا...... دور اپنے پیچھے اس نے گھوم کر دیکھا وہ لمبی چوڑی سڑک جس پر معلوم ہوتا تھا کسی اژدھے کے لہریے کھنچے ہوئے ہیں..... اس کے پیچھے دوڑتی چلی آرہی تھی۔ دہشت زدہ ہو کر اس نے چاہا لوٹ جائے اور اس بھیانک نشان کو مٹا کر صاف ستھری سیدھی لکیر کھینچ دے...... مگر یہ قدم تو فولاد کے تار کی طرح ضدی ہو چکے تھے۔ ایک ہی چوٹ میں چیخ جائیں گے! منہ پھیر کر اس نے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑنا شروع کیا۔ اور ناک کی سیدھ میں آنکھیں بند کیے بھاگتی چلی گئی۔

"یہ الٹا، یہ سیدھا!" اس نے لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھاتے وقت کپڑا فرش پر پھیلا کر بغور دیکھا مگر وہ فیصلہ نہ کر سکی! کاش اسے معلوم ہو جاتا کوئی ایسی طاقت جو کبھی جھوٹ نہیں بولتی، کبھی دھوکا نہیں دیتی اس کے کان میں آکر بتا دیتی کہ کپڑے کا رخ کون سا سیدھا ہے اگر غلط رخ پر کشیدہ بن گیا تو پھر کیا ہوگا؟ جنگ کی امداد کے سلسلے میں جو مینا بازار لگایا جانے والا تھا اس میں یہ چیزیں بے کار ہو جائیں گی۔

ویسے ہی اس کا کام کتنا سست پڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا مشین میں ہوتے ہوتے زنگ لگتا جا رہا ہے پیچ اڑ گئے ہیں اور ہینڈل نہیں گھومتے لائبریری کی نئی کتابوں پر ابھی نمبر درج نہیں ہو سکے تھے رجسٹر ادھورے پڑے تھے حاضریوں کو جوڑ کر میزان نکالنا اس کا دم گھٹا جاتا تھا۔ اس جمع تفریق سے رسید کی کتابیں بغیر دستخطوں کے جمع ہوتی جا رہی تھیں اور فرنیچر کی سالانہ جانچ نہیں ہوئی تھی۔ ... کیا ہوگا؟ یہ مشین کیسے گھسیٹی جائے گی؟

اور اوپر سے یہ کپڑا! صبح سے کئی بار وہ کام رکوا کر اسی غور میں ڈوب گئی کہ کپڑا سیدھا ہے یا الٹا کئی استانیوں نے ایک رخ کے بارے میں رائے دی اور کسی نے دوسرے رخ کو سیدھا بتایا ... مگر وہ رائے عامہ کے اوپر اس وقت بھروسہ نہیں کر سکتی۔ عوام کچھ نہیں جانتے۔ آنکھ بند کر کے ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔

کئی بار اس نے سب سے چھپ کر بذریعہ قرعہ بھی صحیح رخ معلوم کرنے کی کوشش کی چپکے سے دو پرچیاں لکھ کر بٹنوں کے ڈبوں میں ڈالیں ہینڈبیگ میں۔ اونک۔ اطمینان نہیں ہوا۔ اتنی بار دھوکہ کھانے کے بعد اسے کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ کیا پتہ جو یہ قرعہ بھی جھوٹ بول رہا ہو اسے پھنسانے کے لیے کوئی چال چل رہا ہو۔ اور اتنی باریک کشیدہ کاری غلط رخ پر کڑھ گئی تو کیسے ادھیڑی جائے گی۔ تمام کپڑے کا قیمہ ہو کر سوراخ ہو جائیں گے اور پھر ان گڑھوں کو کیسے پر کیا جائے گا؟ یہ ننھے ننھے مہاسے آنکھوں میں کھٹکیں گے اور اس کی نیندیں تلخ کر دیں گے!

یہ اتنا کھچ پچ کام ہندوستان میں کیوں پسند کیا جاتا ہے؟ یورپ والے کیسے بڑے بڑے پھول کاڑھتے ہیں! دل کش بھی آسان بھی اور صوفیانہ بھی! لیکن یہاں تو ہر چیز ایک دم سے چپکی ہوئی ایسی کہ سانس بھی نہ لی جائے ایک جان اور ایسی مینا کاری! ہر چیز اکھی جا رہی ہے

اُلجھے ہوئے دماغ سے نکلی ہوئی ساری چیزیں آپس ہی میں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں یا کوئی انھیں کیسے بکھیرے ؟

جوں جوں فروخت کا دن قریب آتا گیا۔ اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ عمارت ہو۔ یہ وار فنڈ اور بازار! کیا ہوگا اس پیسے سے لڑائی میں جائے گا اور مرہم پٹی کے کام آئے گا۔ ایک طرف زخمی کرنے کے لیے نئے نئے آلے ایجاد ہوں گے دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نرسیں دوڑیں گی۔ یہ خوبصورت کشیدہ کاری لاکھوں ٹینکوں اور بموں کی صورت میں انسان کی طرف سے انسان پر برسائی جائے گی۔ جسم پیسے جائیں گے۔ خون کے دھارے بہیں گے ظالم اور مظلوم سب ہی مٹی سے منھ دیے جائیں گے۔

اور یہ بھولے بھالے سپاہی، جنگ شروع ہوئی اور ان کے دام بڑھے۔ پھر تو سب ہی کچھ ان کا ہے مالک ان کا۔۔۔ عالی شان عمارتیں ان کی قوم خطرے میں۔۔۔۔ ان کے باپ دادا کی ہڈیاں خطرے میں۔۔۔ شاندار عمارتیں یہ مندر اور مسجدیں سب ان کی جب تک سکھ چین رہا انھیں بے مصرف کا کھلونا سمجھ کر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آج جنگ سے سب بھولے دیوتا کا منھ بھاڑ کی طرح کھلا ہوا ہے۔ جھونکے جاؤ گیہوں اِن کے گھان!

اس کے بعد جب کھیل ختم تو پیسہ ختم۔ توپیں پگھلا کر ریل کی پٹریاں بنائی جائیں گی۔ اور بندوقوں کے فراٹے بھرتے موٹر بنیں گے۔۔۔۔ تھوڑی سی دھات ان کے حصے میں بھی تمغوں کی صورت میں آئے گی جن سے آنے والے بچوں کے جھنجھنے بنائے جائیں گے جب کٹتے مرتے انسان تھک جائیں گے ملاپ ہو جائے گا۔ سپاہی اپنا کٹا ہاتھ یا پیر لے کر گھر جا بیٹھے گا اور جب تک بن چلے پھر نہ لڑیں وہ کبھی کبھی استعمال ہونے والے ہتھیار کی طرح پڑا زنگ کھایا کرے گا۔

جب لڑائی ختم ہو جائے گی اسکولوں میں چھٹیاں ہوں گی ڈنر پارٹیاں ہوں گی

اور سیاہی؟ اس سیاہی کا کیا ہوگا۔ اسے پگھلا کر چور، اُچکّے اور ننگے بھوکے فقیر ڈھالے جائیں گے۔

کوئی ان سے پوچھے، کیوں لڑتے ہو کمبختو؟ مانا کہ آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور تمہیں کچھ سوجھتا نہیں، ذرا یہ بھی تو سوچو کہ جن ماؤں نے جنم دیا ہے ان کے جی پر کیا گذرتی ہوگی۔ خوش قسمت ہیں وہ مائیں جو بانجھ رہیں یہ سب ان مردوں کا کیا دھرا ہے انھیں یہ سیاہی جننا پڑتے تو پتہ چلتا کیا بیتتی ہے جی پر!

مینا بازار کی کامیابی کا سہرا باندھنے سے پہلے ہی سر چکرا اٹھا۔ طاقت ضبط بار گئی۔ توازنِ دماغ ڈگمگانے لگا لہٰذا چھٹی لے کر گھر آرام کرنے کے ارادے سے چلی گئی۔ یہ جنگ کے زمانے میں اپنوں کی ضرورت کتنی بے رحمی سے محسوس ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کسی میں جذب ہو کر چھپ جاؤ اور پھر عمر میں ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھنا چاہئے کہ اپنوں کی محبت کا کیا مزا ہے شاید یہاں ہی آ کے وہ سب کچھ مل جائے۔ جس کی تلاش میں اتنا بھٹکی کہ کوئی بوجھ نا آشنا نہ رہا۔

یہ بھائی بہن! اس نے انھیں بھولنے کی کیوں کوشش کی تھی۔ ایک ہی شکم میں سب نے تکمیل پائی۔ ایک ہی گھر میں بڑھے پلے جیسے ایک ہی پیڑ کی بہت سی پتیاں مگر جب ڈال سے ٹوٹ کر ایک پتی گری تو زمانے کی ہوا اسے کتنی دور اڑا کر لے گئی۔ لڑھکتے لڑھکتے جب تھک گئے تو اس نے پھر اُچک کر شاخ پکڑ لی۔ عادت نہیں رہی تھی نا! اس لیے بڑا زور لگانا پڑا کندھے کھنچ گئے، مگر واپس ماں کے گود میں کتنا سکون ملا نیند سی آ گئی۔

ہیں؟ .... ساری دنیا تو اس کے گھر میں موجود تھی! اسی ایک خاندان میں کچھ ولائتیوں جیسے گورے بھبوکا۔ کچھ حبشی نژاد، کسی میں منگولی خون کی کڑواہٹ تو کسی میں ایرانیوں جیسا تیکھا پن۔ اور یہ سب چار پانچ عورتوں کی محنت کی کمائی تھی۔ اگر جرمنی کی طرح ہندوستان کو بھی مصفّٰی خون کی ضرورت

محسوس ہو تو خالص دیسی مال کتنا رہ جائے گا۔ یہی جتنی تل پر سفیدی یا شاید اتنا بھی نہیں۔ آریوں کا حصہ، ایرانیوں کا حصہ اور افغانی منگولی اور عربی خون اور پھر یہ جو تازہ تازہ ولایتی خون سامانِ جنگ کے ساتھ ساتھ لال کنٹروں میں بھر بھر کر آ رہا ہے یہ؟..... ہندوستانی مٹی ہر بیج کو نگل لیتی ہے۔

ان اودے پیلے رشتہ داروں سے اس نے مذہبی عقیدت کے ساتھ جُٹ کر محبت کرنی شروع کر دی اس نے کبھی بچوں کو چھوا نہ تھا اس لیے پہلے پہلے سخت ابکائیاں آئیں اور جی گبھرایا۔ کیا ناک تھوک میں لتھڑے ہوئے نامکمل انسان ان سے تو کتے بدرجہا بہتر۔

اگر خزاں کی ماری پتی دوبارہ پیڑ میں لٹکنے کی ضد کرے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر سے بہار لوٹ آئے؟ گرا ہوا پھل طشتری سے بھاگ کر ڈال میں لٹکنا چاہے تو کیا وہ کامیاب ہو سکتا ہے یہ مرغیاں ہی اگر اپنی ماں کے پوٹے کے نیچے گھسنے کی کوشش کریں تو کیا سما سکتی ہیں؟ لٹکے لٹکے اس کے شانے ٹوٹنے لگے۔ جتنی جتنی گرفت مضبوط کی اس کے ہاتھ پھسلتے گئے اور جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ پیسہ خرچ کر کے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ جنسی بھوک مٹائی جا سکتی ہے۔ پیٹ ناک تک بھرا جا سکتا ہے۔ مگر ممتا کسی داموں نہیں ملتی۔ کسی کے بچے کو اپنانے کی کوشش ایسی ہی احمقانہ حرکت ہے جیسے کوا دُم میں مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کرے۔ کوے ٹھونگیں مارتے ہیں سو الگ۔ اپنی مور موقع پا کر شامت بلا دیتے ہیں۔ ناجائز بچے کی ماں پھر ماں تو ہے ورنہ اگر گور پھول لگائے تو کیا ہو؟

سب سے پہلے اس نے بڑے چاؤ سے بڑی بہن کی بچی پر دستِ شفقت پھیرنا شروع کیا۔ ماں بننے کے بعد شاید دکھ جھیلنے کی تمیز بھی خود بخود آ جاتی ہے مگر شمن کو تو الٹے لٹکنے کا مزا آ گیا۔ ٹیں ٹیں بچی دن اور رات روتی۔ جی چاہتا اس جاندار ریڈیو کی ایک بار ہی ایسی کل مروڑے کہ سدا کے لیے چپ ہو جائے

گھٹنے پر لٹا کر بچے کو تھپکنا بھی ایک* فن ہے۔ ایسی مشین جیسی رفتار ہو کہ سر جھٹکا نہ کھائے صرف جھومتا رہے اور پھر ساتھ ساتھ منہ اور تالو کی سبب سے انتہا سے زیادہ عجیب و غریب بے معنی آوازیں نکالی جائیں تاکہ بچے کو بیک وقت انسان، مرغی اور چرخے کی گود میں سونے کا مزا آجائے۔ تھوڑی سی سانس منہ میں جمع کر کے لفظ "رے" پر چھوڑ دی جائے ایسے کہ ایک پھوار کی صورت میں "رے" ڈھلتے ہوئے سکوں کی قطار کی طرح دوڑتے چلے جائیں پھر تالو سے زبان لگا کر انگریزی کے لفظ کیو (Q) کو بار بار ایک خاص تناؤ سے نکالا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی کنپٹیوں پر تھپکیاں بھی لگائی جائیں۔ اگر یہ تمام حربے بے کار ثابت ہوں تو دو چار آدمیوں کی مدد سے قریب رکھی ہوئی اشیاء کو ملا کر جھنجوڑ کر جتنی بھی آوازیں مہیا ہو سکیں مع اوپر دی ہوئی ترکیب کے ایک شور قیامت کے صورت میں بچے کے دماغ پر نازل کی جائیں۔ اگر تھپکیاں باقاعدہ ہیں، گھٹنے کی رفتار سائنس کے مقرر کردہ اصول کی پیروی کر رہی ہے تو انشاءاللہ بچہ سو جائے گا۔ اور اس طرح سے سویا ہوا بچہ عموماً جاگتے میں بھی دماغی طور پر سوتا رہے گا۔

بچی کو صحیح و سالم واپس کر کے اسے ایک گونہ اطمینان ہوا بھلے کو بچی عارضی تھی اگر خدانخواستہ کہیں خود اس کے وجود سے مستقل طور پر پھوڑے پھنسی یا گانگن کی طرح پھوٹ نکلی ہوتی تو کیا حال ہوتا؟ کچھ تعجب نہیں کہ جو اس ہندوستان میں اس کثرت سے بچے مرتے ہیں۔ خود اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر چپکے سے وہ بچی کی رضائی اتار کر کھڑکی کھول دے صبح تک نمونیا اور پھر شام تک جھگڑا ختم چین سے پیر پھیلا کر سوئے۔ خود ان بچوں کی مائیں آنے والے جی کی خبر سنتے ہی پاس* پڑوس کی دائیوں سے راز و نیاز شروع کر دیتیں۔ مرض تو نہ جاتا الٹی نئی نئی لتیں لگ جائیں اور جب وہ نیا جی جنم لیتا تو بھی ہر ممکن کوشش اسے ختم کرنے کی کرتیں۔ مگر آخر کو ماں ہوئیں نا۔ مارنا بھی چاہتیں

تو نہ مارا جاتا۔ جوں ہی نزع کی حالت شروع ہوتی ماماتا بے قابو کر دیتی جاتی ہوتی روح واپس گھسیٹ لاتی جاتی ساری عمر گھسٹنے کے لیے۔

جب پہلی بچی کی ہیبت ذرا ختم ہوئی تو اس نے پھر ایک بچے کی سرپرستی شروع کی۔ یہ بد قسمتی سے ذرا کم رو تھا، صحت خراب تھی اور گندگی سے خاص انس رکھتا تھا۔ بہت دوا دارو کی مگر حملہ امراض اس کے جسم میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ کوئی ہی ایسا مرض ہوگا جو دائمی طور پر اس پر قابض نہ ہو چکا ہو۔ ویسے مرنے ورنے کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔

مجبوراً منجھوبی کی چینی کی گڑیا جیسی بچی کے نام قرعہ پڑا۔ بڑی تیاریوں سے کپڑے بنے اور اب کے شمّن نے سنجیدگی سے گود لینے کے مسئلے کو سوچا۔ جاتے وقت منجھوبی ایسا روئی جیسے وہ بچی کو زندہ دفن کر چلی۔ ہزاروں نصیحتیں! "مارنا مت تمہارا غصہ بہت تیز ہے!" وہ کہہ گئی۔ اللہ کی شان یہ وہی منجھوبی تھی جس نے ذرا سی عمر سے اسے انا سے لے کر پالا تھا۔ یقیناً وہ منجھوبی کی بد ذات بچی سے تو ہزار گنا بہتر ہوگی جبھی تو پل بھی گئی۔ پر اسے تو دو دن پالنا دوبھر ہو گیا۔

اب لی جر کووں اور نوروں نے، وہ چونچلیں دھار رکھ رکھ کر جمائیں کہ مزا آ گیا۔ بچی بھی سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی نہ اگلتے بنے نہ نگلے۔

"پھر بیہ... اے ہے اتنی سی جان کو ماں سے چھڑا لیا... توبہ"

"اے ہے پرائے بچوں پر کیا چونچلا، ایسا بھی ظلم نہیں چاہیے" جتنی زبانیں اتنی بکواس۔ جلتی اور اس امید میں سر جھکا لیتی کہ شاید لوگ تھک کر چپ لگا جائیں گے۔

وہ طعنے بھی برداشت کر لیتی کیونکہ بچی غضب کی پیاری تھی مگر رات کو ظالم نے وہ ستم ڈھایا کہ جاڑوں کی رات میں اولا برف پانی سے نہلانا پڑا دوسرے دن نمونیا اور دو چار دن میں بچی ختم۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بچی اسے شرمندہ کرنے کو شرط لگا کر مر گئی۔ رنج کو شرم اور غصے نے دبا لیا۔ جی چاہا کاش وہ دن واپس لوٹ آتے۔ جب منجھو اسے پال رہی تھی کیا کیا ظلم توڑا کرتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو منجھو کے منہ پر تمانچہ مارنے کو ہی مر جاتی۔ دو دن بعد منجھو رو لی پیٹتی کالک ملنے آ پہنچی۔

ویسی ایسی باتیں سُننا پڑیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ منجھو نے سارا الزام اس پر تھوپ دیا۔ بس نہ تھا جو وہ اسے قتلِ عمد کے جرم میں گرفتار کرا دیتی۔ دشمن کے بس میں ہوتا تو وہ ایسی ایسی دس بچیاں جن کر منجھو کے منہ پر کھینچ مارتی۔ توبہ! اتنا چھچھورانہ سمجھتی تھی منجھو کو۔ اس کا دل رکھنے کو رونے کی بھی کوشش کی۔ بچی کے سارے نئے نئے کپڑے خیرات کر دیئے اور دھوم دھام سے پھول چالیسواں کیا۔ گویا بچی نہیں گناہوں کی پوٹ ہی تھی جس کی بخشش دشوار تھی۔

اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے سمجھاتے وقت صاف کہہ دیا کہ یہی بچی منجھو کو انگلی پکڑ کر جنت میں لے جائے گی۔ یہ معصوم بچے جنتی ہی نہیں بلکہ زبردست سفارشی بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ جو کچھ ستمن نے پھول چالیسویں پر روپیہ بہایا سب منجھو کے توشہ خانے میں جمع ہو گیا۔ پھر بھی منجھو کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر روتی رہی۔

لیکن سر پھرا ضدی بیج چٹان کے سپاٹ سینے سے چپک کر پھلنے پھولنے کی آس لگا بیٹھا۔ لاکھوں موجیں آئیں کہ بہا لے جائیں مگر چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ گئیں۔ پھر ایک دن وہ بیج بھی پتھر بن گیا۔ پروفیسر کا خط آیا۔ "یہاں لڑکیاں اتنی فیاض ہیں کہ شادی فضول معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم بطور مہمان (یاد رہے فقط مہمان!) آنا چاہو تو مکان کافی وسیع ہے۔"

پتھر بن جانے والا بیج اس تصویر کے بے حیا جھاڑ سے بدرجہا غنیمت تھا۔

جو گھن بن کر سوسائٹی کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ وہ انسان بھیڑیا جو کرسیاں توڑنے

کا کرایہ ہزار روپے وصول کر رہا ہے۔ دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہا ہے

شمن نے جواب دیا۔ "مہمان نوازی کا شکریہ۔ اگر ایسا وقت آن پڑا تو دیکھا جائے گا۔"

"وقت چھپر پھاڑ کر نہیں آ پڑے گا۔ تمہیں خود لانا پڑے گا۔ ورنہ یہ وقت آنے میں تو دیر کرتا ہے جانے میں ایسی تیزی دکھاتا ہے کہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ ڈرو اس وقت سے جب تمہیں کہنا پڑے۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اس عرصے میں اس نے ایک اور بچے کو اپنانا چاہا مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ انسان یکسانیت سے کیوں گھبرا جاتا ہے۔ جتنی اس نے پرورش کی یہی ہوا کہ اس کی حیثیت بالکل اس زمین جیسی تھی جس کی چھاتی پر چڑھ کر ہر ایک اپنا پیٹ بھر لیتا ہے مگر پھر اسے بنجر کہہ کر چھوڑ جاتا۔ یوں تو یہ بچہ بالکل سیدھا سادا تھا مگر باوجود کوششوں کے اس نے اپنی ماں کے آنچل سے جھولنا نہ چھوڑا۔ شمن سے اپنی خاطر کروا کر وہ سیدھا ماں کے کلیجے سے لگ بیٹھتا۔ "پرایا ..... پرایا" اس کے کانوں میں بار بار گرم سلاخوں کی طرح گھسنے لگا۔ ایک بار ہی اس نے جھٹکا مار کر ساری بندشوں کو توڑ ڈالا ..... کوئی نہیں اس کا اور اسے ضرورت بھی کس کی ہے؟ وہ خود کیا ناکافی ہے؟

دوسرے دن شام کی گاڑی سے اس بکھرے ہوئے "خود" کو سمیٹ کر روانہ ہو گئی۔ کہاں؟ ..... وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ اس نے بالکل نہ سوچا۔ اتنی لمبی چوڑی دنیا میں وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اور کیوں نہ جائے، مانا کہ کوئی منزل نہیں۔ یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیوں ہو کوئی منزل؟ ان بادلوں کی بھی تو کوئی منزل نہیں۔ جہاں اور جدھر جی چاہے بغیر پروگرام بنائے

چل نکلتے ہیں۔ جہاں جی چاہا برس گئے۔ جی چاہا تو بھیگے کو بھگو دیا اور جی نہ چاہا تو پیاسوں کو ترساتے نکل گئے۔ ان آندھیوں کا بھی تو کوئی گھر نہیں ادھر کا کوڑا ادھر گھسیٹ لے جانا۔ سنسان غاروں میں چیخیں مار مار کر دوڑنا۔ چٹانوں پہ سر پھوڑنا دریا کی چنچل موجوں سے الجھنا اور یوں ہی اٹھتے گرتے رہنا۔ لطف بھی تو ہے اس خانہ بدوشی میں۔ شاید کبھی کہیں ساحل مل جائے! اور یہ بھی بھٹکتی ہوئی ناؤ پار لگ جائے جو نہ لگی تو بھی کیا ہے؟ کچھ حرج ہے۔ اسی طرح بہتے چلے جاتے ہیں نہ پتوار نہ بادبان اور نہ ناخدا کا احسان!

آگرہ!

وہ اتر پڑی نہ جانے کیوں جی چاہا تاج محل کو دیکھے، شاید یہ عشق و محبت کی اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ کیا لوگ تھے! بیوی کی محبت میں کیا کچھ بنا کر چھوڑ گئے کتنا مقدس رشتہ ہے یہ بھی مگر ایسی ہی یادگار کوئی دنیا والوں کی محبت میں نہیں بنا دیتا۔ جبکہ لاکھوں ہزاروں سڑک کے پتھروں پر سر رکھ کر زندگی گزارتے ہیں شہنشاہ اور ملکہ کی روحیں کیونکر چین سے پیر پھیلا کر سنگ مرمر کے سائبان تلے سو سکتی ہیں؟ باقی عمارت میں چمگادڑیں اور الو بستے ہیں۔ مزے ہیں ان کے ان الوؤں سے تو کوئی ٹیکس بھی نہیں وصول کرتا! ابھی یہاں تو مردوں اور چمگادڑوں کے ہی ٹھاٹ ہیں اگر سکھ اٹھانا منظور ہو تو ایسے کرم کرو کہ دوسرے جنم میں چمگادڑ یا الو کے روپ میں آنا ملے یہی مکتی کا بلند ترین درجہ ہے۔

ہمیشہ سنا کرتی تھی کہ چاندنی رات میں تاج سچ مچ اندر کی پیشانی پہ جگمگاتا ہوا مکٹ دکھائی پڑتا ہے لیکن دن ہی میں اس کے اس عظیم الشان لاش کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شام ہوتے ہی شوقین مزاج کونے کھدروں میں دادِ عشق دینے کو آ موجود ہوئے۔ سستے مال سے آراستہ "حوریں" جن کے چہرے سفید پاؤڈر کی افراط سے بھوبل میں دبائی ہوئی

شکر قندی کی طرح مٹیالے ہو رہے تھے اور وہ اس جشن عیش میں بھتنیوں کا
کردار ادا کرنے کے لائق نہ تھی۔

یہ مردے کے سینے پر بیٹھ کر جینے میں ان لوگوں کو خاص لطف کیوں
آتا ہے۔ کیا کشش ہے ان قبرستانوں میں جو زندگی کی ہر حسین انگڑائی ان ہی
کے سر پہ توڑنے کو جی چاہتا ہے۔ شاید جذبۂ انتقام کچھ تسکین پا جاتا ہے۔
"تم نے اپنی ناموری کے لیے صدیوں کا خون ان عمارتوں کی بنیادوں میں نچوڑ
دیا..... اور ہم... کسی فعل کے کرنے سے نہیں جھجکتے۔ کاش انتقام
سیدھے راستے پر چل سکتا اور یوں نہ بھٹکتا۔

لاہور!

اس کا اور بھی جی گھبرایا۔ اگر اسے اختیار حاصل ہو تو شالیمار اس سے
زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا تھا۔ نورجہاں کے مقبرے کی عرصہ سے دھوم
سنی تھی مگر اسے یہ دیکھ کر ہنسی آگئی کہ وہاں بھی گدھوں کو ہی سکون نصیب
تھا۔

نورجہاں! دل کی گہرائیوں میں ایک عورت کی فتح دوسری عورت کے
دل میں کچھ کھٹک سی پیدا کر دیتی ہے۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جو نورجہاں
سلیم کی ہستی پر یوں چھا گئی اور کون جانے اُسے شیر افگن سے زیادہ عشق
تھا یا جہانگیر سے!..... یا پہلے شیر افگن سے اور پھر جہانگیر سے! اور ہو
سکتا ہے۔ ایک ہی وقت میں دونوں سے رہا ہو۔ عورت کے دل میں محبت
کی جدا جدا کوٹھریاں ہیں۔ کسی میں مامتا کی، کسی میں شوہر کی محبت.....
اور کسی میں عاشق کی!

اور پھر اس نے خود اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔ یہ ان کوٹھریوں
میں کیا ٹھنسا ہوا تھا۔ دھند اور بادل کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ کاش وہ ان الجھے
ہوئے ڈوروں کو سلجھا کر الگ الگ پنڈیاں بنا کر رکھ سکتی۔ عاشق تو محبوبہ

اور دشمن سب ہی کے چہرے دھندلے ہو چکے تھے۔ پنسل لے کر صرف ضروری نقوش گہرے کر دیتی اور باقی وقت کے گھستوں سے آپ ہی مٹ جاتے۔

دہلی!

اسے ہر چیز بیمار اور بدنما نظر آئی۔ ٹوٹے مکان بنا جانے والوں کو کھڑے کوس رہے ہیں۔ سڑتی ہوئی موریاں جو کسی کی ملکیت نہیں، بھوکے کتے سڑک کے بدنصیب بیٹے، نہ جانے کس کی فرمانبرداری میں کس کی رکھوالی کر رہے ہیں۔ لمبے چوڑے دیواروں پر پھیلے ہوئے گھناؤنے امراض کے علاج جو پکار پکار کر بسنے والوں کی مردانگی کی داد دے رہے ہیں اس کی سوتیلی بہن نئی دہلی؟ صاف ستھری اجاڑ، سنسان! معلوم ہوتا ہے چمگادڑیں یا روحیں بستی ہیں۔ بالکل جدید تاج محل کا نمونہ۔ کبھی...... بہت اور سنے آقا آئیں گے تو اسے ان کے ابدی مالکوں کو سونپ کر سنے کا استھان بنائیں گے۔

مگر یہ قطب مینار اتنا بلند مگر کتنا بے کار! ایک اکیلا پاگل سا دروازہ اس کے کیا معنی یہ کیوں بھوت کی طرح ہاتھ پھیلائے کس کے لیے آغوش وا کیے ہوئے ہے؟

کہاں؟ کہاں؟ وہ کہاں جائے؟ اس بھول بھلیاں میں راستہ کیوں نہیں ملتا؟ جی چاہا یہ دہ پھاڑ کر باہر نکل جائے، پرسکون خلا میں کچھ نہیں ہوگا اور کتنا سکون ہوگا۔ روپیہ ختم ہو چلا تھا۔ واپس جا کر کہیں نوکری تلاش کر لینا مشکل کام نہ تھا۔ مگر کیوں؟ یہ وہ کس سے پوچھے؟ ایلما اسے ایک دم یاد آ گئی۔ یقیناً اس نے اپنی "کیوں" کا جواب پا لیا ہوگا، وہ اسے ضرور تسکین پہنچائے گی۔ وہ سیدھی بانکی پور روانہ ہو گئی۔

ایلما کو دیکھ کر اسے رشک ہوا۔ وہ کتنی سنبھل چکی تھی — مسلسل تھکان کے آثار مٹ چکے تھے اور بڑی مستعدی اور چستی نظر آ رہی تھی۔ تھا ہی کیا ایک دوسرے کو بتانے کے لیے سوائے تنہا اور بے رنگ گزرنے والی ٹھوس گھڑیوں کے۔ پھر بھی ایلما خوش تھی۔ اپنے حساب یوں وہ رالف کی بیوہ بنی زندگی کے دن گزار رہی

تھی یہ سسرال میکا، شوہر سب اس ایک جان کے وجود میں ملا اور کھو گیا۔

پروفیسر ناتھن اب بھی اس پہ مہربان تھے شام ہوتے ہی آجاتے اور رات گئے تک گپ شپ رہتی۔ کتابوں کے اس کیڑے کو اتنا زندہ دل دیکھ کر وہ تحیر زدہ ہو جاتی۔ اس کے ساتھ اور بھی چند پروفیسر آجاتے۔

"ان سے ملو شمن، ڈروتھی ٹیلر۔" ایلما نے اسے ایک طرف بلا کر کہا اور شمن نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے سر اور شربتی بالوں والے گورے سے ہاتھ ملا رہی ہے اس نے مجبوراً رسمی تعارف کا جواب دیا۔ اسے ایلما کا یہ طریقہ قطعی پسند نہ آیا۔ ٹیلر کو وہ اس قدر عزت اور عقیدت سے دیکھ رہی تھی، گویا کوئی معمولی گورا نہیں بھگوان گھر بیٹھے پدھارے ہیں اسے ان ہندوستانیوں سے ازلی نفرت تھی جو ان سفید چمڑی والوں کے ذرا سے منہ لگانے سے پھولے نہیں سماتے۔ اتنا نہیں جانتے کہ یہ لوگ ہم سے ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ واپس اپنے ملک جا کر لوگوں کو حیرت زدہ کریں کہ وہ ہم درندوں کے اتنے قریب پہنچ کر مطالعہ کرتے رہے پھر بھی نہ ہم نے انھیں کاٹا اور نہ ہماری سیاہی نے ان کی سفیدی کو گدلا کیا۔ ہماری تصویریں دکھائیں گے کہ یہ ہیں وہ جنگلی بندر جنھیں ان کی تہذیب کی ہوا نے کپڑے پہننا سکھا دیے ہیں۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شمن کچھ اداس ہو رہی تھی اس نے کئی بار گفتگو میں دلچسپی لینے کی کوشش کی مگر پھر دلی الجھن میں کھو گئی۔ اکتا کر وہ کتابوں کی الماری ٹٹولنے لگی کہ کہیں لوگ اسے بالکل احمق نہ سمجھیں۔

"ضرور پڑھو...... لاجواب ہے۔" اس نے مڑ کر دیکھا ٹیلر اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ جو شمن کے ہاتھ میں تھی۔

"شکریہ!" اس نے بے توجہی سے کتاب رکھ دی اور دوسری اٹھالی۔

"ایک بات......" ٹیلر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ "میں انگریز نہیں آئرش ہوں۔"

سفید رنگ کا ہر آدمی انگریز ہی ہو سکتا ہے اس رنگ کی کچھ ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی ہے کہ دوبارہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، دوسرے اسے آج تک کتوں، گھوڑوں اور ان سفید انسانوں کی کبھی پہچان نہ مل سکی۔ سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ گو بہت سے لوگ دانتوں کھروں اور چال سے نسل پہچان لیتے ہیں پر نہ جانے کیسے؟

"اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ میں خوب جانتا ہوں" اس نے شرارت سے اپنی بے پلکوں والی آنکھ ماری کہ بڑی آسانی سے شمن اسے اقدام جرم میں پکڑوا سکتی تھی۔ "تم لوگ سفید چمڑا دیکھ کر ہی بدظن ہو جاتے ہو۔ اور اس میں تمہارا قصور نہیں۔"

"بدقسمتی ہماری!" جل کر شمن پھر کتابوں کی طرف جھک گئی۔

"میرے پاس کچھ تازہ ترین کتابیں ہیں۔ اگر شوق ہے تو......" شمن کو بے اعتباری سے دیکھتا پا کر وہ کچھ کھسیانا سا ہو گیا "معاف کرنا اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو کہتے ہیں عورت کو سلام بھی کرو تو گالی سمجھتی ہے...... مگر میں سمجھا تھا تم ایلما کی دوست ہو...... شاید تم بھی اسی کی طرح......"

اتنے میں ایلما نے چائے کے لیے پکار لیا۔

"ارے تم ٹیلر سے نہیں ملیں شمن......"

"ہم مل چکے!" ٹیلر نے مسخری صورت بنا کر کہا۔

"ارے نہیں...... شمن یہ جرنلزم کے بہت شوقین ہیں۔ لڑائی میں شریک ہونے سے پہلے..... کیا لکھا کرتے تھے ٹیلر؟"

"نمائندے تھے اخباروں کے" پروفیسر ناتھن بولے۔

"بڑا لائق آدمی ہے اور...... ہاں بھئی اٹھو سینما نہیں چلے گا پھر" ایلما نے بے وقوفوں کی طرح سب کو گڑبڑانا شروع کیا

فلم ردی ہی نہیں انتہا سے زیادہ لچر تھا۔ چند گورے جنگلیوں کے بیچ

میں داد طلب بہادری سخاوت اور انسانیت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ٹیلر چند سیٹیں چھوڑ کر بیٹھا تھا مگر کئی دفعہ جب شمن نے اس کی طرف دیکھا تو اسے بھی اپنی طرف دیکھتا پایا اور کئی بار بے ساختہ دونوں کو ہنسی آ گئی۔

"اب یہ بھی میرے اعمال نامے میں لکھ لیا۔" کھیل کے ختم ہونے پر ٹیلر نے طنزیہ صورت بنا کر کہا۔ اور شمن زور سے ہنس دی۔

رات کو ایلما نے ہٹلر کی بے انتہا تعریف کی۔

"تم بھول رہی ہو کہ یہ سفید چمڑی والے کیا ہوتے ہیں۔ یہی دیکھو یہ دنیا کے مارے دھتکارے یہودی، پولش اور نہ جانے کون کون صرف اپنی چمڑی کے بل بوتے پر یہاں آ کر اینٹھنے لگے۔ آج کل تو جسے دیکھو شیر کی کھال اوڑھے شیر بنا پھرتا ہے یہاں تو جو مہمان بن کر آتا ہے آقا بن بیٹھتا ہے۔"

"کچھ اس میں ہمارا بھی قصور ہے ذرا بازار میں جا کر دیکھو ہزاروں فقیر بھک منگے اور دوکان دار "صاحب" "سرکار" کہہ کر دوڑ پڑتے ہیں۔"

"وہ بے چارے کیا جانیں کون ہیں یہ چاہے وہ انھیں کی طرح کنجڑے جلاہے ہوں مگر معلوم تو صاحب ہوتے ہیں اور رہتے بھی ٹھاٹ سے ہیں۔ ہم تو ہمارے مہمان ہی اچھے۔ ہم خود بھوکوں مر رہے ہیں مگر یہ دیکھ لو میزبانی میں فرق نہیں آتا۔ جب انھیں تمیز سے رہنا نہیں آتا تو پھر دھکا مار کر نکال دینے کو کیوں نہ جی چاہے۔"

"ارے یہ بھی مظلوم ہی ہیں ہٹلر کے مارے۔"

"ہٹلر کے مظلوم بھی ہمارے ظالم ہیں۔ ذرا سوچو ہمیں ان سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے ہم ہٹلر سے بچ کر کہاں جائیں؟ ہمیں تو کوئی اپنی زمین پر قدم بھی نہ دھرنے دے گا۔" مگر ایلما اونگھ چلی تھی نہ جانے اس کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کی وہ جوشیلی ایلما مر چکی تھی اور اب یہ ہاری ہوئی ایلما ہر مجبوری کے آگے سر جھکانے لگی تھی۔

صبح اٹھ کر ایلما نے کہا کہ نوکر کو لے کر شہر سے جنس لے آئے کیونکہ اسے کچھ حرارت معلوم ہو تی تھی۔ اناج کی قلت نے بری طرح پریشان کر رکھا تھا اور جگہ تو راشننگ ہو گئی تھی مگر اس حصے کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ روز بروز اناج اپنی مرضی سے مہنگا ہوتا جا رہا تھا گھر میں جتنا پہلے گھی کا خرچ تھا اس سے چوگنا تو صرف گیہوں پر صرف ہو جاتا تھا اور گھی کا تو کیا پوچھنا۔ گھاس کا گھی بھی اتنا ہوا جا رہا تھا۔

"ہیلو!" کسی نے پکارا۔ شمن نے مڑ کر دیکھا تو ٹیلر اپنی چندھی آنکھوں میں جاذبیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تھک گیا ہوں اس رینگتے ہوئے سست ہندوستان سے، سوچا لاؤ کوئی مصیبت ہی مول لوں۔" وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کو بھی ہنسی آ گئی۔

"ارے تمہیں سخت نا امیدی ہو رہی ہے؟"

"کیوں؟"

"میں سمجھتا تھا گرج کر برس پڑو گی..... خیر فال اچھی رہی اس لئے دوسری ترکیب چلنا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟"

"کہ چلو میرے ساتھ چائے پیو۔"

"مگر میں سامان خریدنے آئی ہوں۔"

"چلو پہلے سامان خرید لیں پھر نوکر کو چلتا کریں گے۔"

ہر دکان پر ٹیلر کو دیکھ کر دکان داروں نے چوگنے دام کر دیئے چاروں طرف سے وہ لے ڈالے جاتے تھے کہ شمن کو اسے رخصت کرنا پڑا۔

"تم سامنے ہوٹل میں ٹھیر دمیں سامان خرید کر آتی ہوں۔"

"کیوں؟" وہ بگڑا۔

"تمہاری موجودگی سے بھاؤ بگڑے جا رہے ہیں۔"

"ارے وہ کیسے؟ اچھا اب میں کچھ بولوں گا بھی نہیں۔"

"وہ تم کچھ بھی کرو۔ تم بھی تو شاہی خاندان سے ہو اس لیے۔"

"میں کیوں ہوتا شاہی خاندان سے، ہشت!"

"یہاں والے ہر سفید چمڑی والے کو بادشاہ سلامت کا بھائی بھتیجا ہی سمجھتے ہیں...... انکساری ہماری گھٹی میں پڑ چکی ہے...... اور تم جانتے ہو یہ گھٹی قریب سو سال سے ہمیں کون پلا رہا ہے۔"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ٹیلر جا کر ہوٹل کے دروازے پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ شمن خوب بھاؤ تاؤ کر کے سامان خرید چکی تو گاڑی کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔ ٹیلر بالکل اس کے ذہن سے اتر گیا۔ لیکن جونہی وہ گھر پہنچی اسے فوراً یاد آیا اور جلدی سے سامان اتروا کر اس نے اسی گاڑی میں واپس بھاگنا مناسب سمجھا جونہی گاڑی مڑی پھاٹک میں داخل ہوتی ہوئی دوسری گاڑی سے قریب قریب ہم آغوش ہو گئی۔ گاڑی بان ایک دوسرے کو خوبصورت رشتوں سے نوازنے لگے۔ دیکھنے کے لیے سر باہر نکالا تو ٹیلر کو اترتا دیکھ کر سن سی رہ گئی۔

"میں بالکل بھول گئی" اس نے لجاجت سے کہا۔ "سامان کی گڑبڑ میں۔"

"یہ میری عزت افزائی ہے" ٹیلر نے طنزیہ ادب سے جھک کر کہا۔ "مجھے پتہ نہ تھا کہ ایک زندہ انسان سے تمہیں بلڈی دھنیا اور چاول زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تمہارا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی مگر میں داد دیتا ہوں کہ تم ناگوار چیزوں کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیتی ہو۔" وہ مڑ کر چلا۔

"مگر......" شمن کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ پھر لوٹا۔

"کس گاڑی میں چلو گی؟...... اپنی میں یا یہ جو میں لایا ہوں" اس نے بالکل ایسے پوچھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

جب گاڑی کافی دور نکل گئی تو ٹیلر ایک دم ہنسنے لگا۔

"اوفو..... یہ لڑکیاں!"

"تم دل ہی دل میں ہم ہندوستانی لڑکیوں کو جنگلی غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہو..... مگر......."

"مگر ہندوستان پر کیا موقوف' دنیا بھر کی لڑکیاں ایسی ہی وحشی ہوتی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "تم سمجھتی ہو ہماری لڑکیاں ادھر بلایا اور دوڑیں۔"

"کم از کم ہندوستانیوں کا تو یہی تجربہ ہے۔ دیکھ لو یہاں تک بندھی چلی آتی ہیں۔"

"غلط بالکل غلط جو ہندوستانی یہ کہتے ہیں وہ ایسی ویسی لڑکیوں سے ملتے ہوں گے وہاں کی اچھی تعلیم یافتہ لڑکیاں بڑی خشک ہوتی ہیں اور یہ ننگی بھوکی فقیرنیاں کہاں نہیں گرتیں۔"

"تو وہاں بھی لوگ ننگے بھوکے ہیں۔" شمن نے کلا طعنہ دیا۔

"کیوں نہیں' تم سمجھتی ہو وہاں سب لارڈ اور بیرن ہی رہتے ہیں۔ تم جو مٹھی بھر انگریز دیکھتی ہو یہ تو ہندوستان کی قسمت سے ایسے نظر آتے ہیں ورنہ جب تک دنیا میں شیطان موجود ہیں لوگ ننگے بھی رہیں گے اور بھوکے بھی۔"

"اس حد تک؟" گذرتی ہوئی گاڑی میں سے شمن نے مرجھائے ہوئے سڑاند فقیروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نہیں اس حد تک تو نہیں۔" ٹیلر نے پھریری لی۔ "ہندوستان آنے سے پہلے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا تھا....."

"یہی کہ بس نواب راجہ سونے ہیرے سے مرصع ہاتھی....."

"بالکل یہ تو نہیں پر ہاں خیال تھا اتنے دن کی حکومت میں ان لوگوں نے کچھ تو کیا ہوگا۔ مگر یہاں آنے سے کچھ دن پہلے ہی میں نے ایک آدھ کتاب ہندوستان کے متعلق پڑھی تھی پھر بھی یہ دیکھنے کی امید نہ تھی۔"

اور اب یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد سارا الزام ہمارے ہی سر منڈھا نا۔"

"سارا تو نہیں..... کچھ ضرور......"

"لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ بھی ہمارے سر منڈھنے کا......"

"......یہ تم لوگوں کی ہیں نے عجیب خصلت دیکھی ہے کہ تم اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ بے گناہ اور غیر ذمّہ دار ظاہر کرنے میں فخر سمجھتے ہو آخر انسان ہو حیوان تو نہیں۔"

"حیوانوں کے ہاتھوں مجبور تو ہیں۔"

"اور جیسے ہندوستانیوں میں ایسے حیوان نہیں۔"

"ہیں انھیں کے پٹھو۔"

"تو یہ کہو یہاں کے اور وہاں کے حیوانوں کے جتھے نے ایک دوسرے کی مدد سے ملک کا یہ حال بنا رکھا ہے مگر سچ بتانا، اپنی ذات سے تم نے اب تک اس جتھے کو توڑنے کی کیا کوشش کی ہے، کون سی قربانی کی ہے؟"

"قربانی کرنے والوں کی گت دیکھی تم نے کیا حال کیا گیا ان کا۔"

اور واقعہ بالکل تازہ تھا ملک کی سب سے بڑی جماعت نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بغاوتیں ریل کے ڈبوں میں پورے زور خروش سے رونما ہوئیں سفید قوم کو کھلا "حکم" مل گیا کہ بھاگ جاؤ یہاں سے نہیں مانگتے تم کو ورنہ بسیں جلا ڈالیں گے۔ ریل کی پٹریاں اکھیڑ دیں گے۔ یہ تمہارے ہیٹ اور ٹائیاں جلا دیں گے مگر سفید بادشاہت اس بغاوت کے زکام کو بجائے گولہ بارود کے لاٹھیوں سے ہی راہ راست پر لے آئی۔ چوہے دان کا پٹ کھلا۔ اور بالائی غائب اور چار ہی دن میں بے سری فوج کو حکومت کے ہاتھی نے روند کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اہنسا بھی اتنی بے ضرر نہ تھی جتنی یہ بغاوت ثابت ہوئی ایسا معلوم ہوا جیسے ناسمجھ بچے مچل گئے تھے کہ ہم تو چاند لیں گے۔ ایسے بچوں کو تو بس دو طرح سے درست کیا جا سکتا ہے یا تو تھالی کا چاند دے دو...... مگر یہ بچے بڑے ہوشیار ہیں صاف پٹی کو پہچان گئے دوسری ترکیب یہ ہے کہ لگاؤ ایک تھپڑ اور کہہ دو

جب ابّا بازار سے آئیں گے تب چاند ملے گا۔"

"مگر کون جانے جب ابّا بازار سے آئیں تو تھکے ہوئے ہوں یا ایک سرے سے چاند کی ضرورت ہی نہ سمجھیں۔"

"اتنا سلیقہ نہیں انھیں کہ چاند بیچ کا دے دیا جائے بھاڑ پھوڑ کر الگ کریں گے آپس میں بھائی بھائی جھگڑیں گے نوچ کھسوٹ کر پھینک دیں گے۔ ہمارے پاس سیف میں رکھا ہے چاند حفاظت سے، جب بڑے ہو جاؤ گے تب ملے گا۔"

"مگر کب بڑے ہوں گے یہ تو ابّا ہی جانیں۔ کتنے ہی بڑے ہو جاؤ اطمینان دلاؤ مگر ماں باپ کے دل میں تو وہ کل کے بچے ہی رہیں گے۔ اور پھر جانے ابّا بازار سے لوٹیں گے بھی یا وہیں دھرے رہ جائیں گے۔ ہٹلر تو کبڈی اڑا رہا جاتے پر پالا مار رہا ہے پالے پر پالا مارتا جا رہا ہے کون جانے چاند بھی دبی مارے جائے۔"

"ہاں...... اور تاریخ ہمیشہ ان کی اس حرکت پر لعنت بھیجے گی۔" ٹیلر نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر مورخ بھی تو یہ خود ہی ہیں، ہم تو وہی پڑھیں گے جو آج تک پڑھتے آئے ہیں یعنی ان کی عقل مندیاں اور اپنی بے وقوفیاں..... ہر زمانے میں آنکھ کھول کر انہی کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کیے"

"مگر اس مرتبہ امریکہ جو موجود ہے۔"

"امریکہ کب موجود نہ تھا مگر وہیں تک جہاں تک ایک ڈالر کے دس بننے کی امید ہے روئی کا بیوپار نہیں جنگ کا سہی۔ اب ان کے گن اور گانے پڑیں گے۔ گرتوں کو سنبھالنا، ہارتے ہوؤں کو جتانا، کمزوروں کو طاقت بخشنا ان ہی کا کام ہے۔ اب ہماری پٹتی ہوئی سرکار کے سر پر انھوں نے ہاتھ رکھا۔"

"نہیں ایسا نہ ہوگا..... ہم سے بہت سے نہ معلوم کن مغالطوں میں مبتلا رہے اب ہماری بھی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں..... میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعی کچھ ہو ہی جائے گا ہم میں سے گنتی کے چند ہیں جو ایسی باتوں میں دلچسپی

لیتے ہیں ان میں سے نہ جانے کتنے تو واپس جا کر بھول بھال جائیں گے۔ شاید چند ایسے بھی ہوں جو کچھ یاد رکھیں۔"

"کہیں کپلنگ کی طرح یاد نہ فرمانے لگیں یہ زمانہ کپلنگ نہیں پیدا کر سکتا.... تم دیکھنا اس جنگ میں انسانیت نئی روشنی لے کر پیدا ہوگی۔ ارے ہم کہاں نکل ......گاڑی والے۔"

"باتوں باتوں میں پتہ بھی نہ چلا اور گاڑی کافی دور نکل گئی۔ گاڑی والا بھی کچھ متحیر ان دو مختلف عناصر کو ٹکراتا دیکھ کر کھو سا گیا تھا دونوں نے اتر کر ایک ہوٹل میں چائے پی۔

"ایلما کے بعد میں دوسری ہندوستانی لڑکی سے ملا ہوں...... مجھے ناامید نہیں ہوئی۔ نہ جانے کیوں ہم لوگوں سے اتنا پرہیز کیا جاتا ہے۔"

"اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ تم لوگوں کی لڑکیاں تو ہمارے لڑکوں کو قیمتی سمجھتی ہیں کیونکہ شوہر کی حیثیت سے وہ بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں انھیں وہ اپنے ہی رنگ میں سمو کر بہ آسانی زندگی گذار سکتی ہیں۔"

"تو کیا ہندوستانی لڑکیاں ایسا نہیں کر سکتیں وہ چاہیں تو یوروپین لڑکوں کو ہندوستانی بنا سکتی ہیں۔ ارے اس عورت ذات میں بڑے بڑے معجزے دکھلانے کی طاقت پوشیدہ ہے وہ چاہے تو دنیا سے یہ قوم اور نسل کا فتنہ مٹا سکتی ہے۔"

"یہ میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ اونچی نسل کو بیٹی دے دیتے ہیں۔ مگر لیتے نہیں تاکہ دھبا نہ آجائے۔"

"ہشت...... بالکل پرانی باتیں، تم سوچتی ہوگی ایسا۔ میں تو بڑی خوشی سے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"قول سے فعل مشکل ہے۔"

"مگر میں یقین دلاتا ہوں۔" رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ لہٰذا لوٹ

آئے دونوں شمن جب گھر پہونچی تو ایلما دیکھ کر مسکرا اٹھی۔

"بڑی گاڑھی چھن رہی ہے......"

"صاحب لوگ جو ہوئے نا۔ سمجھتے ہیں اس طرح ہماری عزت افزائی ہوتی ہے...... کہاں ہم خاک کے ذرّے اور کہاں وہ آفتاب عالم تاب!"

"شیلما ایسا نہیں۔"

"اجی سب ایک ہی مل کے نکلے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر کیوں گئی تھیں اس کے ساتھ؟"

"یہ دکھانے کہ ہم اتنے جاہل نہیں جتنا تمہارے بیوپاریوں نے سمجھ رکھا ہے...... ایلما جی اکتا گیا بھئی میرے لیے بھی کام ڈھونڈ دو۔"

"فوج کے دفتر میں......"

"بھئی یہ فوج دوج سے تو مجھے معاف رکھو۔ مجھے اس دوسروں کی جنگ لڑنے سے کیا دلچسپی۔"

"کیا مطلب ہے کیا چیچے کو آجانے دو گے؟"

"میری بلا سے چیچے آئیں یا چنڈھے۔"

چیچے - جاپانی
چنڈھے - چینی

"وہ لوٹ مار کریں گے کہ توبہ بھلی۔"

"اور یہ کیا کم لوٹ رہے ہیں۔ دوسرے لوٹیں گے انہیں جن کے پاس کچھ ہے اور جو آپ ہی مر رہے ہوں انھیں وہ کیا ماریں گے؟ ان ننگے بھوکے کسانوں کا نہ کسی نے اب تک کچھ بگاڑا اور نہ کوئی بگاڑ سکتا ہے اچھا ہے یہ دولت مند لٹیں تو۔"

"ارے بھائی اپنے دولت مندوں کو خود لوٹو تو ایک بات بھی ہے دوسروں سے لٹوانے میں کیا عقلمندی ہے۔"

"خود نہیں طاقت تو دوسروں کی مدد سے سہی۔"

"ارے کہیں بندر نے بلیوں میں بٹوارہ کیا ہے۔ دیکھ تو رہی ہو یہ باہر

کی مدد کا نتیجہ تاریخ گواہ ہے کہ جس کی مدد مانگی وہی ظالم بن بیٹھا اب تو جب ہی کچھ ہو گا جب ہم خود کریں گے" جب ہی

"تم دلی کے چاول بہت کم لائیں" ایلما نے ایک دم سیاست کے میدان سے گھر کی چار دیواری میں چھلانگ لگائی۔

"ملے ہی نہیں"

"لالو نے تمہیں دکان نہیں بتائی۔ ایک بنیا ہے پروفیسر کی جان پہچان وہ دے دیتا ہے جتنے بھی مانگو۔ یہ موٹے چاول سے تو گھن آتی ہے۔"

مگر یہ گھن آنے والے چاول بھی بازار سے اڑ کر نہ جانے کہاں روپوش ہونے لگے کچھ ایسا مرض پھیلا کر اندر ہی اندر چاول چاٹ گیا۔ گیہوں کو بھی گھن لگ گیا۔ گھن بھی ایسا ویسا نہیں بھنسا گھن!

"ارے اٹھو نا" ایلما نے جھنجوڑ کر جگایا روز تو وہ اسے دن چڑھے تک سونے دیتی تھی۔

"کیوں؟" شمن نے کروٹ بدل لی۔

"ارے وہ تمہارا صاحب بہادر کھڑا ہے۔"

"کون صاحب بہادر؟"

"ارے بومت، وہی ٹیلر، اٹھو نا۔"

"لعنت، تمہارا ہو گا صاحب؟"

"دیکھنا ہے" ایلما چھیڑنے کو ہنسی۔

"کیا؟" شمن اٹھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں، تو پھر اٹھتی کیوں نہیں۔"

"چڑیل!" شمن نے تکیہ کھینچ کر مارا۔

پروفیسر کو بھی لے لیا اور چاروں مل کر ٹیلر کی لائی ہوئی ٹیکسی میں روانہ ہو گئے پکنک کا ارادہ تھا۔

"ہم لوگ تو عموماً مقبروں میں پکنک مناتے ہیں۔" ثمن نے کہا۔

بخدا

"یا خدا! یہ کیوں؟" ٹیلر حیرت سے بولا۔

برکت ملتی ہے

"تاکہ برکت ملتی رہے۔"

"بھئی ہمیں لائبریری میں ضروری کام ہے۔ تم اور ٹیلر چلے جاؤ......"

پروفیسر اور ایما شاید گھر ہی سے کوئی سازش کر کے آئے تھے۔

"تو میں بھی ساتھ چلوں۔" پروفیسر کو خاموش اور ایما کو بے توجہی سے دوسری طرف دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے بات پلٹی۔ "میں گھر چلی جاؤں گی مجھے ذرا کام بھی ہے کپڑے وغیرہ ٹھیک کرنا ہیں۔"

"واقعی؟" جب پروفیسر اور ایما چلے گئے تو ٹیلر نے پوچھا۔

"کیا؟"

"کہ تمہیں گھر جانا ہے۔ اور بہت ضروری کام ہے؟"

"ہاں کیا کچھ اعتراض ہے؟" ثمن نے بھی مذاقیہ جواب دیا۔

"بہت سخت، کیوں کہ......"

"کیا؟"

"میرے ساتھ کھانا کھاؤ گی؟"

"ابھی کھانے کا وقت دور ہے۔"

"کیا عجیب جواب ہے!" وہ برا مان گیا۔ ثمن کو ہنسی آگئی۔

"ہمارے یہاں ان باتوں کو اچھی نظر* سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے تمہارے ساتھ گھومتے دیکھ کر لوگ نہ جانے کیا کہیں گے!"

"چھوڑو ان لوگوں کو...... اگر تم جیسی لڑکیاں ہی لوگوں سے ڈرتی رہیں گی تو پھر مل چکی آزادی تم لوگوں کو۔"

"گویا اسی طرح گھوم پھر کر ہی تو ہمیں آزادی جیتنا ہے۔"

"یقیناً...... جتنے ملک ان "لوگوں" کی ہیبت سے پاک ہیں سب آزاد ہیں۔"

"بے شک تم چاہو تو سب ہی کچھ کہہ سکتے ہو۔ آزاد ہو نا۔"

"چھوڑو اس آزادی کے جھگڑے کو اور تھوڑی دیر کے لیے میری رنگت قومیت کو بھول کر میری کوئی بات سننے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کرو۔ ذرا آ کے ذرا اس نفرت کو بھول جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برسوں سے پل رہی ہے۔ مورچے پر لڑنے والے سپاہی تک ایک بار سب کچھ بھول کر آپس میں انسانوں کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اتنا سوچو ایک پردیسی انسان اپنوں سے دور تمہاری مہمان نوازی کا طلبگار ہے۔"

"کی تو تھی ایک دفعہ تمہارے ہی بھائی بندوں کی مہمان داری..... بنئے بن کر آئے...... اور...."

"چھی چھی...... بڑی خراب زبان ہے تمہاری!" وہ خوش مزاجی سے ہنسا۔

"دوسرے حربے بے کار ہو جانے سے ساری تیزی اسی پر دھار رکھنے میں صرف ہو گی۔ وہ مثل سنی ہے کسو کے ہاتھ چلیں اور کسی کی جیب!"

ہوٹل کے سامنے ٹیکسی ٹھہری۔ کرایہ چھ روپے ہوا تھا مگر ٹیلر نے دس روپے دے دیے اس نے جب ریزگاری کے لئے لاچاری سے جیبیں ٹٹولیں تو ٹیلر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور چلنے لگا۔ ڈرائیور نے جھک کر ایک سلام دیا اور شمن کے غصے سے بھری نظروں کو دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کی...... گویا کہتا ہے آگئیں بھاجی مارنے کو، ہونا کلوٹی، روزانہ اتنی میموں کو لاتا ہوں وہ کچھ بھی نہیں سوچتیں۔

"یہی تو ہے وہ چال جس کی بدولت تم لوگ یہاں حکومت کر رہے ہو۔" اس نے ٹیلر سے کہا۔

"یا خدا کیا ہوا!؟"

"یہ تم نے چار روپیہ بخشش دے کر اس کی روح تک خرید لی۔"

"ارے، مگر میں نے قطعی اس خیال سے روپیہ نہیں دیا۔ بلکہ مجھے معلوم تھا وہ زیادہ سے زیادہ دو روپیہ نوٹ میں سے واپس کرتا باقی کے لیے کہہ دیتا نہیں ہے،"

اور یہ بھی جانتا ہے کہ میں کہاں نوٹ بھنانے دوڑتا پھروں گا۔ میں نے کہا جہاں دو دو ہال چار..... مصرف ہی کیا ہے ہمارے روپئے کا؟ کس کے لیے کمائیں؟"

"عیش اڑانے کے لیے جس کے لیے تم لوگ بنے ہو۔"

"یہی ہوتے ہیں ہمارے عیش، کچھ تانگوں پر کچھ موٹر پر اسی طرح سے روپیہ اڑ جاتا ہے۔" اس کے طعنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ٹیلر نے خود سے کہا۔

کھانا کچھ سونا سونا سا رہا۔ ٹیلر بڑا حساس اور خاموش سا ہو گیا۔ شمن کو بڑی خوشی ہوئی کم بخت فلرٹ کرنے کی کوشش میں اسے یہاں لایا ہے۔ ہوٹل سے وہ سیدھا اپنے گھر پہونچا گیا۔ ایلما رات گئے جب وہ سو گئی تب آئی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح جب وہ ڈرائنگ روم میں گئی تو دیکھا ٹیلر بیٹھا ایلما کو اپنا البم دکھا رہا ہے۔ معمولی صاحب سلامت ہو گئی جب ایلما دیکھ چکی تو اس نے البم شمن کو پکڑا دیا اور خود چائے لانے چل دی۔

معلوم ہوتا تھا البم نہیں کوزے میں شہر بھر دیے ہیں۔

"بم! بم!" اس کے دماغ میں گونجا، کتنا لطف آئے۔ یہ کھلونے ذرہ ذرہ ہو کر اڑ جائیں۔ پر ہندوستان کا تو یہ بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے کچی مٹی کا سینہ چیر کر کیا لطف لیا جا سکتا ہے، وہ تو انھیں گرم گرم نوالوں کی طرح نگل جائے گی۔ پر یہ عظیم الشان سربفلک عمارتیں کیوں نہ لرزیں بموں کے خوف سے؟

"تم ان عمارتوں کے لیے خود لڑ رہے ہو، پر یہیں بھی بارود کی جگہ جھونک رہے ہو۔" اس نے انتہائی زہریلے انداز سے کہا کہ ٹیلر جو پر شوق نگاہوں سے تصویروں کو دیکھ رہا تھا کھسیانا ہو گیا اور اس کا منہ اتر گیا۔

"ایں؟" شمن کو اپنی کم ظرفی پر شرم آ گئی۔ "کتنی عجیب انسان ہو! میں تو تمہیں اپنے کیمرے کی چالاکیاں دکھا رہا ہوں اور تم سیاست کو لے بیٹھیں....." وہ روٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

"سچ کہا تھا میرے ایک ہندوستانی دوست نے کہ اگر مغرب شرق سے

دوستانہ معانقہ کرنا چاہے تو وہ اسے زنا سمجھ کر پرے جھٹک دے گا۔" وہ آہستہ سے مڑ کر بولا۔

"کل سے میں برابر تمہاری جلی کٹی باتوں کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر توبہ ہے...... کیا تم سب ہندوستانی اسی ذہنیت کے مالک ہو؟ اگر ایسا ہے تو تمہارا مرض لاعلاج ہے، ہر بار تم ہاتھ مار کر دوا گرا دیتے ہو اور پھر واویلا مچاتے ہو؟"

"یہ کریس کی دوا پینے سے تو بہتر ہے ہم بیمار ہی رہیں!"

"مگر یہاں کریس کہاں ہے۔ تم سے سیاست کون بے وقوف پوچھ رہا ہے تم سمجھتی ہو کہ تمہیں سیاست سے لگاؤ ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ قطعی نہیں سیاست کو تم بالکل نہیں سمجھتیں۔ بس دوسروں پر الزام دے کر خود بچ نکلنا، یہ کہاں کا انصاف ہے مانا کہ انگریز تمہیں بھڑکاتے ہیں آپس میں لڑاتے ہیں مگر تم کیوں اتنے احمق ہو جو لڑ پڑتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے ابھی سو دو سو سال تمہیں اور غلامی کی زنجیریں گھسیٹنا پڑیں گی بے وقوف ہے وہ حکومت جو تمہیں آزاد کر دے، دشمن ہے وہ تمہاری کیونکہ تم آزاد رہنے کے قابل نہیں، اپنی حفاظت کرنا تمہیں نہ آیا ہے نہ کبھی آئے گا۔ تاریخ کے صفحے الٹو اور مجھے دکھاؤ کہ کہاں کس موقع پر تم نے دشمن کا کیسے مقابلہ کیا ہے۔ آج اگر یہ چلے جائیں تو دوسرے آجائیں گے۔ نئے سرے سے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہونا پڑے گا۔"

"ایسا ملا بھی بہت ہے جو چھین لینے کی دھمکی دیتے ہو۔"

"ارے بھئی میرے بس میں ہوتا تو کیا کچھ نہ دے دیتا۔" ایلمر نے بات کا رخ بدل کر شرارت سے کہا۔

"بس دیکھ لیا، تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، وہ آزادی بھی دیکھی جو امریکہ نے نیگرو کو دے رکھی ہے۔"

"میں بتاؤں ایک ترکیب، تم سیاست میں ٹانگ نہ اڑاؤ یہ کھیل نہیں کہ

سنی سنائی رائے پر یقین کر کے میدان میں کود پڑے۔ سخت* مطالعے کی ضرورت ہے اور میں شرط بدتا ہوں* دنیا کی کوئی عورت سنجیدگی سے مطالعہ کر ہی نہیں سکتی۔

"اور میری رائے میں عورت سے بڑا سیاست داں کوئی نہیں، وہ جو گھر میں حکومت کر سکتی ہے ملک میں بھی راج کر سکتی ہے۔ تمہارے خیال میں یہ سارے نسوانی حربے جن کی بدولت عورتیں مردوں کی کمائی، شخصیت یہاں تک کہ تخیل تک کو غصب کر لیتی ہیں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے؟"

"غلط بالکل غلط، کوئی عورت ہماری کمائی زبردستی نہیں چھین سکتی۔ ہم جیسے جی چاہتا ہے خود خرچ کرتے ہیں رہی شخصیت تو وہ عورت کی عقل سے بالاتر شے ہے رہا تخیل کی ملکہ وہ ضرور ہے۔ مگر صرف ہماری دماغی* عیاشی کے لیے۔"

"بڑے لطیف مغالطے* ہیں۔ اچھا ہے آپ لوگ انھیں مغالطوں میں مبتلا رہیں۔ جب ہی تو کمال ہے کہ بے وقوف انسان اور اپنے آپ کو عقل مند سمجھتا رہے" سیاست سے ہٹ کر گفتگو نے زندگی کے رومانی* دائرے میں قدم رکھ دیا۔

"کہا تو میں نے جہاں تک دل کی حکومت کا پھیلاؤ ہے تمہارا ہی ڈنکا بجتا ہے" ٹیلر نے ایسے واضح طور پر شمن کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہنس پڑی۔

"اور دل کی سلطنت کا پھیلاؤ چادر کی وسعت کو دیکھ کر محدود کیا جاتا ہے یا مشرق مغرب....."

"دل کی حکومت سمتوں کی پابند نہیں اس کے لیے مشرق بھی اتنا ہی حسین اور روشن ہے جتنا مغرب!" ٹیلر کی آنکھوں کی شرارت بڑھی اور شمن نے غور کیا کہ اس کی آنکھیں اتنی ٹنڈی نہیں اور بھوؤں کی جگہ بھی خاصے بال ہیں۔

اتنے میں ایلما چائے لے کر آ گئی۔ آج وہ کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ اسے بار بار کسی کے انتظار میں خاموش ہو کر بیروں کی چاپ سنتے دیکھ کر ٹیلر نے چھیڑا۔

"بڑا احمق ہے" ٹیلر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون؟" ایلما چونک پڑی۔

"پروفیسر!"

ایلما جھینپ گئی۔ شمن نے دیکھا کہ یہ رنگین نسوانی جذبہ اس کے چہرے کو نرمی اور شیرینی سے منور بنا گیا۔ وہ کرخت اور خشک ایلما گویا موسم بہار کی آمد سے شگفتہ ہوتی جا رہی تھی۔ "وہ اس کی باغیانہ آنکھیں ایک اطمینان بھری امید میں ڈوبی ہوئی پہلے سے زیادہ بڑی اور جاندار معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے پھونک مار کر ان پر سے برسوں کی پڑی ہوئی گرد جھاڑ دی ہو۔" اتنے میں پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتے آن پہنچے۔ ان کی زرد پیشانی دھلے ہوئے شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

"ہم لوگ دلی جا رہے ہیں۔" انھوں نے بچوں کی طرح کہا۔

"مبارک ہو" ٹیلر نے جوش سے پروفیسر کا ہاتھ جھٹکا

"ایں!" شمن بے وقوفوں کی طرح دیکھتی رہی۔

پھر ایلما نے اسے بتایا کہ آخر کو پروفیسر نے اسے اس تاریک بل سے کھینچ ہی نکالا جس میں وہ خوف زدہ ہو کر جا چھپی تھی۔ ان کی دوستانہ ہمدردی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پریشانیوں کا تھوڑا سا بوجھ ان کے کاندھوں تک پھیلا دے۔ پروفیسر ابتدائی تعلیم پر ریسرچ کر رہے تھے انھیں ویسے بھی اپنی اسکیم کو عمل میں لانے کے لیے ایک مددگار کی ضرورت تھی ویسے اگر کوئی کہتا کہ انکی اپنی نجی زندگی میں ایلما کا وجود کارآمد ثابت ہو سکتا تھا تو یہ بات مشکل سے یقین آتی۔ پروفیسر کچھ عجیب گھریلو انسان تھا۔ خود وہ اپنے وجود میں کہیں نمایاں نظر نہ آتا تھا۔ شاید وہ ان کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے ایلما کو مفید سمجھتا ہو جو اسے اپنے جسم سے زیادہ عزیز تھیں یہ ایلما کا کہنا تھا۔

"میں عرصے سے تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہوں۔" پروفیسر نے صرف اتنی بات کو بار بار دہرایا۔ "اور یہ ضرورت اسی طرح محسوس ہوتی رہے گی جب تک کہ اسے پورا نہ کیا جائے گا۔"

"میں اس کے اطمینان اور سکون سے تھوڑا حصہ اپنے لیے چرا لوں گی اور وہ مجھے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔" ایلمانے کہا۔

شمن کے جانے کے سوال کو ایلمانے ایک سرے سے سنا ہی نہیں۔

"تم چاہتی ہو میں نہ جاؤں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"نہیں بھئی یہ کیسے کہہ سکتی ہوں..... مگر ......"

"تو اتنے دن کی دیکھ بھال تمہارے سپرد!" ایلما نے بات کاٹ کر کہا۔ "ذرا باورچی کو دن دن بھر تاش مت کھیلنے دینا اور آس پاس کے غنڈوں کو جمع نہ کرنے پائے۔ پچھلی دفعہ میں ایک دن کو گئی رات کو لوٹ تو جوا خانہ بنا ہوا تھا گھر....." ایلما نے بات گھٹتے سمجھا۔

"مگر ایلما آخر مجھے جانا تو ہے ہی۔" وہ ڈری کہ ایلما منزل کا نشان نہ پوچھ بیٹھے۔

"تو پندرہ دن میں گھس نہیں جاؤ گی۔"

"مجھے نوکری کے لیے بھی تو کوشش کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں کر لینا۔ ذرا پہلے چل کر سامان تو درست کر دالو۔"

"پروفیسر کہہ رہا تھا کہ....." کپڑے رکھتے رکھتے ایلما ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا۔ کہو نا بن کیوں رہی ہو۔"

"او ہو شرم آ رہی ہے۔"

"ہشت، میری بات تھوڑی ہے۔ وہ تو ٹیلر کو کہہ رہا تھا۔" شمن کے کان کھڑے ہوئے۔

"کیا؟"

"کہ..... کہ..... اچھا آدمی ہے ٹیلر ہے نا؟ مجھے تو وہ انگریز لگتا ہی نہیں ....."

"ہاں..... وہ آئرش ہے....... مگر یہ کیسے کہ وہ لگتا نہیں؟"

"اس کی باتوں سے، شمن اگر ہم ایسے انگریزوں سے بھی ملیں تو ان سے

"ایسے سے تمہارا کیا مطلب؟"

"ایسے سے میرا مطلب جیسا ٹیلر ہے۔"

"بڑی گدھی ہو......"

"اونہہ بنومت تم خود دیکھتی ہو کہ وہ اور سفید چمڑی والوں سے مختلف ہے۔"

"مختلف ہو سکتا ہے مگر یہ خصوصیت ان کی جبلت پر اثر نہیں ڈالتی۔ بہت سے سانپ کاٹتے نہیں مگر نگل جاتے ہیں رہے تو پھر بھی سانپ۔"

"ارے تو نگل ہی گیا آخر۔" ایلما بڑے زور سے ہنسی۔

"پاگل ہو گئی نا۔ ارے چل وہ مجھے کیا نگلے گا۔"

"مگر تو اسے ضرور نگل گئی...... پروفیسر کہہ رہا تھا کہ....."

"لعنت تیرے پروفیسر پر کہ...... اس کے سوا کچھ نہیں کہتا....."

"تمہیں جیسے کچھ نہیں معلوم؟ ہنہ مجھ سے بنتی ہے...... ڈرائنگ روم میں وہ کوئی چپکے چپکے تو بول نہیں رہا تھا۔"

"ارے وہ تو مذاق کر رہا تھا۔"

"میں اسے تین سال سے جانتی ہوں وہ ایسے مذاق کرنے کا عادی نہیں عجیب انسان ہے خیر جی اس میں بات ہی کیا ہے وہ تمہیں پسند کرتا ہے تو اس میں گناہ کون سا ہے۔"

"گناہ کیوں ہوتا۔ سچ بتانا ایلما کیا تمہیں پسند ہے وہ۔"

"ٹیلر؟...... حد سے زیادہ۔"

"ٹیلر کی خصوصیت سے بات نہیں کر رہی ہوں...... دراصل مجھے تو اس سفید چمڑی سے ہی گھن آتی ہے۔"

"سفید چمڑی میں اگر سرخ دل ہو تو؟"

"ہوا کرے...... وہ ہم کالوں کے مذاق سے بہت مختلف ہے۔"

"وہ اتنا بدرجیا تو سفید ہے بھی نہیں...... ہمارے یہاں اس سے
کہیں گورے آدمی ہوتے ہیں مگر ان سے ہمیں گھن نہیں آتی پھر آخر اس میں کیا
بات ہے؟"

"خیالات، ہمارے دل نے ان سب یورپ والوں کو بھوت بنا کر نفرت
شروع کر دی ہے...... ذرا بند کرو اور صندوق کپڑے بہت ٹھنس گئے۔"

دونوں مل کر صندوق بند کرنے لگیں۔ ایلما بڑے جوش و خروش سے سامان
باندھ رہی تھی۔ آزاد چڑیا کی طرح دھیمی آواز میں کوئی ہلکا پھلکا راگ گنگنانے لگتی
اور پھر کسی سوچ میں ڈوب جاتی شاید ماضی بار بار اسے کچوکے دینے کے لیے ابھر
آتا تھا جسے وہ اپنی قوت ارادی سے دور جھٹک پھینکتی۔

صبح ہی صبح ٹیلر ملٹری کا ٹرک لے کر آن پہنچا مزدوروں کی طرح سامان بھرتا
رہا جب چائے پینے بیٹھا تو اس نے بتایا کہ دو روز بعد وہ بھی روانہ ہونے
والا ہے وہ کچھ غمگین تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ دیکھ رہا تھا کہ شمن نے بھی
یہ بات سنی کہ نہیں۔

"سنا شمن ٹیلر بھی جا رہے ہیں۔" ایلما نے شمن کو ٹالتے دیکھ کر نہایت
بھدے پن سے کہا۔

"اُہو...... بڑا افسوس ہے۔" شمن نے بڑے تپاک سے کہا۔

"مہربانی ہے اس قدر صدمہ لوگوں کو نہ پہنچاؤ۔" ایلما ٹیلر نے طعن سے کہا
اور شمن بھی تکلف سے مسکرا دی۔

"بھئی دیر نہ ہو جائے۔" پروفیسر بڑے بڑے چائے کے گھونٹ پینے
لگے۔

"اچھا خدا حافظ شاید پھر ہم نہ مل سکیں۔" ٹیلر نے بڑے تکلف سے کہا
اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"بنو مت ٹیلر" ایلما نے جل کر کہا۔

"مگر تم تو پرسوں جا رہے تھے۔" اس نے مصافحے کے لیے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور بڑی معصومیت سے نمک دانی پیش کر دی۔

"شکریہ....." اس نے بگڑ کر ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔

"ارے میں کبھی تم نے نمک مانگا!"

"زخموں پر نمک...... خوب خوب...... بھئی واہ" پروفیسر نے قہقہہ لگایا

"واقعی تم میں کسی نمک کی ضرور کمی ہے...... بدمذاق ہو ٹیلر" ایلما نے اٹھتے ہوئے اس کا کندھا ہلا کر کہا۔

ایلما کی گاڑی روانہ ہو گئی تو ٹیلر نہایت خاموش موٹر چلاتا رہا معلوم ہوتا تھا وہ بڑی تن دہی سے اسے گھر پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر موٹر کی رفتار ضرورت سے زیادہ دھیمی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"پونا" منہ موڑے موڑے جواب دیا۔

"اچھی جگہ ہے؟"

"بہت، جنت ارضی"۔ ٹیلر نے جل کر کہا۔

"بہت خوش نصیب ہو۔"

"شکریہ!"

"کیا پٹرول ختم ہو گیا" شمن نے موٹر کی سستی کو ٹوکا اور ایک دم سے ٹیلر نے اسپیڈ اتنی بڑھا دی کہ معلوم ہوا موٹر الٹ گئی۔

"آخر مطلب کیا ہے" شمن نے زبردستی غصہ ہونے کی کوشش کی۔

"یہ کہ ہم انسان نہیں...... بھرے کے ٹکڑے ہیں چند بھیڑیوں کی خود غرضی اور مکاری نے پوری قوم کے منہ پہ کالک مل دی اور اس حد تک کہ اب کوئی کوشش اسے نہیں مٹا سکتی۔"

"کچھ تو ان بھیڑیوں نے ایسا دماغی دکھ پہنچایا ہے جس نے اس حد کو پہنچا

دیا۔"

"مانتا ہوں...... مگر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔" شمن نے بہ مشکل اسے سمجھایا۔"

"تو کیا واقعی تمہارے دل سے میرے لیے نفرت نہیں مٹ سکتی۔" ٹیلر نے بڑی نرمی سے کہا۔

"نفرت تو نہیں ہے مجھے۔" شمن نے جیسے خود کو بتایا۔

"تو پھر تم صرف مجھے جلانا چاہتی ہو۔" وہ مسکرا دیا۔ "جی چاہتا ہے اسی بات پر موٹر لڑا دوں کسی پیڑ سے۔" اس نے موٹر کی رفتار دھیمی کر دی۔

"ہمارے دل دکھے ہوئے ہیں۔"

خصوصاً اس اگست کے واقعے کے بعد سے۔" ٹیلر نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"تم بھی یہ سوچتے ہو کہ یہ سب فساد کانگریس نے کروائے....."

"ہاں اور کانگریس قابلِ مبارک باد ہے۔" شمن پھر بے اعتباری سے بھڑکی۔ "اتنے مجبور اور نہتے مگر وہ سے اتنا پرجوش اظہار ایک معجزہ سا معلوم ہوتا ہے۔ لاٹھیاں بھی تو پوری نہیں۔"

"تو تمہارے خیال میں یہ بے وقوفی نہ تھی۔"

"آزادی سے محبت رکھنا اگر بے وقوفی ہے تو اس کے پانے کے لیے جدوجہد کرنا بھی بے وقوفی ہے۔"

"مگر حماقت تو تھی اس طرح اودھم مچا دینے اور بے موت مرنے سے آزادی نہیں ملا کرتی۔" وہ اس سے جواب مانگنا چاہتی تھی۔

"آزادی کی دیوی بھینٹ چاہتی ہے اور اگر اسے رام کرنا ہے تو ایسی ایسی لاکھوں قربانیاں دینی ہوں گی جو کچھ ان سرپھرے جوشیلے بچوں نے کیا وہ واقعی

بہت معمولی نظر آتا ہے کیونکہ جو کچھ ہوا بے ترتیبی سے اور بد انتظامی سے ہوا اگر یہ قربانی باقاعدہ دی جاتی تو آزادی کے میدان کا تھوڑا بہت حصہ ضرور ہاتھ آجاتا۔"

"مگر یہ گاندھی جیسے لیڈر بھلا ہماری جنگ آزادی میں کیا رہنمائی کریں گے اہنسا ہنہ کہیں اہنسا سے بھی ملک جیتے گئے ہیں۔" وہ خود اپنی مخالفت کرنے لگی۔

"گاندھی ہی نہیں اگر اس وقت چنگیز خاں بھی ہوتا۔ ایسے کہ ہاتھ میں تنکا نہیں تو وہ کیا کر لیتا دیکھا نہیں تم نے کچھ نہ کرنے پر تو یہ سزا ملی اور کہیں ہاتھ بھی ہلا دیتے تو صاف انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔"

"ہنہ ہیں بھی کس کام کے یہ لیڈر..... کچھ کیا ہے انھوں نے آج تک، بلا سے مر جائیں تو سچے لیڈر پیدا ہوں۔"

"لیڈر انڈا پھوڑ کر نہیں نکل آتے۔ اگرچہ تمہارے یہ لیڈر کچھ نہیں کر رہے مگر پھر بھی ان کا خاموش ضد عوام کے جی میں ڈھارس بندھائے ہوئے ہے آزادی کی خواہش نہیں مری گو جیل میں جانے سے بہت کچھ عوام پر سے ان کا بھروسہ اٹھ گیا..... بہت سے ناامید ہو کر منکر ہو گئے چڑ کر بگڑ بیٹھے مگر پھر بھی ایک زمانہ آئے گا جب وہ محسوس کریں گے کہ ہمارے لیڈر فضول نہیں بلکہ مجبور تھے۔"

"تو پھر یہ جیل میں کاہے گئے ہی کیوں؟ کیا قوم کی خدمت کی؟" شمن نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"بہت بڑی خدمت کی جو کچھ وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے ڈرامے کے ذریعے دکھا دیا۔"

"ایں؟" شمن نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

"کہ ظالم جب ضد پر آجاتے ہیں تو وہ کیا نہیں کرتے وہ نفرت جو ان کے اس فعل سے اس وقت عوام کے دل میں پیدا ہو گئی ہے اسے کوئی مہربانی کوئی رعایت دور نہیں کر سکتی۔ اگر اس وقت حکومت تمہارے اوپر یہ مظالم نہ کرتی تو تم اس کے

ضرور گن گاتے رہتے اور آزادی کی وہ لگن جو آنے والی پود کے دل کو لگے گی وہ ایک ایسی چیز ہوگی کہ...... ارے ہم کدھر نکل آئے؟ ٹھیرو کار موڑنے دو۔"

ٹیلر نے اسے گھر پر اتار دیا اور شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ابھی دھوپ کافی تھی جو بیرے نے آکر کہا کہ وہ آگیا۔

"ارے اتنی جلدی؟" وہ ہلکے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ بخار ہے۔

"بخار ہے کیا؟"

"شاید یہاں ہر وقت بخار ہی کا لطف آتا رہتا ہے چلو جلدی چلو پکچر دیکھیں گے..... اور وہ...... وہ لگالینا سرخ بوندا!" اس نے ابروؤں کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہا۔

"اچھا بندی؟"

"ہاں ہاں!" اس نے زور زور سے سر کو جھٹکا۔

"کیوں؟"

"اچھی لگتی ہے" اس کی سرخ تھکی ہوئی آنکھیں ہنستے ہیں بالکل غائب ہوگئیں اور دانت چمک اٹھے۔

بجائے پکچر جانے کے وہ ہوٹل میں بیٹھے کافی پیتے رہے ٹیلر نے بتایا کہ اس کی منگیتر جسے چھوڑتے وقت اس کا دل ٹوٹ گیا تھا اسے یک لخت بھول گئی۔

"اس نے میرے خطوں کا جواب بھی دینا بند کر دیا۔" اس نے افسردگی سے کہا "ہم یہاں میدان جنگ میں وطن سے دور ایک ان کی یاد میں زندگی کی گھڑی گذارتے ہیں اور وہ جھوٹے موٹے کو بھی ہمارا دل رکھنے کی کوشش نہیں کرتیں۔"

"کوئی گھڑی کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب وہ ہمارے خیالوں سے دور رہتی ہوں مگر...... یہ بے وفا عیش کی متوالیاں ہمیں انسان ہی نہیں سمجھتیں۔" شمن خاموش سنتی رہی۔

"تمہیں اب بھی اس لڑکی سے محبت ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔
"محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ یوں تو مجھے لفظ لڑکی سے ہی شدید محبت ہے۔"
وہ پھر شرارت سے مسکرایا۔ "گذشتہ چند سالوں نے اور بھی کمزور بنا دیا ہے......"
گھنٹوں بکواس کرکے جی ذرا ہلکا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بچپن اور اپنی ماں کی باتیں بتاتا رہا۔ اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور بہن کو پیار بھری ملامتیں بھیجنے میں لطف آتا تھا وہ بہت شریر مگر پیاری تھی نیز ارد گرد لڑکے لگا رکھے تھے اور ٹیلر کو بدھو سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ سے جھینپو تھا۔
دوسرے دن ٹیلر اتنی صبح آیا کہ شمن کو اسے گھنٹہ بھر بٹھائے رکھنا پڑا۔ نہا دھو کر جب وہ باہر نکلی تو وہ لان پر جانے کی کشتی کے قریب لیٹا ہوا تھا۔
"میں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ کل صبح جا رہا ہوں۔"
"خدا حافظ!" شمن نے جواب دیا۔
"اوہ...... بس تمہیں اتنا ہی کہنا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یہ بھی پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ کہاں جا رہا ہوں...... ویسے نہیں تو رسماً ہی سہی۔"
"تمہیں رسم وراہ بڑھانے کی ضرورت ہے؟"
"ہوں، ٹھیک کہتی ہو۔" وہ گھاس پر ماتھا ٹیک کر اداسی سے بولا۔
"رات کو سائیکل پر چلیں۔"
"رات کو؟"...... "بھئی مجھے رات سے ڈر لگتا ہے۔" اسے برا مانتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بولی۔ "اگر تمہیں شام کو فرصت ہو تو چلو گھوم آئیں......"
"سنو باورچی سے کوئی مزے دار کھانا منگواؤ۔ گرمی نے زبان بھی تو سن کر دی ہے۔"
"مرچیں کھاؤ گے۔"
"ہاں۔" اس نے سر ہلایا اور زور سے آنکھیں ہتھیلیوں سے بھینچنے لگا۔
"کیا سوئے نہیں رات بھر؟"

"نہیں۔" وہ روٹھ کر بولا۔ "نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تم مجھے پسند ہو لیکن...... میں اسے محبت نہیں بلکہ کوئی سخت بے رحم اور تکلیف دہ مرض کہوں گا۔"

"معلوم ہوتا ہے لو لگ گئی۔" شمن بات ٹالنے کو زور سے ہنسی۔

"کیا ایسی کوئی بیماری ہے ہندوستان میں، جس میں شدید ترین محبت وبالِ جان بن جائے؟"

"ہاں لو کی طرح یہاں عشق کی لو بھی چلتی ہے۔ مگر آج کل نہیں، وہ برسات کے دنوں میں جب کالی گھٹائیں گھر کر آتی ہیں۔ کوئلیں کوکتی ہیں اور پپیہے شور مچاتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے خزاں کا کوئی مرض لگ گیا ہوگا؟"

"ہو سکتا ہے۔ کافی خطرناک مرض ہے۔ تم بھوتوں میں یقین کرتے ہو؟"

"میں ــــ؟ ہشت! تم بھی نہیں کرتیں۔ مگر یہاں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں صرف بھوت رہتے ہیں۔ تم نے وہ مرگھٹ دیکھا ہے وہاں کھوئے ہوئے انسانوں کی روحیں صدیوں سے بھٹک رہی ہیں، ہڈیوں کے ڈھیر رات کو جاگ اٹھتے ہیں اور ہر آنے جانے والے کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔"

کسی کا روپ بھر کر نا، مثلاً تمہارے روپ میں!

"ہاں۔" دونوں ہنس پڑے۔

"اگر میں تم سے شادی کے لیے کہوں تو؟"

"تو؟ ......تو...... ارے تم نے جو اچھی مرچوں دار کھانا منگوانے کو کہا تھا...... منگواؤں؟" اس نے چاہا مذاق اڑا دے۔

"میں سوچتا ہوں ہم اور تم مل کر انسانیت کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر اس کے لیے شادی ضروری ہے؟" اسے سنجیدہ ہونا پڑا۔

"ایں؟...... مجھے نہیں معلوم، مگر نہ جانے کیوں میرا خیال ہے کہ ـــــ ہم دونوں
ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں، کیوں؟"
"جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ۔ میں تو ہندوستانی ہوں اور یہاں کے موسم
کی عادی ہوں مجھے لو بھی نہیں لگی۔"
"بکومت، تم محبت نہیں کر سکتیں کیونکہ میں سفید ہوں۔"
"ہمارے ملک میں تم سے بھی زیادہ سفید انسان ہیں ہم ان سے محبت بھی
کرتے ہیں اور شادی بھی۔"
"تو اگر مجھ سے شادی کرو تو بعد میں محبّت کر سکو گی۔ میرا مطلب ہے اگر کوشش
کرو تو۔"
"مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا نہیں آتی۔"
"تم میں اتنی ہمّت ہے کہ مجھ سے شادی کر لو"
"کہہ نہیں سکتی۔"
اتنے میں باورچی پھلکیاں اور چٹنی لے کر آ گیا۔ ٹیلر نے ڈھیر ڈھیر سی چٹنی
لگا کر تیزی سے کھانا شروع کر دیا۔ مارے مرچوں کے ناک آنکھ سے پانی بہہ
نکلا اور منہ کچے گوشت کی طرح لال بھبھوکا ہو گیا۔
"تمہارے سوال کا جواب مل گیا؟"
"ایں؟" وہ بچوں کی طرح ناک پونچھ کر بولا۔
"یہ مرچیں کیا کہتی ہیں؟"
"کہتی ہیں...... کہ تم...... تم بے وقوف ہو شم شم" اس نے پہلی دفعہ اس کا
نام لیا وہ بھی بگاڑ کر۔
"اتنا بڑا جوا کھیلتے ڈرتی ہو؟" اس نے طعن سے پوچھا۔
"جوا!" شمّی کا دل نامعلوم مسرت سے چونکا۔ "زندگی کا لطف اونچے اونچ
داؤں لگانے میں ہے۔" اس نے جیسے خواب میں دہرایا۔

"ہمت ہے اتنی" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ہمت تو کچھ ایسی مہنگی چیز نہیں۔ مگر تم یہ سٹّا کیوں لگا رہے ہو؟"

"میرے لیے یہ سٹّا نہیں مجھے ہندوستان سے لگاؤ ہے۔ اسے زخمی دیکھ کر میرا دل دکھ رہا ہے مجھے وہ دنیا کا ایک عضو نظر آرہا ہے۔ اس دنیا کا ایک ٹکڑا جو میری ہے......"

"زندگی کی طرف سے تمہارا رویّہ بھی صرف شاعرانہ ہے تم جانتے ہو یہ سٹّا ہے مگر اس کے نتیجے کا خوف ابھی سے تمہارے خون کی حرکت تیز کیے دے رہا ہے اس خوف میں بڑی لذّت ہے مگر تمہیں اس لذّت کا کہاں سے چسکا پڑا۔" شمن نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دور الٰہ آباد کے کیمپ میں جو اس نے خوفی وعدہ کیا تھا۔ اس کی لذّت اب تک اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔

"تم میری فکر نہ کرو۔"

"میں نہ کروں گی تم خود ہی کر لوگے۔ تم پچھتاؤ گے۔"

"میں؟"

"ہاں...... اور ابھی یہاں سے جا کر تم اپنی ہر بات کو یاد کر کے شرمندہ ہوگے یہ نشہ زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔"

"کیسا نشہ؟"

"خود فریبی کا نشہ کہ یہ تم عجیب و غریب بات کرنے جا رہے ہو۔ میں ہندوستانی تم......"

"چپ رہو...... میں تمہارے اور اپنے درمیان کسی دنیا کو نہیں لانا چاہتا ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اور تم قریب تر ہو جائیں...... میری ماں بڑی اچھی ہیں وہ بہت خوش ہوں گی" وہ ایک دم جھک کر بولا۔ "ہم ساتھ سارے یورپ کا سفر کریں گے...... اوہ...... کتنا لطف آئے گا۔ یہ کمبخت لڑائی ختم ہو جائے گی تو پھر سے پڑھائی شروع کر دوں گا تم بھی وہاں کوئی ڈگری لے لینا...... پھر ہم دونوں

ہندوستان آکر......"

"ارے بڑے تیز ہوا باز ہو، دم بھر کی سیر کر کے لوٹ بھی آئے؟"

شمن زور سے ہنسی اور ٹیلر بھی کھلکھلا اٹھا۔

"چلو ذرا باہر چلیں نا......" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا دو ننھے بچوں کی طرح وہ قہقہے لگاتے دیوانوں جیسی باتیں کرتے دور تک نکل گئے۔

"تم ہاں کہہ دو اور ہم اپنی جنت میں......" زور سے ایک لاری گذری اور دھول کے پھنکے اس کے ہنستے ہوئے حلق کو گھونٹ گئے، بات ادھوری چھوڑ کر وہ شمن کے کندھے کا سہارا لے کر کھانسنے لگا مسافر اس عجیب و غریب سین کو آنکھوں میں جذب کرنے کے لیے لاری میں سے لٹک لٹک کر جھانکنے لگے۔

"دیکھا تم نے؟" شمن نے تلخی سے کہا۔

"میں ان کتوں کی پرواہ نہیں کر سکتا۔ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔" وہ بھی جھلا کر بولا۔

کمرے میں پہنچی تو وہ سارے قہقہے جو تھوڑی دیر قبل شگوفوں کی طرح دل میں پھوٹ رہے تھے یک لخت مرجھا گئے۔ جیسے کسی نے بٹن دبا کر بجلی غائب کر دی، وہ خاموش پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بار بار اس کے شانے میں کوئی چیز چبھتی جیسے کوئی رگ چڑھ گئی ہو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"انتہا!" اس نے سہم کر جواب دیا۔

"کوئی راستہ؟"

"ناممکن، خضر بھی بھٹک رہے ہیں۔"

"علاج؟"

"کوئی نہیں۔"

"دعا؟"

"بے کار!"

جلدی سے اس نے اٹیچی میں وہ ساڑیاں ڈالیں۔ کوئی تو گاڑی جا رہی ہوگی کہیں، دنیا کے کسی کونے میں، بس یہاں سے دور۔ سامان پھر آتا رہے گا۔ ویسے بھی کیا سامان خانہ بدوشوں کا؟"

"کیا حماقت ہے؟ ایسا بھی کیا خوف؟ ہشت، کیا نگل جائے گا وہ تمہیں، کہہ دو صاف صاف دن اور رات کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

[illegible] ابھی تو [illegible] تھی۔ امی [illegible] دماغ شاید [illegible] تھا۔

اس نے اٹیچی دور پھینکی۔ دیر تک ایمالی کتابیں درست کرتی رہی پھر لیٹ کر سو گئی جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا باہر سے نے کہا ٹیلر آیا ہے جلدی سے ساڑھی لپیٹ کر باہر آ گئی۔

"کیا ہے رونی؟"

"ادھر..... ادھر آ جاؤ....." وہ سہما ہوا اور پریشان تھا۔ چہرہ بہت لمبا اور زرد ہو رہا تھا۔ بار بار سگریٹ جھاڑنے کے بہانے وہ ہاتھوں کی لرزش کو چھپا رہا تھا۔ برساتی سے نکل کر دونوں گھاس پر پہنچ گئے۔

"میں..... میں سوچتا ہوں۔ میں نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔"

"کیا بات ہے؟"

"ہا..... یہی....." وہ بری طرح گھبرا گیا۔

"رونی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میں بچہ نہیں اور نہ ہی تم ننھے ہو۔ ہم یہ شادی کیوں کر رہے تھے؟ صرف اس لیے کہ ہم دونوں مل کر بہت کچھ دنیا میں کر سکتے ہیں اس میں محبت کو دخل نہیں۔"

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔"

"میں..... میں آج تک محبت کو نہیں سمجھ سکی اور اب تو میں نے اس فضول مسئلے پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ٹیلر غور سے اس کا منہ تکتا رہا۔

"میں تمہیں محبت کرنا سکھا دوں گا۔" اس نے شمن کا ہاتھ ہمدردی سے

دبایا۔

"سکھا دو گے؟" وہ زور سے ہنسی۔ اس کی آواز میں تلخی اور خوف کے ملے جلے ساز بج اٹھے "محبت سکھائی نہیں جاتی۔ یہ ایک احساس ہے جو پیدا ہوتا ہے پروان چڑھتا ہے اور...... اوہ چھوڑو اس قصے کو...... تو دیکھو کوئی ایسی حماقت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

"حماقت کیوں کہتی ہو۔"

"یاد ہے وہ لاری...... جو ہمارے پاس سے گذری تو لوگ ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہم تبدہ ہوں۔ مگر انسان بننے کی جرأت کر رہے ہوں۔"

"مگر میں تو ان کی پروا نہیں کرتا۔" وہ دانت بھینچ کر چیخا۔

"تو تم غلطی کرتے ہو، قدرت سے جنگ کرتے ہو۔"

"مگر یہ ایسی انہونی بات تو نہیں۔ ہزاروں سفید لڑکیاں ہندوستان میں مسرت کی زندگی گذار چکی ہیں اور گذار رہی ہیں۔ کیا وجہ کہ میں اور تم خوش نہ رہیں۔

"لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک بار ایک عورت اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے تو خواہ اسے کتنا نیچے اترنا پڑے۔ وہ وہیں اپنا گھر بنا بیٹھتی ہے مگر مرد؟ مرد بڑا نازک مزاج ہوتا ہے ذرا سی بات پر چڑ کر نکل جاتا ہے۔"

"مگر......"

"ہم تم ملے...... زندگی کے تجربات میں عظیم الشان...... اضافہ ہو گیا۔ سنو تم کل ہی واپس لوٹ جاؤ...... ارے ہاں۔ میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہاں جا رہے ہو۔"

"واپس ہونا......"

"صبح گاڑی جاتی ہے۔ میں تمہیں خدا حافظ کہنے پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو۔ دیکھو ہماری دوستی ختم نہ ہوگی۔" اس نے شیلا کو سر سے پکڑ کر گہری سانس بھرتے دیکھ کر

سہارا دیا۔

"ہماری دوستی بڑی کارآمد ثابت ہوگی مجھے ہی نہیں پورے ہندوستان کو تم جیسے دوست مل جائیں تو بھاگ کھل جائیں۔"

"تو تم صبح آؤ گی؟ اسٹیشن پر۔" شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے التجا کی۔

"ضرور۔"

سمجھا بجھا کر واپس لوٹی تو معلوم ہوا سر پہ لدا ہوا بھاری بوجھ پھینک آئی۔
سورداس جی ایک بار رسّی کے دھوکے میں سانپ پکڑ کر بیوا کے مکان پر پہنچ گئے تھے۔ کیا دنیا میں ایسے بھی جذبے موجود ہیں جو ہمیں اس حد تک اندھا بنا سکتے ہیں؟ مذہب

ہلکی پھلکی غبارے کی طرح مگن وہ پلنگ پر جا پڑی۔ جیسے کسی نے بال و پر کے جھٹکے سے آزاد کر دیا مگر نیند نہ آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ غبارے کی ڈوری جڑ سے ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ دور خلا میں اڑتا چلا۔ کدھر؟ کہاں؟ ہوا بھی تو نہیں چل رہی۔ کہ کوئی رخ کا اندازہ لگا سکے۔

ایک دم نہ جانے کدھر سے بادل اٹھے۔ نہ گرجے نہ چمکے بس برس ہی نکلے۔ نہ جانے کب سے گھٹے ہوئے پرنالے بہہ نکلے تکیے میں منہ گھونٹ کر وہ ہچکیوں میں ملی ہوئی آنسوؤں کو جذب کرتی رہی۔ اسے نہیں یاد تھا وہ کب روئی تھی اور آج جیسے پہلی بار ضبط کا چٹیل بند ایک ننھی سی چوٹ سے پھٹ پڑا اس کا رواں رواں بلک بلک کر سسکیاں بھرنے لگا۔ تنہا ہمدم غنودگی نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور آہیں گہری سانسوں میں ڈوب گئیں۔

صبح اس کی آنکھ بجائے سات بجے کے آٹھ بجے کھلی۔ ایک اطمینان بخش دھچکے سے اسے یاد آیا کہ ٹیلر جا رہا ہوگا۔ ریل کا انجن اسے ہر لمحہ اس سے دور تر گھسیٹے لے جا رہا ہے۔ بُعد دم بدم بڑھ رہا ہے اور کچھ ہی دن میں یہ اتنا لامتناہی ہو جائے گا کہ ناپے نہ نپے گا۔

رات کو مچل جانے والی بچی کو ملامت کرتی وہ اٹھی۔ نیم گرم پانی سے غسل کیا تھکے ہوئے اکڑے ہوئے کندھے بھینچ کر اس نے رہی سہی سستی کو بھی جھٹک دیا۔ بڑی تیز بھوک لگ رہی تھی۔ رات وہ کھانا بھی تو بھول گئی۔ باورچی نے نہ جانے کیا کیا تھا اور پتہ نہیں اس

نے کیا جواب دیا تھا۔ توبہ ہے کہیں بیرے نے اس کی سسکیاں نہ سن لی ہوں۔ ناشتے کے بعد وہ دیر تک بیٹھی ٹوکری میں سے چلغوزے اور بسکٹ کے ٹکڑے چن چن کر کھاتی رہی۔ اسی ٹوکری میں سے کل اس نے اور ٹیلر نے لان پر بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا کتنا لاپروا تھا ٹیلر! کالر ٹنگ تھا تو اوپر کا بٹن نکال کر اس نے جنوں کی پڑیا میں گرا دیا تھا نیچے کا حصہ کدھر گیا۔ دو انگلیوں کے سرے سے بٹن کو پکڑے وہ پھراتی رہی اور پھر اسے اپنے بٹوے کی ننھی سی جیب میں ڈال دیا۔

آج وہ کیا کرے جو یہ لمبا چوڑا دن کٹے۔ معلوم ہوتا تھا ہندوستان کی زمین ہی ختم ہو گئی اور ہے بھی کیا اس کھنڈر میں؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ خیر اس وقت تو بازار کا ایک چکر بُرا نہ رہے گا

کمرے میں تالہ لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کنجی چھوٹ پڑی! ٹیلر کا بھوت مع اپنی تمام مردنی کے دیوار سے سہارا لیے کھڑا تھا۔

"تم جھوٹ بول گئیں۔ اسٹیشن پر نہیں آئیں" اس نے روٹھے ہوئے انداز میں نخرہ کر کہا۔

"ہیں؟ تو اس لیے تم نہیں گئے"۔

"اس نے نیم مردہ مسکراہٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مگر......"

"لعنت ہے اس اگر اور مگر پر!" وہ زور سے بھونکا۔

کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلر نے بتایا کہ وہ صبح چھ بجے اسٹیشن پہنچ گیا تھا شمن کا جی دکھ گیا۔

"چھ بجے......مع تمام اسباب کے؟"

"نہیں" وہ شرارت سے مسکرایا اور شمن کے بگڑنے پر زور سے چلّایا۔

مجھے معلوم تھا تم ہندوستانی بڑے دھوکے باز ہوتے ہو اور تم ضرور دھوکا دوگی اس لیے سامان لاد کر لے جانا......وہ زور سے ہنسا۔

"دیکھو روفی۔"

"چپ رہو کچھ نہیں دیکھتا میں...... تم عورت نہیں پتھر ہو تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں پھر بھی...... پھر بھی تم مجھے ٹھکرا دیے جا رہی ہو۔ بس ہو چکی تمہاری نصیحت...... اور ہاں تمہیں یہ بھی بتانے آیا ہوں کہ اب میں پونا واپس قطعی نہیں جاؤنگا۔"

"تو میں جا رہی ہوں شام کو۔"

"چلو...... سات بجے کی گاڑی ہے۔" وہ مسرت سے بولا۔

"چلو سے کیا مطلب گویا آپ بھی...... دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔"

"دماغ سلامت ہوتا تو کہنا ہی کیا تھا۔ کچھ کھانے کو منگاؤ۔"

"کھانے کے کمرے میں چلو۔"

"نہیں ہم تو یہیں کھائیں گے۔" اس نے بستر پر لیٹ کر کہا۔

"ٹیکسی یا پھر وہ گن والا پروگرام۔ سائیکل؟" اس نے ناشتہ ختم کر کے کہا۔

"تمہارا اسرا!"

"میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔" ٹیلر نے آہستہ سے اپنا تھکا ہوا سر اس کے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

"نیند نہ آئی۔"

"آئی ہی نہیں بالکل۔" اس نے سر بالکل گود میں سرکا دیا۔

"اسپر دلاؤں۔" اس نے آہستہ سے اس کے بھورے رنگ کے بالوں کو چھوا۔

"تین اور تین چھ اور تین نو گولیاں کھائیں۔" ٹیلر نے معصومیت سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

دن آنکھیں میچے جب چاپ گذرتے چلے گئے ایلما نے بہت ملامت کی کہ اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رجسٹری کا دفتر کوئی نامعلوم جگہ تو نہ تھی۔

گیارہ بجے جب وہ سول میرج کے دفتر سے نکلے تو سڑکیں کافی بھری ہوئی تھیں۔

ٹیلر بار بار مسکرا رہا تھا مگر وہ وحشیانہ مسرت جو دفتر کی میز پر سے سر اٹھاتے وقت بجلی کی طرح اس کی آنکھوں میں کوندی تھی اب معدوم ہو چکی تھی۔ اس کا انداز گفتگو نہایت نرم اور پیارا تھا۔ اور چہرے پر شاندار فتح کے احساس کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا شمن کچھ ششدر سی پراگندہ تیز تیز باتیں کر کے ان اجنبی آوازوں کو نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے کانوں میں ہتھوڑے کی چوٹ بن کر پڑ رہی تھیں۔

"غلط..... سب غلط...... آگ اور پانی کبھی بغل گیر نہیں ہو سکتے" کوئی بار بار سرگوشیاں کر کے یاد دلا رہا تھا۔

شملہ میں چیڑ کے درختوں کے درمیان چھپے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جب شمن نے نیا سبز کاہی شب کا لباس پہنا تو ایسا معلوم ہوا کسی نے اسے برف کے تودے میں دفن کر دیا۔ باہر کے کمرے میں ٹیلر بیٹھا دیر تک ضروری خطوط لکھتا رہا۔ اور وہ صندوق میں سے کپڑے نکال کر جانے لگی۔

زور زور سے کھانسنے اور منہ دھونے کی آوازوں نے اسے بتایا کہ ٹیلر غسل خانے میں ہے۔ باہر خشک ہوائیں سوکھی چادروں کی طرح پھڑپھڑا رہی تھیں نامعلوم خوف و ہراس فضا میں تیر رہا تھا خاموشی موت کی طرح اداس تھی۔ معلوم ہوتا تھا کائنات کسی بھیانک سانچے سے لرز کر یک دم چپ چاپ رہ گئی ہے۔ دو بلیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھڑکی سے باہر کھو گئیں۔ خزاں رسیدہ پتیاں مردہ چڑیوں کی طرح پیڑوں سے ٹپک رہی تھیں۔

"کھڑکی بند کر دو" اس نے لجاجت سے ٹیلر سے کہا۔ بڑبڑا کر نہ جانے وہ کیا بولا اور چٹخنی لگا دی۔ جب وہ مڑا تو شمن نے دیکھا وہ بہت سہمے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا جیسے کاغذ کا ٹکڑا جو بارش میں پڑے پڑے دھل کر بے رنگ ہو گیا ہو۔ "

وہ جاگ پڑی مگر آنکھیں بند کئے چپ چاپ پڑی رہی۔ دور کہیں بہت سے گھنگھروؤں کی جھنکار ہوا کو جان دار بنائے تھی یہ گھنگرو چڑیاں بجا رہی تھیں بے تال سُر جیں جیں بجی، ملا کر بھیرویں کا الاپ معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی سُر کومل تھے۔ نیم خوابیدہ احساسات کو جمع کرنے کے لیے اس نے جاگنے کی کوشش کی جسم کو آہستہ سے سمیٹا اور پھر پھیلا دیا۔ پپوٹے کھولنے چاہے مگر نہ کھلے جیسے سورج اس کی آنکھوں میں گھور رہا ہو ایک دم اسے کچھ یاد آیا۔ دماغ میں سوئی سی چبھی اور بھالا بن گئی۔ آنکھیں بزدل چڑیوں کی طرح بچتی بچتی کھل گئیں۔ کمرہ خالی تھا!

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہاں تھا ہی کیا؟ "رات جہاں ٹیلر کے کوٹ ٹانگے تھے وہاں صرف ایک بلگجی سی سرخ ٹائی لٹکی ہوئی پھانسی لگے ملزم کی طرح جھول رہی تھی" جوتوں کی قطاریں جو اس نے اپنے ہاتھ سے سیدھی کی تھیں غائب صرف ایک میلا موزہ کونے میں پڑا منہ چڑا رہا تھا۔

خاموش اور مفلوج وہ اس میلے موزے کو گھورتی رہی جو بڑھتے بڑھتے ایک مٹیالے پہاڑ کی طرح پھول گیا۔ ہوا کے خاموش جھونکے سے ٹائی گوشت کے لوتھڑے کی طرح پھسل کر زمین پر آ رہی جلدی جلدی اس نے سر میں گھستے ہوئے مرچوں دار دھوئیں کو دونوں ہاتھ سے پرے ہٹایا اور بیچ کمرے میں کھڑی ہو گئی۔

"گیا!..... وہ گیا!!" در و دیوار قہقہے مار کر چیخ اٹھے۔

"تو پھر؟..... اب؟..... اب کیا ہو؟" اس نے لجاجت سے جواب مانگا۔

"وہ گیا! تم بھی جاؤ..... کوڑی بھی تو نہیں تمہارے پاس ابھی مالک مکان سنے گا کہ تم رہ گئیں اور وہ گیا تو وہ تمہیں کوئی بسوا سمجھے گا۔ جنھیں یہ سفید چمڑے والے آئے دن چند سکوں کے عوض لاتے ہیں۔ دھکے مار کر نکال دے گا۔"

"تو پھر؟..... اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"بھاگو! جتنی طاقت تمہارے پیروں میں ہے وہ سب ایک بار لگا دو اور بھاگو وہاں باغ کے کونے میں جو باؤلی ہے وہی جس میں کل آتے وقت تم دونوں نے جھانکا تھا کہ دیکھیں یہ دن رات کا ملاپ کیسا نظر آتا ہے پانی کے آئینے میں؟ تو تم چمگادڑوں اور مکڑیوں کی غارت گری دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئیں تھیں۔ بدبو تو ہے اس میں اور ان جانے کیڑے مکوڑے بھی۔ مگر راستہ بڑا سیدھا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی کمر کے لیے اس سے سیدھا راستہ نہیں"

سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ وہ ایک دن کی بیاہی دلہن مگر نہ ابٹنے کی مہک نہ مہندی کا رنگ ایک چوڑی بھی تو نہیں کلائی میں اس کا سہما ہوا دماغ اور جھجکا۔ یہ بیاہ ہے یا رنڈاپا؟ لڑکھڑاتی ہوئی وہ باہر بھاگی۔ برآمدے میں بہت سے ہاتھوں نے اُسے لپک لیا۔ بہت سے نہیں صرف دو ہی تو تھے مگر کتنے سکون بخش اور محافظ اور ٹیلر کا بھوت کتنا سرخ اور تازہ دم ہو رہا تھا۔

"تم اٹھ آئیں....." اسے سیڑھیوں کے پاس کھڑا کر کے وہ برآمدے کے نیچے کود گیا۔ "میں نے کہا تمہیں کیوں جگاؤں۔" اس نے نیچے سے اس کی کمر دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ تمہیں ایک چیز......ہیں؟"

"روفی!" اس نے طوفان کے نیچے سے نکل کر لمبی سانس کھینچی۔

"کیا ہوا؟" اس نے نرمی سے نیچے اتار کر اسے ایسے دیکھا گویا وہ کوئی چینی کا کھلونا ہے جس کے ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو۔

"کچھ نہیں....." وہ آنسو پی کر ہنسنے لگی۔ ڈری ہوئی دھڑکن سے بھری ہوئی مصنوعی ہنسی۔

"روفی.... تمہارے جوتے اور کپڑے کہاں گئے۔" چائے پیتے وقت اس نے رک رک کر پوچھا۔

"جوتے؟.... کپڑے؟.... کیا کرو گی۔ ابھی میں تمہیں اس جھگڑے میں

ڈالنا نہیں چاہتا.... لو" اس نے بہت سا مکھن لگا کر توس دیا۔

"یونہی پوچھا تھا۔"

"کیا بات ہے شمی" اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"آ.... کچھ نہیں.... میں اٹھی.... تو تمہاری سب چیزیں غائب تو۔"

"تو....؟" ٹیلر اور سنجیدہ ہو گیا.... "تم سمجھیں...."

"تو میں سمجھی.... ہیں کہ چور لے گئے" اس نے بچوں کی طرح بہانہ بنایا۔

"جھوٹ.... مجھ سے جھوٹ مت بولو" ٹیلر کا منہ اتر گیا "میں سمجھتا ہوں۔"

"خاک سمجھتے ہو۔"

"اگر یہ حال رہا تمہاری بے اعتباری کا.... تو...."

"ہشت.... بہت عقل مند بنتے ہو...."

"ہاں تم سمجھیں میں چلا گیا، تمہیں چھوڑ کر۔"

"بہت سمجھے۔ اتنی سمجھ ہوتی تو شادی ہی کیوں کرتے.... سچ بتاؤ کہاں گئے کپڑے؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے" اس نے ایسے بات ٹالی کہ ٹیلر سیدھا ہو گیا۔

"بیرا برش کرنے کو لے گیا۔ دیکھو بھئی میں نے شادی اپنے لیے کی ہے نہ کہ ان کم بخت جوتوں کے لیے صبح صبح میری تو بات بھی نہ پوچھی اور جوتوں پر نثار ہوئی جا رہی ہیں۔"

"واہ اچھا کہیں چلوگے گھومنے؟"

"نہیں.... بس یہیں تمہارے پاس...." وہ اس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا پورا مہینہ چھٹیوں میں سوتے جاگتے ہنستے بولتے گذر گیا دن بھر اجڑے ہوئے باغ کے سنسان کونوں میں سر سے سر جوڑ کر کیٹس اور بائرن کے اشعار اور عمر خیام کی رباعیاں پڑھی جاتیں۔ ٹیلر کی آواز بہت نرم اور بھاری تھی دبی آواز میں محبت بھرے نغمے اور بھڑکتی ہوئی نظمیں سنایا کرتا۔

وہ کیا سوچا کرتی تھی اور کیا نکلا اس کا خیال تھا کہ انگریز عام طور پر گندہ

دبی رہتے ہیں دانتوں کی صفائی کے لیے ہزاروں دوائیں ایجاد کرنے کے بعد بھی اس کی نظر سے کوئی چمکیلے سفید دانتوں والا انگریز نہ گذرا۔ ان کے سیاہی مائل زرد دانت دیکھ کر ہمیشہ روندگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ ٹیلر کے دانت سفید نہ تھے مگر بالکل ہموار اور بیماری سے پاک تھے۔

"سب سے پہلی چیز جس نے مجھے تمہاری طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا تھا، یہ نیلگوں سفید دانت تھے" وہ شمن سے کہتا۔ دانتوں کا رنگ بدلنا ممکن نہ تھا۔ مگر وہ ضرورت سے زیادہ ان کی صفائی میں منہمک رہتا۔ اخروٹ کی چھال چبا کر وہ شمن کے دانتوں سے مقابلہ کرنے لگتا اور شکست کھا کر بچوں کی طرح بگڑ اٹھتا اور اداس ہو کر کہتا۔

"میں یہ دانت اکھڑوا کر دوسرے لگواؤں گا۔"

"تم ہندوستانی نہ جانے کس مٹی سے بنائے گئے ہو کہ ہم لوگ دواؤں سے بھی اس کی نقل نہیں اتار سکتے۔" وہ اس کے سانولے رنگ کو دیکھ کر کہتا۔ "اس رنگ میں کتنی کشش ہے آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں۔" وہ نیم باز آنکھیں بنا لیتا۔ اسے پاؤڈر اور رنگ سے بہت نفرت تھی۔

"اس سے جلد کی حساس ملائمیت چھپ جاتی ہے۔"

"میں تو خوشبو کے لیے لگاتی ہوں۔"

"اوہ...... خوشبو! اس جلد کی خوشبو سے بھی تیز اور کوئی خوشبو ہے اگر ایسا ہی ہے تو اسے تیز کرنے کے لیے شراب چھڑک لو۔"

"جی چاہتا ہے زندگی کی لمبان لامتناہی ہو جائے یہی چیڑ کے لمبے درخت ہوں اخروٹ کی چھاؤں ہو وہ اور شیلی کی نظموں میں الجھ کر کھوئے رہیں۔ زندگی اتنی نرم و نازک بھی ہو سکتی ہے" یہ اسے معلوم نہ تھا بے معنی قہقہے گہری نیندیں بڑھی ہوئی بھوک اور کیا چاہیئے تھا۔

ٹیلر روز بروز بدلتا جا رہا تھا شمن سمجھتی تھی کہ اس اجڈ گنوار کو ہندوستانی

رنگ میں رنگنا قطعی ناممکن نہ سہی مگر دشوار ضرور ہے مگر وہ تو خود بڑی تیزی سے ہندوستان کی آب و ہوا خوراک اور طرز رہائش کی طرف کھنچتا جا رہا تھا یہ مردھی کتنے سہل پسند ہوتے ہیں جو زندگی انھیں دینا چاہو دے دو۔ اس معاملے میں نہ ان کا ملکی اختلاف آڑے آتا ہے نہ قومی۔ جس آغوش میں گئے آنکھیں بند کر کے سر ڈال دیا اب جو چاہے کرو دن رات ایک ہی لباس پہنے سستی کا اشتہار بنا پڑا رہتا۔ شیو کرنا بھول جاتا وہ تو داڑھی چھوڑ دیتا مگر شمن نے شدت سے مخالفت کی لہٰذا مجبوراً شیو کرتا۔ پانی سے گھبراہٹ ہوتی خوب مرچوں دار سالن کھا کر تین چار گھنٹے دوپہر کو سوتا۔ بڑی مشکل سے شام کو اٹھتا۔ باہر جانے کے لیے ہزاروں بہانے بنانے لگتا اور شمن زبردستی گھسیٹ لے جاتی تو وہ بالکل سنسان اور غیر دلچسپ راہوں میں گم ہو کر وہاں قدرت کی رعنائیوں کی تعریف کرنے بیٹھ جاتا اس نے پچھلے دو ہفتے کی چھٹی اور منگا لی۔ شمن نے پوچھا تو بہانے کرنے لگا کہ اسکی چھٹی واجب ہے۔

دہشت زدہ ہو کر شمن نے دیکھا کہ وہ ایک تجدید معمہ بنتا جا رہا ہے زیادہ تر وہ گھنٹا رہتا ہے مگر جونہی جاگتا ہے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور پھر جلدی اس مدہوش تاریکی میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ رات گئے تک خاموش بیٹھا سوچا کرتا۔ اگر شمن کچھ بات بھی کرتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتا۔ کبھی کبھی جماہیاں لے کر آنکھیں بند کر لیتا۔

"میں یوگ کا عمل سیکھ رہا ہوں" وہ مذاق کرتا۔

"یوگ کا عمل؟"

"ہاں نروان حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے"

"دماغ خراب ہوا ہے؟" وہ بگڑ جاتی۔

"یہ دنیا فانی ہے" مذاق حد سے گذر جاتا اور وہ روٹھ جاتی تو بچوں جیسی حرکتیں کر کے مناتا بے وقوف ناموں سے پکارتا جس پر وہ اور جھنجھلا جاتی اور اٹھ

کر باہر چلی جاتی۔ جب تنہا گھوم پھر کر آتی تو اسے کرسی پر اسی طرح سویا پاتی۔

اس کی توجہ اور محبت بھی عجیب تر ہوتی گئی شدت میں تصنع کی ملاوٹ معلوم ہوتی۔ وہ جتنا خاموش رہتا اتنا ہی پرجوش اظہار محبت ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا کسی چیز کو دور جھٹک کر وہ جا کھڑا رہنا چاہتا ہے ایک نامعلوم سا خوف اور اکتاہٹ اسے نڈھال کر دیتی اور وہ جھلاہٹ بھری محبت دشمن کو خار بن کر کھٹکنے لگتی۔

ایک دن بڑی زبردستی سے وہ اسے آبادی کی طرف گھسیٹ لے گئی تھوڑی دیر کو اس کی نیند دور ہو گئی بالکل پرانے ٹیلر کی طرح کافی پی کر قہقہے لگاتا رہا مگر جونہی سنسنی ختم ہوئی ایک عجیب قسم کی جھجک اس کی حرکات میں معلوم ہوئی جیسے وہ رسیاں تڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ روشنی سے آنکھیں چندھیائی جاتی ہوں تھوڑی دیر میں وجہ معلوم ہو گئی لوگ چپ چپ بیٹھے اس انوکھے جوڑے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ بیرا اپنا فرض بھول کر ان کے قریب کسی بہانے سے کھڑا رہ جاتا کاؤنٹر پر ریزگاری لیتے ہوئے گاہک کا حساب کتاب گڑبڑ نظر آتا اور دو چار پرچی سوکھی ماری میمیں تو کھلم کھلا ناراض بیٹھی تھیں۔

"نہ جانے یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"یہی کہ...... نہ جانے میں کون ہوں...... اور تم...... اوہ...... سوچنے دو .... آؤ" وہ دشمن کے چہرے پر رنگ آتا دیکھ کر ٹالنے لگا۔

"واپس چلو!" دشمن نے درشتی سے کہا۔

"کیوں؟ ارے واہ!"

"میں کہتی ہوں واپس چلو"

"مگر......" وہ کچھ جھینپا ہوا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا۔ راستے بھر خاموشی رہی۔

"ہم ان سے ڈرتے ہیں...... کیا ان کا دیا کھاتے ہیں" وہ مارے غصے کے

لرزنے لگا۔ "جاہل کمینے!" وہ بری بری گالیاں بکنے لگا۔ آخر لوگ اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں؟ آخر انسان ہے تو ایک ہی بیج کا پھل۔ کیا چھوٹا کیا بڑا، کیا کالا کیا سفید۔ مگر کون سمجھاتا۔ کاش وہ اس شادی کے پیچھے چھپا ہوا شاندار مقصد موٹے موٹے حرفوں میں لکھ کر اپنی پشت پر ٹانک لیتے تاکہ یہ کور مغز لوگ متحیر آنکھوں سے تو نہ گھورتے یہ بے رحم آنکھیں جو معلوم ہوتا ہے پیٹھ میں سوراخ کر کے دل میں گھسی جاتی ہیں۔

"ان کا کوئی قصور نہیں، عجائبات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔" شمن کا دل بیٹھنے لگا۔

"مگر انھیں کیا مطلب؟ یہ کیوں مرے جاتے ہیں۔ میں سب جانتا ہوں ان لوگوں کی سفیدی کو، دل کی سیاہی تو کوئی دیکھے۔"

"وہ مجھے کیوں بازاری عورت سمجھتے ہیں۔"

"میں..... میں گولی مار دوں گا ان حرام زادوں کو..... جیسے ان کی سفید بیبیاں تو بس دیویاں ہیں۔" شمن نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ اس لیے اس کا غصہ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا۔ پھر وہ شمن سے لڑ پڑا گویا وہی ان سب کو بھڑکا آئی تھی۔

"تم جھجکتی کیوں ہو؟" وہ چیخا۔

"میں کہاں جھجکتی ہوں۔"

"اور کیا تم گھبرا کر انھیں اور شیر بنا دیتی ہو۔" اپنا الزام وہ شمن پر تھوپنا چاہتا تھا۔ "مگر میں ان کمینی حرکتوں کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتا۔ اگر یہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے تو میں خود ان کے منہ پر تھوک دوں گا۔" اس نے اس زور سے چنگھاڑ کر کہا کہ ہر لفظ ان کی ذہنی کوفت کا آئینہ دار بن گیا۔ گو وہ منہ سے بکتا رہا مگر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں مانتا ہے کہ ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ شمن کو سہما ہوا دیکھ کر جی دکھ گیا اور

وہ اسے سمجھانے لگا۔

اس ذہنی کوفت کو اس نے شراب اور زبردستی کی محبت میں ڈبونا شروع کیا۔ مگر اس طرح وہ اکیلا فرار پا جاتا۔ شمّن اس کے رویے سے عاجز آجاتی۔ اکتا دینے والا عشق مصنوعی اور فضول معلوم ہوتا۔ اپنے ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے وہ اس مدہوشی کے پاس کیونکر پہنچ سکتی۔

"پونا کب چلو گے؟" اس نے ایک دم نرمی سے پوچھا۔

"نہیں،" اس نے اپنے پوشیدہ خوف کو اور چھپانا چاہا۔ "تمہیں چھوڑ کر میں کیسے کام کر سکوں گا۔"

"مجھے کون چھوڑنے کو کہتا ہے۔" شمّن نے جبر یہ ذلّت برداشت کر کے کہا۔

"ایں؟... ہاں...... مگر وہاں ڈیوٹی پر مجھ سے نہ جایا جائے گا۔"

"پھر کیا ارادہ ہے؟ اسی طرح مٹ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"اگر تمہاری آغوش میں مٹ بھی جاؤں تو......"

"بکواس مت کرو رومی...... تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"دھوکا..... کون کم بخت دھوکا دے رہا ہے؟ ہنہ!" وہ مجرمانہ انداز میں نظریں بچا کر کہنے لگا۔

"تم مجھے ہی نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے رہے ہو۔ تم...... پچھتا رہے ہو۔"

"غلط..... غلط..... یہ سراسر بہتان ہے!" اس کی تیزی اور جھلاہٹ نے بات کو اور پختہ اور یقینی بنایا۔

"میں تمہاری ہر بات سہہ سکتی ہوں۔ مگر رومی یہ جھوٹ مجھ میں برداشت کرنے کی طاقت نہیں۔ اگر تم صاف کہہ دیتے کہ تم مجھے ساتھ لے جانے میں ذلّت محسوس کرتے ہو تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔"

"میں۔ میں تمہارے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا۔ یہ بات طے ہے اور یہ کیسے کہتی

ہو کہ مجھے تمہیں ساتھ لے جاتے ذلت محسوس ہو گی۔"

"اس میں تمہارا قصور نہیں اس جنگلی جوڑے کو دیکھ کر جب لوگ مسکرا اٹھتے ہیں، آنکھ بچا کر اشارہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ تم........"

"تو پھر تو تم بھی جھوٹ بولتی رہو گی۔ گو ظاہر تو یہ کرتی ہو کہ نہ تو تم نے کچھ دیکھا اور نہ سمجھا۔"

"یہ...... یہ میں اس لئے کرتی ہوں کہ..... میں....." وہ کچھ نہ بتا سکی۔

"تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو۔ تم خوب دیکھتی ہو کہ میرے ہم وطن مجھے نفرت بھری ہمدردی کے ساتھ دیکھتے ہیں گویا تم ایک بیماری ہو جو میری حماقت سے میرے سر منڈھ دی گئی۔ اور تمہارے بھائی بند سمجھتے ہیں کہ تمہارے پہلو میں ایک انسان نہیں ان کی ساری قوم کی شخصیت پر ایک موٹی سی گالی ہے۔"

"لوگ مجھے کمینہ سمجھتے ہیں...."

"تم..... مگر تم مجھ سے کیوں لڑ رہی ہو۔ گویا اس میں میرا کوئی قصور ہے ..... تم جانتی ہو میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ہوں، یہ جو تم پستی کی طرف گرتے جا رہے ہو یہ بھی صرف میری خاطر...... تم نیچے اتر کر میرے برابر ہونا چاہتے ہو تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میرے برابر آنے کے لیے تمہیں اٹھنے کی نہیں بلکہ گرنے کی ضرورت ہے؟"

"یہ تمہارا وہم ہے۔"

"نہیں یہ میرا وہم نہیں میں دیکھ رہی ہوں تم اس دوری اور فرق کو مٹانے کے لیے خود مٹے جا رہے ہو۔"

"تمہاری محبت کی خاطر۔ سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر....."

"مگر یہ محبت کیسی جو تمہیں مٹا رہی ہے میں سمجھتی ہوں یہ کیا ہے تمہیں محبت ہو نہ ہو مگر اتنا یقین ہے کہ مجھے اٹھا کر اپنے برابر کرنے کی کوشش بے کار ہے تم سفید انسانوں کی دنیا اتنی بلند ہے کہ میرے سیاہ وجود کو اس مقدس درجے تک لے

جاکر اپنی اور اپنی قوم کی توہین نہیں کر سکتے لہٰذا خود اپنی حماقت کے حضور میں اپنی ہی قربانی دے رہے ہو۔"

"تمہارے وہم سیدھی سی بات کو بھی بھوت بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت...."

"ہندوستانی ہے کہہ دو۔" لہجے میں انتہائی تلخی پیدا کر کے کہا۔

"چہ چہ اتنا احساس کمتری! تم ہندوستانیت کو توہین سمجھتی ہو۔ یقین مانو تم میں ہنے جو کچھ کیا انجان ہوتے ہوئے کیا۔"

لیکن یہ ہی کیا کم تھا کہ "وہ کیا" آخر قدرت کو اس کے ہر شعبۂ زندگی سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں ہو گیا تھا۔ تلخیاں بڑھتیں پھر دب جاتیں مگر ہر چیز کا ایک داغ چھوڑ جاتا۔ محبت اور انسانیت ہر وقت میدان میں ڈٹے نہیں رہ سکتے۔ ویسے دونوں کا جی بھی اکتا گیا تھا۔ محبت بیچیز معلوم ہونے لگی تھی ایک دوسرے کے وجود سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ یونہی من ہی میں ایک دوسرے کی جدائی کے سپنے ترسانے لگے اور یہ چھوٹے موٹے جھگڑے اس نفرت کو بڑھاتے گئے جو دونوں کے لاشعور میں حلول ہو چکی تھی مگر وقتی طور پر دبی ہوئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں اپنی بھول پر حیرت زدہ ہیں۔ جھکانے میں خودداری کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا سکون قلب کا یہ نسخہ بھی ٹھکرا دیا ہوا ہے۔ یقیناً ٹیلر پر تو کسی قسم کا کوسوداوی مرض قابو کیے ہوئے تھا ورنہ وہ اس قدر آسانی سے یہ ڈرامہ نہ کھیل جاتا۔ اوپر سے مرگوں اور شراب نے دھار رکھ دی۔ جھنجلا کر وہ احساس شکست سے بچا جاتا۔

بہت ضبط کرتے مگر ذرا سی ٹھیس سے پکا پھوڑا پھوٹ نکلتا اور دونوں کو اپنی خوبیاں اور دوسرے کے عیب نظر آنے لگتے وہی طعنے جو انھیں لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتے تھے الفاظ کی مدد سے ایک دوسرے پر پھٹنے لگے شکل وصورت کی وہی خوبیاں جو کبھی دیوانہ بنا گئی تھیں آنکھ میں شہتیر بن کر کھٹکنے لگیں۔ ٹیلر کے بال بے جان اور بدرنگ نظر آتے۔ آنکھیں خائف معلوم ہوتیں اور جلد کچے گوشت

جیسی لگتی۔ ادھر ٹیلر کو اس کے سیاہ بال اور آنکھیں ڈراؤنی معلوم ہونے لگیں۔

خدا خدا کر کے ہنی مون کا مصیبت بھرا زمانہ ختم ہوا اور مجبوراً ہونا روانہ ہونا پڑا۔ ٹیلر کا خوف تازہ ہو گیا وہ نہایت پرخطر اور اجنبی محاذ پر جا رہا ہے۔ شمن ایسے محسوس کرتی اور سارا غصہ اور نفرت لاوے کی طرح سینے میں جمع کر لیتی جو غول بیابانی کی طرح دل و دماغ میں ہلچل مچائے رکھتا۔

اسٹیشن پر ایک دوسرے سے رشتہ داری ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی اور کمپارٹمنٹ میں بھی اگر کوئی غور سے دیکھتا تو دونوں کو انسانیت سے زیادہ قریب رشتے میں منسلک تصور نہ کرتا۔ وہ ایک دوسرے سے بے توجہ اپنی تنہائی ظاہر کرنے میں کوشاں تھے۔ کوئی نہ دیکھتا ہوتا جب بھی حساس بنے غصے ہونے کو تیار رہتے آوازوں پر کان لگائے رہتے کہ کہیں ان کے ہی متعلق تو کانا پھوسی نہیں ہو رہی ہے۔ غیروں کی طرح ڈائننگ کار میں کھانا کھایا اور بل ادا کرتے وقت ٹیلر کے کان سرخ ہو گئے اور شمن نے بیرے کی ناقدانہ نظروں کا بڑی مشکل سے مقابلہ کیا۔ دو بے جوڑ انسان اپنے جوڑے کے بے تکے پن کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

کبھی بھولے سے وہ بے تکلفی سے کوئی دلچسپ بات ایک دوسرے سے کہتے تو فوراً ادھر ادھر دیکھنے لگتے کہ لوگوں کی حیرت کا کیا حال ہے۔ اس بہادری اور جوتی سے قائم کیے ہوئے جائز رشتے کو گناہ کی طرح چھپانا پڑ رہا تھا جب ٹیلر کا سر سوتے میں تکیے سے ڈھلک کر مڑ گیا تو شمن کی ہمت نہ پڑی کہ اس بے چین سر کو سیدھا کر دے۔ گو اسے خوف تھا کہ کہیں بے چارے کی گردن نہ رہ جائے وہ معمولی سا خیال جو برسوں کے پرانے میاں بیوی میں بھی تھوڑا بہت رہ جاتا ہے یعنی ایک دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جانا اس کے اظہار کا حق بھی چھن چکا تھا اور وہ ابھی دولہن دولہا تھے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا بیٹھا کھلے بندوں

ننھے بچوں جیسے اخلاص کر رہا تھا۔ اگر ابھی اس کی جگہ کوئی سفید قوم کی لڑکی ہوتی تو سر بازار اپنے سیاہ بھٹ میاں کو چٹا چٹ چومنے کا حق رکھتی تھی بلکہ فخریہ کہتی کہ "تو دیکھو میرے روپہلی حسن کی طاقتیں کہاں کہاں کا جانور پھانس کر لاتی ہیں" اور وہ سیاہ آدمی بھی اس روپہلی بارش سے کھل کر فخریہ کہتا کہ "دیکھو تم ہم کو کالا سمجھتے ہو مگر یاد نہیں کرشن جی بھی تو کالے تھے اور گوپیاں ان کی متوالی تھیں ......"
مگر وہ، حقیر تھی۔

اور اس کا جی چاہا سب کے منہ پر تھوک دے اور اسی وقت سب کے سامنے جھک کر ٹیلر کے دکھتے ہوئے سر کو آرام سے رکھ دے اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے شرتی بالوں کی ریشمی نرمی کو انگلیوں میں جذب ہوتا محسوس کر لے۔ اس کی پلک کا ایک بال جو ٹوٹ کر بوٹے پر چپک گیا ہے جیسے سونے کا باریک سا تار، وہ اسے انگلی سے ہٹا دیتی تو کتنا اچھا ہوتا کہیں آنکھ کھلے تو اندر نہ جا پڑے ویسے ہی کیا کم کوئلے پڑ چکے ہیں جو اس نے غسل خانے میں آنکھیں مسل مسل کر نکالے۔ کتنا اس کا جی چاہا کہ ساڑھی کا پلو تہہ کر کے منہ کی بھاپ سے گرمی پہنچائے مگر اسے یہ تجویز ٹیلر کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہ پڑی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ذلت کو برداشت کرنے سے پہلے مر جانا بہتر سمجھے گا۔

اور یہ وہی ٹیلر تھا جو ضدی بچے کی طرح روز آن کھڑا ہوتا تھا۔ دھن کے پکے بھکاری کی طرح اس نے دروازے پر دھرنا دے کر اسے حاصل کیا تھا اور پھر اپنے کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا یہ وہی انسان تھا جو اس کے گھٹنے پر سر ٹکا کر تیل ملوانے کے لئے مصر ہوتا تھا پیڑوں کی جڑوں سے کشتی لڑ کر جب پھانسیں لگا لیتا تو شملے کی خنک شاموں کو بجلی کے سامنے وہ سوئی سے انھیں نکالا کرتی اور اس وقت وہ ضرورت سے زیادہ شریر بن جاتا ہر پھانس کرایہ وصول کر کے نکلواتا اور دوسرے دن جان بوجھ کر نئی پھانسیں لگا لیتا لیکن اگر اس وقت سب کے سامنے وہ اس کا سر چھو بھی دیتی تو وہ مارے ذلت کے مر ہی

جاتا اور وہ خود؟ اُسے اپنے آپ پر کچھ کم رحم نہ آتا۔

وہ پہلے سوچا کرتی تھی کہ بھلا کیا جانیں یہ انگریز کہ عشق و محبت کیا چیز ہے ہوا و ہوس کے بندے نہ شرم نہ حیا بھلا وہاں کیا اسلامت رہتا ہوگا ان میں؟ کتنی سخت کھردری اور مطلبی محبت ہوگی لیکن رونی بالکل مختلف تھا وہ ہر ہندوستانی اور غیر ہندوستانی مذاق کو سمجھ جاتا اور اس میں وہ ساری حماقتیں موجود تھیں جنھیں وہ بچپن سے عشق و محبت سے وابستہ سمجھتی تھی وہ بدمذاق نہ تھا گھنٹوں ایک دوسرے کے بچپن کے قصے سن کر ہنستے دنیا کے دو مختلف ٹکڑوں پر بسنے والے ایک ہی جیسا بچپن اور جوانی گذار چکے تھے وہی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور سزائیں۔ معصوم دلچسپیاں اور ایک ہی جیسے کھیل۔

اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ پھر دور دور ہو جاتے اور ایک دوسرے کے سائے سے بھاگتے تھوڑی دیر میں کیا رٹ منٹ خالی ہو گیا تو بجائے قریب آنے کے وہ ایک دوسرے کو بزدل اور بے اصولا ثابت کرنے لگ گئے، اور وہ نرم گرم جذبات جو تھوڑی دیر قبل شمن کے دل میں جنم لے رہے تھے کملا کر ختم ہو گئے۔

لیونا پہنچ کر زندگی سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر بوجھل ہو گئی سب سے پہلے تو نوکروں کی حیرت کا مقابلہ کرنا پڑا پاس پڑوس کی متعجب آنکھوں کے تیر سہنے کے لیے گینڈے کی کھال کی زرہ بکتر پہننا پڑی جو آتا تو لینے آتا اور کچھ نہیں تو بے کار کے سودا بیچنے والے ہی جان بوجھ کر ناک لگاتے سونگھتے چلے آتے ٹیلر کے دور دراز کے ملنے والے ان کے دوست اور دوستوں کے دوست آنکھیں پھاڑے مبارک باد دینے دوڑے آتے۔ ان کی آمد اور تلخیاں بڑھاتی وہ لوگ بڑے مہذب طریقوں سے اس عجیب و غریب سانحے کا ذکر اول سے آخر تک سننا چاہتے ان کے چہرے تجسس سے پریشان ہو جاتے اور عقلیں پراگندہ! یہ ہوا تو کیسے ہوا؟

جتنے منہ اتنی باتیں پرانے گھاگ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی آوارہ عورت تھی، نوواردوں سے کسی ریاست کی مہارانی سمجھتے چند ایسے بھی تھے جو کچھ فیصلہ نہ کر سکتے

مگر دونوں کو خالی الذہن ضرور سمجھتے انتہا ہو گئی کہ ٹیلر کے افسر نے اس کو بلا کر اس واقعہ کو سیاسی نقطہ نگاہ سے معیوب حماقت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے آقاؤں کی قدیم روایتوں کو ٹھیس لگانے کی کوشش کی تھی جواب دہی کرتے کرتے ٹیلر تھک ہی نہیں گیا۔ بلکہ خود اپنے اوپر جو اعتماد تھا کھو بیٹھا۔ یہ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ ڈاک کے پروں پر اڑتی ہوئی امریکہ میں ٹیلر کی بیوہ ماں تک پہنچ گئی وہ کم عقل اور کٹر نہ تھی مگر پھر بھی مفصل خط مانگا تھا ٹیلر اس پر بھی چراغ پا ہو گیا۔

"مگر اس میں ایسی کیا برا ماننے کی بات ہے" اس نے بڑھیا کی حمایت کی۔

"کچھ نہیں تم اس کی حمایت صرف میری ضد میں کر رہی ہو۔ میں اسے منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔ اگر وہ اب تک مجھے بچہ سمجھے ہوئے ہے تو یہ اس کی بھول ہے"

ٹیلر کا غصہ ناک پر دھرا رہنے لگا تھا وہ اب بالکل جاگ اٹھا تھا اور شراب بھی نشہ نہ لا سکتی تھی۔ وہ عموماً ہر جلسے اور پارٹی سے جان چراتا یا تو اسے کوئی مرض آن دباتا یا مجبوراً "شمن" کو ایک آدھ بہانہ تلاش کرنا پڑتا۔ دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک دوسرے سے اور بھی اکتانے لگے۔ زیادہ وقت ایک دوسرے کو طعنے دینے اور اپنے حال پر رحم کھانے میں صرف ہوتا۔ دونوں اس مصیبت کا الزام اپنے اوپر سے اٹھا کر دوسرے کے سر منڈھنا چاہتے رہتے۔ بہت جلد زندگی خوفناک حد تک بار بن کر رہ گئی۔ اگر وہ ہمت کر کے کسی کے یہاں چلے بھی جاتے تو گھما پھرا کر ان کے بے تکے عشق کا ذکر نکل آتا۔

"ایک بار ہمارے ایک رشتے کے چچا نے ایک ریڈ انڈین سے شادی کر لی تھی بڑی باوفا اور نیک تھی۔ ہمیں اپنی زبان کے گیت اور خوفناک جنگلوں کے قصے سنایا کرتی تھی" وہ بڑے جوش سے کہتے۔

"ہندوستان سے دوستی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے کہ کالے اور گورے کا امتیاز اٹھا دیا جائے" وہ بڑے فراخ دل بن کر کہتے مگر ان کی یہ سخاوت

دونوں کو اور بھی دکھ پہنچاتی وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس کے اصلی معنی یہ ہوئے کہ مشرق اور مغرب کو ملانے کی کوشش اتنی ہی مشکل اور بے سود ہے جتنی کہ سیاہ کو سفید بنانے کی آرزو۔

ہر ملاقات کے بعد نئی ملاقات کا خیال بھیانک بن کر خون خشک کرنے لگا کئی دن تک دلوں پر مردنی چھائی رہی جو آپس کی تلخیوں کی شکل میں پھوٹ نکلتی الگ الگ دوستوں کا حلقہ بنایا تاکہ ایک دوسرے کی موجودگی جو سوال دلوں میں پیدا کرتی ہے اس کی گنجائش ہی نہ رہے مگر لوگوں سے نجات کہاں تھی۔ لاکھ یقین دلاتے کہ یہ سب حماقت محبت کے زبردست ہاتھوں مجبور ہو کر کی گئی۔ اب بھی بہت خوش ہیں اور قطعی نہیں پچھتاتے ہر مخالفت کو تیار ہیں مگر اس طرح متعدی سے تیار ہونا ہی صاف ظاہر کرتا تھا کہ انھوں نے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کش مکش میں خود کو ڈال دیا ہے۔

اور ادھر جاپانی پٹاخوں نے بری طرح فضا کو مکدر کر رکھا تھا۔ بم تو خیر جہاں گر رہے تھے تباہی مچا رہے تھے مگر جو انسان ان سے بچنے کے لیے بھاگ رہے تھے ان کی حالت قابل رحم تھی جیسے کھٹکا سن کر بدحواس بھیڑیں چاروں طرف بھاگنا شروع کر دیتی ہیں اور بجائے محفوظ ہونے کے خود خطرہ بن جاتی ہیں یہ گھبرائے ہوئے کم عقل جانور ایک شہر سے بھاگ کر دوسرے شہر میں پناہ لینے دوڑ پڑے۔ اونے پونے سامان بیچ کر ریلوں پر حملہ کر دیا۔ بمبئی کے لوگ کلکتہ اور کلکتہ کے بمبئی اس کوٹھی کے وہاں اس کوٹھی میں بدل کر یہ سمجھ لیا کہ اب گھن نہیں لگ سکتا۔ حادثوں سے جتنی جانیں گئیں اتنی شاید سال بھر کی لگاتار بمباری سے بھی نہ جاتیں گھپ اندھیرا سڑکوں ہی پہ نہیں عقلوں پر بھی چھا گیا۔

"مگر یہ کیا ہوا؟ یہ ڈھال پر سے اترتے اترتے روڑے پر سے پیر پھسل گیا۔ برف کے بے جان سفید بھوت نے چاروں طرف سے ہاتھ پھیلا کر شلر کی بڑھتی ہوئی جرأت کو آغوش میں بھینچ لیا ہڈیاں تک جما کر رکھ دیں موجیں امڈ

امڈ کر چڑھتی ہیں اور سفید چٹانوں سے سر پھوڑ کر لوٹ آتی ہیں۔ ادپر سے برف کے بیٹوں کی دیدہ دلیریاں الاماں۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دم لوٹ پڑے جیسے چالاک کبڈی باز، اپنے پالے میں دور تک دوڑا لائے پھر چوڑ ٹا یا ہے تو چین بلا کر ہی چھوڑا۔ تمام دنیا کی ٹوٹتی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ہارتے اور پیچھے بھاگتے ہوئے بھی سنبھل کر ڈٹ گئے۔ سرخ ستارہ خون میں لت پت مگر سانس لیے ہوئے نکل آیا وہ دو مہینوں میں ختم ہونے والا مریض سنبھالا لے کر چاق و چوبند ہو گیا۔

(یعنی سنبھالا کر وہ بند ہو گیا)

"ہم جانتے تھے آخر میں فتح ہماری ہی ہو گی" ٹیلر نے اخبار دیکھ کر غرور سے کہا۔

"تمہاری؟ یعنی یہ فتح تمہاری رہی اور وہ شکستیں جن کا مزہ شاید اب تک وہاں پر ہو گا۔ وہ کس کے حصے میں لگا دیں" شمن نے چڑھ کر کہا۔

"ایں؟..... ہار اور جیت تو ہوا ہی کرتی ہے....."

"اچھا تو کبھی ہار بھی ہوئی ہے۔ منہ سے تو یہی کہتے رہے کہ جیت رہے ہیں وہ بہادری سے پیچھے ہٹنا کچھ تم ہی لوگوں کی صفت ہے۔ تم میں تو کیا دم تھا کہ ہٹلر جن سے لڑتے۔ یہ ہندوستانی بھیڑیں اس دیوتا کے کلیجے کی آگ کیا بجھا سکتیں۔"

"تم پالٹکس نہیں سمجھ سکتیں۔ اتحادی......"

"جب تک ہارنے کا خوف ہے اتحادی بنے ہوئے ہو ادھر جیتے اور ادھر سارا اتحاد چولہے میں ڈال کر حصے لینے دوڑ پڑو گے اور پھر نہ دیکھو گے بھائی نہ بھتیجا بس سرکار عالیہ رہ جائیں گے اور ان کے چیلے چانٹے"

"اب کے ایسا نہ ہو گا"

"اجی خصلتیں بھی کہیں بدلی ہیں۔ جرمنی ختم ہوئے پھر روس کی باری ہے ہے۔ آج روس کے گن گائے جا رہے ہیں کل تک اسے انسانیت کا دشمن کہتے تھے آج چائنا کی محبت میں خدا لگے میں پیار سے ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں کل تک یہی چینی چور ظالم وحشی اور بدمعاش تھے سوائے ڈاکوؤں کے مکار چیلے کے کبھی کوئی

دوسرا عہدہ نہ ملا۔ آج وہی چینی اتحادیوں کی فہرست میں گنے جارہے ہیں۔ جاپان کے مظالم کا تو غل مچا رکھا ہے اور اپنے فعل انسانیت کی حفاظت بنا کر پیش کیے جارہے ہیں مگر یاد رکھو ظلم کی ایک انتہا ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ظالم خود اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹ لیتا ہے۔

"ٹھیک ہے ظلم تو ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان ہی میں فائدہ ہے غور سے دیکھو تو باوجود مظالم کے ہندوستان بہت ترقی یافتہ ہو گیا ہے اور ہوتا جارہا ہے۔"

"یہ جو چند کروڑ انسان انگریزی بولنے لگے ہیں اسی کو تم ترقی کہتے ہو گے کاش اسی طرح تمہیں ہٹلر جرمن سکھا کر مہذب بنا سکتا۔"

"اسے ذاتی لڑائی کیوں بنا رہی ہو۔" ٹیلر چڑ گیا۔

"کیونکہ یہ ہماری ذات سے وابستہ ہے۔"

"سکون چاہتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا ہوگا۔"

"میں سب کچھ برداشت کر دوں گی مگر اپنے ملک کو ان سفید جرنیلوں کی ایڑی تلے مسلتا دیکھ کر ضرور میرے دل سے خون ٹپکے گا۔ میرا دل روئے گا آنکھیں روئیں گی اور روح ہمیشہ روتی رہے گی یہ نہ سمجھو یہ بھوبل ٹھنڈی پڑ گئی ہے تو چنگاریاں بھی بجھ گئیں۔ کبھی تو زمانے کی ہوا رخ بدل کر چلے گی پھر انتقام۔"

"مگر تم نے تو رہی ہو اپنی ساری قوم کا دیا ہوا جذبہ انتقام تم میرے ہی سر پر ختم کر دو گی۔" گھریلو جھگڑا تلخ تر ہوتا گیا۔

"اور تم؟..... میری قوم کو دماغی، مالی اور جسمانی طور پر پیسنے کے بعد اب اس کی روح پر حملہ کر رہے ہو۔ خیر اب تک تو اقتصادی اور سیاسی دنیا کے مالک تھے اب مجھ جیسی بدنصیب عورتوں نے اپنی آخری دولت بھی تمہاری جوتیوں میں ڈال دی۔"

"مگر میں کون سا خوش ہوں مجھے بھی تو خوب انعام ملا۔ میری قوم میرے

منہ پر تھوکتی ہی ہے تمہارے وجود کی سزا مجھے ان کی پھٹکار کی صورت میں بھگتنی پڑ رہی ہے سڑے ہوئے انگلی کے پورے کی طرح انھوں نے مجھے کاٹ کر جسم سے دور پھینک دیا ہے۔"

"اور..... اور مجھے؟ رنڈی بھی اتنی کمینی نہیں سمجھی جاتی جتنی میں اپنی قوم کی نظروں میں ہو گئی ہوں میں نے ان کے پر غرور سر کو تمہاری ٹھوکر دل میں ڈال دیا۔ وہ میری پرچھائیں بھی اپنی شریف عورتوں کے اوپر پڑنا گوارا نہ کریں گے۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے تم بچے تو نہیں تھیں تمہارے کم بخت ملک کی غلیظ آب و ہوا اور خود تمہاری سیاہ کشش نے میرے دماغ کو مفلوج کر دیا میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا لیکن کوئی علاج بھی تو نظر نہیں آتا۔ میں اس راہ پر گم ہو گیا ہوں جو مجھے لوٹنے بھی نہیں دیتی۔"

"یہ الفاظ تمہارے منہ سے نکل رہے ہیں۔ تم جو میری جوتی پر ناک رگڑتے تھے میں نے تمہاری چاپلوسیوں کو سچ سمجھ لیا۔ تم پر بھروسہ کیا ایک بار تمہارے برف کے تودے جیسے وجود میں انسانیت کو پانے کی کوشش کی اور اسی حماقت کی سزا بھگت رہی ہوں مگر معلوم ہو گیا کہ تم لوگ انسان ہو ہی نہیں سکتے۔ لاکھ خول چڑھالو حقیقت تم بھیڑیوں کا راز فاش کر کے رہے گی۔ خونخوار درندے جھوٹے اور فریبی کہیں کے۔"

"خاموش، بدتمیز!"

"ہنہ بدتمیز! چور کو چور اور حیوان کو حیوان کہنا بدتمیزی نہیں راست گوئی ہے تم جیسے لٹیرے۔"

"میں کہتا ہوں خیریت اسی میں ہے کہ چپ رہو۔" روفی کی زبان بار گئی اور غصے سے آنکھیں دہک اٹھیں۔ اس کی شکل گھناؤنی ہو گئی۔

اڑ جاؤ۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے تھوکنے سے میں ڈر جاؤں گی۔ چاہے مجھے کچھ ہو میں تمہارے فریب کا حال ضرور کھول دوں گی۔ اس طرح دھوکا دے کر......"

شعلے کی طرح بھڑکا ہوا چہرہ اور بھی سیاہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے چوڑا چکلا ہاتھ کنپٹی اور رخسار کو کچلتا ہوا شمّن کو زمین پر گرا گیا۔

ٹیلر کانپتا لرزتا باہر چلا گیا۔ شمّن نے ایک آہ بھی نہ بھری، وہ بڑی احتیاط سے سنبھل کر کرسی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

"وہ کیا کرے؟ اب کیا کرے؟"

"ٹھیرو اتنا مت سوچو، ذرا ٹھیرو۔ تم نے گناہ کیا ہے تو خمیازہ بھگتنے سے اتنی مت ڈرو۔ شوہر کا پیٹر سینچ کر انگور توڑنے کی امید نہ کرو۔ ٹھیرو۔" سر ٹیکے وہ کئی گھنٹے روتی رہی۔ ٹیلر رات گئے آیا نشے میں دُھت تھا اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر ہی وہ کانپ اٹھی اور جلدی سے کنڈی لگا کر پلنگ پر گر گئی۔ ٹیلر تو پلنگ پر گرتے ہی سو گیا مگر وہ آنکھیں پھاڑے صبح تک کھڑکی سے کالی بھیانک رات کو گھورتی رہی سوچتے سوچتے کنپٹیاں سن ہو گئیں دماغ دکھ گیا پر وہ کیا سوچ رہی تھی سوائے شدید غم کے کوئی دوسرا احساس زندہ بھی نہیں رہا تھا جسم تھک کر پکا پھوڑا ہو گیا کاش کسی غیبی جرّاح کا مشتاق ہاتھ اس ٹیکن کو ٹھنڈا کر سکتا۔

صبح اس نے چائے کی پیالی بستر پر پڑے پڑے حلق سے نیچے اتار لی۔ ٹیلر کے جانے کے بعد وہ اٹھی۔ آج وہ بہت خوش وضع کپڑے پہن کر گیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سیٹی بھی بجائی تھی جس کی ہر تان سے مسرّت ٹپک رہی تھی دوپہر کو اس نے فون پر لنچ کو منع کر دیا اور سیدھا ریس کورس چلا گیا وہاں سے خوب ہار کر اور پی کر رات گئے لوٹا۔ بیرے کو مارتے مارتے چھوڑا۔ یہ ایک نئی ادا تھی۔ اس کا رویّہ نوکروں سے عام سفید لوگوں سے بہت مختلف رہا تھا۔ وہ ان سے بہت نرمی سے بولتا اور عموماً مذاق کیا کرتا تھا۔ آج وہ بیرے

میڑی میں عین بیچ انگریزی اور اردو میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

دو دن اسی طرح آنکھ مچولی ہوتی رہی اگر ہیولے سے سامنا ہو جاتا تو نفرت سے منہ موڑ کر دور ہٹ جاتے تھے۔ بظاہر بڑا بہادر بن رہا تھا مگر شمن کو یہ دیکھ بڑی حیرت ہوتی کہ وہ بھول بھول کر سر تھام کر پریشانی میں ڈوب جاتا بار بار چیزیں پٹخ دیتا اور نوکروں پر بگڑ اٹھتا وہ دکھی تھی تو کیا وہ بھی کچھ تو بھگت رہا تھا۔

شمن کھوئی ہوئی سی بیٹھی تھی جیسے وہ کسی مضبوط پل پر دوڑتے دوڑتے ایک دم ٹھٹک گئی آگے تختے اکھڑے ہوئے تھے اور نیچے لامتناہی گہرائیاں اور بے رحم چٹانیں۔ شب بیداری سے اس کی آنکھوں کے گرد بھورے حلقے پڑ گئے تھے کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ مگر وہ بے خبر نہ جانے کیا سوچنے کی کوشش کیے جا رہی تھی جو کچھ اس نے کیا تھا اس کی سزا وہ تنہا بھگتنا چاہتی تھی ویسے اس نے اپنی کسی سہیلی کو اس بے وقوفی کی خبر بھی نہ دی تھی۔ ہمدردی وصول کرتے کرتے اکتا گئی تھی اور خطوں میں بھی اس کی موجودگی نہیں چاہتی تھی اس کے گھر والوں کو بے شک خبر مل گئی تھی مگر وہ بھی سناٹے میں خاموش ہو گئے تھے۔

"جب تم ہی اتنی مضبوط ہو تو ہم کون" ان کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا تھا ایک طرح وہ لوگ اس کی طرف سے عرصہ ہوا تھا ناامید ہو چکے اور کوئی بھی خبر انھیں متحیر نہ کر سکتی تھی اگر انھیں اس انجام کی خبر ملتی تو بھی شاید کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکتے گویا وہ پہلے ہی سے اس انجام کی پرچھائیاں دیکھ چکے ہوں۔

روپے کی اس نے کبھی پروا نہ کی لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اگر پاس روپیہ ہی ہوتا تو زندگی اتنی کٹھن ہوتی نہ نظر آتی گو اسے نوکری آسانی سے مل سکتی تھی کوئی معمولی سی پڑھانے کی نوکری دنیا سے دور بوسیدہ کتابیں بدشوق لڑکیاں اور لامتناہی اکیلا پن وہ اس آخری ہیولے سے بہت ہی خائف ہو چکی تھی مگر اس دم گھوٹنے والی خلا میں گرتے ہو لرزہ چڑھتا تھا۔ لیکن اب

کیا ہوگا؟ سوچتے سوچتے سر کی رگیں سوج گئیں مگر کوئی دھندلی سی شعاع بھی روشنی کی نہ ملی۔

انجام ۔ ماں کا خط

"شم..... شم..... روفی کی آواز گھبراہٹ اور خوشی سے لرز رہی تھی۔ "کہاں ہو تم ڈیر..... " وہ گیلری میں بے تحاشا دوڑ رہا تھا "شم" اس نے دروازے ہی سے اسے چیخ کر پکارا۔ "یہ..... یہ دیکھو..... ممی پیاری مم کا خط" جلدی سے وہ آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شمن نے جھڑ کر پیر سمیٹ لیے۔

بروچ اور لاکٹ

"یہ دیکھو..... ذرا دیکھو کیا لکھا ہے۔ "میں اپنی پیاری بیٹی کے لیے اپنے بیاہ کا بروچ اور لاکٹ بھیج رہی ہوں..... اصلی ہیروں کا ہے، میرے باپ کو ہیروں سے عشق تھا..... اچھا سنو..... میں خود اپنے ہاتھوں سے اگر پہناتی تو..... " اوہ مم..... وہ شمن کی گود میں سر رکھ کر قہقہوں میں ملے ہوئے آنسو بہانے لگا۔

"ممی ہیرا ہے ہیرا..... شم"

اور پھر نہ جانے کیسے طلاپ ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے تختے جڑ گئے اور پھر ایک بار زندگی کی گاڑی ڈنڈنانے لگی۔ ٹیلر نے اپنے آپ کو خوب گالیاں دیں اور کوسا۔ سارا الزام اپنے سر لے لیا بالکل ننھا سا روفی بن گیا اور سوائے ممی اور شم کے اس کے منہ سے دوسری بات نہ نکلتی تھی۔ رات کو دونوں نے للارل اور ہارڈی کا ایک بد مذاقی سے بھرا ہوا فلم دیکھ کر بچوں کی طرح تالیا بجائیں باوجود سختی سے منع کرنے کے وہ بے دھڑک اسے سب کے سامنے چومے جا رہا تھا لوگوں کی تحیر سے پھٹی ہوئی نگاہوں کا جواب وہ گستاخ قہقہوں سے دے رہا تھا۔

آج دنیا میں بس تین انسان تھے دو بگڑے دل اور ایک محبت کرنے والی ماں جو ہزاروں کوس دور امریکہ میں بیٹھی انھیں اپنی آغوش میں لیے چوم رہی تھی۔ شاید اسے معلوم بھی نہ ہوگا کہ اس نے غریب الوطن بیٹے اور غیر قوم کی بیٹی کو اپنے کتنے قریب کھینچ لیا تھا دونوں کے دل سفید بالوں والی معصوم صورت بڑھیا کے خیال سے ناچ رہے تھے وہ اب دنیا میں اکیلے نہیں تھے ایک تیسری

جان ان کی زندگی میں آگئی تھی آج ان کا بھی ایک راز دار پیدا ہو گیا تھا جس نے نصیحت کو بھول کر رنگ اور قومیت پر لکچر دیے بغیر انھیں پیار بھری مبارکباد دی تھی۔ اس کی بہو ایک عورت تھی جسے اس کے چہیتے بیٹے نے چنا تھا اس کے علاوہ اس نے کچھ بھی تو نہ سوچا اور ضرورت بھی کب تھی کچھ سوچ بچار کرنے کی آج تک اس بیٹے نے کون سی غلطی کی۔ ہمیشہ اس کی رائے پر عمل کیا اور کامیاب جوان بن کر اب انسانیت کے لیے ہتیلی پر جان رکھ وطن سے دور پڑا ہوا تھا۔ وہ عورت جس نے اس انجان غریب الوطن سے پیار کیا ہو گا۔ وہ ضرور قابل محبت ہو گی۔ خواہ کتنی ہی کالی ہو مُن کی ضرور گوری ہو گی بس وہ اسی لیے اپنے خاندانی زیور اس کے سپرد کر رہی تھی۔

نہ جانے روفی نے اسے کیا لکھا ہو گا آخر ماں ہے بیٹے کی ضد سے مجبور ہو گئی۔ اور یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بدگمانی نے سر اٹھایا۔ تو یہ ماں بھی بیٹے کی طرح مکّار تھی! اُف یہ سفید چمڑی!

مگر جب روفی خراٹے لینے لگا تو سرہانے کا دھیما لیمپ جلا کر اس نے خط دوبارہ پڑھا۔ ایک بار۔ دو بار۔ اور آنسو نہ رک سکے۔ دور بچھڑی ہوئی ماں کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا خط، دنیا کے کسی جھگڑے کا اس میں ذکر نہ تھا۔ نہ اس خون آشام جنگ کا نہ قومی خدمت کا۔ نہ آفتوں سے ڈرایا تھا نہ کہیں ہمت دلائی تھی جیسے دنیا میں اور تیسری چیز کا وجود ہی نہیں۔ ایک ماں ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا۔ ہاں ایک چیز اور...... وہ ان کی کبھی نہ مٹنے والی محبت ایک دوسرے پر پکا اعتماد اور اس کی نئی بہو جیسے ہر سطر میں لاکھوں پیار اور دعائیں بھیجی تھیں بغیر دیکھے بھالے وہ محبت کا بیش قیمت خزانہ اس پر لٹا بیٹھی تھی۔ کتنا فراخ تھا اس ماں کا دل جسے تمنّا اپنے پرو فیسروں سے ملتی جلتی ناک چڑھی بڑھیا سمجھے بیٹھی تھی۔ بالکل اپنی معلوم ہو رہی تھی۔ بلکہ اپنوں سے بھی زیادہ۔

وہ پارسل بھی دوسرے دن آگیا اگر تمنّا نہ روکتی تو وہ پولیس کے دفتر

میں ہی چیر پھاڑ کر کھول ڈالتا۔ اس میں ماں کی ایک تصویر بھی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ایک کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ نظریں اوپر کیے اپنے دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی ایک ایک شکن میں ماتا کا خزانہ پوشیدہ تھا وہ چھلکتی ہوئی آنکھیں ہجر کی داستان بنی ہوئی تھیں وہ کسی اونچے خاندان کی عورت نہ تھی بیوگی کے بعد اس نے اپنی ساری توجّہ اپنے بچّے کی پرورش کی طرف مبذول کر دی تھی اس کے کرخت جسم اور ابھری ہوئی چہرے کی ہڈیوں سے سخت محنتی ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی عمر کلرکی اور ٹائپ کرتے بیتی تھی۔ اور اب آخری میں علاوہ اور چھوٹی موٹی جنگ کی بخشی ہوئی فکروں کے یہ بیٹے کی جدائی بھی جان کو آزار بن کر لگ گئی تھی آخر کیوں بھیج دیا اس نے اپنے اکلوتے کو جنگ کی بھٹی میں جھونک جانے کے لیے؟ کیا بڑھیا کو اس بیٹے سے بھی کوئی چیز زیادہ پیاری تھی جس کی خاطر وہ ساری عمر کی کمائی کا داؤ لگا بیٹھی تھی۔

ایک بڑا سا آنسو خط پر ٹپکا اور کاغذ کانپ اٹھا وہ دروازے پڑی ہوئی دو اجنبی عورتیں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئیں۔ روفی سوتے میں نیند سے تھکی ہوئی کروٹیں لے رہا تھا اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور آنکھوں کے کونے بھیگے ہوئے تھے۔

تو ان برفانیوں کے دل میں بھی محبت چھپی ہوئی ہے ان کے سینوں میں بھی دل ہیں اور ان میں ٹیسیں بھی اٹھتی ہیں! وہ سمجھتی تھی کہ یہ ایثار اور قربانی صرف مشرقی عورت کا ورثہ ہے یہ مغربی موم کی پتلیاں کیا جانیں۔ محبت کیا چیز ہوتی ہے خصوصاً اولاد کی محبت۔ سنا ہے بڑی بدمعاش ہوتی ہیں۔ بوڑھی ہو جاتی ہیں پر ہوس نہیں جاتی ہے۔ جانور ہوتی ہیں۔ کسی ملک کسی قوم کا ہو۔ گلے میں لعنت کا طوق بن کر چمٹ گئیں۔ اوّل تو بچے پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں اور اگر بدقسمت رد جیں آن ہی ٹپکیں تو کتوں سے بدتر گت بناتی ہیں۔

مگر شمّن نے یہ سب کچھ کہاں سے دیکھ لیا۔ نہ ہی وہ کبھی ان کے ملک میں

گئی اور نہ ہی ہندوستان میں آئے ہوئے باشندے ملک، اور قوم کے صحیح نمائندے کہلائے جانے کے حق دار ہیں تو پھر کس نے بتائیں یہ ساری باتیں یہی باتیں فولادی دیواریں بنی انسانوں کے بیچ میں اڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی آنچ انھیں پگھلا سکتی ہے! کیا یہ لاکھوں کروڑوں سفید اور کالے انسانوں کا خون انھیں گھلا سکتا ہے۔

ساس! ساس کے نام پر اسے ہنسی آگئی بچپن سے اس نے مرکھنی ساسوں کے قصے سن رکھے تھے ہر سڑی گلی چیز کو اس کی ساس کا سر یا کلیجہ بتایا جاتا تھا۔ مگر اسے خواب میں بھی کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ اسے ایسی بھولی گڑیا جیسی ساس ملے گی۔ کاش اس کا سسر بھی زندہ ہوتا۔ ڈکنس کے ناولوں جیسا وہ گردن ہلتی منہ میں پائپ دبائے باغبانی میں دھت بڈھا۔!

کون کہتا ہے وہ کھو گئی سامنے لمبی سیدھی اور روشن سڑک کہکشاں کی طرح جگمگا رہی ہے اس پر دو نہیں تین کھلونوں جیسے ننھے منے انسان آگے قدم بڑھاتے چلے جا رہے ہیں روفی وہ خود اور ماں!

صبح خط دوبارہ پڑھا گیا۔ ساتھ ساتھ ہزاروں لمبے چوڑے قصے یاد آگئے ٹیلر نے چھٹی منانے کی رائے دی مگر شمن کے اصرار پر بادل ناخواستہ جبراً دفتر گیا۔ جاتے وقت ٹیلر نے تاکید کر دی کہ قلم اور بہت سا کاغذ خط لکھنے کے لیے تیار رہے۔ آتے ہی لکھائی شروع ہو جائے گی۔ دوپہر کے کھانے پر شامی کبابوں اور دہی کی خاص فرمائش کی۔ یہ مرد روٹھ جاتے ہیں تو کھانے سے پہلے روٹھتے ہیں۔

شام کو خط لکھا گیا دو لفظ لکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پیاری ماں... نہیں کاغذ پھینک دیا۔ بہت پیاری ماں سب سے پیاری! اب؟ آگے کیا لکھے جیسے آگے کچھ کہنا ہی نہ ہو ان تین لفظوں میں دنیا سما گئی۔ کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد خط لکھا گیا۔ ٹیلر نے کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ نصف سے زیادہ خط شمن کے بارے میں تھا۔

جیسے بادل پھٹ گئے۔ اب باہر جانے آنے میں کوئی خطرہ نہیں ماں چھتری

پھیلا کر کھڑی ہو گئی بوند نہیں پڑ سکتی۔ زندگی مزے سے ہچکولے کھاتی گذرنے لگی۔ جیسے ربڑ ٹائر گاڑی کنکریلی سڑک پر ٹھمکتی چلی جا رہی ہو۔ شکر رنجیاں آتیں اور گذر جاتیں ہر جھٹکے پر دور ہو جاتے مگر پھر سر ٹکرا جاتے، دل ہل جاتے۔ قہقہوں میں آنسو سوکھ جائیں تو کبھی آنسوؤں میں ہنسی ڈوب جائے دنیا کبھی عجائبات کی عادی ہو جاتی ہے خصوصاً جب کہ ڈھٹائی پر اتر آئیں۔ اب سڑک پر گردن موڑ کر بھی کوئی نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہے تو انھیں نہیں دکھائی دیتا۔ جلسوں پارٹیوں میں بھی جاتے اور کوئی متحیر نہ ہوتا۔ لوگوں کو ایک بار مشرق اور مغرب کے مل جانے کا گمان ہونے لگا ان کی شادی ضرب المثل بن گئی۔ حوالے دیے جانے لگے۔

گھر سے بار بار تقاضا ہو رہا تھا کہ آجاؤ، دو چار ہی دن کو آؤ اور اس کا بھی جی چاہ رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی خون کی کشش مجبور کیے دیتی تھی۔ ارادہ بھی کیا مگر پھر ایسی وحشت ہوئی کہ نیند اڑ گئی۔ یہاں کے لوگ تو عادی ہو چکے تھے پر یہ اب نئے پہاڑ کیسے کھودے جائیں گے اور پھر ان چٹانوں کو ہموار کرنے کے لیے جس ماتھا پچی کی ضرورت تھی وہ کس سے جھیلی جائے گی۔ بڈھی بوڑھیوں کے طعنے کیسے سنے جائیں گے۔ سب کی سب ٹیلر کی ماں نہیں بن سکتیں۔ بہن بھائی چھوٹے بچے بچیاں کیا کہیں گے۔ انھیں کون سمجھائے گا۔ چڑیا گھر ہی چلے جاتے ہیں تو جانور بوکھلا اٹھتے ہیں بھلا یہ خوگیر کی بھرتی کیا نہ دند مچائے گی۔ تو وہ نہیں جا سکتی۔

وقت بدل جانے سے زیادہ فرصت بھی کم معلوم ہونے لگی۔ ادھر جنگ کی آگ بھڑکی ادھر وقت کی رفتار میں بھی کوک بھر دی گئی۔ ہر وقت یہی معلوم ہوتا گھنٹے منٹ سکنڈ ہاتھوں سے پھسلے جا رہے ہیں۔ سپلائی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ آئے ہوئے مال کی بھی دیکھ بھال کرنا پڑتی۔ اس کے علاوہ جب ایک ٹوکری میں دو برتن رکھے ہوں تو آبائی حق کے بل بوتے پر ٹکراتے ہیں۔ سینما ہی ایسی چیز رہ گئی تھی جہاں بغیر ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے وقت کاٹا جا سکتا تھا۔ شمن بےکاری سے اور بھی اکتا گئی آنکھ کھول کر پڑھنا اور پڑھانا۔ کچھ نہ کچھ زندگی کا مصرف رہا۔ اور اب

یہ حال کہ دن گذر جاتا تو رات دو بھر ہو جاتی۔ ٹیلر تو تھکا ماندہ آکر مزے سے سو جاتا اور وہ پڑی جاگا کرتی۔ دن کو لازمی طور پر نیند آجاتی اور یہ لمبی لمبی راتیں اور تھکا دینے والی تنہائی اس کا دماغ ہلا ڈالتیں۔ ٹیلر کا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہوتا دن کو وہ کام میں رہتا اور رات کو نیند میں۔ اور شمن اس کی دنیا سے نکلی ہوئی باوجود ساتھ رہنے کے تنہا ہی رہتی جیسے وہ اس کی بیوی نہیں پڑوسن ہے جس سے بوقت ضرورت بات کر لی ورنہ نہیں۔

"مگر سینما میں بھی چخ ہو جاتی۔ "گریٹ ڈکٹیٹر" پر کچھ ذاتی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ بزدلی اور چھچھورا پن ہے...... مذاق تو ہر ایک کا بنایا جا سکتا ہے۔"

ٹیلر جو بغیر سوچے سمجھے ہنس رہا تھا اس فلسفہ پر چڑ گیا۔

"ارے "مائی کیمپف" پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ نازی کیا ہیں۔ شیطان ہیں پورے" اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

"کچھ زیادہ فرق تو نہیں نازیوں میں اور ان کے بھائی بندوں میں، شیطان نئے روپ بھر کر جنم لیتا ہے۔"

"مگر اتنا تو کوئی نہیں۔"

"ہنہ...... بھلا تم کیوں کہو گے۔ ان کے چیلے جو ٹھہرے۔ شاہی پاسبان جو ہوئے۔"

"ہم...... میں...... ہم لوگ برطانوی راج کی حفاظت کے لیے ہرگز نہیں لڑ رہے ہیں۔"

"کہہ دو انسانیت کی حفاظت میں لڑ رہے ہو۔ ہنہ چوٹی بلّی جلیبیوں کی رکھوالی کرنے چلی ہے۔ تو سو چوہے تو پورے ہو گئے اب حج باقی رہ گیا ہے۔ کیا کہنے ہیں۔"

"لیکن اس مرتبہ انصاف ہو گا۔"

"کیوں نہیں لٹیرے ہی انصاف نہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا۔"

"مگر بھئی میں تو لٹیرا نہیں۔ میرے ملک نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم لٹیروں کا ساتھ دو گے تو ضرور لٹیرے کہلاؤ گے۔ بڑے انسانیت کے پہرے دار بنے ہو ذرا ہندوستانیوں کو بھی انسان سمجھ کر دیکھو۔"

"کون کہتا ہے ہم ہندوستانیوں کو انسان نہیں سمجھتے؟"

"تو پھر ان چالیس کروڑ انسانوں کو نازیوں کی چکی میں پستا دیکھ کر تمہارے کان پر جوں کیوں نہیں رینگتی۔ فرانس کو تم بچانے دوڑے۔ پولینڈ کی موت پر چھاتی کوٹ کوٹ کر روئے برطانیہ کے ہاتھ سے دو تین سونے کی چڑیاں جاپانیوں نے چھین لیں تو کلیجے مسل گئے۔ مگر یہ کیسی انسانیت ہے جو بس تمہیں سفید چمڑی ہی میں نظر آتی ہے؟"

"کیوں ہم چین کے لیے بھی لڑ رہے ہیں؟"

"جیسا لڑ رہے ہو وہ خوب معلوم ہے۔ روس کی بھی تو مدد کر رہے ہو۔ دوسرا محاذ کیسے قائم ہو رہا ہے۔ یہ نہ جانے کیا بات ہے کہ کنجی ہی نہیں ملتی۔ ہم جانتے ہیں یہ دوسرا محاذ کب کھلے گا.... جب جرمنی پسنے لگے گا اور روس تھک جائے گا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے اب سینما بھی تمہارے ساتھ دیکھنا حماقت ہے"

طے ہوا کہ فلم بینی بند۔ مگر یہ عہد زیادہ دن قائم نہ رہا اور فرمائش ٹیلر ہی کی طرف سے شروع ہوئی یہ طے پایا کہ اگر ایک انگریزی فلم دیکھا جائے تو دوسرا ہندوستانی بالکل کھرا سودا۔ یہ نہیں کہ وہاں سے تو دنیا بھر کا کوڑا اسمیٹ کر ہندوستانیوں کے سر تھپا جائے اور یہاں کی ایک تصویر بھی نہ دیکھی جائے۔ خیر حکومت کے آگے بس نہیں تو گھر میں تو چلے گا اپنا قانون۔ ٹیلر راضی ہو گیا۔ وہ آسان ہندوستانی بھی سمجھ لیتا تھا۔

"مگر وہ ایک اسٹنٹ پکچر تو جھیل گیا پھر تو یہ حال ہو گیا کہ دو ریلیں دیکھیں اور خفقان اٹھا۔

"یہی فلم تو پچھلے ہفتے دیکھا تھا" وہ ضد کرتا۔

"دو، کیسے ہو سکتا ہے امی ہنسے تو بن کر آیا ہے" شمن لڑتی۔

"نہیں جی یہی تھا۔ وہ چھدّا سا عاشق۔ کیا میں اسے پہچانتا نہیں۔ جنگلوں میں گاتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ جیٹی کی ہیروئین گر پڑی تھی تو...... چلو چلو یہ تو وہی ہے کوئی دوسرا انگریزی فلم دیکھیں۔"

اب شمن کا پارا چڑھ جاتا یوں تو ہر فلم میں یہی ہوتا ہے۔ ہیرو جنگل ہی میں گاتا ہے ہیروئین گرتی ہے تو اسے اٹھانا ہی پڑتا ہے مگر ٹیلر تو اسے جان بوجھ کر جلانا چاہتا ہے جو فلم اچھا بھی ہوتا تو وہ پورے وقت سوتا رہتا اور شمن جلی بھنی منہ سجائے مٹھی ضد سے دیکھا کرتی۔ اور جان بوجھ کر انگریزی کے اچھے فلم میں عاجز بن جاتی غرض کوئی بھی ہو دونوں کا مزہ کرکرا رہتا۔

"یہ تمہارے یہاں ہر کیرکٹر گاتا ہے یا روتا ہے۔"

"اور تمہارے یہاں سوائے لپٹی چپٹی کے اور کیا ہوتا ہے۔" وہ بحث کرتی۔

"یہ کرنا چاہئیے کہ امریکن فلموں کی نقل اتاریں۔"

"ہنہ، بڑے امریکن فلم گندے غلیظ، سوائے ننگے پن کے اور ہے بھی کیا۔"

گو اسے معلوم تھا کہ عام طور پر جو ہندوستانی فلم ذرا بہتر ہوتے ہیں ان میں یہی چالاکی استعمال کی جاتی ہے مگر وہ بنتی رہی۔

"لاجواب ہوتے ہیں۔ تمہارے فلموں میں تو کچھ ہوتا ہی نہیں۔"

"یہ تمہاری سمجھ کا قصور ہے نہ کہ فلموں کا۔ تم ہم لوگوں کی زندگی کا فلسفہ ہی نہیں سمجھتے تم لوگ تو بس جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو فلم دیکھتے ہو۔"

"اوں تو ہمارے جذبات بم کے گولے نہیں کہ ٹھسکیں لگی اور بھک سے اڑ گئے دوسرے اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔"

تلخیاں اور بڑھتیں بحثیں عام موضوع سے ہٹ کر گھر کی چار دیواری میں آن جتیں۔ نجی باتیں پھوٹ نکلتیں اور ایک سرے سے سینما سے بائیکاٹ کرنا پڑتا مگر ریڈیو بھی جان کو روگ کی طرح لگ گیا۔ ان دونوں کو تو بس کسی بہانے

کی تلاش رہتی۔ ٹیلر ہندوستانی گانا سنتے ہی پاگل ہونے لگتا۔ اس کی ضد میں شمع نے پکّے راگ سیکھنے کے لیے ماسٹر رکھ لیا وقت بھی کٹ جاتا۔ اور جنگ کا مواد بھی مہیا ہو جاتا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر استادوں کے راگ سنتی ہر تان پر جھوم اٹھتی ہر گٹ کری پر لرز جاتی اور النکاروں میں کھو جاتی۔ مگر جونہی ٹیلر آتا وہ کھٹ سے لندن جا پہنچتا۔

"یہ ہے اصل نغمہ!" وہ جھوم کر کہتا۔

"ہنہ جیسے بڑا ہوا کتا رو رہا ہو۔" وہ جل کر کہتی۔

"تبھی تو کہتا ہوں سمجھنا سیکھو۔ کان پیدا کرو۔"

"تم ہندوستانی گانا سمجھنے لگو تو یہ کائیں کائیں سنو بھی نہیں۔"

"ہندوستانی گانا کسی عقل والے دماغ میں تو سما نہیں سکتا۔"

اس پر بات بڑھ جاتی۔

"تم میرے ملک کی ہر چیز کو حقیر سمجھ کر مجھ سے دور کرنا چاہتے ہو۔"

"میرے ساتھ تو تمہیں میرے ہی رنگ میں رنگنا پڑے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں کہ میں تمہیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش نہیں کرتی تو تم میرے اوپر جبر کرو۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارا رنگ پھیکا ہے تمہارے مرد زیادہ عقلمند ہیں وہ یورپین لڑکی سے شادی کر کے کس قدر مہذب ہو جاتے ہیں۔ کھانا پینا رہنا سہنا بول چال سب میں سلیقہ آجاتا ہے۔"

"ہنہ خوب۔ یہ ایک اور امپیریلزم کو پھیلانے کی چال ہے کہ اپنی لڑکیاں الوؤں کو پھانسنے کے لیے لگا دی ہیں اسی طرح انگریزیت کا پرچار ہو جاتا ہے ان کا لباس پہن کر ان کی زبان منہ میں لے کر ان کی عورتوں کی آغوش میں بھلا ان کے خلاف چوں کرنے کی سکت رہ جاتی ہے پھر نہ وہ ہندوستانی رہتے ہیں اور نہ ان کی سیاہ چمڑی انگریز بننے دیتی ہے۔ نتیجہ اکثر میں معلق ہو جاتے ہیں۔ ان کی

اولادیں یا تو اپنے دوسرے حسن کے بل بوتے پر پیشہ چلا لیتی ہیں یا آنے جانے والے ٹامیوں کی جوتیاں چاٹتی پھرتی ہیں۔ ایک طریقہ تھوڑی ہے مٹنے کا۔ یوں جذب کر کے بھی تو فنا کیا جا سکتا ہے۔"

"تو پھر تم ہی مجھے اپنے نظام میں جذب کر لو۔ اس کیچڑ میں رہنے کی عادت ذرا مشکل سے پڑے گی۔

"مگر....."

"مگر اصل بات یہ ہے کہ...." "خیر جانے دو"

"کہو میں کوئی بچہ نہیں جو تم چڑا دو اور رو دوں۔"

"یہ کہ یورپین طرز رہائش بہت بلند ہے اور تمہیں یقین ہے کہ وہ جذب ہونے کے لائق ہے اس لیے تم جان بوجھ کر بجائے اوپر اٹھنے کے نیچے کیسے گھسیٹی جا سکتی ہو تم لوگ دل سے یورپین معاشرت کے مداح ہو۔"

"بڑے حسین مغالطے ہیں۔"

جھک جھک ہوتی مگر شمن دل میں ضرور نادم ہوتی۔ یہ کیا بات تھی کہ وہ یورپ کی اتنی بڑی مخالف ہوتے ہوئے بھی انجان طور پر اسی رنگ میں رنگتی جا رہی تھی وہ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتی بیڈ پر سوتی اور چھوٹے چھوٹے قواعد پر عمل بھی کرتی۔ یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں اس ندامت نے ضد کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی۔ معمولی بیماری کے بہانے سے کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ اور کرتا پہننا شروع کیا۔ مگر شیر نے محسوس بھی نہ کیا اسے غرارہ بے انتہا پسند آیا۔ بالکل اسکرٹ معلوم ہوتا تھا۔

تو گویا جس چیز میں اسے اپنی معاشرت کی جھلک نظر آتی تھی وہ اچھی اور قابل پسند تھی! اتنا دشمن خیال ہوتے ہوئے بھی وہ انجان طور پر کس قدر کوتاہ بین تھا جہاں تک ہوش و حواس کا ذکر تھا وہ وسیع نظر تھا۔ مگر یہ

لاشعور کی پاسبانی اس کی طاقت سے باہر تھی۔ یہ صدیوں کی جمی ہوئی کائی آسانی سے نہیں کھرچی جا سکتی تھی یہ حال ہے ان روشن خیالوں کا تو کوتاہ نظر والوں کا تو کہنا ہی کیا وہ کتنا بھی چاہیں احساس برتری دماغ سے نہیں نکل سکتا انسانیت ہمہ گیر برابری کو مانتی ہے یہ دماغ میں جو چور بیٹھا ہے وہ کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا ہے۔" پانچ انگلیاں یکساں نہیں۔ انھیں کھینچ تان کر یا کاٹ چھانٹ سے برابر نہ کرو...... ہاتھ بدوضع اور بھونڈا ہو جائے گا۔ دنیا کی شوبھا اسی اونچ نیچ سے قائم ہے۔ اس معاملے میں روشن خیالی خام خیالی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

اور گھر میں ایک عجیب کش مکش شروع ہو گئی۔ جیسے گاما اور زبسکو جٹے ہوئے ہیں وہ اپنی طرف کھینچتا ہے یہ اپنی طرف کبھی یہ دانوں لگا کر جیت کرنے لگتا ہے تو وہ پلٹا مار جاتا ہے ساتھ ساتھ ذہنی رسّہ کشی بھی بڑھتی گئی کیسے پار لگے گی۔ یہ دو انجنوں کی کشتی جس میں دونوں انجن مخالف سمت کو دوڑ رہے ہیں کبھی دو انچ مشرق کی طرف بہتی ہے تو کبھی دو انچ مغرب کی سمت۔ نتیجہ وہی انجماد۔ گھٹن اور گوفت اوپر سے طوفان تلا کھڑا ہے جو جیبیں منہ پھاڑ پھاڑ کر دوڑ رہی ہیں اور ناخدا نے جنم ہی نہیں لیا۔

زندگی سے تھکی ہاری ٹہلتی ہوئی دور نکل گئی۔ آنج ہی ٹیلر سے تیز ہوئی تھی زخم تازہ تازہ تھے پارک میں بنچ پر ذرا دیر کو سستانا چاہا مگر جیسے سانپ نے جھٹک لیا یہ بنچ آخر بنچ کیوں چبوترہ کیوں نہیں۔ یہ سارے نوٹس سارے اعلانات یہ انگریزی میں کیوں؟ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ذرہ ذرہ مالکوں کی دست درازیوں سے کچلا ہوا۔ میلے کچیلے تھیلوں کی وضع کے تیلون بھدیلی فراکیں...... ٹوٹے ہوئے پائے والی کرسیاں اور کھرچی ہوئی میزیں۔ ان درندوں کے خونی پنجوں کے نشان بچے بچے پر کھدے ہوئے ہیں۔ کیسے بھریں گے یہ گھاؤ۔

اس کا جی چاہا پنج کو ایک ٹھوکر لگائے اور زمین پر لوٹ لگا دے یہ امپیریلزم کے پھٹے کاش کوئی غیبی ہاتھ ان گندگیوں کو چن کر کہیں دور سمندر میں جھونک دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ ان سفید پوشوں کے داغوں کو بھی دھو ڈالتا جو سیاہی اور گرمی سے تپ کر کوڑھ کے زخم بن گئے ہیں جن کی عفونت نے انسانیت کا دم گھونٹ رکھا ہے۔

”ادہو السلام علیکم....... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں“ کسی جانی پہچانی سی آواز نے پہلو سے پکارا۔ اور وہ چونک پڑی۔

”ارے...... تم...... آپ“ وہ حیرت زدہ ہو کر پروفیسر کے بگڑے ہوئے حلیے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو واپڈا کی سازش معلوم ہوتی کہاں وہ ٹک ٹک سے درست چھیل چھبیلے پروفیسر اور کہاں یہ ڈھیلے ڈھالے کھدر میں غرق بد وضع شاعر نما لیکن انتہائی غیر شاعرانہ انسان۔

”مگر آپ تو چلے گئے تھے“

”ہاں اور آ بھی گیا تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے۔ تم تو ایسے چونکیں جیسے میں کوئی مردہ ہوں جو کفن پھاڑ کر آن کھڑا ہوا“

”کچھ نہیں اصل میں یوں ایکا ایکی ملنے کی امید تو نہ تھی۔ مگر یہ......“

”کہو کہو......“ وہ خوش مزاجی سے مسکرایا۔

”کچھ نہیں جانے بھی دیجئے اتنے دن بعد ملیں اور پھر وہی جنگ شروع کر دی کہئے خیریت تو رہی؟“

”پوچھو مت۔ خود دیکھنے کی کوشش کرو“

”بس اب دیکھئے مجھے الزام نہ دیجئے گا۔ آپ ہی چھیڑ رہے ہیں۔ کوئی بات منہ سے نکل گئی تو تنتنا اٹھیں گے“

”دو آزماؤ تو ایک بار۔ اب وہ نازک مزاجیاں نہ رہیں“ پروفیسر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"معلوم ہوتا ہے کسی سے عشق ہو گیا۔"

"جی ایسا ویسا عشق۔ شدید قسم کا۔"

"مبارک ہو۔ مگر یہ ہوا کیسے؟"

"عشق ہونے میں بھی کیا کوئی پل بل لگتے ہیں۔"

"مگر معاف کیجئے گا یہ ڈھونگ تو کچھ قوم پرستوں کا سا رچایا ہے۔"

اس نے سر سے پیر تک نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے" پروفیسر چپکے سے بولا۔

"مگر یہ بات کیا ہوئی۔ کم از کم آپ سے تو یہ امید نہ تھی۔"

"کیا امید ...... یہ ڈھونگ رچانے کی ....."

"جی ...... یہ لباس یہ کالکیں ..... اور یہ ٹیکا ..... کمال کر دیا آپ نے تو۔ تب تو آپ کمیونسٹ بھی ہو گئے ہوں گے۔"

"لازمی طور پر" پروفیسر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"وہ تیرہ سو کی نوکری؟"

"وہ چھن گئی۔"

"وجہ؟ آپ تو ....."

"سخت نالائق نکلا۔ کبھی تو یہ روپ دھار لیا" پروفیسر کی آواز میں طنز کی تلخی نہ چھپ سکی۔ شمن نے بے اعتباری سے پروفیسر کو گھورا۔ یہ وہ کیا پینترے چل رہا تھا۔ اس شخص پر بھروسہ نہ تھا دم بھر میں الو بنا دیتا اور پتہ بھی نہ چلتا۔ پر آج تو وہ خود بگلا بھگت بنا بیٹھا تھا۔

"کچھ آپ بیتی بھی تو سناؤ۔ ہاں بھئی شادی کی مبارک باد دینا تو بھول ہی گیا۔"

"جی ہاں۔ آخر کو ایک کارندہ پھانس ہی لیا۔ جنگ کا زمانہ ہے ہر چیز مہنگی ہو رہی ہے۔"

"میرا ہی جوتا میرے ہی سر لیکن مجھے تم سے یہی امید تھی برا نہ مان جانا۔ دراصل شادی بیاہ کے معاملے میں میری رائے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مگر کہیں تم نے شادی صرف اس لیے تو نہیں کر ڈالی کہ تمہیں ذرا عجیب و غریب بننے کا شوق ہے...... سنو سنو بیچ میں نہ بولو۔ اگر اس وجہ سے کی ہوتی تو تم خوش اور اس قدر مطمئن نہ نظر آتیں۔"

"میں خوش نظر آتی ہوں؟" وہ کھوکھلی آواز میں ہنسی۔

"کم از کم صورت اور صحت تو یہی کہتی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ کچھ کرتی بھی ہو یا کام چھوڑ دیا؟"

"بہت دن ہوئے چھوڑ دیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اوہ بھولی... ...آپ تو "کام" کر رہے ہوں گے۔ پروفیسر مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا

"اب تو آپ سرکاری کمیونسٹ ہیں۔ اب تو راج ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔"

"قومی جنگ کا بھی کام جاری ہوگا۔"

"بڑی تیزی سے۔"

"بھئی مزے ہیں آپ لوگوں کے۔ ایک بیچارے وہ کمیونسٹ تھے جو چوہوں کی طرح بلوں میں چھپتے پھرتے تھے، پاگل کتوں کی طرح دوڑائے جاتے تھے۔ ایک آپ ہیں کہ......"

"مزے سے وائسرائے کے ساتھ ڈنر اڑا رہے ہیں...... موٹریں ...... گھوڑا...... گاڑی کیا ہے ہم لوگوں کو۔" شمن نے بھر طنز کی کڑواہٹ پر منہ بنایا۔ مگر پروفیسر کی مکار دھنسی ہوئی آنکھوں اور بے معنی مسکراہٹ نے گڑبڑا کر رکھ دیا۔

"اچھا تو وہ آپ کی محبوبہ کون ہیں۔"

"ہے ایک بنگال کی حسینہ۔"

"بنگال کی۔"

"ہاں...... تمہیں نہیں معلوم۔ ارے بنگال ہی میں تو میرا تقرر ہوا تھا۔ بس وہیں ایک کافرہ کے تیر نظر کا گھائل......" شمن گھبرا کر دور ہٹ گئی۔ پروفیسر کی آنکھیں بھیانک طور پر سکڑ گئیں ان میں عجیب نامعلوم سا خوف بھر گیا۔ جیسے وہ کسی ڈراؤنے خواب کو نیم بیداری میں دہرا رہا ہو۔ اس کا جسم پہلے سے نصف بھی نہیں رہ گیا تھا چہرے پر بڑھاپے کے آثار اچانک برس پڑے تھے اس لیے مسخ ہو گیا تھا۔ بال کتنے سفید ہو گئے تھے جیسے وہ بن جھاڑ کر چلا آ رہا ہو وہ چکرا گئی۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔ گھر چلیں گے یا دیر ہونے کا ڈر ہے" اس نے بنچ پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چلوں؟" پروفیسر نے جاگ کر جواب دیا۔

"ہاں کیوں نہیں...... ٹیلر تو شاید دیر سے آئے۔"

"تلی نہ پھاڑ دے کالا آدمی دیکھ کر!"

"مگر تم تو سرکاری کالے ہو۔"

"پھٹکار ہو...... کیوں؟" وہ خوش مذاقی سے ہنسا۔

گھر پہنچے تو وہ دیر تک گھوم پھر کر مکان دیکھتا رہا۔ کھانے پر اس نے ہوکے زدہ ہو کر ایک دم نوالے نگلنا شروع کیے۔ مگر پھر ٹھٹک گیا۔ جیسے ایک دم اُبکائی نے گلا دبوچ لیا ہو اور پھر نگلنا شروع کر دیا۔

"ذرا ہاضمہ بگڑ گیا ہے مرغن کھاتے کھاتے"۔ وہ پھر بے معنی طور پر مسکرایا۔ کھانا کھاتے ہی وہ روانہ ہو گیا جیسے کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو۔

"پھر آؤں گا اب تو گھر دیکھ لیا ہے۔ فیرنی خوب تھی۔" وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا اس کے جانے کے بعد شمن چپ چاپ اداس بیٹھی رہی۔

رس بڑھتا جا رہا ہے وہ قطعی متاثر نہ ہوئی۔ سب ڈھونگ بگلا بھگت ہیں کے۔ انسانیت کے سگے بن کر چلے ہیں حمایتی۔ کہیں رہی سہی انسانیت کو بھی نہ ہڑپ کر جائیں۔

رعب جمانے آیا ہوگا میرے اوپر۔ وہ کوئی اور ہوں گی جو ان ہتھکنڈوں پر ریجھ جاتی ہوں گی غبن وبن کیا ہوگا کم بخت نے جو نکالا گیا تو اپنی سیاہی پر پردہ ڈالنے کو لال جھنڈے کی آڑ میں آن ڈبکا۔ کچھ ایسی چوریں، تو ہوتی بھی نہیں یہ بنگالنیں سوائے آنکھوں کے اور ہوتا ہی کیا ہے مگر یہ دو ٹکے کے شاعر انہی پر مرتے ہیں لیکن بنگال میں تو قحط پڑ رہا ہے!

اور یہ کونسی نئی بات ہے" قحط پڑے یا ہریالی ہو بیوہ کی مانگ تو ویسے ہی اجڑی رہتی ہے" روفی تھکا ہارا اجڑا بجڑا آتا ہو آیا اور سو گیا اور کوئی دن ہوتا تو وہ کوئی بات نکال کر اس بنگال کے قحط کا تھوڑا سا بدلا تو اس کا خون جلا کر لیتی۔ مگر پروفیسر نے جیسے اس کی روح تک کو کچل دیا ہو۔

جلی بھنی بیٹھی تھی کہ بیرے نے پروفیسر کے آنے کی اطلاع دی۔ جی چاہا کہہ دے دھکّے مار کر نکال دو۔ مگر پھر سوچا دو چار چٹکیاں تو کم بخت کی ڈھیٹ بوٹیوں میں لی ہی جائیں چنانچہ بلا لیا۔

پروفیسر کو دیکھ کر وہ پھر چونکی۔ یا خدا یہ دنیا ہے یا مداری کا تھیلا مرغی کا پر۔ ڈالو کبوتر کا بچّہ نکال لو۔

"میرے بالوں کو دیکھ رہی ہو...... بہت کاٹ دیے کم بخت نائی نے۔ میں نے کہا بھیّا ذرا اچھے کاٹ دینا۔ اس نے گُدی کھرچ ڈالی۔" اس نے گردن سہلا کر کہا اور شمّن کے منہ پر طمانچہ سا لگا گویا کہتا ہے تم سمجھتی تھیں مجھے ڈھول تاشوں کی ضرورت ہے ویسے مجھ میں کچھ دم خم نہیں یہ لو میں نے یہ ہتھیار بھی پھینک دیے اب آ جاؤ میدان میں۔

"میں تمہارے پاس ایک غرض سے آیا ہوں۔ تنہائی سے اکتا جاتی ہو گی۔" شمن کے کان تمتما گئے اور وہ بھی سمجھ گیا اس لیے جلدی سے بولا۔

"اتنی حساس نہ بنو۔ ذرا غور سے سنو۔ مذاق کو چھوڑو۔ ہاں پہلے میری اس دن کی بکواس کو معاف کر دو میں مذاق کر رہا تھا۔ مگر معلوم ہوا تم بڑی بدمذاق ہو گئی ہو۔ وہ تمہاری قیافہ شناسی کیا ہوئی یا صرف بنا کر رکھی تھیں دو لفظوں میں میری داستان سن لو یقین نہ آئے تو کوئی پروا نہیں۔ ہمارے تعلقات نجی باتوں پر نہیں بگڑے ناچاشیں میں کلکتہ بھیجا گیا تھا۔ وہاں کیا کچھ دیکھا اور کیسے دیکھا یہ نہ پوچھو اور نہ ہی کوئی بیان کر سکتا ہے بھوتوں میں یقین تو نہیں کرتا مگر کوئی بے آسیب ہو چمٹ گیا اور مجھے استعفا دے کر بھاگنا پڑا۔ آمدم بر سر مطلب ہمارے کچھ کلرکوں کی کمی ہو گئی ہے بہت معمولی کام ہے ہفتہ میں دو تین روز کام دیکھنا۔ دفتر کا کام نہیں۔ وہ تو ہم نے انتظام کر لیا ہے بلکہ...... اگر تم تیار ہو تو خیر ورنہ......"

"کیا سو کام ہے؟"

"جی تو چاہتا ہے کہہ دوں......" وہ شرارت سے مسکرا دیا۔

"کہیے۔ کہیے نا۔"

"رہنے دو کہنے سننے کے لیے تو بہت وقت پڑا ہے...... سنو کام یہ ہے کہ ہم نے چند سنٹر مقرر کیے ہیں جہاں ہمارے آدمی جا کر اناج بٹتے وقت انتظام کرتے ہیں۔"

"کیسا اناج؟" لیکن وہ جھینپ گئی اسے وہ لمبی لمبی قطاریں بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے کے ٹکریں مارتی ہوئی اناج کی دوکان کے سامنے کھڑی یاد آ گئیں۔

"ایسا مشکل کام نہیں بس عورتوں کو ایک قطار میں سیدھا رکھنا اور یہ دیکھنا کہ منتظمین خواہ مخواہ تنگ تو نہیں کرتے۔ اناج کے سنٹر کم ہیں اس

سے لے بھیڑنا قابل بیان ہوتی ہے سنبھال سکو گی؟"

"سنبھالنے کو کیا ہوا مگر......"

"کیا تم اپنی مگر کو دو چار مہینے کے لیے سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔ میں کوئی بھاگ نہیں جاؤں گا۔ جانتا ہوں تمہارے دل میں ہزاروں لاکھوں سوال کھلبلی مچارہے ہیں مگر یہ وقت ان سوالوں کو حل کرنے کا نہیں"

"بے سمجھے بوجھے کوئی کام....."

"نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اوّل تو ذرا سا مطالعہ کرو، ذرا اخبروں میں دلچسپی لو تو خود بخود سارے جواب مل جائیں گے۔ اور ویسے اگر تم سے بحث کرنے بیٹھا تو خوب جانتا ہوں ہار جاؤں گا"

"تو آپ کھوکھلی بنیادوں کے بوتے پر بحث کریں گے۔ بنیادیں کھوکھلی تو نظام بھی کھوکھلا"

"وہ دیکھو میں ہار گیا۔ کہتا ہوں تم اسے کمیونسٹوں کا کام نہیں خدا ترسی سمجھ کر کر دو۔ اگر جی چاہے تو۔ ورنہ زبردستی نہیں"

"پروفیسر نے ہتھیار ڈال کر جو ستیہ گرہ کی پالیسی پکڑلی اس پر شمن جھنجلائی تو بہت مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے قائل کرے۔ غنیم بحث پر ہی تیار نہیں۔ ورنہ دو لفظوں میں پرخچے اڑ جائیں۔

"کیا ہے ذرا شغلہ ہی ہاتھ آجائے گا۔ جواب دوں تاکہ پھر کوئی دوسرا راستہ نکالوں"

"میں آؤں گی"

"تو میں کل ہی تمہارے پاس ہفتہ بھر کا پروگرام بھیج دوں گا"

اور دوسرے دن وہ آٹھ بجے روانہ ہو گئی ابھی اناج بانٹنے میں دو گھنٹے باقی تھے مگر ہجوم کا یہ حال تھا جیسے کسی بڑے دیوتا کے درشن

کا جماؤ لگا ہوا ہے نوچ کھسوٹ دھکم دھکا بس نہیں جو ایک دوسرے کو نگل جائیں۔ جوں ہی مندر کے پٹ کھلے خلقت طوفان کے ریلے کی طرح ٹوٹ پڑی۔ "ہٹو ہٹو..... پیچھے ہٹو" پولیس نے کوڑا گھما کر جاتریوں کو پیچھے دھکیلنا چاہا مگر توبہ کیجیے ان دیوتا کی کشش یوں کوڑوں سے کمزور کی جا سکتی تو پھر مشکل ہی کیا تھی۔ یہ پھڑکتے ہوئے بھوکے خود اپنے ہاتھوں سے جسم کی کھال ادھیڑ لیتے۔ بدن دیکھو تو ایسے سوکھے جیسے گھسے ہوئے کپڑے میں کھپچیوں کا ڈھیر لپیٹ دیا ہو۔ مگر ہوس دیکھو تو پہلوانوں جیسی چاول کا دانہ دیکھتے ہی جسم میں بھوت جاگ اٹھتے ہیں وہی کھپچیاں جو پٹ کھلنے سے پہلے ٹھیرے سے بھی زیادہ بے جان ہو رہی تھیں بجلی کی سرعت سے جی اٹھتی ہیں اور پھر زبانیں تو خدا کی پناہ۔ تیل نہیں ملتا تب ہی اس تیزی سے چلتی ہیں اگر دو چار چٹ پٹے نوالے پہنچ جاتے تو نہ جانے کہاں پہنچتیں اور پھر یہ زبانیں عورتوں کی قطار میں چل رہی تھیں۔

بڑی مشکلوں سے ان بے کل کیڑوں کو قطار میں کھڑا کرنے کی کوشش جاری تھی اگلے حصّے کا انتظام شمّن کے ہاتھ آیا گو یہاں قدرے سکون تھا کیونکہ اناج قریب تھا مگر پچھلے حصّے میں باوجود تین چار لڑکیوں کی جدوجہد کے اودھم برپا تھا ڈیڑھ دو فرلانگ لمبی لکیر بالکل زہریلے سانپ کی طرح دم پیچ پیچ کر تلملا رہی تھی۔

یہ عورتیں تھیں یا بھوکی کتیاں! صنف نازک اس طرح بدتمیزی سے اچھل کود مچائے تو جی برا ہو ہی جائے گا شمّن نے کئی بار انھیں سمجھانے کی کوشش کی مگر شاید وہ زبان بھی نہ سمجھتیں تھیں اور نہ جانے کیا کچھ جنگلی زبان میں چیخ پڑیں۔ دھوپ تیز تھی معلوم ہوتا تھا سورج سے گیلی گیلی بھوبل برس رہی ہے کوئی بجھی ہوئی راکھ جسم پر پوت رہا ہے اور پھر ان گنواروں کی گھٹی گھٹی سڑاند..... سر بھنا گیا۔

سب سے اگلی عورت سخت لڑنے کا مٹی کی بنی ہوئی تھی نہ جانے دکان دار سے کیا چیخ چیخ لگار کھی تھی اور کھسکنے کا نام نہیں لیتی تھی کبھی پیر پکڑتی تھی کبھی اسی ہاتھ سے سر کوٹنے لگتی تھی جمعدار جی کا ہنٹر گھوما اور وہ روتی بسورتی گھسیٹ کر دور پھینکی گئی۔ کچھ اناج کی برائی کر رہی تھی بازار میں دو سیر کا تھا تو یہاں ساڑھے تین سیر پھر بھی ہائے ہائے بند نہ ہوتی تھی لیکن سب سے پہلی عورت کا مرض متعدی معلوم ہوتا تھا کیونکہ جو آگے بڑھی اڑ کے رہ گئی اور دو چار کو ہنٹروں سے ہٹانے کے بعد قطار میں بذریعۂ لاسلکی خبر دوڑ گئی کہ مال گھٹنا ہوا ہے۔

اتنے میں اس نے دیکھا پروفیسر بھیڑ میں کہنیاں چلاتا تیرتا چلا آرہا ہے ایک بار اس نے تمن کو دیکھا مگر آگے بڑھ گیا۔ آگے پہنچ کر اس نے ہاتھ چلا چلا کر دوکان دار سے بالکل ایسے لڑنا شروع کیا جیسے وہ عالم فاضل پروفیسر نہیں بلکہ قطار والیوں کا کوئی بھائی بند ہے۔ زبان بھی تو وہ کوئی نئی بول رہا تھا جس میں گجراتی مرہٹی اردو اور انگریزی الجھی ہوئی تھی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے پیچ و تاب کھانے شروع کئے اور کنڈلی مار کر ایک بار ہی دوکان میں گھسنے کی کوشش کی۔ ڈھیل تمن کے لحاظ پر ہوئی وہ پروفیسر کی طرف متوجہ ہوئی اور بلوہ ہو گیا۔ باڑ بکھر گئی۔ آہیں اور سسکیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ بھوکے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچنے لگے زبانیں پھڑ پھڑانے لگیں۔

پچھلے حصے کا انتظام کرنے والے آگے دوڑے۔ پروفیسر بھی دوکان دار سے نبٹ کر موقع پر آ گیا۔

"ابھی ملے گا اناج..... یہ بوریاں غلطی سے آ گئی تھیں۔ تھوڑا صبر کرو بھو"

اس نے چیخ کر آگے پیچھے لپکنا شروع کیا۔ مگر معلوم ہوتا تھا صبر بھی

جنگ کے ساتھ کھل کھلا کر خاک ہو گیا تھا۔ انہیں بھنیں بن گئیں۔ نہ جانے کیا ہوتا مگر معلوم ہوا کہ اناج آ گیا اور پھر لنگر جاری ہو گیا۔

ٹیکسی میں بٹھاتے وقت پروفیسر نے شرمندہ ہو کر اس کی نفیس جارجٹ کی ساڑی کو دیکھا جو قریب کی موری میں ڈوب کر مرے ہوئے چوہے کی طرح لٹک رہی تھی۔

"آج تو تم تماشہ دیکھنے آئی تھیں مگر مجھے یقین ہے۔ بدھ کے دن جب آؤ گی تو اصل لطف آئے گا۔ آؤ گی نا؟ دو دن آرام کر لو۔"

"کوشش کروں گی۔" اس نے اپنے دکھتے ہوئے کندھے تکیے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ ساڑی کا لتھڑا ہوا کونا پنڈلی پر رینگا اور اسے پھریری آ گئی۔

۴۳

کام غیر دلچسپ تھا اور تکلیف دہ بھی لیکن اتنا تو ہو گیا کہ شام کی تھکی ہوئی خاموشی ٹوٹ گئی۔ ٹیلر بڑی دلچسپی سے ان معرکوں کا حال سنتا۔ آئے دن نیا ڈرامہ دیکھنے میں آتا انسانوں کی ایسی ایسی فاش کمزوریاں دیکھ کر کبھی تو جی جل اٹھتا۔ آخر ہندوستانیوں کو ترتیب سے کیوں اس قدر نفرت ہے۔ ہر کام میں بس گڑبڑ ہو جاتا ہے۔

"انھیں سدھانا مشکل ہے۔" ٹیلر نے سب کچھ سن کر کہا۔

"جاہل ہیں نا بے چارے۔" شمن رسانیت سے بولی۔

"ہاں اور دوسرے کچھ ہے ہی ان کی خصلت میں۔"

"بھوک کے آگے کیا یاد رہے۔" شمن نے ذرا ضبط کر کے کہا۔

"مگر اناج تو برابر مل رہا ہے۔ دراصل یہ لوگ ہوتے ہی بے اصول ہیں۔"

"خاک مل رہا ہے اناج سارا ایسا ہی گھُن لگا ہوا چاول اور گھُنا ہوا گیہوں۔"

"مگر ہم نے پنجاب سے تازہ گیہوں منگوایا ہے۔"

"منگوایا ہوگا مگر ملتا نہیں، وہ تازہ گیہوں تو کیا کھیتوں میں جب سڑ جائے گا تب نکالا جائے گا۔"

"یہ تو بڑی مصیبت ہے۔"

"اور کیا پھر سرکار سنتی بھی تو نہیں۔"

"سرکار کیا کر سکتی ہے جب ڈاکو تاک میں لگے ہوئے ہوں۔"

"یہ ڈاکو بھی سرکار کے ہی پٹھو ہیں۔ ہر سال انسان کشی کے سلسلے میں خطابات ملتے ہیں ان کو۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو گویا میں ہی سرکار ہوں۔"

"سرکار کے حمایتی تو ہو۔"

"یوں تو تم بھی سرکار کی حمایتی بن گئیں۔ راشن اسکیم میں کام کرتی ہو جو سرکاری ہے۔" شمن ذرا اس جرح سے لاجواب ہو گئی۔

"تو اس میں عیب ہی کیا ہے۔" ٹیلر صلح کے انداز میں بولا۔ "تم تو بالکل بچوں سی باتیں کرتی ہو۔"

"میں سرکاری ہتھکنڈے سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے اداس ہو کر کہا۔ ٹیلر آج اسے منانے پر تلا ہوا تھا۔

"صبر کرو۔ وہ وقت بھی آجائے گا۔"

"کون سا وقت؟"

"جب تم ان ہتھکنڈوں سے آزاد ہو سکو گی۔ نہ جانے تم لوگ اس قدر کم ہمت کیوں ہو۔ ذرا سی بات پہ ناامید ہو جاتے ہو ہمارے ملک کی تاریخ پڑھ کر بھی تم نے کوئی سبق نہ حاصل کیا.... یہ احساسِ شکست کب دور ہو گا تمہارے دلوں سے"

"شکست کھا کر بھی محسوس نہ کریں اچھا ظلم ہے"

"شکست کھا کر اگر دوگنے جوش سے آگے بڑھو تو احساس خود بخود زائل ہو جائے گا۔ اگر صرف رونے سے کام چل جایا کرتا تو شاید کبھی کا قصہ ختم ہو جاتا۔ ہندوستان میں کتنی آنکھیں ہیں جو دن رات خشک آنسو نہیں بہاتیں" آج ٹیلر میں کھویا ہوا انسان واپس لوٹ رہا تھا۔ گھر کے جھگڑوں نے انھیں کس قدر حیوان بنا دیا تھا دونوں طرف مورچہ بندی شروع ہو گئی تھی۔ اور اس آپس کی جنگ نے دنیا بھر میں بھڑکتی ہوئی آنچ کو نظرانداز کر رکھا تھا اپنے کھرونچوں کے آگے انسانیت کے کلیجے میں رستا ہوا گھاؤ نظرانداز کر دیا تھا۔

وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھی۔ لوٹ کر اس نے جیسے بالکل انجان بن کر ٹیلر کے سنہرے بالوں میں انگلیاں ڈبو دیں۔ کتنا نرم گرم احساس تھا گلے میں اٹکی ہوئی گرہ دکھنے لگی۔

"روفی!" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور نہ ہی ٹیلر نے کہنے دیا۔

"ممی کا خط" ٹیلر نے اسے جاگتا پا کر ڈاک اٹھا کر دے دی۔

"ذرا دیکھنا.... بڑی بی نے کیا کیا الٹا مارا ہے۔ سمجھتی ہیں میں اب تک وہی دو فٹ اونچا روفی ہوں جسے پورے وقت نگرانی کی ضرورت ہے"

روفی چلا گیا تو وہ لیٹی خط پڑھتی رہی ماں نے لکھا تھا کہ کیا کیا کھانے

ٹیلر کو پسند ہیں اور کن چیزوں سے نفرت ہے۔ وہ رومال بہت کھوتا ہے اور یہ عیب ایک بیوی کے لئے وبالِ جان ہے اس کے موزے بھی بہت پھٹتے ہیں۔ اگر وہ رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے پیر دھلا کر ٹیلکم پاؤڈر چھڑک دیا جائے تو......"

ہارا ہوا دماغ نیند میں لپٹا دھانوں کے ہرے بھرے خواب دیکھتا رہا۔ سانولی مٹی کے گداز سینے پر دھانوں کے ننھے ننھے سنہرے دانے گھنگھروؤں کی طرح ٹپکے، کنجوس مٹی کب تک ضد کیے منہ موڑے رہتی۔ آن کی آن میں سورج کی نوکیلی کرنوں نے انھیں گدگدا کر زندگی کی رمق پیدا کر دی۔ وہ پہلا پانی چھل چھل ناچتا ان میں جذب ہو گیا۔ "دیکھتے دیکھتے ہرے بھرے دھان شرابیوں کی طرح جھومنے لگے۔"

اب کشتی کشتی ڈھیلی پڑ جائے گی۔ نیا دھان آ گیا! پھٹی پھٹی آنکھیں شکم سیری کی نیند میں نشیلی ہو جائیں گی۔ نیا دھان آ گیا۔ اب سسکتے ہوئے بنگال کے حلق میں بھی امرت ٹپکے گا۔ نیا دھان آ گیا.... اب قحط ختم! خالی مٹھیوں میں یہ دھان سونے کے ٹکڑے بن جائیں گے خالی ڈھنڈار خزانے بھی دولت سے مالا مال ہو جائے گا.... کروٹ لیتے میں اس کی گردن ڈھلک کر ٹیلر کے سینے پر ٹک گئی۔

آنکھ کھلی تو ٹیلر کی ناچتی ہوئی سیٹی کان میں گونجی۔ وہ آئینے پر جھکا ہوا سیفٹی ریزر سے گال کھرچ رہا تھا اس کی آنکھیں سچے نیلم کے ٹکڑوں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور شمن کو کانچ کی وہ نیلی گولیاں یاد آ گئیں جنھیں بچپن میں اس نے کندن کے ساتھ مل کر کیاریوں میں بو دیا تھا۔ وہ ایک دم مسکرا اٹھی۔

شمن کو زور سے ہنسی آ گئی یہ مائیں اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں

سب کی سب ایک ہی جیسی لیکن ٹھیک ہی کہتی ہیں کتنے دن ہو گئے شمن نے ٹیلر کے کپڑوں کی مرمت نہیں کی۔ بٹن ٹوٹ گئے ہیں کالر گھس گئے ہیں۔ موزوں کی پچاس جوڑیاں ہوں گی مگر سب کی ایڑیاں اور پنجے غائب۔ دیر تک بیٹھی وہ کپڑوں سے کھیلتی رہی۔

چاہتی تھی کہ کسی طرح کام سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پروفیسر سے ہی جھڑپ ہو جائے کہ اس بہانے مصیبت سے جان چھوٹے۔ اب اسے بڑی تھکن ہو جاتی تھی اور موسم بھی ناگوار ہوتا جا رہا تھا ہفتے میں دو کے بجائے تین دفعہ جانا پڑا کیونکہ ملیریا کی وجہ سے مددگاروں میں اور کمی آ گئی تھی اور کام بھی کیا گویا بندر سدھانے پڑ رہے ہیں۔ اسکول میں وہ ہمیشہ اعلیٰ جماعتوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ بد تمیز چھوٹے بچے اسے کبھی نہ بھگتنے پڑے۔ لیکن ان عورتوں کو قطار میں کھڑا رہنا سکھانے سے تو بکریوں کو پڑھانا آسان تھا۔ کھوپڑیاں ہی نہ تھیں بس ساری قوتیں سمٹ کر دھان کے دانے سمیٹنے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ خیر دو چار دن کی بات ہوتی تو کچھ نہ تھا۔ مگر یہاں تو مہینوں کا سلسلہ تھا۔

بے وقت کے مہمان سب ہی کو کھلتے ہیں مگر پروفیسر کو آتا دیکھ کر تو جی ہی لوٹ گیا۔ کم بخت بھوکا تو آیا ہی ہو گا۔ چائے پر دو وقت کے کھانے کا انتظام کر لے گا۔ بجبر خوش آمدید کہنا پڑا۔

"نہیں چائے پینے کی فرصت نہیں شیلا رہ گئی تھی ویسے بھی آج ایک سو چار بخار چڑھ آیا۔ عورتوں کا معاملہ ہے ورنہ ویسے تو کام چل رہا ہے۔"

وہ کچھ مجبور اور شرمندہ سا ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "ایک تم مسلمان ہو جو اس کام میں دلچسپی لے رہی ہو۔ سنا ہے پردہ چھوڑ دیا ہے مسلمانوں نے بھی مگر شاید صرف جلسوں پارٹیوں کے لیے چھوڑا ہے"

"مگر جب لڑکیاں موجود ہیں تو ہندو مسلم کا سوال کیوں اٹھاتے ہیں۔"

"یوں نہیں ...... کوتاہ نظر ہوں۔ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہوئے کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے کہ ..... خیر تم تو آؤ گی؟"

"کیا خیال آ جاتا ہے؟ کیا اب راشننگ میں بھی پاکستان قائم کرنے کا ارادہ

ہے۔" اس نے سوئی چبھو ہی دی۔

"پھر بحث!"

"بات نہ ٹالیے یہ آپ کے کون سے لینن یا اسٹالن نے بتایا ہے کہ حصّے بخرے کر دیئے گئے تو ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔"

"مگر....."

"ہندو مسلم فساد نہیں ہوتے تو تم لوگوں نے یہ چال چلی۔"

"تم کہتی ہو کہ پاکستان دے دیا تو ہندو مسلم فساد ہوں گے..... میری بات بھی تو سنو۔ کون دے رہا ہے پاکستان؟ ہے کس کے پاس کچھ دینے کو۔"

"آپ ہی لوگ پرچار رہے ہیں۔"

"جی ہاں ہماری جیب میں رکھا ہوا ہے پاکستان کہ مانگے کوئی اور ہم دے دیں۔"

"مگر آپ ان کے مطالبے تو مانتے ہیں۔"

"ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اگر انسانوں کا ایک گروہ کسی خاص قسم کی حکومت پسند کرتا ہے تو ہمیں کیا حق کہ انکار کریں۔ ہمیں ان کے بہت سے مطالبات سے اختلاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سرے سے پاکستان کا مطالبہ ہی ماننے سے انکار کر دیں۔ ہم فیصلہ کرنے والے کون؟"

"مگر مذہبی ڈھونگ رچا کر....."

"کچھ تو دیانتاً اختلاف ضرور ہیں۔ ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ابھی تو صرف پاکستان کا مسئلہ درپیش ہے۔"

"اور اگر سکھستان، عیسائیستان اور بدھستان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔"

"تو اس پر بھی غور کیا جائے گا۔ کسی مسئلہ پر خواہ وہ کیسا ہی فضول ہو غور نہ کرنا....."

"مگر مقصد کیا ہے اس طرح کے تضیع اوقات سے۔"

"مقصد صرف ایک ہے۔ اتحاد۔"

"ہنر کس قدر گھسا ہوا لفظ ہے کانوں کو بھی متاثر نہیں کرتا۔"

"ہاں گھسا تو بہت گیا ہے مگر مرا تا نہیں گیا۔ ابھی شیشے کا دھندلا سا ٹکڑا ہے مگر میں نے کہا تو کہ پھر کر لینا بحث۔"

"یہ خوب ہے آپ تو دلائل سے گھبراتے ہیں۔ انسان کی قوت* متخیلہ کو مفلوج کیے دیتے ہیں۔"

"اب میں کیسے ہر منکر کو دلائل سے قائل کرتا پھروں تم ہی سوچو اگر دو چار بھی تم جیسے ضدی پلے پڑ جائیں تو اپنی زندگی تو ان ہی کو قائل کرتے کرتے گذر جائے خیر یہ بھی کر لیتے مگر ذرا دیکھو تو کیسی افراتفری پڑ رہی ہے جو بنگال میں ہو گیا کیا چاہتی ہو یہاں بھی ہو جانے دیں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہ ہوتی تو بھلا اپنا قیمتی وقت یوں برباد کرتا۔ خیر اگر تمہیں فرصت نہیں تو۔۔۔۔

چائے تو پیجئے زیادہ دیر نہ لگے گی" اس نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھو اگر مجھے اتحاد منظور نہ ہوتا تو تمہیں اتنی خوشامد میں کر دانے کی ہمت نہ ہوتی "چائے کے گھونٹ لے کر پروفیسر مسکرایا۔ کسی قیمت پر بھی ہم ملاپ کرا کر رہیں گے۔ گو ایسا کرنا آسان نہیں دونوں ہی طرف سے جوتے پڑ رہے ہیں مگر تم دیکھنا ہماری ڈھٹائی کو" وہ زور سے ہنسا۔

*"اچھا اب چلے۔۔۔۔ تو ذرا جلدی آنا صبح۔۔۔۔" بغیر کچھ کھائے پیئے وہ تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ شمن نے دیکھا کہ اس کے بال پھر گدی پر شاعروں کی طرح بڑھ آئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔

شمن کو ڈانسی پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ٹیلر بھی یہی کہتا تھا پتہ نہیں دل سے یا مجبوراً وہ عموماً کترا جاتا۔ مگر یہ پارٹی افسروں کی طرف سے تھی اور اسے کامیاب بنانے کی ذمہ داری بھی انھیں کے* سر تھی۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے شمن کو بخار بھی آ گیا اور اس کا جھگڑا تو یوں حل ہو گیا۔ پچھلے کچھ

دنوں سے صحت ویسے ہی خواہ مخواہ گرتی جا رہی تھی اوپر سے یہ بخار اور پھر شبلی کی لاپروا مصروفیت پروفیسر بھی غرض سے آتا تھا جب سے بخار آیا وہ رسم پوری کرنے کو ایک دو منٹ کے لیے آتا اور بھاگ جاتا۔ شاید دوسری لڑکیاں بھی روبصحت ہو رہی تھیں اور شمن کی اشد ضرورت نہ رہی تھی۔

چڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ آگے ہی دو طشتریاں اور ایک پیالی پھینک چکی تھی کہ ٹیلر چاق چوبند ٹائی اتارتا زور زور سے سیٹی بجاتا آن پہنچا۔

"اوہو بڑے تر مال اڑا رہی ہو" اس نے مسکرا کر کہا اور شمن کا جی چاہا کہ اس کی تھوتھنی پر کھینچ مارے۔ صبح سے ایک نوالہ حلق سے نہیں اترا اور یہ سمجھ رہا ہے وہ دن بھر چرنیاں ہی کرتی ہے۔

"ممی کا خط پڑھا پاگل ہو گئی ہیں" وہ شرمائے انداز سے مسکرایا۔ "بے کار کی چیں چیں نہ جانے ان عورتوں کو کیا اچھی لگتی ہے۔ ہشت فضول" مگر شمن نے خط نہیں اٹھایا خاموش چائے میں چمچہ چلاتی رہی۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے۔

"بے کار کا جنجال ۔۔۔ جی گھبراتا ہے میرا بچوں سے۔"

"ہنہ ایک حماقت ہو گئی اب دوسری....."

"ایں؟" وہ کچھ کھسیا کر چونکا۔

"اور کیا جو ہم نے بویا ہے ہم ہی بھگتیں اور بے گناہوں کے ماتھے پر سیاہ دھبہ کیوں تھوپ جائیں۔"

"ممی... ان کی خواہش ہے...." کچھ کہتے کہتے رک گیا شدتِ احساس سے کان سرخ ہو گئے۔

"ممی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ جائیں وہ خود خلاف ہوں گی۔"

"کون ممی..... ارے توبہ کرو۔ دیوانی ہیں وہ بچوں کی..... تمام ادھر ادھر کے بچوں کو چٹائے رکھتی ہیں۔"

"تو اب بھی ادھر ادھر کے بچے موجود ہیں شوق سے چٹائیں۔"

"ہوں" وہ چپ ہو گیا۔

"آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ ہنہ" اس نے انتہائی مکّاری سے کہا اور خون پھر ٹیلر کے کانوں کی طرف دوڑا۔

"ہم نے سخت غلطی کی" ٹیلر کپکپی ہوئی آواز میں بولا۔

"حد سے زیادہ بڑی حماقت"

"کیسے بھگتی جائے گی یہ دو نسلے بچے"

"کیا ضرورت ہے کہ بھگتی ہی جائے۔ اگر زہر کھا لیا جائے تو قے کیوں نہ کر دی جائے"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ دو نسلیوں کو قبر میں جھونکنے سے بہتر ہے تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں"

"کسی ہندوستانی سے کہتیں تو وہ مزہ چکھا دیتا" اس وقت ٹیلر نے دانت پیس کر کہا۔

"شاید"

"اور پھر تمہیں اعتراض بھی نہ ہوتا"

"شاید"

"کس قدر ذلیل ہو تم" اس کے منہ میں جھاگ آ گیا۔ "ذبح کر ڈالنا چاہیے اس قسم کی حیوان عورتوں کو ... مجھے تم سے کتنی نفرت ہے"

"ہنہ۔ اور جیسے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں"

"تم ..... تم بیسوا سے بھی بدتر کسی خبیث طبقے سے ہو ..... کاش ایک بار کوئی تمہارا گلا گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے"

"اور تمہیں کیوں نہ نسل ڈالے جونک بن کر سارے ملک کا خون چوس رہے ہو۔ ذرا اپنی ماں بہنوں کو تو دیکھو ..... بدمعاش زمانے بھر کی"

اقتباس دو

اقتباس

"چپ کم بخت..... گلاب کے پھولوں کو چقندر میں نے تھوہر سے ناتا جوڑا۔"

"اور تم..... بڑے حسن کے پتلے ہو۔ کوڑھ جیسی رنگت۔ سڑے ہوئے دانت بندر کہیں کے۔"

"تو پھر کسی بھیل چمار سے جا لپٹو۔ ایسی ہی یاجیا ہو تو نکل جاؤ یہاں سے۔"

"بھیل چمار تم سے لاکھ درجہ بہتر ہے ٹامی کہیں کے۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

مذاق مذاق میں شمن بتا چکی تھی کہ ٹامی ہم ہندوستانی اس سفید ناجائز اولاد کو کہتے ہیں جو فوج میں بھرتی کر کے توپوں کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ ٹیلر اس کے منہ سے اتنی نیچ گالی سن کر کانپ اٹھا تھوڑی دیر وہ ساکت بے حس و حرکت بیٹھا رہا اس کی رنگت سفید پڑ گئی جیسے کسی نے پچکاری سے خون کھینچ لیا ہو۔ شمن نے جلدی سے کمرے میں جا کر دروازے بند کر لیے۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں بکتا رہا۔ شمن نے اسے کبھی اتنا غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل پاگل معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ضبط کی لگام تڑا کر غصہ دماغ پر جھپٹ پڑا ہو۔ شمن پیر لٹکائے پلنگ پر بیٹھی کانپا کی۔ اتنی بات بڑھ گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی۔

رات بھر ٹیلر کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی وہ زخمی چیتے کی طرح تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ بار بار الماری کھول کر کچھ انڈیلنے کی آواز آتی مگر وہ بھی جلدی خاموش ہو گئی کیونکہ ایک بوتل آنے جانے والوں کے لیے رکھی تھی۔ عادتاً ٹیلر نہیں پیتا تھا۔

اور پھر سسکیوں کی آواز آئی جیسے کوئی دم گھونٹ کر رونا ضبط کر رہا ہو۔ شمن کا جی ہل گیا وہ رو رہا تھا۔ ٹیلر مٹا کٹا قد آور جوان مرد ایک عورت کے مارے ہوئے ڈنکوں پر سسکیاں بھر رہا تھا اس کا جی چاہا جا کر..... مگر وہ لرز اٹھی۔ وہ نیلی نیلی کانچ کی گولیوں جیسی آنکھیں وہ تمتمایا ہوا چہرہ!

دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر نوکر نے بتایا کہ وہ اچانک سامان تیار کروا کر دہلی روانہ ہو گیا کوئی ٹرنک کال بھی کی تھی۔ شمن کا بخار بھی نہ اترا اور کمزوری حد سے

زیادہ بڑھ گئی۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور شلپا کا نہ ہی کوئی خط آیا، نہ خیر خبر۔ اس نے ادھر ادھر ٹیلی فون کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چل سکا وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گیا ہوگا جس میں شاید رازداری کا جھگڑا شامل ہوگا۔

دو ہفتے اور شلپا کا نام و نشان نہیں۔ صرف سرکاری طور پر اس کی تنخواہ تو شمن کو مل گئی۔

ذرا سی چنگاری کو پنکھا جھل جھل کر اس نے کتنا بڑا شعلہ بنا دیا کہ دم بھر میں سب کچھ بھک سے اڑ گیا۔ بس شلپا ایک بار واپس آجائے پھر؟ پھر یہ تاریخ کبھی نہ دہرائی جائے گی وہ آجائے پھر تو..... بن جائے گا۔ سب کچھ بن جائے گا۔ کھنڈر اتنے بوسیدہ بھی نہیں ہو گئے کہ مرمت نہ ہو سکے۔

اقتباس
خود اعتمادی
اپنے کردار کے
...
...تقات
...سکے
...سے
...اپنی زندگیاں کا
...ہوا۔

"زیادہ نہیں بس ایک بار..... آخری بار..... آخری موقع! وہ نہ جانے کس سے اور کیا مانگتی رہی۔ دن گزرتے گئے وہ کام پر بھی چلی جاتی مگر جی کھویا کھویا رہتا۔ اس نے شلپا کے سارے کپڑے نکلوا کر دھونے دی۔ کمزوری باقی تھی اس لیے نوکر کو ہی ہدایات دیتی رہی۔ برش خود کیا اور گولیاں ڈال کر بند کر دیئے۔ دن میں کئی بار احساس تنہائی خوف بن کر چھایا اور وہ خاموش آنسو بہایا کی۔

اور دن گزرے! اس کا کوئی نہیں دنیا میں وہ سب کو کھو چکی ایک ایک کر کے سارے ڈورے زہریلے دانتوں سے کتر ڈالے مگر امید کا آخری تار سلامت تھا گو بار بار لرزتا کہ اب ٹوٹا اور اب ٹوٹا۔

اس کی نیند بالکل اچاٹ ہو گئی تھی سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ رات بھر یہی معلوم ہوتا..... وہ مل گیا راستہ! شلپا کی موٹر آ کر رکی..... وہ اترا..... اب زینے پر چڑھ رہا ہے۔ سیڑھیاں طے کر چکا..... اب دروازے پر آ رہا ہے مگر نہیں سارا حساب گڑبڑ معلوم ہونے لگتا نہیں بھلا اتنی جلدی موٹر سے کیسے اترا ہوگا۔ زینے کہنا اور بات ہے فعل کے سرزد ہونے میں تو وقت لگتا ہے۔ وہ کھٹ سے اس نے

موٹر کا دروازہ بند کیا...... اب...... چلا...... سیڑھیوں پر چڑھا، صاف جوتوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے...... مگر یہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ختم نہ ہو سکتی۔ دس بارہ سیڑھیاں ہزار چاپوں میں بھی طے نہ ہو پاتیں...... اور پھر اسے معلوم ہوتا جیسے وہ پیر کی چاپ نہیں تھی وہ نل کی بوندیں ٹب میں گر رہی تھیں ٹپ ٹپ متواتر یہ بوندیں انسانی قدموں کی طرح چلتی معلوم ہوتیں۔ جھنجھلا کر وہ اٹھتی اور نل کو خوب مروڑ کر بند کر دیتی تاکہ گلا گھٹ جائے کم بخت کا۔۔۔ دماغی خلجان بڑھتا گیا کھانے کی اکیلی میز پر ایک نوالہ بھی اس کے حلق سے نہ اترتا۔ زبان پہ کائی لگ گئی تھی ہر چیز کڑوی بدمزہ بساندی اور پھپھاندی معلوم ہوتی۔ تھک گئی تھی وہ ان کھانوں سے، میز کرسی سے نرم نرم صوفوں سے جی چاہتا ایک بار ہی سب کچھ دور جھٹک کر کھڑی ہو جائے آخر تھا کیا ان الجھنوں میں؟ اس پھیکی کسیلی زندگی سے تو یقیناً موت زیادہ چٹ پٹی ہو گی۔ شامی کباب کا چھوٹا سا ٹکڑا منہ میں سڑاندی غلاظت کا پہاڑ بن کر پھیل گیا۔ بیرے کی نظر دل سے ابکائی بچاتی ہوئی وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یہ کباب ٹیلر کو کس قدر پسند تھے روکھے روکھے نگل جاتا تھا لیکن اب یہ نہ بکیں گے جب تک ٹیلر نہ آ جائے ورنہ یوں ہی گلے میں ابکائی بن کر اٹکے رہیں گے۔

یہ ذرا سی بات اتنی لمبی کیوں ہو گئی کتنی بار تو اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا مگر پھر بھی قسمت میں اس کی تکمیل یوں لکھی تھی مانا کہ وہ ایک دوسرے سے اکتا چلے تھے مگر یہ کون سی نئی بات ہے اور لوگ بھی تو لڑتے بھڑتے ہیں مگر زندگی کی روانی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل نہیں گر پڑتی۔ اب کے ٹیلر آ جائے تو؟ تو...... کتنا ارمان بھرا تھا تھا! مگر وہ اس سے معافی مانگ لے گی۔ گو معافی تو کجا اگر وہ صرف ایک معمولی سے اشارے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی تو ٹیلر ریشہ خطمی ہو جاتا اتنا غصیل تھا پر جہاں آنسوؤں کی چمک دیکھی اور عقل کی آنکھیں چندھیائیں الٹی معافیاں حصے میں آئیں۔ اور کیا حرج ہے جو ماں کی بھی بات مان لی جائے یہ وہی تو ماں تھی جس نے دور بیٹھے بیٹھے جیسے بٹن دبا کر دو مختلف طاقتوں کو کھینچ کر ملا دیا تھا تف ہے اس کی اوقات

ہے کہ وہ اس کی ننھی منی آرزو نہ پوری کر سکی خیر وقت اتنی دور نہیں بھاگا ہے اب بھی تلاش کی جا سکتی ہے۔

لیکن..... ایک بھیانک "لیکن" نے اس کے جمع ہوتے ہوئے خیالات کو بکھیرنا شروع کیا سرکاری طور پر اسے معلوم ہوا کہ ٹیلرا بھی پندرہ بیس دن نہ آسکے گا۔ جی کڑا کر کے چاہا اسے خط لکھے مگر یہ کم بخت قلم بڑا مجبور آلہ ہے اس کے پاس وہ طاقتیں کہاں جو ایک روٹھے کو منانے کے لیے استعمال کرنا پڑتی ہیں۔

پروفیسر کا فون آیا کہ فوراً آؤ جی تو نہ اٹھتا تھا مگر کرنے کو کچھ نہ تھا بے کار دن اونگھتے گذارنا قیامت سے کم نہ تھا راشننگ کے دفتر پر چھوٹی چھوٹی جھاڑ بھاڑت بھیڑی نظر آتی تھی چند بے پر کی خبروں نے اڑ کر بھوکوں کے پیٹوں کی آگ اور بھڑکا دی تھی بنگال کی بھوک ہیبت بن کر سہما رہی تھی لوگ اناج پر ٹوٹ پڑتے تھے رہا سہا صبر بھی مفقود ہو چکا تھا۔ انسانیت کو اتنا نیچا دیکھ کر جی جھنجھلا اٹھتا آخر اتنی کانٹوں بھری زندگی اتنی پیاری کیوں تھی۔ آخر دوسرے ملکوں میں بھی تو بھوک ہے پر اتنی اندھی اور بے حیا نہیں اگر ذرا صبر سے مر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

دھوپ تیز ہونے لگی مرجھائے ہوئے زرد چہرے تیل جیسے چپچپے پسینے سے دمک اٹھے جیسے لاشوں پر برقی روشنی پھیل گئی آنکھیں زیادہ خشک اور بے رونق ہو گئیں تھکی ہوئی ٹانگیں ٹھوس تپش کے بوجھ سے لرزنے لگیں مجمع ہنڈیا کی طرح کھدبدا اٹھا تعفن کے بھبکے شمن کے بھیجے کو گھونٹنے لگے دوڑا میں جھنجھناہٹ گویا تھوڑی پر تلتے باجے کا سماں باندھتی گذر گئیں یوں یوں ہزاروں موٹریں شمن کے کانوں میں گھسنے لگیں لڑکھڑا کر اس نے پان والے کی دکان کا سہارا لیا۔

چونا سادہ ودیسی؟..... بائی..... ..... سپاری؟ پان والے نے جلدی جلدی کتھے چونے کی کلھیوں کو بجایا بھیڑ کے پیچھے تاش کی گڈیوں کی طرح بکھرے سمٹے ہوا میں لہرائے پیر کے نیچے سے پچھلی پان کی پیکوں سے لتھڑی ہوئی زمین کتاب کے ورق کی طرح پھڑپھڑا کر منہ پر آن چپکی..... اور کہیں آگ بجھانے کا انجن ٹن ٹن

کرتا خاموشی میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک نئے کمرے میں پایا۔ گھومتا ہوا دماغ ٹھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے پاس ہی پروفیسر جھکا ہوا برف توڑ رہا تھا دو تین اور نا واقف چہرے موجود تھے۔ "ایسی حالت میں باہر نہیں نکلنا چاہیے" ڈاکٹر نے ربڑ کی نلکیوں والا آلہ تہ کرتے ہوئے کہا۔

"حالت؟ کیسی حالت؟" مگر شاید یہ ڈاکٹرانی کہنے میں جو مزہ پاتے ہیں وہ مریض کی سننے میں نہیں پاتے۔ ڈاکٹر نے لمبی چوڑی فہرست احتیاطوں اور دواؤں کی سنا دی.... دوائیں طاقت کی دوائیں!

اوہ.... مارے حیرت کے وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ بچہ تو نہیں تھی مگر پریشانیوں میں وہ کتنا کچھ بھولی ہوئی تھی اس عظیم الشان انکشاف نے جیسے بھاگتے بھاگتے ایک دم پکڑ لیا پروفیسر کچھ خجل کچھ مجرم سا کھڑا تھا وہ اٹھی تو ایسے سہارا دینے دوڑا گویا وہ نازک سا کانچ کا گلاس ہے اور پھونک مارنے سے ٹوٹ جائیگی۔ وہ کھسیا کر تیز تیز چلتی باہر ٹیکسی میں آن بیٹھی۔

موٹر کی تیز ہوا نے اسے جگا دیا چونک کر اس نے پھریری لی اور ایک دم اس کا دماغ بھی موٹر کے ساتھ بھاگنے لگا۔ جی چاہا زور زور سے ہنسے یا پھر زور زور سے روئے مگر وہ ڈرائیور سے جھینپ گئی۔ "جلدی جلدی" اس نے ڈرائیور کو ٹوکا۔ بس نہ تھا جو وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن موٹر کی طاقت میں شامل کر دیتی آج اس کا جسم ایک دم ہلکا ہو کر اڑ جانے پر تلا ہوا تھا بار بار آنکھوں میں بے معنی آنسو چھلکے آ رہے تھے سامنے آئینے میں اس کی شکل کتنی مردہ اور اجڑی ہوئی نظر آتی مگر کچھ پروا نہیں حسن اور بد صورتی یک جان ہو کر اس نئی چمک کے سامنے ماند پڑ چکے تھے بد صورت تھی تب بھی...... تب بھی اس کا دل ایک دم کتنا حسین ہو رہا تھا وہاں صرف ایک متحیر سا خیال تھا رونی..... رونی ٹیلر..... کہاں ہو تم۔ مجھ سے معافی مانگو..... بے رحم کہیں کے..... اس کا گلا گھٹ گیا۔

وہ ڈانٹ بتائے گی روفی کو آنے دو تو ذرا۔ اپنی "بد نصیبی" کا سارا الزام اس پر تھوپ دے گی اور پھر روفی! اسے اتنا ہوش کب رہے گا کہ برا مان سکے۔ جنگلی کہیں کا! خود غرض وحشی! چلا گیا اتنے دن کے لیے یہ بھی نہ سوچا کہ آج کل پیٹنٹ دوائیں کہاں ملتی ہیں۔ کیلشیم انجکشن لانا جوئے شیر لانے سے کم ہو گا۔ اور اس وقت یہ لا پروائی ..... مگر پھر اسے روفی پر پیار آ گیا اتنی دور ہو کر وہ کہیں بالکل ہی قریب تو تھا۔

اور ماں! جب بے وقوف پیاری سی ماں نے لکھا تھا "تم لوگ گھبرانا نہیں اونی سامان میں سب خود تیار کر لوں گی" تو ہنسی۔ دیوانی بڑی بی مارے ارمانوں کے مری جا رہی ہیں۔ سمجھتی ہیں جیسے ان میں تو بہت ہی بہت سلیقہ پا لنے کا لاڈ میں بگاڑ کر ناس مار دیں گی روفی سے بھی بد تمیزی اور منہ چڑھا بنا دیں گی اور پھر بڑی بی میں دم کہاں ہو گا جو بات برات ہو الگ جائے۔ کہتی ہیں آئیں گی۔ مگر یہ بد نصیب جنگ بھی دم لے کبھی تو جینے کی فرصت ملے جب ہی تو۔ نہ جانے کم بختوں کو کیا مل رہا ہے ایک دوسرے کا خون بہانے میں۔ وہ سوچتی رہی۔ اس خون میں لتھڑی ہوئی دنیا کا خیال کر کے جی دہل گیا کاش یہ جنگ جب تک ختم ہو جاتی۔ خدا کسی کو اس قیامت کے دنوں میں جنم نہ دے۔ کون بچا ہوا ہے؟ اور کب تک نہ جانے کس وقت آگ برسنے لگے۔ پریشان ہو کر وہ اپنے لمبے چوڑے کنبے کو بچانے کی فکر میں پڑ گئی۔

ارے ..... اور کوئی احتیاط نہیں کرتا۔ روشنیاں دھڑا دھڑ جلنے لگی ہیں۔ شیشوں پر سے کالے کاغذ اتر گئے تہ خانہ قبر بنا پڑا ہے۔ مانا کہ خطرہ قریب نہیں مگر چیل جھپٹا مارنے سے پہلے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دم میں بمباری ہونے والی ہے۔ اسٹور میں بھی تو کچھ نہیں۔ روفی کے پائپ کو تمباکو نہ ملا تو وہ سر کھا جائے گا۔ پاگل آدمی ٹھیرا۔ اور جو وہ روفی کو کچھ نہ بتائے تو؟ مزہ آ جائے۔ ایک دم مارے حیرت کے پاگل ہی تو ہو جائے گا۔ اور جو ابھی سے معلوم ہو گیا تو جینا دو بھر کر دے گا۔ جان کھائے گا "یہ نہ کرو وہ نہ کرو" اسے ایک دم ہنسی آ گئی کیسی اترائی ہوئی باتیں

سوچنے لگی تھی وہ بھلا آج کل بم کہاں؟

مگر احاطے میں داخل ہو کر واقعی اس پر بم پھٹ پڑا۔ ملٹری کی بھوری گاڑی برساتی میں کھڑی تھی بے قابو ہو کر وہ بھاگی۔۔۔ روفی..... روفی..... ہانپتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ساڑھی پیر میں لپٹی اور وہ سہم کر رک گئی۔۔۔

"روفی" اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ دور دھکیل کر کھولا۔ "روفی!"

"گڈ ایوننگ میڈم!" ایک کلف لگے ہوئے فوجی نے سلام کیا۔

"روفی!" اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔

"مسٹر ٹیلر بذریعہ ہوائی جہاز محاذ پر روانہ ہو گئے۔ یہ خط۔" اس نے ادب سے خط بڑھایا اور جلدی سے سلام جھاڑتا ہوا لوٹ گیا۔

ہاتھ میں خط لیے وہ ٹھیری ہوئی سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہوا میں ہوائی جہازوں کے ہزاروں لاکھوں پر ببر شیروں کی طرح غرائے چیختے چنگھاڑتے بم لاکھوں کی تعداد میں برس پڑے جنگی گرج کانوں کو سن کر گئی۔

"روفی... روفی" اس کی بھٹکی ہوئی روح کراہتی ہوئی موہوم سے ڈاہیے کے تعاقب میں ڈوب گئی۔

روفی سارے اختیارات سونپ کر جنگی محاذ پر روانہ ہو گیا تھا۔ وہ آزاد تھا۔ جسم سے نکلی ہوئی روح کی طرح آزاد! لاوارث اور کھوئی ہوئی۔۔۔ "تم نہیں گئے روفی..... روفی یہ نہیں ہو سکتا۔ ظالم اب تم کہیں نہیں بھاگ سکتے۔" اس نے بڑے وثوق سے پکارا۔ گویا وہ اسے قید کر چکی ہو۔ "سنو روفی....." مگر وہ کسی کو نہ سنا سکی اور گھنگھور گھٹائیں زور شور سے گھر کر منڈلائیں۔۔۔ "ٹھیر و ٹھیر و.....،" اس نے منہ زور طوفان کو لجاجت سے چمکارا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیرو۔ اتنا زور نہ لگاؤ..... ورنہ یہ تنی ہوئی ڈوریاں ٹوٹ جائیں گی۔" "تم گئے روفی!" اس نے گھٹے ہوئے کلیجے کا زور لگا کر پکارا۔ مگر آہ بھی نہ نکلی اور پھر ایک دم نئی جان نے اس کی پکار سن لی..... زندگی کی پہلی پھریری لہروں کی طرح تھراتی اس

کے جسم میں تیر گئی۔ ڈوبتی ہوئی طاقتیں تاریکیوں سے ابھرنے لگیں۔ تنی ہوئی رگیں آپ ہی آپ لچک کر ڈھیلی پڑ گئیں۔ آنکھوں کی وحشت آنسوؤں سے دھل کر بہہ نکلی سسکیاں ہنسی کے فوارے بن گئیں۔ اور بم باری کا بھیانک احساس دور جھٹک کر وہ بوسیدہ ملبے کے ڈھیر کے نیچے سے رینگ آئی..... اکیلی؟

امریکہ میں بیٹھی ہوئی اونی کپڑے بننے کی شوقین ماں ہوائی اژدہوں کے پروں پر موت کے دہانے کی طرف اڑتا روئی..... وہ خود..... اور..... اس کے اپنے وجود سے اس قدر قریب ایک نئی جان! اتنی لمبی چوڑی برادری میں وہ اکیلی کہاں ہے۔ مانا کہ بہت دور ہیں وہ، ایک دوسرے سے ہزاروں میل کا سفر حائل ہے مگر اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی ساری دنیا سمٹ کر خود اس کی ہستی میں سما گئی آج اس بے کسی کی تنہائی میں بھی کتنی چہل پہل تھی اس بے سروسامانی میں بھی کتنی سلجھی ہوئی سجاوٹ تھی! آج وہ کتنی متحیر مگر خوش تھی۔ اس سے قبل اس نے اپنے آپ کو اتنا کمزور..... اتنا بہادر، اتنا پریشان..... مگر اتنا مطمئن کبھی نہ محسوس کیا تھا۔ اور دنیا کتنی حسین ہو گئی! زندگی کتنی عزیز!

اور روئی؟

اس کا جی مسل گیا۔ خالی ہاتھ، اکیلا روئی! اس کی مفلسی پر اسے ترس آ گیا جیسے کسی رئیس اعظم کو اپنے محل کی کھڑکی سے کسی قلاش فقیر کو ناداری کی سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر رحم آنے لگے۔

"ٹھگ کہیں کی۔" اس نے نئی دولت سے مالا مال ہستی کو طعنہ دیا۔ ایک ہرجائی لٹیرے کو بھی لوٹ لیا!

نشیلے قدم اٹھاتی، جیسے اس کے ٹخنوں پر نقرئی گھنگھروؤں کے گچھے آن بندھے ہوں، وہ پلنگ کی طرف مڑی اور نہایت احتیاط سے اپنا تھکا ہوا سر تکیے پر لٹکا دیا۔

— — —

چند اہم علمی و ادبی مطبوعات

لکھنؤ کی پانچ راتیں	سردار جعفری	40/-
شرر بہ حیثیت ناول نگار	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	65/-
لندن او لندن	ڈاکٹر سید محمد عقیل	60/-
شعلے کی شناخت	عمیق حنفی	30/-
ایک نایاب مثنوی	ڈاکٹر عبد الرؤف	15/-
غالب ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین	30/-
در بدری	رتن سنگھ	15/-
فراق فن اور شخصیت	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	30/-
ادب کی تلاش	بلراج کومل	30/-
تنقیدی مطالعے	ڈاکٹر شارب ردولوی	20/-
اردو افسانے کے افق	مہدی جعفر	25/-
ساحل اور سمندر	احتشام حسین	30/-
تاریخ ادب کی تدوین	علی جواد زیدی	15/-
کروچے کی سرگذشت	محمد علی صدیقی	15/-
باغ و بہار ایک تجزیہ	ڈاکٹر وحید قریشی	15/-
مغربی تنقید کے اصول	ڈاکٹر انور سجاد	35/-
مارکسی جمالیات	اختر علی انجینیر	25/-
تاریخ و تحقیق	الطاف حسین شروانی	25/-
کشمکش حیات	مرزا جعفر حسین	6

نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ
226018

چند اہم ناولیں اور افسانوی مجموعے

ناول: معصومہ	عصمت چغتائی	30/-
اندھیری رات کا تنہا مسافر	شہزاد منظر	25/-
ندی	عبداللہ حسین	10/-
ضبط کی دیوار	سلیم اختر	10/-
آدھے سفر کی پوری کہانی آدھا راستہ	کرشن چندر	30/-
چراغِ تہہ داماں	اقبال متین	20/-
بے جڑ کے پودے	سہیل عظیم آبادی	15/-
افسانے: ایک حلفیہ بیان	اقبال مجید	20/-
سیمیا	نیّر مسعود	20/-
قیدی سانس لیتا ہے	زاہدہ حنا	50/-
پیش بھیڑ میں خود کلامی	رشید امجد	30/-
عقب کا دروازہ	حمید سہروردی	30/-
بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	25/-
خالی پٹاریوں کا مداری	اقبال متین	30/-
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	20/-
دوسرا کھوروخاں	نور پرکار	18/-
سبزۂ بیگانہ	نور پرکار	20/-

نصرت پبلشرز۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔
226018

2058

عصمت چغتائی